ناول
ربیسنکر بال
دوزخ نامہ
انگریزی سے ترجمہ : انعام ندیم
عکس
AKSPUBLICATIONS

کچھ مصنف کے بارے میں

کتاب کے مصنف ربیسنکر بال بنگالی زبان کے نامور صحافی اور ادیب تھے۔۱۹۶۲ء میں پیدا ہونے والے اس نہایت عمدہ ادیب کا ۲۱/ دسمبر ۲۰۱۷ء کو انتقال ہوگیا۔ اپنی پچپن برس کی عمر، اور تیس برس کی ادبی زندگی میں انھوں نے ۱۵ ناول اور ۵ افسانوی مجموعوں کے علاوہ، شاعری اور ادبی مضامین کا ایک ایک مجموعہ تحریر کیا۔ ربیسنکر بال کو ان کے ناول ''بائیوگرافی آف مڈنائٹ'' پر مغربی بنگال حکومت کا سٹوپا رائے چودھری میموریل پرائز دیا گیا اور ''دوزخ نامہ''، جسے اُن کا سب سے قابلِ ذکر ناول قرار دیا گیا، کو اسٹیٹ سرکار کی جانب سے بنکم چندرا سمرتی پرسکار دیا گیا۔ ربیسنکر بال نے ایک ناول جلال الدین رومؔی کے بارے میں بھی تحریر کیا، اس ناول کا بھی انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سعادت حسن منٹو کی تحریروں کے بنگالی تراجم بھی مرتب کیے۔

دوزخ نامہ

(ناول)

مصنف

ربیشنکر بال

مترجم

انعام ندیم

عکس

AKSPUBLICATIONS

کتاب	دوزخ نامہ (ناول)
مصنف	ربیسنکر بال
مترجم	انعام ندیم
سن طباعت	2019ء
کمپوزنگ	حبیب الرحمٰن اعوان
تعداد	500
قیمت	800

''غیر حقیقی لوگ'' کے مصنّف
سیّد مصطفےٰ سراج
کی یاد میں

(ربی سنکر بال)

ترجمے کی یہ کاوش
اکبر معصوم
کے نام

(انعام ندیم)

ناول کا مقدمہ: مرزا بنام منٹو

عجیب ستم ظریفی ہے۔

ستم ظریفی کے ایسے کتنے ہی معاملات کی طرح اس بحر کی تہہ سے بھی برآمد ہوتے ہیں تو مرزا غالب۔ اس بار یوں کہ اپنے جلو میں سعادت حسن منٹو کو لیے ہوئے۔ گویا اپنے قول کے مطابق اس عالم میں کہ:

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

یوں بیان کیا گیا ہے کہ آسمانوں میں فرشتے ایک الوہی واقعے کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے کہ کچھ سُن گُن پا کر ابلیس نے ادھر کا قصد کرنا چاہا تو اس کا راستہ روکنے کے لیے فرشتوں نے نور اور آگ کے گولے اس کی طرف برسائے جنھیں دنیا والے شہابِ ثاقب کے نام سے جاننے لگے۔ اس طرح مرزا غالب اور سعادت حسن منٹو کی آپس کی گفتگو کی کن سوئیاں لینے کے لیے، دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے والا ناول نگار ادھر کا ارادہ باندھ رہا ہوگا کہ اس کے روکنے کے لیے غالب اور منٹو نے نور کے گولے اس کی طرف پھینکے ہوں گے۔ انھی میں سے ایک آگ اور نور کا گولہ ''دوزخ نامہ'' کہلانے والا ناول بن گیا، جس کے ماتھے پر لکھا ہے یہ کہاں سے آیا، کس نے بھیجا۔

آگ اور نور کا ہم رنگ یہ ناول شہابِ ثاقب سے کم نہیں۔ اور جیسے شہابِ ثاقب اپنے

پیچھے روشنی کی لکیر چھوڑ جاتا ہے پھر دنیا والے اسے اہم واقعہ گردانتے ہوئے آنے والے دنوں کا قیاس کرنے لگتے ہیں، اسی طرح میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو میں ڈھل کر یہ ایک اہم تخلیقی واقعے کی صورت میں نمودار ہوا ہے، اپنے ساتھ گزرے زمانے کا ذائقہ اور آنے والے زمانوں کا شگون لیے ہوئے۔

اس ستم ظریفی کے انوکھے پن پر اصرار مجھے اس لیے بھی کرنا پڑ رہا ہے کہ اس عالمِ رنگ و بو سے رُخصت ہوجانے والے مشاہیر کے نام پر نامہ بری کے دعوے کے ساتھ ٹھٹھول، ابتذال، پھکڑ پن اور سیاسی لطیفے جوڑ دینے کی ایک سستی سی عام پسند صورت کے ہم اس درجہ عادی ہوتے جارہے ہیں (یا بنائے جارہے ہیں) کہ یہ انتباہ ضروری معلوم ہوتا ہے! ایسے لوگوں کے لیے لازم ہے کہ اس ناول سے احتیاط برتیں۔ مرحومین یا مشاہرین سے مکالمے کو ایک اور امکان کی طرف لے جاتا ہے یہ ناول۔ عجیب اس لیے لگا کہ پڑھنے کو اٹھایا تو بے تابی سے ورق پلٹتا گیا اور پڑھ لیا تو یوں معلوم ہوا، یہ سب تو پہلے ہی پڑھ چکا ہوں۔ کتنے بہت سے پرانے مطالعات کو زندہ کردیتا ہے یہ ناول۔ یہ ان سب سے زیادہ عجیب کتابوں میں سے ایک ہے جس کے پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور ذرا بھی تعجب نہیں کہ اس میں غالب موجود ہیں اور منٹو بھی۔

ایک زبان سے دوسری زبان اور پھر دوسری سے تیسری زبان کی مشکلات اپنی جگہ، لیکن اس سب کے باوجود پوری کتاب ایسی کیفیت کی حامل ہے، جیسے یہ ناول اپنی اصیل اور فطری زبان میں ظہور پذیر ہوا ہے، جو زبان اس کے تار و پود میں اس طرح پیوستہ ہے کہ کرداروں سے بڑھ کر کردار اور واقعات سے بڑھ کر واقعہ بننے لگتی ہے، کرداروں کو متعین اور حدود کی پابندی سے آزاد کرنے والی زبان اور واقعات میں زمان و مکان کا استدلال فراہم کرتی ہوئی زبان، ایک اَن دیکھی اور نامحسوس حقیقت کی طرح اس ناول کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہے۔ اردو زبان میں یہ ناول پڑھتے ہوئے یہ احساس بھی مشکل ہے کہ کسی اور زبان میں لکھے جانے کی وجہ سے اس کے اندر نامانوس کیفیت ہوگی اور اس کی وجہ سے ایک فاصلہ یا تکلف آجائے گا اور اب اس کی جگہ اس میں ایسا بے ساختہ پن پیدا ہوگیا ہے کہ پڑھنے والا بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

لیکن اب اس کو ترجمہ کہتے ہوئے میں ہچکچا رہا ہوں۔ کیسا ترجمہ اور کہاں کا ترجمہ؟ سرقہ تو پرانے شعراء نے کیا تھا جنھوں نے وہ مضامین چرا لیے جو میرے نام سے رکھے گئے تھے، غالب نے تاویل پیش کی تھی۔ غالب کی سنت پر عمل پیرا ہو کر میں یہ کہہ دوں کہ اصل میں یہ ناول اُردو میں لکھا گیا تھا اور آسمانوں پر لوحِ غیر محفوظ سے ربی سنکر بال نے اُڑا لیا، جیسے نسیمِ بہار زلف کی خوشبو چوری کرلیتی ہے، ترجمہ تو وہ تھا جو دوسری زبانوں میں شائع ہوا اور اصل ناول اب سامنے آرہا ہے۔ ترجمے کی کامیابی میرے نزدیک یہ نہیں کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو اور میں محمد حسن عسکری کے مطابق ترجمے سے اخفائے حال کا قائل نہ ہوتے ہوئے کسی قدر ترجمہ پن کو عیب نہیں سمجھتا کہ ایسے ترجمے کے ذریعے زبان میں بیانیے کی ایک نئی طرز کا امکان بہرحال اُجاگر ہوتا ہے۔ اس ترجمے کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر مناسب ہوگا لیکن اس کتاب سے جوں ہی دو چار ہوجائیں، اس کے موضوع کی دلکشی یعنی اس کا مرکز بننے والی دو شخصیات پہلے اپنے رنگ جما لیتی ہیں، یعنی منٹو اور غالب، یہاں تک کہ باقی ساری باتیں اگر دھیان میں آتی ہیں تو اس کے بعد۔ شاید اس موضوع کا فطری تقاضا بھی یہی تھا اور ماننے کی بات یہ ہے کہ اس موضوع کو ہاتھ لگانے کے بعد ناول نگار نے اس تقاضے کو بڑی نکتہ رسی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

ناول کا بنیادی premise یا مفروضہ یہ ہے کہ غالب اور منٹو محوِ کلام ہیں اور اس گفتگو کا محلِ وقوع عالمِ بالا میں جہنّم کا طبقہ ہے۔ ہر دو کی سوانحی تفصیلات سے عبارت یہ مفروضہ ایک طرفہ افسانوی اور ثقافتی واقعہ ہے۔ ان دونوں منفرد شخصیات کو ان کے اپنے زمان و مکان سمیت اُٹھا کر ایک دوسرے کے مقابل رکھتا ہوا یہ بیانیہ آگے چل کر چاہے جتنا بھی قرینِ قیاس معلوم ہونے لگے، پہلے پہل تو یکدم ششدر کردیتا ہے — ارے، یہ کیسے ہوگیا؟ ہمیں اس کی خبر کیوں نہ ہوئی؟ ایسی چنگاری بھی اپنے خاکستر میں تھی؟ پچھلا مطالعہ جیسے قلم کی جنبش سے وسیع تر ہونے لگتا ہے۔ ایک نئی سمت میں بڑھنے لگتا ہے۔ منٹو کے ذریعے سے غالب اور غالب کے ذریعے سے منٹو، اضافہ شدہ نئی تعبیر میں سامنے آتے ہیں۔ دونوں کے معنی فزوں تر ہونے لگتے ہیں۔ حیرت

ہوتی ہے اور کسی قدر شرمندگی بھی کہ اس درجے مناسب معلوم ہونے والا تعلق، اس سے پہلے دھیان میں یہ بات کیوں نہیں آئی؟ اس امکان کو تخلیقی اُپج رکھنے والے ناول نگار نے پہچان لیا اور اسے activate کیا اور یوں ایک نئی حقیقت کو مستحکم کر دیا جو اس سے پہلے تصوّر کا درجہ بھی نہیں رکھتی تھی۔

غالب کا اس ناول میں موجود ہونا پہلی اور بنیادی حقیقت ہے۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہاں دکھائی دینے والے غالب کیسے ہیں، اور کیا منٹو بھی ایسے ہی تھے جس طرح ان صفحات میں نظر آتے ہیں؟ غالب یہاں جس انداز سے بھی نظر آئیں، بڑی بات یہ ہے کہ وہ کردار بن کر بول اٹھتے ہیں۔ کم وبیش یہی بات منٹو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ غالب اس امکان سے بھی گریزاں نہیں کہ جس کی سمجھ میں آئے، وہ ناول کے غالب کو اصل غالب سے ملا کر دیکھ لے۔ غالب کے بارے میں ہم اس دور کے باقی تمام شعراء کی بہ نسبت زیادہ جانتے ہیں۔ اس کا اہتمام خود غالب نے کر رکھا تھا کہ ان کے شخصی رویّے ان کے خطوط میں واضح نظر آتے ہیں اور ہمیں زندگی کی معمولی تفصیلات اور بہت سے معاملات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر معلوم ہو جاتا ہے۔ اردو کے باقی اکثر شعراء کے برخلاف غالب ایک ایسی شخصیت ہیں جس کے خدوخال ہمیں واضح نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں غالب باضابطہ طور پر ایک شخصیت بنتے ہوئے نظر آتے ہیں — 'یادگارِ غالب' کے صفحات پر۔ 'آبِ حیات' میں آزاد کی معجز بیانی اپنی جگہ، حالی نے غالب کو کردار بنا کر مستقبل کے ناول نگار کا کام آسان کر دیا۔ حالی کے صفحات میں وہ جیتے جاگتے، ہنستے روتے اور زندگی کے عمل سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب زندہ کی ایک جھلک دیکھنے دکھانے کے اس احساس کے باوجود ہم یہ بھول نہیں سکتے کہ ہم غالب شناسی کے اس جھوٹے دور میں سانس لے رہے ہیں جب عام آدمی کے لیے غالب بڑی حد تک وہ سیلولائیڈ کے پتلے، ہدایت کار گلزار اور اداکار نصیرالدین شاہ والے غالب سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کالی داس گپتا رضا جیسا باریک بین محقق سیلولائیڈ کے اس پیکر پر اعتراضات کی بوچھار کر دیتا ہے لیکن مرکزی دھارے، مقبولِ عام کلچر میں وہ اس فرضی اور مصنوعی غالب کو بے دخل نہیں کر سکتا۔ فلم کے یہ نقلی غالب اصل شاعر کی جگہ لینے کے لیے بھی

تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ربی شنکر بال کی کاوش اس سے کہیں زیادہ تخلیقی قوت کی آئینہ بردار ہے۔ اس کتاب میں غالب اصل کے دعوے دار سے بڑھ کر پورے کے پورے افسانوی کردار ہیں، اپنی ہستی کے بجائے بیانیے کی رسوم و قیود کے پابند۔ اپنے اس کاغذی روپ میں بھی وہ ذہن کے پکے ہیں، ایک اور معنی میں حرفوں کے بنے ہوئے! ان کا کردار اپنی منطق پر پورا اُترتا ہے۔ کم وبیش یہی بات منٹو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بہت سلیقے سے دوسروں کا مونڈن کرنے والا منٹو یہاں کردار میں ڈھل جاتا ہے۔ اسے سر جھکانا پڑتا ہے اور نہ بات نیچی کرنا پڑتی ہے۔ غالب جیسی پیچ دار اور کثیر الجہت شخصیت کو کردار میں ڈھال لینا ناول نگار کی کامیابی کی اساس ہے۔ پھر غالب کے ساتھ منٹو یعنی دو آتشہ۔

غالب کے ساتھ منٹو کا مکالمہ قائم کر دینا ناول نگار کے کارنامے کی ایک اور جہت ہے۔ انیس ویں صدی کے دہلی میں رہنے والے شاعر اور بیس ویں صدی کے بمبئی، لاہور میں گزر بسر کرنے والے سعادت حسن منٹو، اپنے زمان و مکان کی حدود کے پروردہ اور نمائندہ، اپنی اپنی جگہ iconic حیثیت کے مالک ہیں اور بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے مقام پر قائم و دائم ہیں کہ انھیں ذرا سی جنبش نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ربی شنکر بال ان دونوں کو جگہ سے بے جگہ کرتا ہے، پھر ان کے مقام کا احساس دلاتا ہے۔ اپنی شعری کائنات میں غالب تو غالب ہیں — اپنی انگلیوں کی پوروں تک غالب، اپنے انفس و آفاق میں کامل، لیکن یہاں غالب اپنے ہونے کے ساتھ منٹو کے مطالعے والے غالب بھی ہیں۔ جیسے منٹو نے انھیں پڑھا، منٹو کا تشکیل کردہ غالب، کتاب کے صفحوں سے نکل کر اس پرانے غالب میں شامل ہو جاتا ہے جس کا کبھی گوشت پوست کا وجود رہا ہوگا۔ اسی طرح منٹو بھی قبائے ساز کتر کر غالب کے اندازے کے مطابق اپنا جامۂ ہستی تیار کرتا ہے، وہ منٹو جو غالب کے سامنے زبان کھول سکے، اپنی تمام زندگی کو غالب کے سامنے Apologia Pro Vita Sua کے طور پر پیش کر دے، وہی منٹو جس کے بارے میں اس کے معاصرین کہتے تھے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا، وہی منٹو غالب کے سامنے اوراقِ ہستی ایک ایک کر کے ترتیب کے ساتھ رکھ رہا ہے، زندگی کے تمام تر درد سے عبارت۔ دونوں کردار ایک

دوسرے کے لیے آئینہ فراہم کرتے ہیں،ایک آئینے کے سامنے دوسرا آئینہ، پہلے آئینے میں دوسرے کا عکس، اور دوسرے میں پہلے کا عکس در عکس۔

ربی سنکر بال کو اس بات کا کریڈٹ بھی ملنا چاہیے کہ اس کے صفحات میں غالب نہ منٹو، دنیا سے کٹے ہوئے isolated اشخاص نہیں ہیں۔ اپنے زمانے سے وابستہ و پیوستہ ہونے کے ساتھ غالب میں سبک ہندی کا ہلکا سا پرتو نظر آتا ہے جس سے ردّ و قبول نے غالب کی شعری شخصیت کو متعین کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس خفیف سا ہے۔ ربی سنکر بال کے لیے اس حد تک ہی ممکن تھا ورنہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سبک ہندی کو ہم نے کون سا قابلِ اعتنا سمجھا ہے؟ یہ تمام انداز اور اس کے ممتاز شعراء مجرمانہ غفلت کا شکار رہے ہیں۔ اسی طرح کہیں کہیں بیدل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مگر بیدل پورے ناول کے متقاضی ہیں۔ اسی طرح منٹو کے کردار کی تشکیل کرتے ہوئے معاصر افسانہ نگاروں کے متحرک سائے بھی نظر آتے ہیں، جن سے الجھنا منٹو کو پسند تھا۔ یوں غالب اور منٹو اپنے سیاق کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

اس ناول کی تمام تر عمارت دو ستونوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔ جو اردو ادب میں iconic حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے وقت کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے آگے بھی نکل جاتے ہیں۔ انیس ویں صدی کے مرزا غالب اور بیس ویں صدی کے سعادت حسن منٹو، جن دونوں کے درمیان اس طرح کی ملاقات بھی طبعی طور پر ممکن نہیں تھی جس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ عمر رسیدہ میر نے نو عمر غالب کے ابتدائی اشعار سن کر ان کے بارے میں پیش بینی کی ہوگی۔ دونوں اپنے حالات اور کیفیات کے اسیر ہیں اور انھی سے عبارت یہ زندگی کی کیفیات، معاشرے کے سماجی اداروں سے مخاصمانہ برتاؤ، فنی رویّے اور اوضاع سے شغف، غرض مماثلت اور مغائرت کا پورا ایک دائرہ کھینچا جا سکتا ہے۔ غیر مساوی لکیروں پر ایک دوسرے کے برابر چلتے ہوئے وہ مساوی نہ ہونے کے باوجود متوازی زندگی کے حامل نظر آتے ہیں۔ نادرۂ روزگار ہونے کی مشکلات سے لے کر غالب کے روز و شب میں ۱۸۵۷ء میں دہلی کی بربادی اور منٹو کے سلسلۂ زندگی میں ۱۹۴۷ء کا برپا کردہ ہنگامہ ایک دوسرے پر خوب روشنی ڈالتے ہیں۔ دونوں ہی

انگریزوں کے قائم کردہ قانون و عدالت اور تعزیرات کا شکار اس طرح بنتے ہیں کہ قانون کی شق اور فوجداری بھی افسانہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ورق اُلٹتے ہیں، مملکت برباد ہوتی ہے، ایک نئی حکومت وجود میں آتی ہے اور زندگی ایک بار پھر چل پڑتی ہے — دونوں کی اپنی اپنی زندگی۔ اپنے قابلِ قدر مقالے "غالب اور منٹو" میں ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے لکھا ہے:

"غالب اور منٹو اب نام نہیں، استعارے ہیں۔ ان کا خمیر انسانی جذبات و احساسات کی فہم اور پاس داریِ فن کی مساوی قوتوں سے اٹھا ہے..."

مساوی قوت ماننے میں مجھے تامل ہے لیکن یہ بات اہم معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کو استعارہ کے طور پر دیکھا جائے۔ اس کتاب کے تعارف میں شمیم حنفی صاحب نے ان دونوں شخصیات کو ساتھ رکھ کر دیکھتے ہوئے ان کے درمیان خطِ امتیاز بھی نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تاریخ کے بظاہر دو مختلف دائروں میں گردش کرنے کے باوجود، غالب اور منٹو کی حیثیت کئی اعتبار سے مماثل بھی کہی جا سکتی ہے۔ یوں تو غالب اور منٹو دونوں اپنی اپنی انا کے قتیل تھے اور دونوں اپنی انفرادیت پر آنچ نہ آنے دیتے تھے، مگر دونوں میں، اس انا گزیدگی کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ مشترک تھا۔ ہر طرح کی ذہنی، جذباتی اور معاشرتی مطلقیت کے خلاف یہ دونوں بہت سرگرم تھے۔ ان کے شعور کی بنیادی حقیقت اور سرشت نہ تو زمانے کی بخشی ہوئی تھی، نہ اپنی روایت کی۔ حسبِ توفیق اپنے اپنے دور کی اجتماعی سچائیوں کا بوجھ دونوں نے اٹھایا۔ اور دونوں نے بہت مستقل مزاجی کے ساتھ، اس واقعے کے باوجود کہ سیماب صفتی دونوں کے مزاج کا حصہ تھی، ہر حال میں اپنی انفرادیت کو محفوظ بھی رکھا۔ اپنے کمالات کا احساس غالب کو اپنے ہم عصروں سے بڑھ کر تھا۔ اسی لیے اپنی ناقدری پر وہ ہمیشہ بے چین رہے اور ساری آس ایک گلشنِ ناآفریدہ سے لگائے رکھی۔ ادھر منٹو کی طبیعت میں خود پسندی اور خودسری کے عنصر نمایاں تھا...... تاہم غالب کی طرح منٹو کے رویّے میں یگانگت اور بے تکلفی کے باوجود احترام اور عقیدت کی ایک کیفیت بھی شامل تھی۔ منٹو کی حیثیت میں غالب کے لیے جتنی گنجائش تھی، شاید منٹو کے ماضی اور حال کی کسی دوسری شخصیت کے لیے نہیں تھی..."

غالب کے لیے منٹو کا احترام اور عقیدت اپنی جگہ مگر ریشم کی ڈور الجھتی جاتی ہے۔ شمیم صاحب نے آگے چل کر دونوں کو "آؤٹ سائیڈر" قرار دیا ہے جو مجھے مفید تنقیدی تصور سے زیادہ مروجہ تنقیدی لغت کی پاس داری معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دونوں نے آزمائشوں سے بھری ہوئی، معاشی، ذہنی اور جذباتی سطح پر ایک پریشان حال زندگی گزاری۔ دونوں اپنے معاصرین میں سے کسی کو آسانی سے خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنی اپنی روایت کی طرف دونوں کا انداز نظر باغیانہ اجتہاد اور گستاخانہ انحراف کا تھا۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں اشتراک اور مماثلت کے ہوتے ہوئے بھی بہت فرق تھا..."

یہ عبارت بڑی آسانی کے ساتھ تنقید کی کتاب سے منہا کر کے اس ناول کے سرنامے کے طور پر درج کی جاسکتی ہے۔ ہرچند کہ آگے چل کر دونوں کے درمیان ایک بیّن فرق، یعنی صنف کا انتخاب کے معاملے میں وہ پلڑا نظم کی طرف جھکا دیتے ہیں، جو محلِ نظر ہے:

"شاعر اپنے آپ کو لسان الغیب سمجھنے اور اپنے صریرِ خامہ کو نوائے سروش سے تعبیر کرنے کا جواز رکھتا ہے مگر فکشن لکھنے والا اپنے وقت اور اپنے مکاں کے دائرے کو بس ایک حد تک توڑ سکتا ہے۔ حقیقت کا جو شعور منٹو کی تحریر میں رونما ہوا ہے، غالب کے تصورِ حقیقت کے مقابلے میں بہرحال محدود ہے..."

اپنے استدلال کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے شمیم حنفی غالب اور منٹو کے درمیان تفریق کو واضح کرتے ہیں مگر اس بات میں خطرہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حبیب کے بجائے حریف معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میں اس راہ پر چلنا نہیں چاہتا۔ اس ناول نے دونوں شخصیات کے واضح فرق کے باوجود بلکہ اسے پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے انھیں ایک دوسرے کا غم گسار بنا دیا ہے۔ غالب نے کہا تھا ؎

کیا غم خوار نے رُسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

یہاں ماجرا یہ ہے کہ غالب کے غم کی تاب اگر کوئی لا سکتا ہے تو وہ سعادت حسن منٹو ہے اور منٹو کو اپنا

رفیق ملتا ہے تو ایک صدی پہلے کے مرزا غالب۔ دونوں کی ممکنہ رفاقت کا یہ احساس، جو ان کی ادبی تحریروں کے بل بوتے پر مبنی ہے، اس ناول کا بنیادی مفروضہ ہے اور تخلیقی مطالعے کی ایک کامیاب مثال۔ غالب اور منٹو کا فرق بہرحال غزل اور افسانے کے فرق سے بڑھ کر ہے اور اس بات کو بیچ مان بھی لیا جائے تو یہ بورخیس کے الفاظ میں ادھورا سچ ہے۔ لیکن اس بات کو یہیں روک دینا چاہیے اس سے پہلے کہ یہ کسی قسم کا موازنہ انیس و دبیر بننے لگے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہاں ہماری ملاقات غالب کے بجائے ان کے نمائندہ نقش (represantation) سے ہو رہی ہے جو غالب ہی کے انداز میں تحریر کا نہیں، شوخی تصویر کا فریادی ہے۔ نثر میں بھی برابر کی چوٹ ہے۔ غزل کے رمز و ایماء کو معرضِ بحث میں لانے کی ضرورت نہیں اور پھر نثر کے حق میں شہادت خطوط والے مرزا غالب سے بھی مل سکتی ہے۔ یاد رہے کہ غالب کے خطوط پڑھ کر انتظار حسین کو گمان گزرا تھا کہ غالب ناول سے بس دو چار قدم دور ہی رہ گئے اور اگر ان کے سامنے اس طرز کے نمونے ہوتے تو شاید وہ اپنے اظہار کے لیے اس کا انتخاب بھی کرتے۔ ظاہر ہے کہ انتظار حسین کی یہ خوش گمانی غالب کے خطوط پر ہی مبنی ہے۔

اہم تر بات یہ ہے کہ مماثلت اور فرق کے باوجود، دونوں میں اتنا ارتباط ہے کہ مکالمے کا امکان قائم ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں ایک ہی زلف کے اسیر ہوتے، اور محض انا گزیدہ تو دونوں کی خودکلامی کے حباب ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ میں سوچتا ہوں کہ ناول نگار نے غالب کا مکالمہ منٹو سے قائم کیا لیکن یہ مکالمہ بیس ویں صدی کی کسی اور شخصیت سے کہاں قائم ہو سکتا تھا؟ یہاں تک کہ اقبال سے بھی نہیں۔ اقبال، غالب کے قائل ضرور تھے مگر ملاقات کی ممکنہ صورت موعظت میں بھی بدل سکتی تھی جب کہ منٹو بہت مختلف ہیں اس لیے مکالمے کی بنیاد پڑ گئی۔

لکھنے والا چابک دست ہو تو غالب بھی افسانے میں ڈھل سکتے ہیں۔ ہمارے دور کے غالباً سب سے بڑے غالب شناس شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب پر اپنی معتبر تنقید سے الگ ہٹ کر "غالب افسانہ" لکھا اور اس نوع کی تحریر کی مثال قائم کر دی۔ لیکن دوزخ نامہ کے مصنف نے صرف اتنا نہیں کیا کہ غالب کو افسانے کے شیشے میں اُتار لیا بلکہ منٹو کے مقابل میں لا بٹھایا کہ

دونوں ہم کلام ہو گئے۔ یہ اجتماعِ ضدین نہیں بلکہ مجمع البحرین بن گیا۔

ربی سنکر بال کے 'دوزخ نامہ' کی ندرت محض اتنی نہیں ہے کہ غالب جیسا نابغۂ روزگار اس میں کردار بن کر سامنے آتا ہے، بلکہ غالب اور منٹو۔ غالب کا یہ روپ مالک رام کے سراسر تخلیقی مضمون اور سلینا حسین کے بنگلہ ناول میں بھی سامنے آیا ہے اور مختلف نتائج کے ساتھ۔ لیکن بڑے طمطراق کے ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی کے جیتے جاگتے مرقع 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' میں بھی آیا ہے۔ اس میتھڈ کو فاروقی صاحب نے 'سوار' میں شامل افسانوں میں پختہ کیا تھا کہ اس طرح کہتے ہیں سخنور سہرا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے ناول کی داد و تحسین تو ہوئی مگر اس راہ پر چلنے والا اور اس میتھڈ کو لے کر آگے بڑھنے والا کوئی سامنے نہیں آیا۔ شاید یہ اُردو والوں کا وطیرہ ہے کہ 'آگ کا دریا' اور 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' جیسے ناولوں کی تخلیقی جدت پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسادیں گے مگر چراغ سے چراغ جلانے کا کام نہیں کریں گے۔ یوں فاروقی صاحب کے اظہار کا اگلا نقش نظر آتا ہے تو 'دوزخ نامہ' میں۔ یوں اس ناول کا تاثر دو چند ہو جاتا ہے۔

دونوں کرداروں کے ساتھ ساتھ — جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ناول کا ہیرو ہے — اس کا محلِ وقوع بھی غور طلب ہے کہ دوزخ نامہ ہی کیوں؟ کیا مصنف ان کے بارے میں اخلاقی فیصلہ صادر کر رہا ہے یا پھر یہ وجودی کیفیت کا اظہار ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں 'سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی' والی غالب کی خواہش پوری ہو گئی؟ اور منٹو کو بھی عصمت چغتائی کی تحریر میں آجانے والا لفظ دوزخ نامہ راس آگیا؟ دوزخ میں مکالمہ کیسا؟ مکالمے کی فضا دوزخ سے قائم ہوئی ہے۔ دونوں دوزخ کے شہری ہیں اور دوزخ ان کے لیے مکالمے کی توسیع کا نام ہے، اس فردوس سے دُور جہاں ہر شخص اپنی خود کلامی میں قید ہے۔ ممکن ہے یہ دوزخ بھی نہ ہو، اعراف ہو جس کی تصویر کشی دانتے نے کی ہے۔ فردوس اور جہنم کی طرح اعراف بھی دانتے کے لیے آسمانی طبقہ ہے، اور آسمان کی سیر کا لازمی جزو، ایک اور آسمانی منزل۔

غالب اور منٹو کے ساتھ ساتھ اس میں چند اور ادبی ہیولے بھی جھلک پا جاتے ہیں،

میر اور عصمت چغتائی۔ میر یہاں کسی اور مقام سے نہیں، بیاں کار کے بیانیے سے برآمد ہوتے ہیں۔ وہ میر جو اپنے چنیدہ اشعار پر مشتمل ہیں، جو غالب کو دیکھنے جاننے کے لیے ایک زاویہ فراہم کر دیتے ہیں اور منٹو کے لیے بھی۔ (حالانکہ میر سے منٹو کی اُنسیت محتاجِ ثبوت ہے) چیختی چلاتی، ہنستی گاتی عصمت چغتائی منٹو کے بیانیے سے برآمد ہوتی ہیں۔ اتنی ہی دلکش جیسی کہ منٹو کے صفحات میں نظر آتی ہیں، زندگی سے بھرپور اور منٹو کی محبت سے چند گز کے فاصلے پر۔ غرض ان ہنگاموں سے گھر کی رونق قائم رہتی ہے، ایسا مکان جسے اپنے مکینوں کی وجہ سے شرف حاصل ہے۔

غالب اور منٹو کے بارے میں لکھا جانے والا ناول — اس کی دلکشی ان کرداروں سے شروع ضرور ہوتی ہے مگر تمام و کمال ان کی مرہونِ منت نہیں۔ کچھ نہ کچھ اعجاز مصنف کا اپنا بھی ہے۔ اعتبار کا پورا بوجھ کردار پر بھی ڈالا جا سکتا تھا۔ اور غالب اتنے ناتواں نہیں کہ یہ بوجھ نہ اٹھا سکیں۔ اس حوالے سے قاضی عبدالستار کا ناول "غالب" یاد کیجیے۔ غالب کا نام آنے کے باوجود ناول میں بہت گنجائش باقی رہ گئی ہے اور بار بار خیال آتا ہے کہ غالب کو کچھ اور نہیں، اتنا شفاف تو نہ ہونا چاہیے کہ ان کے آر پار نظر آجائے۔ صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو۔ اگر غیر پیچیدہ اور نفیس نہ ہو تو کردار اپنے غالب ہونے کا التباس کیونکر دے سکتا ہے؟ یوں حقیقی دنیا سے شاعر یا ادیب کو جوں کا توں اٹھا کر ناول کی بنیاد میں رکھا جا سکتا ہے اور اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ شاندور مارئی نے کاسانووا کو کردار بنا کر غیر معمولی ناول تخلیق کیا، بلکہ شاید سب سے بڑھ کر حوزے سارا ما گو کا ناول 'دی ایئر آف دی ڈیتھ آف رکارڈو ریس' جہاں فرنانڈو پیسوا کو کردار بنانا ایسا ہے جیسے پرچھائیوں کے ایک سلسلے کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ بہت سے قلمی ناموں اور کئی شخصیتوں کا حامل اور پھر مستزاد کہ اپنے ہر روپ میں ایک الگ شاعر، ہر منظروں کی شکل اختیار کرنے والی پانی جیسی صفت والی شخصیت کو اپنے شاید سب سے زیادہ مستحکم روپ میں گرفت میں لے آتا ہے، جو بجائے خود ایک محیر العقول کارنامہ ہے۔ یہ سب اپنی جگہ درست سہی لیکن ایسا نہیں ہونے پاتا کہ دو علاحدہ شخصیات کی سوانحی تفصیلات کو گونتھ گانتھ کر ناول کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا۔ شاید یہ اب ایک سستا اور کارگر نسخہ بن گیا ہے جس فارمولے سے ہاتھوں ہاتھ بکنے والا ناول تیار کیا

جا سکتا ہے۔

مولانا روم اور شمس تبریز کو کرداروں میں ڈھال کر ایلف شفق نے جو ناول قلمبند کیا، وہ اور کچھ نہیں تو اپنی بین الاقوامی فروخت کے زرِ کثیر کی وجہ سے شاید ربی شنکر بال کے مدِّنظر رہا ہوگا۔ رومی، اس کے ایک اور ناول کا مرکز بن گئے ہیں، رومی جو اپنی زندگی میں پوری طرح موجود ہیں مگر اس شہر میں نہیں جہاں کا راستہ سیاح نے اختیار کیا ہے۔ غائب ہو کر وہ زیادہ طاقت ور معلوم ہوتے ہیں، اس بات کو ناول نگار کی ہنرمندی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اپنے فن کے اوزاروں پر ناول نگار کی ماہرانہ گرفت کا اندازہ "دوزخ نامہ" کی تکنیک سے لگایا جا سکتا ہے جو سیدھی ہے اور نہ سپاٹ۔ ناول کی فضا قائم کرنے کے لیے وہ اپنے کرداروں کی شہرت اور مقبولیت سے آغاز کرتا ہے۔ مگر اسے ترقی بھی دیتا ہے۔ کرداروں کی چھوٹی بڑی تفصیلات سے ناول کا تانا بانا قائم کرنے اور واقعات کو بڑھاوا دینے کے بجائے اس نے ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے جو ہندوستان میں رائج قدیم روایات پر مبنی ہے۔ چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور قصّوں سے ناول آگے بڑھتا ہے، افسانہ در افسانہ۔ ایک افسانے سے افسانہ پھوٹ کر نکلتا ہے اور کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کردار قصّے سناتے ہیں اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہیں۔ میر کلّو یہ فریضہ غالب کے لیے انجام دیتے ہیں مگر منشائے مصنف کے آلۂ کار بن کر نہیں رہ جاتے جو ان کی پیشہ ورانہ مجبوری بھی ہو سکتی تھی۔ مصنف کو اپنے فن پر زیادہ اعتبار ہے اس لیے اُسے ایسے سہارے ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔ شاید یہ بھی ان شخصیات کا جمالِ ہم نشین ہے۔ قصّوں کے ذریعے آگے بڑھنے والا یہ ناول ان دونوں طریقوں کے درمیان اپنا راستہ نکالتا ہے جنھیں والٹر بن یامین جیسے بصیرت افروز نقّاد نے ایک دوسرے سے الگ بلکہ مخالف گردانا تھا۔ ربی شنکر بال نے اپنے ناول کی بنیاد ہی گویا اس پیراڈاکس پر قائم کی ہے۔ قصّہ گوئی کو بروئے کار لانے والا یہ ناول ایک حیرت انگیز تنقیدی صورت حال کا موجب ہی نہیں بنتا، ناول کی صنف میں مضمر امکانات کے ایک بیانیے میں ڈھل جانے کی وجہ سے فتح مندی کا اعلان ہے۔ ناول کو یہ کامیابی غالب اور منٹو کے طفیل حاصل ہوئی ہے جو بن یامین کی تفریق کے مطابق نہ صاحبانِ یمین ہیں اور نہ صاحبانِ یسار۔ نہ قصّے کے افراد اور نہ ناول کے عادی۔ اس

طرح یہ ناول نئے راستوں، ان جانی سمتوں کی طرف لیے جاتا ہے۔

کسی ناول کی تکنیک کو ایک قابلِ علاحدگی عنصر سمجھ کر اس کے حوالے سے یوں براہِ راست بات کرنا گویا اس "شے" کو ناول کی مجموعی بُنت سے کاٹ کر دیکھا جا سکتا ہے، یوں بھی کوئی پسندیدہ رویّہ نہیں۔ لیکن یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ربی شنکر بال نے یہ ناول بنگلہ زبان میں لکھا، اردو کی طرح جہاں ناول کی صنف انگریزی اثرات کے تحت قائم ہوئی۔ اس کے باوجود جب دوزخ نامہ میں پرانی روایات اس قصّے کے فروغ کا وسیلہ بنتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی موجودگی میں شراب پانی بن گئی، ناول اب سراسر "دیسی" اور "مقامی" بن گیا، indigenize ہوگیا ہے۔ اور اس کے بیان میں وہ امکانات در آئے ہیں جو انگریزی مثالوں سے بعید از کار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی ناول کی صنف کا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے، حالانکہ ناول میں منٹو اور غالب کے ہوتے کسی اور معجزے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟

جہاں بات بنانا مشکل ہو، ناول نگار وہاں ترکیب لڑاتا ہے۔ غالب اور منٹو تک رسائی کو قرینِ قیاس بنانے کے لیے اور ناول کا ماجرا مزید گمبھیر کرنے کے لیے، اس نے کتابوں میں درج بڑی پرانی ترکیب استعمال کی ہے — پُراسرار مسوّدہ جو اپنے خالق سے آزاد ہو کر بھٹکتا پھر رہا ہے، آوارہ گرد اشعار کی طرح۔ داستان در داستان کی طرح ناول میں موجود بلکہ اس کے چوگرد قائم فریمنگ اسٹوری میں لکھنؤ کی طرف مراجعت پھر نیّر مسعود اور ان کے مکاں کا ذکر پورے قصّے کو معاصر بناتے ہوئے اس کی پُراسراریت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے عجیب اتفاق ہے کہ انیس اشفاق کے حالیہ ناول "پری زاد اور پرندے" کی پیش بین prefigure کر رہا ہے اور اردو کے مرکزی دھارے کے مزید قریب آجاتا ہے، جب کہ رگِ جاں سے نزدیک تو پہلے بھی تھا۔

منٹو اور غالب کو ناول کا جوہری مرکز بنانے کی بہرحال ایک قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔ غالب اور منٹو سامنے آتے ہیں تو ناول نگار اس للچاوے میں آجاتا ہے کہ اب دنیا جہان کے مسائل کا حل پلک جھپکتے میں سامنے آجائے گا اور کہیں نہ کہیں خلیل جبران کی سی جذباتی دانش

منڈی کی پُڑیا جملہ حاضرین کو تھمانے لگتا ہے۔ وہ اتنی دیر کے لیے بھول جاتا ہے کہ غالب کے
پاس دنیا کے تمام مسائل کا حل تیار شدہ حالت میں ہوتا تو یہ بات ان کی زندگی میں ماجرا بن کر
شامل ہو جاتی۔ غالب ہوں یا منٹو، لوگوں کے سوالات کا جواب دینے والے oracle نہیں بن
سکتے۔ اور اگر ایسے سستے تیر بہ ہدف نسخے کی ضرورت پڑ جائے تو ہمارے دونوں ثقافتی ہیروز کے
ساتھ بھی زیادتی ہے۔ اور ناول کی صنف کے ساتھ بھی جسے بہر حال ربی سنکر بال نے اختیار کیا۔

یہاں مجھے ایک ڈیڑھ بات ناول کی صنف کی موافقت میں بھی کہہ دینی چاہیے،
حالانکہ ذکرِ غالب کا حاوی ہے۔ انگریزی ادب میں خصوصاً امریکا والوں کی ادبی تنقید میں تھیوری
سے لگاؤ اس درجے بڑھ گیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے بیچ میں سے کتاب غائب ہو گئی ہے اور
متن کی جگہ نظریات موضوع بن گئے ہیں۔ اس لیے مجھے حاویئر سرکاز (Javier Cercas) کی
کتاب The Blind Spot کا ذیلی عنوان An Essay On The Novel پڑھ کر بہت
خوش گوار تعجب ہوا کہ اس کا سروکار سچ کے ناولوں سے ہے، جیتے جاگتے گوشت پوست کے
ناول جو اپنی حقیقت میں قائم ہیں، کسی اصولی استدلال کے تابع نہیں۔ اور یہ سچ بھی — سرکاز ہمیں
یاد دلاتا ہے، ادھورا سچ ہے۔ لازمی طور پر ادھورا۔

سرکاز کی مختصر سی کتاب مجھے اس لیے خاص طور پر کارآمد معلوم ہوئی کہ وہ خود اہم ناول
نگار ہے، اس میدان کا عامل اور رازہائے درونِ خانہ سے اچھی طرح واقف، غیر معمولی اور
انکشاف انگیز مطالعے کا حامل جس سے وہ اپنا تنقیدی عمل تیار کرتا ہے۔ سرکاز نے "نابینائی کے
نکتوں" والے ناولوں کا ذکر کیا ہے Blind Spot Novels۔ جو ابہام، پیچیدگی، تضادات اور
ستم ظریفی سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کی ممکنہ تشریحات اور ان میں مضمر معنویت میں اضافہ
ہو جاتا ہے۔ سرکاز کے نزدیک، ڈان کیہوٹے سے لے کر ماریو ورگاس یوسا تک ناول کا سفر اسی
سمت جاری ہے۔ بورخیس کا حوالہ دے کر اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"It to also an elusive, ambiguous, equivocal, contradictory and essentially ironic event that we call the literary truth: the truth that is not in the answer and

a question but in the quest for an answer, in the question itself, in the book itself."

سچ کی تلاش جو کتاب کی طرف لے آتی ہے۔ دوزخ نامہ اس طرز کا ناول نہیں اور اس
نوع کی توقعات فضول ہوں گی مگر اس کا اصل سرمایہ اسی طرح کی ستم ظریفی کی تخلیق ہے
جو ایک ادبی واقعہ بن جاتی ہے۔ اس کے معنی ایک تمثیل یا علامت تک محدود نہیں رہتے بلکہ وسیع تر
پیمانے پر دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ تصور کی یہ وسعت اس ناول کی ایسی ہی خصوصیت ہے۔
ترجمے کی اس کاوش کو انعام ندیم نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ انعام ندیم سخن فہم بھی
ہیں اور غالب کے طرفدار بھی۔ وہ خوش گفتار شاعر ہیں اور وہ بھی ایسے کہ پہلے مجموعے پر شمس
الرحمٰن فاروقی سے داد حاصل کی جسے فی زمانہ سند سمجھنا چاہیے، اور شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے
سے بھی خاص شغف رکھتے ہیں۔ کئی اچھے افسانے اردو میں منتقل کر چکے ہیں جس میں گردیال سنگھ
کے پنجابی ناول 'مڑھی دا دیوا' کو میری نظر میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس ناول کی اشاعت کو
اہم تخلیقی واقعہ قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا موضوع ہمارے جہانِ معنی کو نئے زاویے سے دیکھ
رہا ہے، دکھا رہا ہے اور اس کے ذریعے سے ایک نئی جہت اردو کے ادبی دھارے میں شامل ہوئی
ہے جو اس میں مضمر تھی، جس کا خمیر یہیں سے اٹھا تھا مگر اسی شکل میں موجود نہ تھی اور اس ترجمے
کے ذریعے سے آشکار ہوئی ہے۔ یہ ترجمہ تخلیقی واقعہ اس طرح بنتا ہے کہ انعام ندیم نے محض ترجمہ
کرنے پر اکتفا نہیں کیا حالانکہ اگر وہ ایسا کر لیتے تب بھی کتاب اپنی جگہ اہم ہوتی۔ انھوں نے
اپنے طریقِ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ان متون کو تلاش کیا جن کا
حوالہ دیا گیا تھا، انھیں سعی و تلاش کے بعد ناول کے متن میں دوبارہ جاری کیا، چند ایک واقعاتی
غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ حالانکہ ناول میں واقعاتی غلطی کیا ہو سکتی ہے، اس لیے کہ یہ میر
کے الفاظ میں، دنیا کی طرح وہم کا کارخانہ ہے، ساری عمارت مفروضوں پر قائم ہے مگر معاملہ
غالب اور منٹو کا ہے اس لیے تسامحات کی نشان دہی لازمی تھی۔ غیر معتبر راوی کی طرح غیر معتبر
ناول نگار اعتبار کے درجے پر نہیں پہنچتا۔ ادبی سچ کیا ہے، اس سوال سے آگے بڑھ کر فاضل مترجم

نے ترجمے کی عبارت کو اس اصل سے جوڑا ہے جو پہلے سے کہیں موجود تھا، کسی لوح پر درج تھا۔ یوں ترجمے سے سوا، یہ اس ادبی سچ کی بازیافت کی کامیاب کوشش ہے جو تاریخ پر مبنی ہونے کے باوجود تاریخ سے ماورا ہوتا ہے۔ ربی سنکر بال کا افسانوی متن یہاں اپنی اصل زبان سے رجوع کرلیتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس ناول کی زبان نہیں تھی۔ ہم ایسے ادب کے طالب علم پر احسان ہے یہ ترجمہ اور یہ اس ناول کو بھی فزوں تر بنا دیتا ہے، اس اضافے کے بعد یہ اردو کے ادبی دھارے میں شامل ہونے کے لیے تیار ہے۔ یوں اسے اضافے یا تصحیح سے زیادہ restoration سمجھا جاسکتا ہے۔ اس ترجمے کی کامیابی یہ ہے کہ یہ اصل کتاب معلوم ہوتا ہے، وہ کتاب جو اردو میں منتقل کیے جانے کے لیے کسی اور زبان میں لکھی گئی اور اب اپنی اصل شکل میں واپس آ گئی ہے، ایک نئی فتح مندی سے سرشار اور ایک نئے سفر پر روانہ ہونے کے لیے کمربستہ۔ ایسا سفر جس میں مرزا غالب اور سعادت حسن منٹو کی رفاقت نصیب ہوسکتی ہے۔ اب یہ گلشنِ نوآفریدہ ہے جس کے عندلیب غالب ہیں اور زمزمہ سرا سعادت حسن منٹو۔ اردو ادب کا کوئی طالب علم اس رغبت انگیز بلاوے سے بھلا کیسے انکار کرسکتا ہے؟ غالب اور منٹو، دونوں کے باطن ہم دیگر سے ورقِ ناخواندہ پر کیا نقش اُبھر آئے ہیں!

آصف فرّخی

اکتوبر ۲۰۱۹ء

عرضِ مترجم

تصور کیجیے انیسویں صدی اگر آ کر بیسویں صدی کو گلے لگالے، اور ہم اور آپ، دو صدیوں کے اس ملاپ کے گواہ بن جائیں تو کیسا لگے گا؟ یوں دیکھا جائے تو دو صدیوں کے ملاپ کا یہ موقع اٹھارہ برس پہلے اُس وقت آیا تھا جب ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کی رات دو صدیاں لمحہ بھر کے لیے ایک ہوگئی تھیں، لیکن یہاں تو بنگالی ادیب ربی شنکر بال نے دو صدیوں کو ایک کتاب میں بند کردیا ہے اور ان دو صدیوں کی دو نامور ہستیوں کی ملاقات کی دستاویز ہے ان کا ناول ''دوزخ نامہ۔'' اس ناول میں اردو شعروادب کی دو سربرآوردہ شخصیات مرزا غالب اور سعادت حسن منٹو اپنی اپنی قبر سے اُٹھ کر اور ایک صدی کا فاصلہ طے کر کے ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہیں۔ اسی لیے اس ناول کا ذیلی عنوان قائم کیا گیا ''دوزخ میں بات چیت۔'' انیسویں صدی کے شاعر اور بیسویں صدی کے افسانہ نگار کی مرنے کے بعد قبر میں ہونے والی ملاقات میں ان کے اپنے اپنے زمانوں کا جو نقشہ اُبھرتا ہے وہی دوزخ نامہ ہے۔ یہاں غالب اپنی داستان سنا رہے ہیں کہ کیسے وہ آگرہ سے شاہجہاں آباد یعنی دہلی پہنچے۔ غالب کا بچپن، لڑکپن اور جوانی، ان کے عشق اور فاقہ مستی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کے حالات اور انگریز سرکار سے پنشن کے حصول کے لیے غالب کا کلکتہ کا سفر۔ غالب یہ ساری داستان منٹو کو سنا رہے ہیں اور منٹو بھی ہندوستان میں اپنے قیام اور پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ہونے والی ناامیدی کی کہانی غالب سے کہہ رہے ہیں۔ ان دونوں کی جیون کتھاؤں کے ساتھ ناول ایسے بے شمار رنگارنگ قصوں سے بھرا ہوا ہے جن پر اب وقت کی گرد جم چکی ہے۔ ایک قصہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرے کا بیان شروع ہوجاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے قاری ایک اور الف لیلیٰ پڑھ رہا ہے لیکن اس بار داستان شہرزاد نہیں سنا رہی بلکہ اسے ہم مرزا غالب اور منٹو کی زبانی سن رہے ہیں اور جس داستان کو مرزا غالب جیسے شاعر اور منٹو جیسا افسانہ نگار سنائے، ذرا سوچیے وہ

داستان کیسی پُر لطف ہوگی۔ ناول کی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کوئی بات بھی خلاف واقعہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ غالب یا منٹو ایسی بات نہیں کہہ سکتے اگر چہ اس میں اردو کے یہ دو عظیم ادیب اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں، امیدوں، حتیٰ کہ زمانے سے حاصل ہونے والی ذلتوں کے بارے میں بھی کھل کر ایک دوسرے سے بات کر رہے ہیں۔ منٹو کی باتیں ہمیں ویسی ہی معلوم ہوتی ہیں جیسے اُن کے افسانے ...... اور غالب کی گفتگو میں وہی مزہ ہے جو اُن کے شعر میں ہے۔ یہ ناول دو دیوانے ادیبوں کی جُگل بندی ہے جو پڑھنے والے کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔

ناول کا پلاٹ منٹو کے انھی افسانوں پر اُستوار ہے جنھیں ہم کئی بار پڑھ چکے ہیں لیکن ان افسانوں کا تذکرہ اس ناول میں اس انداز سے آیا ہے گویا منٹو آپ بیتی سنا رہے ہوں۔ منٹو نے اپنے اردگرد کا سچ ہی تو لکھا تھا۔ ان افسانوں کو منٹو کی آپ بیتی کے طور پر پڑھتے ہوئے دل کی دھڑکنیں تھمتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں، چاہے وہ اُن کے ایک سالہ بیٹے کی موت کا تذکرہ ہو یا ہیرا منڈی اور فارس روڈ کی ویشیاؤں کی کہانیاں یا پھر تقسیم اور فسادات کا احوال، منٹو کی داستانِ زندگی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے قاری کا سانس پھول جاتا ہے۔ دوسری جانب مرزا غالب کی زندگی ہے جس میں ہمیں ایک ٹھہراو اور گہرائی معلوم ہوتی ہے۔ ناول میں ہمیں دو زندگیاں پوری آب و تاب کے ساتھ کھِلتی اور کھُلتی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں اکیسویں صدی کا قاری پچھلی دو صدیوں کے حوالے سے لاتعداد زمانوں کی سیر کرآتا ہے۔

اس ناول سے میرا تعارف اُس وقت ہوا جب میں جون ۲۰۱۶ء میں کچھ عرصے کے لیے امریکہ کے شہر میڈیسن میں مقیم تھا۔ یہاں وسکانسن یونیورسٹی میں ایک تربیتی کورس کے دوران میری ملاقات برجیش سمرتھ سے ہوئی جو جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ برجیش کو نہ صرف ہندی اور اردو کے ادب سے دلچسپی تھی بلکہ وہ خود بھی ہندی زبان کے ادیب تھے۔ ایک دن غالب اور منٹو کے ذکر پر اس ناول کا تذکرہ ہوا۔ میں اس ناول کے بارے میں آصف فرخی سے پہلے ہی سُن چکا تھا۔ میں نے اسے پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چند دن بعد ہی برجیش نے اس بنگلہ ناول کا انگریزی ترجمہ مجھے تحفے میں پیش کر دیا۔ برجیش کا اپارٹمنٹ امریکہ میں ہمارے لیے 'پاک ٹی ہاؤس' کی طرح تھا، جہاں روز شام کو ادبی نشست جمتی تھی۔ میں نے جب اس ناول کو پڑھنا شروع کیا تو اس نے مجھے جکڑ لیا۔ کچھ تو غالب اور منٹو کی شخصیات کا اثر تھا، کچھ اس ناول کا 'اُردو ماحول' کہ انگریزی میں پڑھتے ہوئے بھی یہ ناول میرے ذہن میں اُردو میں منتقل ہونے لگا۔ لیکن اس کو ترجمہ کرنے کا خیال بہت بعد میں، جون ۲۰۱۸ء کی گرمی کی تعطیلات میں آیا جب میں نے آزمائشی طور پر اس کے تین ابواب ترجمہ کر کے

آصف فرخی کو بھیجے تا کہ اُن کی رائے جان سکوں۔ آصف صاحب نے ان ابواب کے ترجمے کو پسند کیا اور اصرار کیا کہ میں پورے ناول کا ترجمہ کروں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں یہ مشکل کام کر پاؤں گا لیکن یہ آصف فرخی ہی تھے جن کی تائید اور مسلسل حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں یہ طویل ترجمہ مکمل کر پایا۔

رنجینکر پال کا یہ ناول بانگلہ بھاشا یعنی بنگالی زبان میں ۲۰۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا اور بے حد پسند کیا گیا۔ فوراً ہی اس کے انگریزی اور ہندی تراجم بالترتیب ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۵ء میں سامنے آگئے۔ ''دوزخ نامہ'' کا یہ اردو ترجمہ اَرون سنہا کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ ''دوزخ نامہ'' کے انگریزی اور ہندی، دونوں ترجمے نہایت عمدہ ہیں لیکن ایک مقام ایسا ہے جہاں ان دونوں ہی ترجموں نے ٹھوکر کھائی ہے، وہ ہے اُردو اور فارسی کے اشعار کا استعمال۔ ناول میں قدم قدم پر اُردو اور فارسی کے اشعار پھول پتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ غالب اور منٹو کی داستان سے متعلق ناول کا ہر باب کبھی میرؔ، کبھی غالبؔ تو کبھی حافظؔ کے شعر سے شروع ہوتا ہے۔ ان اشعار میں سے شاید ہی کسی شعر کا متن درست درج کیا گیا ہو، اور صرف متن ہی کیا، ان اشعار کے جو ترجمے پیش کیے گئے ہیں وہ بھی نادرست ہیں۔ زیرِ نظر اُردو ترجمے میں تمام اشعار کو ان کی پوری صحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اُردو ترجمے میں ضرورت کے مطابق بعض مقامات پر مناسب اور موزوں بڑھت کی گئی ہے جس کا مقصد محض متن کو زیادہ مستند بنانا ہے، مثلاً اگر مصنف نے کسی شعر کا حوالہ تو دیا ہے لیکن شعر کی جگہ اس کا مفہوم نثر میں بیان کر کے آگے بڑھ گیا ہے تو ایسے مقام پر اصل شعر کو شامل کر دیا گیا ہے اور اس کی وضاحت حاشیے میں کر دی گئی ہے۔ شعر اگر فارسی کا ہے تو اس کا مستند ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح غالب کی سوانح یا منٹو کے افسانوں کے بعض کرداروں کے نام یا واقعات میں جہاں جہاں غلطیاں دَر آئی تھیں، انھیں غالب اور منٹو کے حقیقی متون کی روشنی میں درست کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر جہاں مصنف سے کوئی تاریخی سہو ہوا ہے، اس کو بدلنے کے بجائے اس کی دُرستی حاشیے میں کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی کے مسلم معاشرے کی چھوٹی بڑی ایسی بے شمار تفصیلات ہیں جن کا مفہوم ادا کرنے کے لیے اردو زبان و ادب ہی نہیں بلکہ اس کی تہذیب و معاشرت سے گہری آگہی بھی از حد ضروری تھی۔ اس حوالے سے مذکورہ بالا دونوں ترجموں کو پڑھتے ہوئے قاری ایک طرح کی تشنگی بلکہ کسی حد تک بے لطفی محسوس کرتا ہے۔ اس اردو ترجمے میں اس بات کی بھی شعوری کوشش کی گئی ہے کہ غالب اور منٹو کے الگ الگ زمانوں میں اُردو زبان کا جو الگ الگ روزمرّہ اور محاورہ تھا، ترجمہ کرتے ہوئے اُسے قائم رکھا

جائے۔

میں یہاں معروف افسانہ نگار، مترجم اور نقاد آصف فرخی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ترجمے کے اس مسودے کو بغور پڑھا اور بعض اہم مشورے دیے، یہی نہیں انھوں نے اس پر ایک مفصّل مقدمہ بھی تحریر کیا جس سے اس ترجمے کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی ہے۔ معروف شاعر افضال احمد سیّد کا شکریہ یوں واجب ہے کہ انھوں نے غالب کی ایک طویل فارسی نظم کا ہاتھوں ہاتھ اردو ترجمہ کر کے دیا اور میری فرمائش پر کتاب کا فلیپ تحریر کیا۔ ہندی اور بنگالی کی ادیبہ امرتا بیرہ جی کا شکریہ جنھوں نے نہ صرف اپنے ہندی ترجمے کا unedited version مجھے بھیجا بلکہ ناول کے مصنف رینسکر بال کے بارے میں بہت سی اہم باتیں بھی بتائیں اور جب جب مجھے کسی بات کی وضاحت درکار ہوئی، انھوں نے مدد کی۔ میرے عزیز دوست اور معاصر غزل کے عمدہ شاعر کاشف حسین غائر کا بھی شکریہ جس نے نہ صرف اس پورے ناول کی حروف سازی کی بلکہ ہر باب کے بعد اگلے باب کی فراہمی کے لیے اصرار کرتا رہا اور یوں مجھے اس کام پر مستعد رکھا۔ اس ترجمے کا بڑا حصّہ حبیب یونیورسٹی کراچی میں مکمل کیا گیا جس کے لیے میں یونیورسٹی انتظامیہ، بالخصوص پروگرام ڈائریکٹر سبین جوہری کا ممنون ہوں جنھوں نے اس سلسلے میں میری معاونت کی۔

غالب اور منٹو کی بات چیت سے بُنا گیا یہ ناول ایک قوم، ایک ملک اور ایک زبان ہی کی نہیں بلکہ پچھلے دوسو سالوں میں بدلتی ہوئی دنیا کی ایک ایسی دلچسپ داستان ہے جسے مصنف نے کبھی ایک شاعر تو کبھی ایک افسانہ نگار کے نظریے سے بیان کیا ہے۔ غالب اور منٹو دونوں ہی لکھنے والوں نے اپنی زندگیوں میں سخت حالات کا سامنا کیا اور انھیں زمانے کی دھتکار سہنا پڑی۔ خاص طور پر منٹو کو کیا نہیں کہا گیا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایسا ادب تخلیق کرنے کی پاداش میں وہ جہنم ہی کے حق دار ہیں، غالب اور منٹو ہمیں بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے فن کی کیسی قیمت ادا کی۔ غالب ہی کا شعر ہے:

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

آنے والی نسلیں بھی شاید اس راکھ کو کسی نہ کسی جستجو کے سبب کریدتی رہیں گی کہ اس سے ہمیں انسانیت کی مہک آتی ہے۔

انعام ندیم

اکتوبر ۲۰۱۹ء

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

(غالب)

ا

میری زندگی اکثر ایسے کئی واقعات کی زد پر رہی ہے جن کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ میں نے انھیں سمجھنے اور بیان کرنے کی لگاتار کوشش کی، بالآخر چھوڑ دیا۔ اب ان کی وضاحت دینے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ان واقعات کے اس سے زیادہ گہرے معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ میری زندگی میں بن بلائے ہی چلے آئے۔ اگر کسی دن سڑک پر یونہی بے مقصد چلتے ہوئے آپ کسی ایسے شخص کو دیکھیں، جسے کسی خواب یا تصویر سے باہر دیکھنے کی توقع نہ ہو، اور آپ لمحے بھر کے لیے حقیقتاً اس کے روبرو آ جائیں، تو آپ کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟ کیا آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوگا کہ آپ کے سامنے ایک بابِ حیرت وا ہو گیا ہے؟

اس دفعہ لکھنؤ جانے پر ایسا ہی ایک بابِ حیرت مجھ پر وا ہو گیا۔ پیشے کے اعتبار سے میں اخبار نویس ہوں، ایک معمولی قلم گھسیٹنے والا مزدور، جو شہر کی طوائفوں کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے، تحقیق کی غرض سے لکھنؤ میں موجود تھا۔ وہاں جس پہلے فرد سے میں ملا وہ تھیں پروین تمبار۔ ایک اونچے عہدے پر تعینات سرکاری افسر۔ انھوں نے اس شہر کی تاریخ کو یوں زندہ رکھا ہوا ہے جیسے یہ ان کی آنکھوں کے سامنے گزری ہو۔ 'جن طوائفوں کے بارے میں آپ نے عبدالحلیم شرر کی کتاب 'گزشتہ لکھنؤ' اور مرزا ہادی سوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' میں پڑھا ہے وہ اب آپ کو لکھنؤ میں نظر نہیں آئیں گی۔' انھوں نے مجھے بتایا اور حقیقتاً ایسا ہی تھا۔ اس لیے میں نے وہ سب کہانیاں، جو وہاں مختلف لوگوں کی زبانی سنیں، اپنی ڈائری میں لکھ لیں۔ یہ بھی کچھ کم رنگین نہیں

تھیں۔نسل درنسل جو کہانیاں چلی آرہی ہیں،انھیں تاریخ سے کم تر خیال کرنا کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں۔

یوں لوگوں سے کہانیاں سنتا سناتا میں پرانے لکھنؤ کے دھول بھرے علاقے وزیر گنج میں فرید میاں کے پاس جا پہنچا۔سورج کے پورے آب و تاب سے چمکنے کے باوجود وہ علاقہ یوں سایوں میں لپٹا ہوا تھا کہ آپ اسے فراموش کردہ محلّہ ہی کہہ سکتے ہیں۔میں نے دور سے 'ادبستان' نامی اس بڑے سے مکان کو دیکھا،جہاں اردو کے ادیب نیّر مسعود رہتے ہیں۔قسمت کے مارے اس ادیب سے ملنے کی میری بڑی خواہش تھی،لیکن اردو جانے بغیر میں ان کی کہانیوں کے متعلق اپنے جوش کو کیسے بیان کر پاؤں گا؟ ہاں میں انھیں ہندی یا انگریزی میں بتا سکتا تھا،لیکن جب تک میں نیّر مسعود سے اردو میں بات چیت نہ کرتا کیا یہ ممکن تھا کہ میں ان کی گفتگو کے اسرار کی تہ تک پہنچ پاتا؟ یہ سب میرا خیال تھا۔کوئی مصنف بھی اس تصویر سے مطابقت نہیں رکھتا جو اس کی تحریر ہمیں دکھاتی ہے۔

فرید میاں یوں دوزانو ہوکر بیٹھ گئے گویا وہ نماز ادا کر رہے ہوں۔جتنی دیر وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے،اسی انداز میں بیٹھے رہے۔طوائفوں کے بارے میں متعدد قصے سنانے کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا،'آپ کہانیاں لکھتے ہیں؟'

— بس یونہی کچھ۔

— کبھی میں بھی لکھا کرتا تھا۔

— اب نہیں لکھتے؟

— نہیں۔

— کیوں؟

— قصہ کہانی لکھنے کے لیے بہت تنہائی جھیلنا پڑتی ہے، یہ آپ کو اکیلا کر دیتی ہے جناب۔اللہ جسے قصہ لکھنے کا حکم دیتا ہے اس کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

— لیکن کیوں؟

— آپ محض پرچھائیں نما لوگوں کے ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

— تو قصے لکھنا چھوڑ دیے آپ نے؟

— جی جناب۔زندگی کربلا ہوئی جارہی تھی۔کربلا جانتے ہیں نا آپ؟

— محرم کی داستان میں......

— ہاں،لیکن کربلا ہے کیا؟ کیا یہ محض محرم کی داستان ہے؟ کربلا کا مطلب ہے جب زندگی موت کا ویرانہ بن جائے۔کہانیاں لکھنے والوں کی قسمت ایسی ہی ہوتی ہے،جناب۔

— کیوں؟

— آپ ہروقت پرچھائیں جیسے لوگوں میں گھرے رہتے ہیں۔وہ آپ سے باتیں کرتے رہتے ہیں اور آپ کو ایک دیوانگی کی طرف لے جاتے ہیں۔کیا آپ کے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہے؟

— جی ہوا ہے۔

— آپ کی بیوی نے پوچھا نہیں کیوں لکھی ہے یہ کہانی؟

— ہاں،پوچھا تھا۔

— مجھ سے بھی کتنی ہی بار میری بیوی نے پوچھا ہے۔کیا کہوں اُس سے؟ جو بھی کہوں گا اس پر وہ ہنسے گی اور کہے گی آپ پاگل ہوگئے ہیں،میاں۔

— اس لیے کہانیاں لکھنا چھوڑ دیں آپ نے؟

— اب دیکھ لیجیے میں آپ کو ایک پیالی چائے پلا سکا۔دعوت نہیں کر سکتا۔ایسے تو ہوتے ہیں کہانیاں لکھنے والے۔

وہ بہت دیر تک چپ بیٹھے رہے۔میں ان کے اندرونی دالان کے چبوترے سے آنے والے کبوتروں کی غٹرغوں کی آوازوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔دفعتاً ان کی آواز نے کبوتروں کی غٹرغوں کے دھندلکے میں گردش کی۔'ایک قصہ ہے جو مجھے سخت پریشان کیے ہوئے ہے،جناب۔'

— کون سا قصہ؟

وہ جواب دیے بغیر آہستہ آہستہ کھڑے ہوگئے پھر بولے،کیا آپ تھوڑی دیر انتظار کریں گے؟

— ضرور۔

— تو پھر میں آپ کو وہ قصہ دکھاتا ہوں۔

— آپ کا لکھا ہوا ہے؟

— نہیں۔ فریدمیاں مسکرائے۔— ذرا انتظار کیجیے۔ یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے صاحب۔

وہ ہلتے ڈولتے اندر چلے گئے۔ اندر جانے والے دروازے کے اوپر ایک جل پری بنی ہوئی تھی۔ تبھی اچانک کوئی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ایک سیاہ رنگت والا آدمی جس کا جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا 'میاں پاگل ہو چکے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں؟'

— جانتا ہوں۔

— تو پھر؟

— میں یہاں انہی سے باتیں کرنے آیا ہوں۔

— کیوں؟

— تم کون ہو؟

— میں اُن کا نوکر ہوں، حضور۔ میاں پھر سے پاگل ہو جائیں گے۔

— کیوں؟

— وہ پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگیں گے۔

— کیوں؟

— جب کوئی کہانیوں کی باتیں کرتا ہے......

اندر سے قدموں کی آہٹ آتے ہی سیاہ فام شخص بولا 'اب آپ چلے جائیے، حضور'، اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ میری آنکھیں پھر اس جل پری پر مرکوز ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی فریدمیاں پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے ان کا وجود طمانیت میں نہایا ہوا محسوس ہوا جبکہ ذرا دیر پہلے وہ بہت بے قرار لگ رہے تھے۔ انھوں نے نیلے مخمل کی ایک پوٹلی کو سینے سے لگایا ہوا تھا۔ وہ پھر اسی طرح نماز پڑھنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے پوٹلی کو اس طرح احتیاط سے زمین پر رکھا جیسے وہ نوزائیدہ بچہ ہو، پھر میری جانب دیکھا اور مسکرائے۔

— اب میں جو چیز آپ کو دکھاؤں گا، آپ کو لگے گا کہ آپ خواب دیکھ رہے ہیں۔

کون سا خواب دکھائیں گے فریدمیاں مجھے؟ خواب دیکھ دیکھ کر ہی تو حال ہی میں عمر کے پچاس برس پورے کیے ہیں میں نے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری یہ زندگی جسے زیادہ تر لوگ حقیقی زندگی کہہ کر خوش ہوتے رہتے ہیں، کسی دوسرے کا دیکھا ہوا خواب ہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ہوں لیکن ایک شبیہہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوں جو ایک لمحے کے لیے ظاہر ہوتی ہے اور پھر معدوم ہو جاتی ہے۔ کسی نے ایک بار ایک تتلی کا خواب دیکھا تھا۔ جب وہ جاگا تو اسے محسوس ہوا شاید یہ تتلی تھی کہ جس نے اُسے خواب میں دیکھا۔

مخمل کا غلاف ہٹاتے ہی ایک پرانا سا مُسوّدہ روشنی میں جھلک اٹھا۔ مُسوّدے کو کہیں کہیں سے دیمک نے چاٹ رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک نظم یاد آ گئی:

مگر میں تو دریا کے دوسرے کنارے سے آیا ہوں
اگر تمھیں یقین نہ ہو تو پوچھ لو
غیر مطبوعہ داستان سے
پوچھ لو چاندی جیسے رنگ والی مچھلی سے
اس کے گوشت کو کرید کر
اور پوچھ لو لال بیگ کے بادامی انڈوں سے
پوچھ لو مُسوّدے کے جسم پر
دیمک کے بنائے ہوئے دریاؤں سے
وہ سارے دریا— جو دم توڑ دیتے ہیں
سمندر تک پہنچنے سے پہلے ہی۔

کس نے لکھی تھی یہ نظم؟ بہت سوچنے کے باوجود اس کا نام یاد نہیں آیا مجھے۔ ضرور وہ کوئی غیر معروف شاعر ہوگا تبھی اس کا نام یاد نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسا شاعر ہو جو اپنی نظموں میں محض ہمارے زخموں ہی کو کریدتا رہا اور پھر کسی دن اچانک غائب ہو گیا۔

مُسوّدے کو فریدمیاں نے کسی نوزائیدہ بچے کی طرح، پیار سے، دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا

اور کہا: 'ذرا اسے دیکھیے۔'

لوگ جس طرح پجاری کے ہاتھوں سے پوجا کے پھول قبول کرتے ہیں، اسی طرح ان کے ہاتھوں سے میں نے مُسوّدہ لے لیا۔ کھر کھری سے آواز سنائی دی۔ کیا مُسوّدے کے صفحات اتنا دھیرے سے چھونے پر بھی ٹوٹ رہے تھے؟ میں نے مُسوّدے کو فرش پر رکھ دیا اور اس کے صفحات الٹنے لگا۔ مُسوّدہ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ یہ زبان تو میں نہیں سمجھتا۔ کچھ صفحے پلٹنے کے بعد میں رک گیا۔ رسم الخط کے حسن نے جیسے مجھے مبہوت کر دیا۔ میں بس اتنا ہی جان پایا کہ میں نے وقت کے بہت سارے کھوئے ہوئے لمحوں کو ابھی تھاما تھا۔ میں نے فرید میاں سے پوچھا: 'کس کا مُسوّدہ ہے یہ؟'

— سعادت حسن منٹو کا۔ آپ نے ان کے بارے میں سنا ہے؟

میں مُسوّدے پر جھک گیا اور مجھے اپنی ہی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی: 'سعادت حسن منٹو۔'

— کہانیاں انھیں ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

— آپ کو یہ کیسے ملا؟

— یہ مجھے میرے والد نے دیا تھا، اپنے انتقال سے کچھ پہلے۔ انھیں یہ مُسوّدہ کہاں سے ملا، یہ نہیں بتایا انھوں نے۔

— کیا لکھا ہے منٹو نے اس میں؟

— ایک داستان۔ جسے آپ لوگ ناول کہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہے، داستان صحیح معنوں میں ناول نہیں ہوتی۔ داستان میں کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں جبکہ ناول میں تو آغاز اور انجام دونوں ہوتے ہیں۔

— لیکن منٹو نے تو کوئی ناول نہیں لکھا۔

— یہی ایک لکھا تھا۔

— تو پھر یہ چھپا کیوں نہیں؟

— کوئی یقین جو نہیں کرتا، میں نے کتنے ہی لوگوں کو دکھایا۔ بہت سوں نے اس کی تحریر کو منٹو کے خط سے ملا کر دیکھا اور کہا کہ یہ منٹو کے ہاتھ کی تحریر نہیں ہے۔ لیکن ناول ان کی زندگی کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ آپ دیکھیے اگر اسے چھپوایا جا سکتا ہو؟

— میں؟

— آپ تو اخبار میں کام کرتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں کوشش کرتے؟ منٹو صاحب کا کام کیا یونہی دیمک کی نذر ہو جائے گا؟

میں نے اس مُسوّدے کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔ کیا واقعی میرے سامنے سعادت حسن منٹو کا غیر مطبوعہ مُسوّدہ رکھا ہے؟ یقین نہیں آیا لیکن اس کے باوجود میں نے اس پر سے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔ یہ وہ افسانہ نگار تھا جو اپنی قبر کے کتبے پر لکھوانا چاہتا تھا: کون بڑا افسانہ نگار ہے: خدا یا منٹو؟

— کیا آپ نے پڑھا ہے اسے؟

— بالکل۔ اتنی بار پڑھا ہے کہ اب تو گنتی بھی یاد نہیں۔

— کیا لکھا ہے منٹو صاحب نے؟

— مرزا غالب کے بارے میں لکھا ہے۔ غالب کے بارے میں ناول لکھنا خواب تھا منٹو کا۔ غالب پر ایک فلم بنی تھی بمبئی میں۔ منٹو ہی نے اس فلم کا اسکرپٹ لکھا تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں؟

— جی نہیں۔

— منٹو صاحب ان دنوں بمبئی میں فلموں کے اسکرپٹ لکھا کرتے تھے۔ غالب کے بارے میں جو فلم انھوں نے لکھی وہ بہت کامیاب رہی۔ لیکن افسوسناک بات یہ تھی کہ جب فلم بن کر تیار ہوئی، تب تک منٹو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ ثریا نے اس فلم میں مرزا غالب کی معشوقہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کو نیشنل ایوارڈ بھی دیا گیا۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے نیشنل ایوارڈ دیا گیا، معلوم ہے؟ منٹو پوری زندگی مرزا کو بھول نہیں پائے۔ مرزا کی غزلیں انھیں دیوانہ بنا دیتی تھیں، اور مرزا کی زندگی بھی۔ کتنی مشابہت تھی دونوں میں۔ مرزا کے اشعار ہر وقت منٹو کی زبان پر چڑھے رہتے تھے۔

— تو گویا یہ ناول انھوں نے پاکستان میں لکھا تھا؟

— بالکل۔ منٹو کے خوابوں کی داستان۔ یہ آپ لے جایئے، دیکھیے اگر کہیں آپ اسے چھپوا سکیں۔

— کیا کوئی اسے اردو میں نہیں چھاپنا چاہتا؟

— کوئی یقین ہی نہیں کرتا کہ یہ منٹو کا ناول ہے اور کتنے دن میں اس بوجھ کو برداشت کر پاؤں گا؟ میرا اب چل چلاؤ ہے۔ میرے بعد تو یہ بالکل ہی مٹ جائے گا۔

فرید میاں نے میرے دونوں ہاتھ کس کر پکڑ لیے۔

— مجھے اس داستان سے نجات دلائیے۔ سب مجھے پاگل سمجھنے لگے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کہانیوں نے مجھے کھا لیا ہے۔

مرزا غالب کے بارے میں لکھا گیا منٹو کا غیر مطبوعہ ناول — جس کے بارے میں ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اصل ہے یا جعلی — میرے ساتھ میرے شہر کلکتہ آ پہنچا۔ میں اردو تو جانتا نہیں تھا، اس لیے یونہی کبھی کبھار مُسوّدے کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا تھا۔ کیا یہ واقعی منٹو کا لکھا ہوا ہے یا پھر کسی اور کا؟ تب مجھے خیال آیا، اگر ہم سراسر کسی اور کا خواب ہیں تو خوابوں کے غالب کے بارے میں کوئی خوابوں کا منٹو بے شک ناول لکھ سکتا ہے۔ پھر سچ اور جھوٹ کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے۔

اس ناول کو پڑھنے کے لیے میں نے اردو سیکھنے کا ارادہ کیا۔ میرے دوست اُجّل نے اس ضمن میں میرے لیے ایک ٹیچر کا بندوبست کر دیا۔ جس کا نام تبسّم مرزا تھا۔ لیکن اس سے اردو سیکھنے کے ابتدائی چند دنوں ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایک نئی زبان کو سیکھنے کے لیے جس صبر اور ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ میں نہیں ہے۔ ایک دن میں نے تبسّم سے کہہ دیا، 'مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی اردو سیکھ پاؤں گا۔'

'تو پھر آپ یہ ناول کیسے پڑھیں گے؟' اس نے پوچھا۔

— آپ اگر اس کو پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتی جائیں تو میں لکھ لوں گا۔

— میں کہیں کہیں غلطیاں بھی تو کر سکتی ہوں۔ آپ کو کیسے معلوم ہو پائے گا؟

— کیا غلطیوں کے بنا بھی کچھ ہونا ممکن ہے، تبسّم؟

— کیا مطلب؟

— غلطی سے ہی تو میں آپ کے پاس اردو سیکھنے آیا تھا۔

— کیا مطلب ہے آپ کا؟

— کچھ ہی دنوں میں آپ کی شادی ہے۔ میں ہرگز نہ آتا اگر مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا۔ شادی کے بعد آپ منہ زبانی ترجمہ کرتی جایئے گا، میں لکھ لوں گا۔ آپ جانتی ہیں نا تبسّم، زندگی بھی تو ایک طرح کا ترجمہ ہی ہے۔

تبسّم کی آنکھیں کسی لائٹ ہاؤس کی گھومتی ہوئی روشنی کی طرح مجھے چیر رہی تھیں۔

وہ گھنگھور بارش والی ایک شام تھی جب میں اردو سیکھنے پہلی بار تبسّم کے ہاں گیا۔ ایک طویل اور تاریک گلی کو پار کر کے میں ایک دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تبسّم کے والد کا نام بتا کر میں نے ان کے گھر کا پتا پوچھا۔

کس کے پاس جائیں گے آپ؟

میں نے پھر تبسّم کے والد کا نام لیا۔

دکان دار نے میری طرف حیرت سے دیکھا، 'لیکن صاحب تو فوت ہو چکے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے؟'

— تبسّم مرزا —

— ان کی بیٹی ہیں۔ پھر دکان دار نے ہانک لگائی۔ 'انور، صاحب کو کوٹھی دکھا دو۔'

انور کے پیچھے پیچھے چلتا میں ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک خاموش اور دو منزلہ مکان بارش میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ انور نے دروازے پر دستک دینا شروع کی آخر دروازہ کھل گیا۔ لیکن کوئی بھی دکھائی نہ دیا، صرف آواز سنائی دی، 'کون ہے؟'

— میں ہوں، صاحب، انور۔

— کیا ہے؟

— مہمان ہے، صاحب۔

بارش میں ایک چہرہ بولا، 'کون؟ کون ہیں یہ، انور؟'

انور نے میرے منہ کی طرف دیکھا۔

— تبسّم مرزا ہیں؟ میں نے اس چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا جو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

— کیا کام ہے؟

— مجھے آج شام یہاں بلایا گیا تھا۔

— اسٹوڈنٹ؟

— جی ہاں۔

— آیئے۔ چلے آیئے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا—

اندر آنے پر میں پہلے سے بھی زیادہ بھیگ گیا۔ گھر کے اندرونی دالان کے اوپر کھلا آسمان تھا۔ وہ شخص جو مجھے اندر لے گیا تھا اور جسے میں دیکھ نہیں پایا تھا چیختی ہوئی آواز میں بولا، 'تبسم دروازہ کھولو، دروازہ کھولو تبسم، اسٹوڈنٹ ہیں— اسٹوڈنٹ—'

دروازہ کھل گیا۔ بارش اور اندھیرے کی اوٹ میں وہ کھڑی تھی، تبسم، میری ٹیچر۔ سر کو دوپٹے سے ڈھانپے ہوئے۔ گہری ہوتی رات میں اس کی آواز کسی ریل کی سیٹی کی طرح تیرتی ہوئی مجھ تک آئی، 'آیئے، آیئے۔ بارش اتنی تیز ہے، میں نے سوچا آپ آج نہیں آئیں گے۔'

اپنے بھیگے ہوئے جوتوں کو پرواہ نہ کرتے ہوئے میں تربوز کی پھانک سے مشابہہ ایک برآمدے کو پار کرتا کمرے میں داخل ہو گیا۔ چھوٹے سے اس کمرے میں ایک بڑے سے حجم کا پلنگ، سنگھار میز اور فریج رکھا ہوا تھا— اس کمرے میں بس چند قدم ہی چلا پھرا جا سکتا تھا۔

— آپ چائے تو پئیں گے نا؟

— نہیں، نہیں۔ زحمت مت کیجیے۔

— آپ تو پورے بھیگے ہوئے ہیں۔

— کوئی بات نہیں۔

— بیٹھیے۔ پہلے تھوڑی سی چائے پی لیجیے۔

تبسم چائے بنانے کے لیے کمرے سے متصل بالکونی میں چلی گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھول بھلیاں میں گھس آیا ہوں اور راستہ بھول گیا ہوں۔ طوائفوں کی کھوج میں لکھنؤ جا کر الجھ گیا سعادت حسن منٹو کے غیر مطبوعہ ناول سے، اور اس ناول کو پڑھنے کی تیاری کے لیے مجھے آنا پڑا ہے وسطی کلکتہ کی ایک تاریک گلی میں واقع تبسم مرزا کے گھر۔ کیا اتفاق ہے! میں نے پہلے اس

پر غور نہیں کیا تھا۔ مرزا غالب کے بارے میں لکھے گئے ناول کو پڑھنے کے لیے، میں اردو سیکھنے کے لیے تبسم مرزا کے پاس آیا ہوں۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا میں ایک دیو ہیکل آئینے میں بند ہو چکا ہوں۔ میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ دیوار پر تقریباً چار فٹ لمبا ایک آئینہ لٹک رہا تھا جس کے فریم پر ساگوان کی لکڑی کا کام کیا ہوا تھا۔ آئینے میں بیش قیمت بیلجین شیشہ جڑا ہوا تھا جس کے اندر مجھ سمیت تقریباً پورا کمرا ہی دکھائی دے رہا تھا اور میں پلک جھپکے بغیر خود کو اس آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ آئینہ جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ یہ سحر تب ٹوٹا جب تبسم چائے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

— کیا دیکھ رہے تھے؟ تبسم کے ہونٹوں کے کناروں پر پہلی کے چاند جیسی مسکراہٹ تھی۔

— آئینے کو۔ کہاں سے ملا یہ؟

— یہ آئینہ کس کا تھا معلوم ہے؟

— کس کا؟

— واجد علی شاہ کی ایک بیگم کا۔

— یہ یہاں کس طرح آیا؟

— میرے دادا— دادا جانتے ہیں نا— پتا جی کے پتا، وہ لائے تھے۔

میں نے دوبارہ آئینے کی جانب دیکھا۔ واجد علی شاہ کی وہ بیگم اب کہاں ہیں؟ آئینے میں تو سر کو ڈھانپے تبسم مرزا کھڑی ہیں۔

میرے اردو سیکھنے کا سبب جان کر تبسم حیران رہ گئی۔

— صرف ایک ناول پڑھنے کے لیے اردو سیکھنا چاہتے ہیں؟ اور کوئی وجہ نہیں؟

— اور کیا کروں گا اردو کا؟

— سنا ہے آپ ادیب ہیں۔ آپ غزلیں بھی لکھ سکتے ہیں۔

— غزل کا دور ختم ہو چکا۔

— غزل کا دور کبھی ختم نہیں ہوگا۔

آئینے کے اندر تبسم کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کی آواز سنی۔ غزل کا دور کبھی ختم نہیں ہوگا، اس کے

یہ الفاظ سر کے اوپر سے کسی بادل کی طرح بہتے ہوئے گزر گئے۔

— کیا آپ نے وہ غزل سنی ہے؟ تبسم نے پوچھا۔

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق
کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

الفاظ کسی آبشار کی طرح تبسم کے گلے سے نکل کر پھیل گئے۔ اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پوچھا، 'یہ کس کی غزل ہے، جانتے ہیں؟'

— کس کی؟

— میر کی۔ میر تقی میر۔ دیکھیے میر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ تمھارے دروازے تک تو میری خواہش کھینچ لائی تھی مجھے۔ اب طاقت کہاں ہے کہ میں اپنے گھر لوٹ جاؤں۔ کیا آپ اب بھی کہیں گے کہ غزل کا دور ختم ہوگیا؟

— پھر بھی—

— خیر چھوڑیے، اس پر بحث نہیں ہوسکتی۔ آپ مجھے اپنے ناول کے بارے میں بتائیے۔

میں کون سا مسوّدہ پڑھنا چاہتا ہوں، کس کا لکھا ہوا ہے، کس کے بارے میں لکھا گیا ہے، کس طرح ملا یہ مسوّدہ، تبسم یہ ساری باتیں سر جھکائے سنتی رہی۔ جس انداز اور توجہ سے وہ میری باتیں سن رہی تھی، معلوم ہوتا تھا وہ مراقبہ کر رہی ہو۔ وہ اس شہر میں رہنے والی اس اکثریت کی طرح نہیں تھی جو سننا بھول چکی ہے اسی لیے انتظار جیسا لفظ ان کی زندگی سے مٹ چکا ہے۔ میری ساری بات سننے کے بعد وہ خاموش رہی اور جب خاموشی گہری ہوگئی تو اس نے دھیرے سے کہا، 'اور اچانک اس ناول کو پڑھنے کی خواہش کیوں ہوئی آپ کو؟'

— منٹو میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انھوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے اور وہ بھی مرزا غالب کے بارے میں۔

— غالب بھی آپ کو پسند ہیں؟

— جی ہاں۔ سچ کہوں تو بہت عرصے سے میں خود مرزا غالب کے بارے میں ایک ناول

لکھنے کا سوچ رہا تھا۔

— کب لکھیں گے آپ؟

— دیکھتے ہیں۔ مجھ سے جلدی جلدی کچھ نہیں ہو پاتا۔ اگر محض ایک تاریخی ناول لکھنا ہوتا تو میں اسے آسانی سے لکھ لیتا۔ لیکن میں—

تبسم کچھ نہیں بولی۔ میں بھی نہیں بولا۔ میں بس آئینے کے اندر خود کو اور تبسم کو دیکھتا رہا۔

اس کے بعد اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔ ا......ب......پ......ت...... میرا ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھایا تبسم نے۔ کبھی کہتی، واہ! کتنی آسانی سے لکھ لیتے ہیں آپ، لیکن ایک دن میں نے اعلان کر دیا کہ اس عمر میں سیکھنے کا صبر اور ارتکاز مجھ میں نہیں ہے۔ بہت بحث مباحثے کے بعد تبسم نے کہا، میں سمجھتی ہوں آپ سیکھ سکتے تھے۔

میری تجویز کو تبسم نے قبول کر لیا کہ وہ ناول کو پڑھ کر زبانی ترجمہ کرتی جائے گی اور میں لکھتا جاؤں گا۔ جب اس کی شادی کے بعد مناسب وقت گزر گیا تو میں نے ہر شام اس کے ہاں جانا شروع کیا، یوں میں نے منٹو کے غالب کو تبسم کے لہجے کے ذریعے نئے سرے سے دریافت کیا، اور ایک فرض شناس مصنف کی طرح ایک نایاب غیر مطبوعہ ناول کو بنگلہ میں لکھتا گیا۔

تبسم کے ترجمہ کردہ منٹو کے ناول کو لکھتے ہوئے مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ میں مرزا غالب کے بارے میں ناول لکھنے کے قابل کبھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد آپ لوگ جو پڑھیں گے وہ مرزا غالب کے متعلق لکھے گئے منٹو کے ناول کا ترجمہ ہوگا۔ بیچ بیچ میں، میں اور تبسم لوٹ بھی سکتے ہیں۔

۲

پیش لفظ

یہ داستان کون لکھ رہا ہے؟ میں سعادت حسن منٹو، یا میرا آسیب؟ منٹو پوری زندگی صرف ایک انسان کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا، مرزا اسداللہ غالبؔ۔ مرزا کو عبدالقادر بیدلؔ کا ایک شعر بہت پسند تھا۔ وہ اسے اکثر پڑھا کرتے تھے ۔

عنقا سرو برگیم نپرس از فقرا ہیچ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ہمارا سروساماں عنقا کی طرح معدوم و نایاب ہے، ناداروں کے بارے میں کچھ مت پوچھو۔ کل عالم میں ہمارا افسانہ مشتہر ہے لیکن ہم ہیچ ہیں۔

جیسے یہ شعر بیدل نے غالب ہی کے بارے میں کہا ہو۔ کیا ان کے ذہن میں میں بھی تھا؟

مجھے ہمیشہ لگا جیسے میں اور مرزا آمنے سامنے رکھے ہوئے دو آئینے ہوں۔ اور دونوں آئینوں کے بیچ ہو معدومیت، ایک خلا۔ دونوں ایک دوسرے کے خالی پن کو دیکھ رہے ہوں۔ کیا خلائیں آپس میں بات کر سکتی ہیں؟

کتنے ہی دنوں تک میں نے مرزا کے ساتھ یک طرفہ گفتگو کی۔ وہ ہمیشہ چپ رہے۔ بھلا وہ قبر سے کیسے جواب دے سکتے تھے؟ لیکن اتنے برسوں کے انتظار کے بعد اب مجھے یقین ہو گیا

ہے کہ مرزا مجھ سے بات کریں گے۔ کیوں کہ اب میں بھی اپنی قبر میں ہوں۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے بعد میں جلد ہی سمجھ گیا تھا کہ مجھے اپنی قبر اب خود ہی کھودنی ہوگی تا کہ مٹی تلے گہری تاریکی میں جا کر سو سکوں۔ میری قبر کے کتبے پر لکھا ہوگا:

'یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فن افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔'

لوگوں کو اندازہ ہی نہیں کہ جب سے منٹو اس دنیا میں آیا تھا خدائی کی دیوانگی اس کے دماغ میں تھی۔ اس لیے ساری زندگی کہانیاں منٹو کو ڈھونڈتی رہیں۔ منٹو کبھی کہانی کی تلاش میں نہیں گیا۔

مرزا اب میرے ساتھ باتیں کریں گے۔ ہم مسلسل گفتگو کرتے رہیں گے، وہ سب جو مرزا ساری زندگی کسی سے نہیں کہہ پائے اور وہ سب جو میں کسی کو نہیں بتا پایا۔ اب وہ ساری باتیں ہم اپنی اپنی قبر میں لیٹ کر کیا کریں گے۔ مرزا وہاں نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے پاس سلطان جی کے قبرستان میں اور میں یہاں لاہور میں میانی صاحب قبرستان میں۔ کبھی یہ ایک ہی ملک ہوا کرتا تھا۔ زمین کے اوپر سرحدوں کی کتنی ہی خاردار تاریں لگی ہوں زمین کے نیچے تو یہ ایک ہی ملک، ایک ہی دنیا ہے۔ کیا کوئی مردوں کی آپس میں بات چیت پر بھی پابندی لگا سکتا ہے؟

کس کو خزاں کہتے ہیں اور کس کو موسم بہار کہا جاتا ہے؟ سارا سال ہم قفس کے اندر زندہ رہتے ہیں اور ہمیشہ یہی کہہ کر آہیں بھرتے رہتے ہیں کہ کبھی ہم اُڑا کرتے تھے۔ مرزا نے اپنی ایک غزل میں یہی بات کہی ہے۔ مرزا کبھی نہیں اُڑ پائے اور نہ ہی میں۔ لیکن اس بار ہم اپنی قبروں کے اندھیرے میں پنکھ لگائیں گے دوستو۔ آپ لوگوں کو وہ سب کہانیاں سنائیں گے جو آپ نے کبھی نہیں سنیں۔ ان سب پردوں کو ہٹا دیں گے جن کے پیچھے کا منظر آپ لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ مرزا کے بنا منٹو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے منٹو کے بغیر مرزا بھی نہ ہوں۔

تو پھر قبروں کے اندر گفتگو شروع کرتے ہیں۔ آداب۔

سعادت جن منٹو

۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء

جب پیش لفظ کا ترجمہ ہو گیا تو میں نے منٹو کے دستخط کے نیچے لکھی تاریخ کو دیکھا۔ یوں لگا جیسے

ایک پہیلی ہو۔ بہت دیر تک میں خاموش اور ساکت بیٹھا رہا، کیا مجھے جاڑے نے آلیا تھا؟ تبسم کی آواز جیسے کہیں دور سے سنائی دی، 'کیا آپ اور نہیں لکھیں گے؟' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا دھند کا بادل سا دکھائی دیا۔

— کیا ہوا؟

—ہوں ں......

— آج اور نہیں لکھیں گے؟ آپ بہت کاہل اور کام چور ہیں۔

— ٹھیک کہا آپ نے۔

— کیا؟

— کاہل اور کام چور

— کیا ہوا ہے آپ کو؟ تبسم کی آواز وائلن کے تیز سُروں جیسی محسوس ہوئی۔

—یہ تاریخ......

—ہاں، یہ وہ تاریخ ہے جب منٹو نے یہ دیباچہ لکھا۔

— لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟

— کیوں؟

—یہ تو وہی تاریخ ہے جس دن منٹو کی وفات ہوئی۔

—اسی تاریخ کو؟ تبسم جیسے کسی غار کے اندر سے بولی۔

—ہاں۔ اور جس طرح منٹو کی موت ہوئی تھی اس حال میں ان کے کچھ لکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

—پھر تو......

—یہ ناول جعلی ہے۔

—یعنی؟

—یعنی کسی اور نے منٹو کے نام سے لکھا تھا۔

تبسم ہنسنے لگی—اچھا ہی تو ہے۔

— کیا مطلب؟

— منٹو کے نام سے ایک جعلی ناول چھپ جائے گا۔

—یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

—ہونے دیجیے۔

— لیکن تبسم کیا یہ صحیح ہوگا؟

— صحیح اور غلط چھوڑیے۔ آپ مرزا غالب کے بارے میں منٹو کا لکھا ہوا ناول پڑھنا چاہتے ہیں نا؟

—ہاں۔

— تو بس فرض کر لیجیے کہ یہ ہی منٹو کا لکھا ہوا ناول ہے۔

— مگر کیسے؟

— کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ جو کچھ بھی منٹو نے لکھا وہ ان کا اپنا لکھا ہوا تھا؟ ہو سکتا ہے کوئی اور دعویٰ کر دے کہ وہ منٹو کے لیے لکھتا تھا۔

—بالکل ایسے جیسے میں بول رہی ہوں اور آپ لکھ رہے ہیں۔ آپ، میں، مرزا غالب، منٹو۔ ایک دن کوئی بھی نہیں رہے گا، ہمارے نام بھی نہیں، لیکن کہانیاں ضرور رہیں گی۔ یہ بھی کیا کم ہے؟ آیئے چلیے، اب لکھنا شروع کیجیے۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

مرزا صاحب، میں آپ کو لامتناہی فاصلے سے دیکھ سکتا ہوں۔ کبھی آپ چت لیٹے اوپر کی جانب دیکھ رہے ہوتے ہیں، کبھی آپ یوں منڈکڑی سی مار کر پڑے ہوئے ہوتے ہیں جیسے یہ قبر آپ کی رحمِ مادر ہو۔ کبھی آپ اٹھ بیٹھتے ہیں اور پریشانی کے عالم میں بڑبڑاتے ہیں، تو کبھی آپ کو سر جھکائے چہل قدمی کرتے دیکھا کرتا ہوں۔ جہاں تک میری بات ہے تو مجھے زیادہ تر اسی تاریکی میں لیٹے رہنا اچھا لگتا ہے۔ آپ ۱۸۶۹ء سے اپنی قبر میں لیٹے ہوئے ہیں، اب تک تو یہ قبر آپ کا گھر بن چکی ہوگی، ہے نا؟ میں تو بس حال ہی میں اوپر کی دنیا سے یہاں آیا ہوں۔ میری

زندگی ہمیشہ طوفانوں میں گھری رہی اس لیے اب صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔شروع شروع میں ضرور آپ کی بھی یہی حالت رہی ہوگی۔ میں جانتا ہوں اپنے آخری ایام میں آپ اپنی زندگی کا بوجھ ڈھونہیں پا رہے تھے۔آپ نے اپنی ولی کیفیات اور اپنی ناآسودگی کا حال یوسف مرزا کے نام ایک خط میں لکھا تھا:'آدمی ہوں، دیونہیں بھوت نہیں۔ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں......'

آپ دراصل کیا تھے، یہ بات آپ کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔جبکہ یہ بات کبھی زندگی کا سب سے اہم سوال رہی تھی۔لیکن زندگی کے آخری آخری برسوں میں آپ کو ہر چیز بے معنی لگنے لگی تھی۔آپ بار بار موت اور خدا کی بات کیا کرتے تھے۔آپ نے کبھی نماز نہیں پڑھی، روزے نہیں رکھے، ازراہ مذاق آپ خود کو آدھا مسلمان کہا کرتے تھے، اسی سبب سے آپ کو امراؤ بیگم سے دور ہو جانا پڑا، اور اب وہی شخص اپنے آخری وقت میں خدا کی طرف دیکھ رہا تھا۔آپ نے خط پر خط لکھے کہ خدا آپ پر رحم کیوں نہیں کرتا اور آپ کو اس دنیا سے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔میں جانتا ہوں آپ اور لڑنہیں پا رہے تھے۔شاعری آپ کو بہت پہلے ہی چھوڑ کر جا چکی تھی، منیرہ بائی کی یادیں بھی ہڈیوں کے پنجرے سے زیادہ نہیں تھیں۔حتیٰ کہ آپ کی مرغوب شراب بھی آپ کو باقاعدگی سے مہیا نہیں تھی۔ایسی حالت میں آدمی خدا کے سوا اور کس کے در پر جا سکتا ہے؟ جب میں آپ کے آخری ایام کے بارے سوچتا ہوں تو مجھے آپ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

لیکن کیا اس طرح فاقوں، بیماریوں، اور اندھے پن کے ہاتھوں مٹ جانا ہی آپ کی تقدیر تھی؟

میں جب آپ کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک آندھی کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔وہ گھوڑوں پر سوار، دریا پار کرتے ہوئے سمرقند سے آرہے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں بے نیام تلواریں سورج کی روشنی میں چمک رہی ہیں۔انھوں نے کتنے ہی دور دراز کے علاقے طے کیے ہیں۔قتل وغارت اور آگ اور خون کے کربلا کو پار کرتے وہ ہندوستان کی طرف آرہے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے میں یہ سب خواب میں یا سنیما کے پردے پر دیکھ رہا ہوں۔آپ

کے ان آباؤاجداد کا سارا دن گھوڑے دوڑاتے ہوئے گزرتا تھا اور اگر ان کے راستے میں کہیں انسانی آبادی آجاتی تو شروع ہو جاتی قتل و غارت اور لوٹ مار۔ پھر رات کو صحرا میں خیمے گاڑ کر آرام ہوتا۔آگ کے الاؤ روشن کیے جاتے اور گوشت بھونا جاتا، رُباب یا دلربا چھیڑا جاتا۔ان میں سے کوئی دور بیٹھا خانہ بدوشوں کا کوئی گیت گانے لگتا۔غیر فانی آسمان کے لیے۔کچھ خیموں میں لوٹ کر لائی گئی لڑکیوں کے ساتھ بدن کا جشن برپا ہوتا۔مرزا صاحب، آپ کو اپنے آباؤاجداد پر بہت فخر تھا، اگرچہ آپ نے کبھی تلوار نہیں تھامی۔تفاخر ہونے کے باوجود آپ جانتے تھے کہ دوسروں کی جان لینے اور اپنی جان دینے کے علاوہ ان لوگوں کی زندگی میں اور کچھ نہیں تھا۔صرف عورتوں کے ساتھ صحبت، شراب نوشی، اور طاقت کا غرور۔ مجھے معلوم ہے ان جنگجو اجداد کی زندگی آپ کے لیے ایک خواب کی طرح تھی۔'دو غالب ہیں'، آپ نے ایک بار کہا تھا: 'ایک سلجوق ترک ہے جو بادشاہوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اور دوسرا بے عزت مفلس جس کے سر پر قرض کا بوجھ چڑھا ہے۔' جو غالب بادشاہوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور ترک سپاہیوں کا وارث تھا وہی آپ کے خوابوں کا غالب تھا۔لیکن مغلیہ سلطنت کے غروب ہوتے ہوئے سورج میں آپ اس غالب کو کہاں ڈھونڈ پائے؟ اور پھر تقدیر بھی تو تھی۔آپ کی تقدیر جس نے آپ کی زندگی میں شاعری کے بیج بوئے تھے۔ایک فرانسیسی شاعر راں بو نے کہا تھا: 'میں غیر ہوں'، آپ اس 'غیر' کو ساتھ لے کر دنیا میں آئے تھے۔ایک مستقل ہمنشیں کے طور پر، ایسا آدمی تو سڑک کے کتے ہی کی طرح مرتا ہے۔

میں نے سنا ہے کہ آپ کے عظیم دادا سمرقند کی فوج میں ملازم تھے۔آپ کے دادا قوقان بیگ ماوراء النہر سے شاہ عالم کے دور میں انہی گھڑ سواروں کے ساتھ آندھی کی طرح اس سرزمین پر آئے تھے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا مرزا صاحب؟ اگر سہو ہو جائے تو درست کر دیجیے گا۔ارے یہ کیا، آپ اٹھ کر کیوں بیٹھ گئے اور مجھے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ مجھے خوب پتا ہے آپ کو یہ قصے سننا پسند ہے۔کہیں آپ کا خون جوش تو نہیں مار رہا، مرزا صاحب؟ آپ کو وہ پہلا والا غالب نظر آنے لگا ہے، ہے نا؟ وہ جس کی مجلس بادشاہوں کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ میں آپ پر طنز نہیں کر رہا، نہ ہی مذاق کر رہا ہوں۔ مجھے بھی اپنے کشمیری ہونے پر کم فخر نہیں تھا۔ میں اگر جواہر

لعل نہرو کو خط لکھنے کی ہمت کر پایا تھا تو اس کے پیچھے کشمیری ہونے کا تفاخر ہی تو تھا۔ ہم مٹی کے
پتلے ہیں مرزا صاحب، اور مٹی میں جو کنکر پتھر ہوتے ہیں وہ بھی خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ خدا
نے جو مہربانی آپ پر کی، اگر مجھ پر نہ کرتا تو کیا میں اتنی جلدی اس قبر میں آکر سو پاتا؟ آپ کی
طرح میں بھی خدا کو نہیں مانتا تھا، لیکن اس کے لیے اس کے سارے بندے برابر ہیں۔

مرزا صاحب میں آپ کو سب کچھ دوبارہ، نئے سرے سے یاد دلاتا ہوں، ہوسکتا ہے آپ
قبر کی اس طویل زندگی میں بہت کچھ بھول گئے ہوں۔ یہ فطری بات ہے۔ ہم زندگی میں بہت کچھ
یاد نہیں رکھ پاتے، اور موت یوں آتی ہے جیسے کوئی پردہ گرتا ہے جس کے پیچھے کچھ دکھائی نہیں
دیتا۔ کس طرح موت کے پردے نے ایک ایک کر کے سب کچھ مٹا دیا، یہ منظر میں نے ۱۹۴۷ء
میں دیکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے وہ سب نہیں دیکھا۔ آپ نے ۱۸۵۷ء دیکھا تھا لیکن
اگر کہیں آپ نے ۱۹۴۷ء دیکھا ہوتا، مرزا صاحب، تو آپ خودکشی کر لیتے، یا پھر اپنے اجداد کی
طرح آپ کے ہاتھ میں بھی تلوار چمک رہی ہوتی۔ ایسی قتل وغارت، اتنی آبروریزی، ایسی
دغابازی دنیا نے شاید کبھی نہ دیکھی ہوگی، ۱۹۴۷ء میں جن دو ملکوں کے نام پر یہ سب شروع ہوا ان
میں سے ایک کی قبر میں آج آپ لیٹے ہوئے ہیں اور دوسرے کی قبر میں میں سویا ہوا ہوں۔

میں ترتیب وار گفتگو نہیں کرسکا، مرزا صاحب۔ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا
ہوں۔ اس ٹھنڈی قبر میں لیٹے ہوئے بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر کہیں آگ دہک رہی
ہے۔ اسی لیے اتنی دیر سے الٹی پلٹی باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن میں شاید آپ کے دادا قوقان خان
بیگ کا ذکر رہا تھا، ہے نا؟ حالانکہ میں نے بہت دنوں سے جانی واکر نہیں پی لیکن پھر بھی غلطی کا
امکان تو نہیں۔ پاکستان جا کر مجھے تو دیسی ہی پینا پڑی تھی۔ آپ تو فرنچ وائن پسند کرتے تھے۔
ہے نا؟ لیکن آخر میں آپ کے پاس زم زم پینے کے علاوہ کوئی چارا نہیں رہا تھا۔ پر مجھے اصل بات پر تو
آنا ہی ہوگا، مرزا صاحب۔ قوقان خان بیگ کی بات پر۔ ارے یہ کیا، آپ جلتے ڈولتے اٹھ کر
بیٹھ گئے ہیں؟ اپنے اجداد کے قصے سننا آپ کو بہت اچھا لگتا ہے، ہے نا؟ کیا آپ کو اپنے خون میں
گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھمک محسوس ہوتی ہے؟ آپ بھول نہیں پاتے کہ آپ ایک گداگر ہیں، ایک
سزا یافتہ۔ اور وہ کیا کہتے تھے لوگ غالب کو؟ مشکل پسند۔ یاد ہے؟ کچھ لوگوں نے مہمل گو کا نام دیا

تھا۔ یہ شاعر ہذیان بکتا ہے۔ آپ کو وہ شعر یاد ہے ۔

یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

مجھے باتیں کرنے کا ایسا جنون ہے کہ ایک بار شروع کر دوں تو پھر رک ہی نہیں پاتا۔ معلوم ہے
کیوں؟ میں سوچا کرتا تھا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ لوگ سمجھ بھی رہے ہیں؟ جب میں نے آپ کے
خط پڑھے تو مجھے پتا چلا کہ آپ کو بھی باتیں کرنے کا کیسا نشہ تھا۔ خط در خط آپ باتیں کرتے
رہے۔ اور مرزا صاحب آپ کے خطوط پڑھ کر ہی تو ایک دن میں نے آپ کی آواز سنی تھی۔ آپ کو
یاد ہے آپ نے کیا فرمایا تھا؟

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

میں نے پہلی بار کسی سزا یافتہ، شکست خوردہ آدمی کو دیکھا تھا۔ آپ کبھی نہیں جان پائیں گے مرزا
صاحب، وہ لوگ میرے کتنے افسانوں میں ظاہر ہوئے۔ وہ لوگ جو اپنی شکست کی ٹوٹی ہوئی آواز
تھے اپنی اس بات چیت کے دوران میں آپ کو ان میں سے کچھ کی کہانیاں سناؤں گا۔ ان کے بغیر
منٹو کیا ہے؟ محض ایک ہوا کا جھونکا۔

لیکن اب مجھے قوقان بیگ کا قصہ سنانا ہی ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کہانی سننے کے منتظر
ہیں۔ جیسے قبر کی مٹی سب کچھ مٹا دیتی ہے، ہوسکتا ہے اسی طرح یہ کہانیاں بھی مٹ جائیں
گی۔ آپ کے دادا قوقان بیگ اس ملک میں آ کر لاہور کے نواب کی سپاہ میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہ
نواب صاحب زیادہ نہیں جیے۔ ایسے میں قوقان بیگ جیسا اجرتی سپاہی کیا کرتا۔ ملازمت کے
لیے کسی دوسرے نواب یا بادشاہ یا کم از کم کسی مہاراجہ کو تلاش کرتا ہی تھا۔ اجرتی سپاہی ایسے ہی
زندگی گزارتے ہیں، رنڈیوں کی طرح۔ چاہے ان کی تلواریں کتنی ہی آب دار ہوں۔ آپ ان
اجرتی سپاہیوں کی زندگی سے واقف تھے، مرزا صاحب، اسی لیے تو آپ نے تلوار کو کنارے کر دیا
تھا۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟ منٹو جیسے حرامی کی آنکھوں کو آپ کیسے دھوکا دے سکتے ہیں۔

پھر آپ کے دادا دلی پہنچ گئے۔ لیکن کب؟ یا اللہ، جب دلی برباد ہونے کو تھی۔ اورنگزیب

نے سب کچھ تباہ کر دیا تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ باہر سے حملے پر حملے ہو رہے تھے۔ شاہ عالم کی دلی مغلیہ سلطنت کی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ مغل دربار گٹھیا میں مبتلا کسی گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اگر چہ تو قان بیگ کو پچاس گھڑ سواروں کے دستے پر سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا اور اس کے عوض انہیں جاگیر بھی عطا ہوئی تھی، لیکن انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں مزید ترقی کا کوئی امکان موجود نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مہاراجہ جے پور کی فوج میں بھی شمولیت اختیار کی لیکن کچھ خاص جاگیر نہ بنا پائے۔ سنا ہے انکا انتقال آگرہ میں ہوا تھا۔

اس کے بعد آپ کے والد عبداللہ بیگ لکھنؤ دوڑے، جہاں وہ نواب آصف الدولہ کی فوج میں نوکر ہو گئے۔ اجرتی سپاہیوں کی جیسی قسمت ہوتی ہے عبداللہ بیگ کی بھی ویسی ہی تھی۔ ایک ریاست سے دوسری ریاست دوڑو، نوابوں، بادشاہوں کو خوش کرو جب دیکھو کہ ان کا تخت ڈگمگا رہا ہے، فوراً نوکری کے لیے کسی دوسرے نواب یا بادشاہ کے پاس بھاگو۔ ان عورتوں کی طرح، مرزا صاحب، جنھیں میں نے امرتسر کے کٹرہ گھونیاں، لاہور کی ہیرا منڈی، یا دلی کے جی بی روڈ اور بمبئی کے فارس روڈ پر کھڑے دیکھا تھا۔ ان کی جنگ رات بھر کی ہوتی تھی۔ ایک دن میں آپ کو ان کی کہانیاں سناؤں گا، مرزا صاحب، ان کے گوشت کی کہانیاں، ان کے دل کی کہانیاں، ان کے خون اور پسینے اور زخموں اور آنسوؤں کی کہانیاں۔ ان کی کہانیاں مجھے برسوں ڈھونڈتی رہی ہیں، اور ان کہانیوں سے گزرتے ہوئے ایک دن مجھے خدا کا یقین ہو گیا۔ ایک وہی تو تھا جو ان کا زندگی بھر کا ساتھی تھا۔ رحیم و کریم۔ کوئی ان کہانیوں پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے الزام دیتے تھے کہ میں انھیں گھڑتا ہوں۔ وہ مجھے ویشیاؤں کا افسانہ نگار کہتے تھے، ایک فحش نگار، کیونکہ میں ان کے بارے میں لکھتا تھا۔ لیکن میں خاموش کیسے رہ سکتا تھا، مرزا صاحب، کیا وہ ہزاروں لاکھوں لڑکیاں ہیرا منڈی یا فارس روڈ پر اپنی مرضی سے بیٹھی تھیں؟ معاف کیجیے گا مرزا صاحب، صفیہ، میری بیوی بھی یہی کہتی تھی۔ آپ اتنا بڑھا چڑھا کر کیوں بیان کرتے ہیں، سعادت صاحب؟

گستاخی معاف، حضور، ذرا گذشتہ باتیں جلدی جلدی دہرا دوں۔ کوئی بات اگر مجھے پکڑ لے تو میں پتا نہیں کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں، مجھے خود بھی پتا نہیں چلتا، مجھے لوگوں کو بھول بھلیوں میں بھٹکا کر تھکا دینے میں بہت مزا آتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے افواہ پھیلا دی کہ امریکہ

تاج محل خریدنے والا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ سب پوچھنے لگے وہ تاج محل کیسے خرید سکتا ہے؟ خرید بھی لے تو اسے لے کر کیسے جائے گا؟ میں نے کہا امریکہ والے سب کچھ کر سکتے ہیں، انھوں نے ایک نئی مشین ایجاد کی ہے، وہ اسی مشین کی مدد سے تاج محل اٹھا کر لے جائیں گے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر یقین کر لیا، مرزا صاحب، اور کیوں نہ کرتے؟ سب جانتے ہیں کہ امریکہ جو چاہے کر سکتا ہے، جیسے وہ کوئی جادوگر ہو۔ آپ سب کچھ محض اس لیے نہیں کر سکتے کہ آپ کے پاس اس کے لیے مشین ہے۔ کیا لوگ یہ بات سمجھتے ہیں؟

ارے ہاں جیسا کہ میں بتا رہا تھا، آپ جو یہ میری طرف توقع بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں تو بہتر ہے کہ میں اس کہانی کو مکمل کر دوں۔ لکھنؤ میں آپ کے والد زیادہ ملازمت نہیں کر پائے۔ انھیں حیدر آباد جانا پڑا، نواب نظام علی خان کی فوج میں ملازمت کے لیے۔ وہ وہاں تین سو پیدل سواروں کے دستے پر سپہ سالار مقرر ہوئے۔ وہ کئی سال تک نظام کی فوج میں رہے۔ پتا نہیں پھر کیا گڑبڑ ہوئی۔ اب ساری تاریخ تو لکھی نہیں گئی، مرزا صاحب، اور اگر لکھی بھی ہوتی تو کیا ہوتا۔ خیر۔ عبداللہ بیگ راجہ بختاور سنگھ کی فوج میں الور چلے گئے۔ تاریخ میں یہ رقم نہیں ہے کہ کس طرح اور کس جنگ میں آپ کے والد کی وفات ہوئی۔ تاریخ میں اجرتی سپاہیوں کے بارے میں نہیں لکھا جاتا لیکن یہ اجرتی سپاہی ہی ہوتے ہیں جن کے دم سے تاریخ کے صفحات جگمگاتے ہیں۔ آپ کو یقیناً یاد ہوگا، اس وقت آپ کی عمر پانچ برس تھی۔

آپ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ جس کے سر پر باپ نہ رہے وہ یتیم ہو جاتا ہے۔ صرف آپ ہی نہیں بلکہ آپ کے بھائی یوسف اور بہن چھوٹی خانم بھی۔ آپ کے والد کا کوئی گھر نہیں تھا۔ ساری زندگی آپ کا بھی کوئی گھر نہ بنا۔ آپ کا، آپ کی بہن اور بھائی کا بچپن اور لڑکپن آگرہ میں واقع آپ کے نانا کی وسیع و عریض حویلی کالے محل میں گزرا لیکن کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کب آپ کو احساس ہوا کہ آپ کے کنبے کے پاس اپنا کوئی گھر نہیں؟ یہ جاننے کو میرا بہت دل چاہتا ہے کہ کالے محل میں آپ کے شب و روز کیسے بسر ہوئے۔ آپ کی والدہ، آپ کی غمناک والدہ ضرور سارا وقت خاموشی سے زنانہ محل کے کسی کونے میں بیٹھی رہتی ہوں گی۔ میں قیاس کر سکتا ہوں کہ کیسے آپ تینوں بہن بھائی ان کے پاس جاتے ہوں گے اور وہ آپ سب کو

اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی ہوں گی۔ اور شاید دل ہی دل میں کہتی ہوں گی، 'یا اللہ، میرے بچوں کو سلامت رکھنا۔'

کبھی کبھی میں آپ کو قبر میں بے قراری سے پہلو بدلتے دیکھتا ہوں، اپنی والدہ کے لیے بلکتے ہوئے، 'امّی، ...... میری امّی جان......'

میں ان کی آواز سنتا ہوں، وہ بیگم جن کا نام ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ آپ کی والدہ کہتی ہیں، 'اسد، میرے بیٹے...... میری جان......'

— ہمیں گھر لے چلیے امّی۔

— کہاں؟

— جہاں بھی ہو۔

آپ دوبارہ کیوں لیٹ گئے مرزا صاحب، میری باتیں آپ کو اچھی نہیں لگ رہیں؟ تو پھر آپ ہی کچھ کہیے، مرزا صاحب، میری بکواس کو بھول جائیے۔

۳

اس بُت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے، صورتِ آدم بہت ہیں یاں

کیا آپ اِتنے لامتناہی فاصلے سے میری بات سن پائیں گے، منٹو بھائی؟ آپ کی ضد نے اتنے برسوں بعد مجھے پھر سے بولنے پر مجبور کردیا۔ یہ سچ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد میں بارہ برس تک زندہ رہا، لیکن میرا کسی کے ساتھ بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی بات کرنا پڑتی تھی کہ لفظوں کی تجارت ہی تو میری معیشت تھی۔ لیکن بس اتنی ہی کہ جتنی میری روزی روٹی چلانے کے لیے ضروری تھی، اس کے علاوہ بات کرنا میرے لیے حرام ہوگیا تھا۔ میں بے پرواہی سے بوسیدہ دیوان خانے میں پڑا رہتا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا کلّو وہیں دے جاتا تھا، ذرا سا پراٹھا کباب یا بھنا گوشت، اور میری شراب۔ بس پھر نیند ہی نیند۔ ایک بھی شعر دماغ میں نہیں آتا تھا، آتا بھی کیسے، آپ ہی بتائیے، میں تو تب سڑ رہا تھا۔ میرے سارے جسم سے بدبو آتی تھی۔ کسی اور کو محسوس نہ بھی ہو مگر مجھے وہ سڑاند مسلسل آتی رہتی۔ ایک شام جب میں اس بدبو کو مزید برداشت نہ کرپایا تو محل سرا چلا آیا۔ ویسے میں وہاں بالکل نہیں جاتا تھا۔ امراؤ بیگم سارا دن وہاں اپنی نمازوں میں مشغول ہوتی تھیں اور تسبیح پکڑے رہتی تھیں۔ ان کے لیے تو میرا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ ذرا تصور کیجیے، منٹو بھائی! دو لوگ پچاس برس سے بھی زیادہ عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے

ہوں، ان کے بیچ نہ کوئی بات ہو، نہ ہی کبھی وہ ایک دوسرے کو پہچان پائیں۔ اسی کا نام نکاح ہے۔ محبت کسے چاہیے؟ یہ مت کہیے گا کہ میں سارا الزام امراؤ بیگم کو دے رہا ہوں۔ کافر تو میں ہی تھا، جیسا کہ میر صاحب نے اپنے شعر میں کہا تھا، کس طرح اسے اپنے قریب لاؤں، مجھے نہیں پتا، وہ کبھی آئی ہی نہیں، اس میں پر اس کی کیا خطا۔

محل سرا کے اندر جا کر دیکھا بیگم، کلّو کی ماں اور مداری کی بیوی کو بڑی صداقت کے ساتھ کچھ بتا رہی تھیں۔ میں نے باہر کھڑے ہو کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ بیگم انھیں کہہ رہی تھیں، 'رسول اللہ کی کتنی بیویاں تھیں۔ لیکن نبی کسی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ان کا ہر زوجہ کے ساتھ رہنے کا وقت طے تھا۔ صرف حضرت سودہ نے اپنا وقت حضرت عائشہ کو دے دیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی پانچ ازواج — سودہ، صفیہ، جویریہ، اُمّ حبیبہ اور میمونہ کے ساتھ نہیں رہتے تھے لیکن اس کے باوجود انھیں کبھی کسی چیز سے محروم نہیں کیا۔ حضورِ اکرمؐ کی طرح غیر جانبدار کتنے لوگ ہیں؟' بیگم کے بات ختم کرتے ہی میں کھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ کلّو کی ماں اور مداری کی بیوی نے فوراً گھونگھٹ کر لیا اور گھر سے باہر چلی گئیں۔ امراؤ بیگم میری طرف بڑھیں اور بولیں، 'تشریف رکھیے، مرزا صاحب۔'

— کیا سب کے ساتھ ایک جیسا حسنِ سلوک ممکن ہے بیگم؟ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

— صرف نبی کر سکتے ہیں، لیکن آپ اچانک زنان خانے میں کیسے چلے آئے؟ کوئی فرمائش تھی تو کلّو سے کہلوا دیا ہوتا۔

— فرمائش؟ میں نے کیا کبھی تم سے کوئی فرمائش کی ہے، بیگم؟

— تو پھر میرے کمرے میں کیسے آ گئے؟

میں نے ان کے ہاتھ کس کر پکڑ لیے اور کہا، 'بیگم، ایک بار میرے بدن کو سونگھ کر دیکھو گی؟'

— یا اللہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مرزا صاحب؟

امراؤ بیگم بہت دیر تک چہرہ جھکائے کھڑی رہیں۔ پھر میں نے ایک آواز سنی، یوں جیسے کوئلے سے دھواں اٹھتا ہے۔ 'وہ سب بہت پہلے کی بات تھی۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے، مرزا صاحب؟'

— کیا تمھیں بدبو آ رہی ہے، بیگم؟

— بدبو؟

— یہ جو میں تمھارے سامنے کھڑا ہوں تو کیا تم کو بدبو نہیں آ رہی؟

— آپ سے کیوں بدبو آئے گی، مرزا صاحب؟

— مجھے ہر وقت اپنے بدن سے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو آتی رہتی ہے۔

— یا اللہ۔ وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئیں۔ دونوں ہاتھ میری پیٹھ پر پھیرتے ہوئے کہنے لگیں، 'آپ کو کیا ہو گیا ہے، مرزا صاحب؟ کیا زیادہ پی لی ہے آج؟ یا کوئی بُرا خواب دیکھا ہے؟' میں ہنس دیا۔ بُرا خواب؟ میں تو خود ایک بھیانک خواب ہوں، بیگم۔ خدا نے پوری زندگی شاید میرے جیسا بُرا خواب نہیں دیکھا ہوگا۔

— مرزا صاحب......

— کہو۔

— خدا سے دعا مانگیے۔

— وہ تو میں ہر وقت مانگتا ہوں، بیگم۔

— کیا مانگتے ہیں؟

— ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

— یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

— کون ہے وہ؟ کون آپ سے بیزار ہے؟

— خدا۔ میں نے یہ کہتے ہوئے ان کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

— چلیے، مرزا صاحب، میں آپ کو دیوان خانے تک چھوڑ آتی ہوں۔

— کیوں؟

ہم دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم اپنے درمیان کی دوری کو ختم نہیں کر سکتے۔ بیگم بھی یقیناً یہ سمجھ گئی تھیں۔ ان کے رُخسار بھیگے ہوئے تھے۔ اس عمر میں یہ سب کس سے برداشت ہو سکتا ہے، منٹو بھائی؟ کیا ملتا ہے رو کر؟ میں اب اور آنسوؤں کی پروا نہیں کرتا تھا۔ رونے کی آواز سنتے ہی مجھے کربلا دکھائی دینے لگتی تھی۔ جیسے قاسم کی

شہادت کے بعد سکینہ کا پورا وجود آنسوؤں کے سمندر میں ڈھل گیا تھا۔

اس دن بیگم نے مجھے دیوان خانے تک پہنچایا۔ مجھے بستر پر لٹا کر، دیر تک میری پیشانی پر ہاتھ رکھے وہ میرے پاس بیٹھی رہیں۔ کئی بار انھوں نے پکارا، 'مرزا صاحب، مرزا صاحب——' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دینے سے بھی کیا ہوتا؟ سب کچھ تو ختم ہو چکا تھا، اب ہمارے الفاظ ایک دوسرے تک مزید پہنچ نہیں پاتے تھے۔ میں آنکھیں موندے ایک پرانی غزل گنگنانے لگا——

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

بالآخر بیگم نے چراغ گل کیا اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں ہر روز کی طرح اپنے قید خانے کی تاریکی میں پڑا رہا، مجھے بہت سردی لگ رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی میں سوائے سردیوں کے دوسرا کوئی موسم ہی نہیں ہے۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ کلو کی آواز سنائی دی، 'حضور...... بندہ پرور...... حضور...... مرزا صاحب......'

کلو کبھی وقت نہیں بھولتا تھا، روز صحیح وقت پر میری دوا لے کر حاضر ہو جاتا تھا۔ صندوق کی چابی اسی کے پاس رہتی تھی۔ وہ میری خوراک ہمیشہ صحیح ناپ کر لاتا، ایک بوند بھی زیادہ شراب نہیں دیتا تھا۔ جب میں ذرا خمار میں آ جاتا تو کلو سے قصے سنا کرتا۔ قصہ سنانے کا موقع مل جائے تو پھر کلو کو کچھ اور نہیں چاہیے۔ اس شام میں نے کلو سے کہا، 'کلو، آج میں تجھے قصہ سناتا ہوں۔

—— بہت خوب، حضور۔

—— کیا تُو جانتا ہے دنیائیں کتنی ہیں؟

کلو آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتا رہا۔

—— دو، ایک خدا کی، جہاں وہ جبرائیل اور فرشتوں کے ساتھ رہتے ہیں، اور ایک ہماری ہے، مٹی اور پانی کی یہ دنیا۔ ان دونوں دنیاؤں کے مالک نے ایک دن پوچھا، 'قیامت کے دن یہ دنیا کس کی ہوگی؟' پتا ہے جواب کس نے دیا؟ خود مالک نے۔ بھلا اس کے سوا اور کون جواب دے سکتا تھا؟ مالک نے کہا، سب، سب کچھ خدا کا ہے، اور مزے کی بات دیکھو کلو، خدا سے صرف

خدا ہی بات کرتا ہے۔ اور کون اس کے ساتھ بات کر سکتا ہے؟ خدا بہت اکیلا ہے، کلو میاں۔

—— یا اللہ! کلو رو پڑا۔

—— کیا ہوا؟

—— اللہ......

—— اللہ کو چھوڑ۔ پہلے میرا قصہ سُن۔ جو لوگ اس دنیا میں گناہ کرتے ہیں انھیں خدا کے دربار میں ضرور سزا ملتی ہے۔ خدا کی دنیا میں بھی کسی نہ کسی سے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ جانتا ہے خدا ان کے ساتھ کیا کرتا ہے؟ وہ انھیں سزا کے طور پر اس دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ میں نے خدا کی دنیا میں گناہ کیا تھا، کلو۔

—— حضور۔

—— اسی لیے خدا نے مجھے اس دنیا میں بھیج دیا۔ تیرہ برس قید خانے میں گزارنے کے بعد، پھر مجھے عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ جانتا ہے کب؟ جس دن بیگم کے ساتھ میرا نکاح ہوا۔ پھر دلّی بھیج دیا گیا۔ یہ ایک بھیانک قید خانہ ہے، کلو۔ کون میری زنجیریں کھولے گا؟ کون—— کون کھولے گا؟ ساری زندگی لکھتے رہنا کتنی بڑی سزا ہے، کلو، تُو نہیں سمجھے گا۔

منٹو بھائی، کلو نہایت عمدہ قصہ گو تھا۔ جونہی اسے وقت ملتا وہ جامع مسجد کی طرف دوڑ لگاتا اور مسجد کے چبوترے پر داستان گوؤں کے پاس بیٹھ کر قصے سنا کرتا۔ بڑے عجیب ہوتے ہیں یہ داستان گو۔ سارا دن جامع مسجد کے چبوترے پر بیٹھ کر قصے سنانا——یہی ان کا پیشہ تھا۔ ان کی زنبیلوں میں بھرے ہوئے قصے کبھی ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ جیسے وہ ساری دنیا گھوم کر ان قصوں کو جمع کر لائے ہوں۔ لوگ انھیں پیسہ دیں یا نہ دیں، وہ قصے سناتے رہتے تھے۔ یہ محض ان کا روزگار ہی نہیں تھا، وہ تو ان قصوں کو سناتے ہوئے خود اپنے ہی خوابوں میں کھو جاتے تھے۔ منٹو بھائی، ہمارا زمانہ ایک ایسے پارچے کی مانند تھا جسے قصوں کے دھاگوں سے بُنا گیا ہو۔ کون سا دھاگہ زندگی کا ہے اور کون سا قصے کا، سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ فوجی بغاوت کے بعد گوروں نے دلّی پر قبضہ کر لیا۔ وہ بڑے بھیانک دن تھے، منٹو بھائی۔ پوری دلّی کربلا بن گئی تھی۔ پھر اس کے بعد داستاں گو بھی دلّی سے ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے۔ انگریزوں کی دلّی میں داستانوں کی کوئی جگہ نہیں

تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں، گوروں کو قصّے کہانیاں نہیں، تاریخ چاہیے تھی۔ مجھے بھی ایک بار شہنشاہ نے تاریخ لکھنے کا حکم صادر کیا تھا۔ کتنا اُکتا دینے والا کام تھا وہ۔ ایک دو لوگوں کی زبانی میں نے انگریزوں کی تاریخ کی باتیں سنی تھیں، مجھے وہ کسی اندھے کنویں میں دم گھٹنے جیسی معلوم ہوئیں۔ آپ تو خود کہانیاں لکھا کرتے تھے، اس لیے سمجھ سکتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جنھیں کہانی کہنا آتی ہے؟ کتنے لوگوں میں درحقیقت لکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے؟ تاریخ تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے تو صرف یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کہانی لکھنے کے لیے خواب دیکھنے کی قوت چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ خواب دیکھے بنا کیا لیلیٰ مجنوں کا قصہ تخلیق کیا جا سکتا تھا؟ اگر آپ خواب ہی نہیں دیکھتے تو یوسف اور زلیخا کے قصّے پر کیسے اعتبار کریں گے؟ کیا اسے محض اس لیے جھوٹ سمجھ لیا جائے کہ یہ ایک کہانی ہے؟ ایسی کہانیاں صدیوں سے زندہ ہیں۔ اور سکندرِ اعظم؟ لوگ بس اس کا نام ہی جانتے ہیں، کہاں ہے آج اس کی سلطنت؟ تاریخ پر خاک پڑ جاتی ہے۔ منٹو بھائی، کہانیاں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

دلّی کے کربلا ہو جانے کے بعد، میں کلّو کو اکثر دیوان خانے کے کونے میں بیٹھے، روتے ہوئے دیکھتا تھا۔ کیا ہوا، کلّو؟ کلّو کی سسکیاں اور بھی تیز ہو جاتیں، وہ کسی زخمی جانور کی طرح نظر آتا تھا، جیسے موت اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ کیا ہوا کلّو؟

کلّو کے اندر سے جیسے مرتے ہوئے آدمی کی چیخ سنائی دی۔ کیا داستان گو اب دلّی نہیں لوٹیں گے، حضور؟

— نہیں، کلّو۔

— کیوں، حضور؟

— جب بادشاہ نے ہی انھیں بھگا دیا تو وہ کیسے لوٹیں گے؟

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں صبح گھر کے باہر ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک پتا نہیں کہاں سے ایک آدمی چلا آیا۔ اس نے پھٹا پرانا لباس پہن رکھا تھا، بال جٹاؤں کی طرح الجھے ہوتے تھے اور آنکھیں لہو کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور میرے قدموں میں آ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

— میاں صاحب، میں نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا۔

— تو میں کیا کروں؟ میں سگِ آوارہ کی مانند غرّایا۔

— اگر کچھ کھانے کو مل جاتا، حضور......

— یہاں اپنا ہی بمشکل پورا ہو پاتا ہے۔

— ذرا سا کھانے کو دے دیں، حضور، میں آپ کو ایک داستان سناؤں گا۔

اچانک کلّو آ پہنچا۔ 'داستان؟' اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

آدمی نے اپنی پیلی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے کہا، 'داستان گوئی ہی میرا پیشہ ہے۔'

کلّو فوراً ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ 'اچھا تو پھر سناؤ ہمیں کوئی داستان۔'

— پہلے مجھے کچھ کھانے کو دو۔

کلّو فوراً اٹھ کر اندر دوڑا اور کہیں سے کچھ کباب اور پراٹھوں کے بچے کھچے ٹکڑے لے آیا۔ اس آدمی نے پلک جھپکتے میں کباب پراٹھے چٹ کر لیے۔ پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

— چلو، شروع ہو جاؤ اب۔ کلّو نے اسے اُکسایا۔ کس کا قصہ ہے میاں؟

— مرزا اسد اللہ خاں غالب کا۔

کلّو نے حیرت سے منہ پھاڑ کر پہلے مجھے اور پھر اس شخص کو دیکھا۔

— میاں، کیا تم مرزا اسد اللہ خاں غالب کو جانتے ہو؟ میں نے پوچھا۔

— جی نہیں، حضور۔

— تو پھر تم نے ان کا قصہ کہاں سنا؟

— آگرہ میں، حضور۔

— تم اکبرآباد میں رہتے ہو؟

— جی، حضور۔

— پر میاں، مرزا تو کب کے اکبرآباد چھوڑ کر دلّی آ بسے۔

— مجھے معلوم ہے، حضور۔ آگرہ میں مرزا کی داستان سننے کے لیے بہت بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی۔

— ٹھیک ہے، تو سناؤ۔ ہم بھی سنتے ہیں۔ میں کلّو کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کلّو کے چہرے

پر بھی ایک شرارتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اس آدمی نے پہلے پتنگ بازی کے بارے میں ایک مثنوی سنائی۔ میں نے یہ مثنوی تب لکھی تھی جب میں نو برس کا تھا۔ اس وقت میرا تخلص اسد تھا۔ آپ کو تو علم ہے کہ نواب حسام الدولہ نے لکھنؤ جا کر میر صاحب کو میری غزل دکھائی تھی۔ میر صاحب نے کہا تھا، 'اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل جائے اور اسے سیدھے رستے پر ڈال دے تو یہ لڑکا ایک لاجواب شاعر بنے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔' ذرا تصور کیجیے، یہ میر صاحب نے میرے بارے میں کہا تھا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

عشق۔ میر صاحب عشق کی خاطر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ انھیں دیوانہ کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنے خاندان میں کسی اور کی بیگم پر عاشق ہو گئے تھے، اسی وجہ سے انھوں نے مسلسل عذاب جھیلا۔ آگرہ سے بھاگ کر دلّی آ جانے پر بھی انھیں نجات نہ ملی۔ وہ پاگل ہو گئے۔ نتیجتاً انھیں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ انھیں دور سے پھینک کر کھانا دیا جاتا۔ علاج کے نام پر کتنی ہی اذیتیں اٹھانی پڑیں میر صاحب کو۔ ان کی ناک اور منھ سے اتنا خون بہتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دلّی میں وہ مزید نہ رہ پائے، لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۱۸۱۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تب میری عمر تیرہ برس تھی اور اسی برس میں امراؤ بیگم کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔

—ارے، اصل داستان تو سنا۔ کلّو نے اس آدمی کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

—وہ ایک وسیع و عریض محل تھا۔ کالا محل۔ خواجہ غلام حسین خاں کا مکان۔ اس کا بڑا سا پھاٹک تھا، محل کے اندر ایک بڑا سا چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر طرح طرح کے پنجرے رکھے تھے۔ کسی میں مور تو کسی میں ہرن۔ ہزار طرح کے پرندے تھے۔ ایک پنجرے میں تو ہُد ہُد بھی تھا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی— ہُد ہُد۔ ارے اس پرندے کا نام تو قرآن میں آیا ہے، یہ پرندہ حضرت سلیمان کے پاس تھا اور میاں تم نے اس ہُد ہُد کو خواجہ غلام حسین خاں کے محل میں دیکھ لیا؟

—میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن بہت سے لوگوں نے کہا تھا کہ انھوں نے دیکھا تھا۔

—خواجہ غلام حسین خاں کی بیٹی کے ساتھ عبداللہ بیگ کا نکاح ہوا تھا۔ وہ کبھی لکھنؤ، کبھی حیدرآباد تو کبھی الور میں نوابوں اور راجاؤں کی فوج میں نوکری کرتے تھے۔ ان کا اپنا گھر نہیں تھا۔ مرزا اسداللہ کالے محل ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

—مرزا پانچ برس کے تھے جب ان کے والد کسی لڑائی میں مارے گئے۔ ہے نا؟

—آپ جانتے ہیں، حضور؟

—میں نے کچھ کچھ سنا ہے۔ آخر مرزا غالب کا ذکر ہے۔ ان کے قصے تو ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ اچھا تو پھر؟

—مرزا کے چچا تھے مرزا نصر اللہ بیگ خاں۔ وہ......

— بکواس بند کرو۔ میں چیخا۔ تمھارا کام کیا ہے؟ بتاؤ، کیا کام ہے تمھارا؟

—جی، میں داستانیں سناتا ہوں۔

—تم اسے داستان کہتے ہو؟ نصر اللہ خاں بیگ کے بارے میں کون سننا چاہتا ہے جو تاریخیں لکھتے ہیں انھیں جا کر بتاؤ۔ یہ سب جان کر مجھے کیا فائدہ؟ ہٹو، ہٹو یہاں سے۔

—حضور۔ کلّو اور وہ آدمی ایک ساتھ چلّائے۔

—میں جانتا ہوں دراصل کیا ہوا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے اس آدمی سے کہا۔

—جی، حضور۔ وہ آدمی میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

—میں جانتا ہوں پانچ برس کی عمر سے لے کر نکاح ہونے تک اسداللہ کس طرح کالے محل میں رہے۔

—ہمیں بتائیے، حضور، اب کے کلّو نے میرا ہاتھ کس کر پکڑ لیا۔

—بہت دنوں بعد مرزا نے ایک غزل کہی تھی۔ سنو، یہ کالے محل کے اُن دنوں کے بارے میں ہے:

نومیدیِ ما گردشِ ایّام ندارد
روزی کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

میری ناامیدی گردشِ ایام نہیں رکھتی (کیونکہ) وہ دن جو سیاہ ہو جائے، شام اور سحر (کا امتزاج) نہیں رکھتا

اب اور باتیں کرنے کا دل نہیں چاہ رہا، منٹو بھائی۔ مجھے اب ذرا سو لینے دیجیے۔ اس کے بعد آپ کی باتیں سنوں گا۔ قبر میں لیٹے ہوئے، کون جانے کتنی مدت تک یہ سارے خواب دیکھتے رہتا ہوں گے۔

۴

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

مرزا صاحب کو تھوڑا سونے دینا چاہیے۔ آس پاس آپ جتنے بھی مردہ لوگ لیٹے ہوئے ہم دونوں کی بات چیت سُن رہے ہیں، چلیے اب ہم سب محلّہ بلّی ماراں کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ ہم سب مرزا صاحب کے گھر کے اردگرد گلی قاسم جان میں پھیل جائیں گے۔ چلیے، چلیے، اٹھ جائیے۔ وہ داستان گو مرزا صاحب اور کلّو کو جو قصّہ سنا رہا تھا، وہ ہم چھپ کر سُن آتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں چھپنے کی ضرورت ہی نہیں، ہمیں بھلا کون دیکھ سکتا ہے؟ ہاں البتہ مرزا صاحب کو پتا چل سکتا ہے۔ سنا ہے وہ ساری رات نیند میں مُردوں سے باتیں کیا کرتے تھے۔

کلّو، مرزا صاحب کا ہاتھ پکڑے مسلسل درخواست کر رہا تھا، ’سنایئے نا حضور، آپ سنائیں گے تو خوب رہے گا۔‘

— نہیں، اِسے سُنانے دو، لیکن تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں میاں؟

— غلام کو عابد کہتے ہیں، حضور۔

— سناؤ عابد میاں۔ مرزا غالب کا قصّہ تمھاری زبانی ہی سنا جائے۔

— حضور، یہ اسد کا قصّہ ہے۔

— اسد؟

—جی ہاں، ابھی وہ مرزا غالب نہیں بنے تھے۔ آگرہ میں سب انھیں اسد ہی کہتے تھے۔ گستاخی معاف حضور، وہ نصر اللہ بیگ خاں......

—پھر وہی؟

—لیکن والد کے گزرنے کے بعد چچا نصر اللہ نے ہی تو اسد کی ساری ذمّے داری اٹھائی تھی۔ حضور، میں یہ بات کیسے بھول سکتا ہوں۔ اسد کے یہ چچا ہاتھی کی پیٹھ سے گر کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اسد ایک بار پھر یتیم ہو گئے، حضور۔

—کیا اُلٹا سیدھا بک رہا ہے۔ مرزا کا چہرہ بگڑ گیا۔ ارے مرزا غالب تو یتیم ہی اس دنیا میں آئے تھے۔ پھر سے کیا یتیم ہوتے۔

—میں سمجھا نہیں، حضور۔

—تو پھر ایک قصّہ سنو، میاں۔ مرزا غالب مسکرائے۔ فرض کرو ایک شخص ہے، اس کا نام حافظ ہے۔ تو ایک دن حافظ نے اپنی محبت کے در پر جا کر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی، 'کون ہے؟'

—'میں'۔ حافظ نے کہا۔

—یہاں 'میں' اور 'تم' کے لیے کوئی جگہ نہیں، جواب آیا۔ دروازہ نہیں کھلا۔

—سال بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرنے کے بعد حافظ نے پھر اسی دروازے پر آ کر دستک دی۔ 'کون ہے؟' اندر سے پھر وہی آواز آئی۔

—'تم'۔ حافظ نے جواب دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔

—پھر، حضور؟ کلّو آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔

—پھر کچھ نہیں۔ حافظ نے جو جواب دیا تھا، اسد وہ جواب نہیں دے سکا۔ اس لیے المقدر نے، اُس حکمرانِ حقیقی نے اُسے یتیم بنا کر اس دنیا میں بھیج دیا۔ دروازہ نہیں کھلا۔

—یہ قصّہ آپ نے کس سے سنا، حضور؟

—تمھی جیسے کسی داستان گو سے۔ ویسے یہ قصّہ شیخ جلال الدین رومی نے برسوں پہلے اپنی مثنوی میں لکھا تھا۔

یہ نام سنتے ہی عابد کھڑا ہو گیا، اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُس نے دائرے کی شکل میں گھومنا

شروع کر دیا۔ ہوا میں جیسے ایک سُریلا جھرنا بہنے لگا، 'مولا— میرے مولا'۔

—سماع موقوف کرو، عابد میاں قصّہ شروع کرو۔ مرزا غالب نے تندی سے کہا۔

—جی بہتر، حضور۔

عابد میاں نے مرزا غالب کی قدم بوسی کی اور کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر یوں گویا ہوا، 'جب بھی میں انھیں دیکھتا ہوں، آنکھیں بھر آتی ہیں'۔

—کسے؟

—اسد میاں کو۔

—کیوں؟ آنکھیں کیوں بھر آتی ہیں؟

—محض نو برس کی عمر میں، باپ کا سایہ سر پر نہیں رہا، حتیٰ کہ پرورش کرنے والا چچا بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اسد میاں اکیلے کالے محل میں گھوما کرتے۔

—اکیلے؟

—جی حضور۔ سنا ہے محل میں وہ کسی سے بات کرتے تھے اور نہ ہی کسی کی بات کا جواب دیتے تھے۔ بس گھومتے رہتے تھے کہ کب ان کی ملاقات ان کی والدہ سے ہو جائے۔ وہ تنہا آگرہ کی گلیوں میں دوڑتے پھرتے تھے۔ تاج محل کے سامنے جا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ رات کو محل کی چھت پر بیٹھ کر تارے گنا کرتے۔

—اسد تارے نہیں گنا کرتے تھے، میاں۔

—تو پھر؟ آپ جانتے ہیں، حضور؟

—نہیں تو اور کون جانے گا؟ کلّو چلّایا۔ حضور کے علاوہ اور کون جانے گا، میاں؟

—تو اسد کیا کیا کرتے تھے؟

—وہ ایک ستارہ ڈھونڈا کرتے تھے۔

—کون سا ستارہ، جناب؟

—جس ستارے پر سے اُنھیں، اُن کے عشق نے، اس دنیا میں لا پھینکا تھا۔

—کیا اسد اس ستارے کو پہچان پائے؟

—نہیں، میاں۔ ستاروں کی دنیا، زمین کی اس دنیا سے الگ ہے۔ ایک بار یہاں آجاؤ تو پھر اس ستارے کو پہچاننا ممکن نہیں رہتا۔ بھلا پہچانا بھی کیسے جائے؟ جانتے ہو، عابد میاں ستارے کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ آج رات جس ستارے کو تم آسمان میں چمکتا ہوا دیکھو گے، وہ دراصل لاکھوں سال پہلے ہی مر چکا ہے۔ اب صرف اس کی روشنی ہماری دنیا تک پہنچ رہی ہے۔ بتاؤ، تم کیسے جانو گے کہ کس ستارے پر تمھارا گھر تھا؟ میاں، اس سے بہتر ہے کہ تم آگے کا قصہ سناؤ۔

—بہت بہتر، حضور۔ ایک دن اسد گھومتے گھامتے، جمنا کے کنارے تاج محل کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ کافی دنوں سے وہ اپنی والدہ سے نہیں ملے تھے۔ انھیں دیوان خانے میں رہنا پڑتا تھا —وہ محل سرا تبھی جا سکتے تھے جب ان کی والدہ انھیں بلائیں۔ امّی کیوں نہیں بلاتیں؟ وہ محل سرا کے اردگرد چکر لگاتے رہتے، جس پر انھیں جھڑکیاں کھانے کو ملتیں۔ 'یہاں کیا کر رہے ہو اسد؟ زنان خانے کے باہر کیوں کھڑے رہتے ہو؟ تمھارے پاس کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟ وہ غصے میں محل کی چھت پر چڑھ جاتے، اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے، 'ابا جان، آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ کیا آپ کبھی نہ لوٹیں گے؟ آپ مجھے اس محل میں چھوڑ کر چلے گئے —اور یہ لوگ مجھے امی جان سے ملنے ہی نہیں دیتے، کیوں نہیں ملنے دیتے، ابا جان؟'

—کیوں نہیں ملنے دیتے تھے، میاں؟

—کیوں، حضور؟

داستان تم سنا رہے ہو اور تمھی نہیں جانتے؟ مرزا غالب زور سے ہنس دیے۔

—اسد کے والد ان کے لیے ترکے میں کچھ بھی چھوڑ کر نہ گئے تھے۔ عبداللہ بیگ خاں کے پاس تو گھر بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی گھر ہوتا تو ان کی بیوی وہاں رہتیں تب اسد کے لیے اپنی والدہ کے ساتھ رہنا ممکن ہوتا۔ پتا نہیں عبداللہ بیگ اور اسد کی والدہ کی یہ کیسی شادی تھی، انھوں نے کتنا وقت ایک دوسرے کے ساتھ بسر کیا، بتایئے؟ عبداللہ بیگ کے دن تو ایک میدان جنگ سے دوسرے میدان جنگ میں کٹتے تھے، ادھر اسد کی والدہ، کالے محل میں بیٹھی انتظار میں دن گنا کرتیں۔ اور پھر ایک دن عبداللہ بیگ کی موت کی خبر آگئی۔ صرف خبر، حضور۔ عبداللہ بیگ گویا ہوا کے جھونکے کے ساتھ غائب ہو گئے۔ کوئی نہیں جانتا کس انجان جگہ انھیں دفنایا گیا۔ جانتے

ہیں، حضور، ترکوں کا ایک عجیب دستور تھا، جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کے بیٹے کو اس کی تلوار ملتی اور گھر بار، زمین جائیداد بیٹی کے حصے میں آتی۔ عبداللہ بیگ نہ جانے کہاں کھو گئے۔ اسد کو ان کی تلوار بھی نہ ملی، جائیداد تو ان کے پاس تھی ہی نہیں۔

—عابد میاں......

—حضور۔

—کیا تم بھول گئے ہو اس دن کیا ہوا تھا؟

—کس دن، حضور؟

—جس دن اسد تاج محل کے پاس، جمنا کے کنارے جا کر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا، میاں؟

—گستاخی معاف حضور۔ داستان کی اپنی مرضی ہوتی ہے، میں اسے قابو نہیں کر پاتا۔ حضور، میرے چچا کہا کرتے تھے، داستانیں بہت غیر متوقع ہوتی ہیں۔ جب تم سوچتے ہو کہ تم اس سمت سے جاؤ گے، تھوڑی ہی دیر بعد تم دیکھتے ہو کہ وہ تمھیں کسی اور ہی راستے پر لے آئی ہیں۔

—وہ ٹھیک کہتے تھے۔ مرزا غالب مسکرائے۔ صرف گوروں کی تاریخ سیدھی سپاٹ ہے۔ ایک ہی رستے پر چلتی ہے۔ لیکن داستان کے لیے تو ہزاروں راستے ہیں۔ امیر حمزہ کی داستان نہیں سنی تم نے؟

—جی، حضور۔ وہ کہتے ہیں نا......

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

—ٹھیک کہا، میاں۔ ہم کیا کوئی عام انسان ہیں؟ نہ جانے کتنے ہزاروں، لاکھوں برس تک یہ کہکشائیں گردش کرتی رہیں، اس کے بعد جا کر کہیں، خاک کے پردے کو ہٹایا گیا اور انسان کا ظہور ہوا۔ کیا کوئی داستان صرف ایک رستے پر چل سکتی ہے؟

—حضور، اسد جمنا کے کنارے پر بیٹھے تھے۔ سنا ہے انھیں تاج محل کچھ خاص پسند نہیں تھا۔

—کیوں پسند نہیں تھا، میاں؟

— حضور......

— کیا تم جانتے ہو ممتاز محل کی قبر کہاں ہے؟ برہان پور میں۔ وہاں ان کی چھوٹی سی تربت پر کوئی بھی نہیں جاتا۔ تو پھر تاج محل کیوں بنایا؟ یہ سب بادشاہوں کے چونچلے ہیں، میاں۔ اور اگر تم اس کی خوب صورتی کی بات کرتے ہو تو فتح پور سیکری کے آگے تاج محل کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اسی طرح جامع مسجد کو دیکھو، وہ جنت کا پھول معلوم ہوتی ہے۔

— جمنا کے نیلے پانیوں سے ایک درویش نمودار ہُوا۔ عابد میاں نے بڑی بڑی آنکھیں گھما کر کہانی کا سلسلہ پھر سے جوڑا۔

— میاں، کیا تم خواب دیکھتے رہتے ہو؟ جمنا کے نیلے پانیوں سے درویش نمودار ہوا؟

— جی، حضور۔ فقیر اور درویش کہاں ظاہر نہیں ہو سکتے؟

— اچھا، پھر؟

— درویش نے اسد سے پوچھا، تُو کیوں اکیلا گھوما کرتا ہے، اسد؟ کیا تُو پرندہ بننا چاہتا ہے؟

— آپ مجھے پرندہ بنا دیں گے؟ اسد نے حیران ہو کر درویش کی طرف دیکھا۔

— ہاں۔ درویش نے اپنا ہاتھ اسد کے سر پر رکھا— آسمان میں اُڑنا چاہتا ہے نا؟ سُن، میں تجھے ایک پرندے کی کہانی سناتا ہوں۔ ایک سوداگر کے پاس پنجرے میں ایک پرندہ تھا۔ وہ پرندہ اسے بہت محبوب تھا۔ ایک بار اُسے تجارت کی غرض سے ہندوستان جانا تھا۔ کسی وقت وہ اس پرندے کو ہندوستان ہی سے پکڑ کر لایا تھا۔ سوداگر نے رخصت ہونے سے پہلے پنجرے کے پاس آ کر پرندے سے پوچھا، بتاؤ، تمھارے لیے کیا لے کر آؤں؟

— آزادی۔ پرندے نے جواب دیا۔

— آزادی؟ سوداگر ہنس دیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا تجھے رہا کرنا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کچھ اور مانگ۔

— تو پھر، میں جس جنگل میں رہا کرتا تھا، آپ ایک بار وہاں جائیے گا۔ وہاں کے پرندوں کو میرے بارے میں بتائیے گا۔ معلوم کیجیے گا کہ وہ سب کیسے ہیں؟

— ٹھیک ہے، تُو فکر مت کر۔ میں سب احوال معلوم کر کے آؤں گا۔

سوداگر چلا گیا۔ اپنے سارے کام کاج نمٹانے کے بعد اسے یاد آیا کہ اسے پرندے کے رشتے داروں اور دوستوں کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ جنگل میں اسے ایک ایسا ہی پرندہ نظر آیا، جیسا اس کے پنجرے میں تھا۔ سوداگر نے جیسے ہی اپنے پرندے کے بارے میں اس جنگل والے پرندے کو بتایا، جنگل والا پرندہ کسی پتھر کی طرح درخت کی ڈال سے نیچے گر پڑا۔ سوداگر نے سوچا، اتنے عرصے بعد اپنے ہم جنس کی خبر سن کر وہ پرندہ صدمے سے مر گیا ہے۔ سوداگر کو بہت دکھ ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ بے چارہ پرندہ اپنی جان سے گیا۔

سوداگر آخر اپنے گھر لوٹ آیا۔ جب وہ پنجرے کے پاس آیا تو پرندے نے سوال کیا، میرے سارے دوست کیسے ہیں، میاں؟ ان کے بارے میں کچھ بتائیے؟

— کیا بتاؤں؟ تمھاری طرح کے ایک پرندے کو دیکھ کر جیسے ہی میں نے تمھارا حال بتایا، وہ جھپ سے پیڑ پر سے گر کر مر گیا۔

سوداگر کی بات سنتے ہی اس پرندے نے اپنے پروں کو سمیٹا، آنکھیں موندیں اور پنجرے کے فرش پر گر پڑا۔ سوداگر نے اسے انگلی سے کئی بار ٹھوکے دیے، لیکن اس نے جنبش نہیں کی۔ سوداگر نے اسے پنجرے سے باہر نکال لیا اور نرمی سے اس کے پروں کو سہلاتے ہوئے سوچا، اگر میں یہ بات اس پرندے کو نہ بتاتا تو اچھا ہوتا، دوست کی موت کی خبر سن کر یہ یوں صدمے سے نہ مرتا۔ سوداگر نے پرندے کو کھڑکی کی منڈیر پر رکھ دیا۔

یکا یک پرندہ اڑا اور کھڑکی کے باہر کھڑے درخت پر جا بیٹھا۔ سوداگر ششدر رہ گیا۔ وہ دوڑ کر اس درخت کے نیچے گیا اور پرندے کو بلانے لگا۔ پرندے نے اڑان بھرتے ہوئے کہا، 'میرا وہ دوست مرا نہیں تھا، میاں۔ اس نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں دوبارہ کیسے اُڑ سکتا ہوں، اور یہ خبر آپ ہی نے مجھ تک پہنچائی۔ سلام میاں۔'

پرندہ دُور اُڑ گیا۔

— جانتے ہو، اس قصّے کو سننے کے بعد اسد نے اُس درویش سے کیا کہا؟ مرزا غالب نے پوچھا۔

— جی نہیں، حضور۔

— عابد میاں، یہ زندگی کیا ہے؟ میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔ کوئی داستان اسے چھو نہیں

سکتی۔ زندگی بس دھند کے سوا کچھ اور نہیں۔ تو پھر سنو، میں تمھیں اس سے آگے کا قصہ سناتا ہوں۔

— کون سا قصہ، حضور؟

— اسد نے اس درویش سے کہا: اے خضر، مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔

— کہاں؟

— جہاں بھی آپ جا رہے ہیں۔

اپنا ہاتھ اسد کے سر پر رکھ کر وہ درویش کتنی ہی دیر منھ ہی منھ میں کچھ پڑھتے رہے۔ اسد کو کچھ معلوم نہ ہوا وہ کیا پڑھ رہے تھے۔ دریا کے کنارے دھوپ میں بیٹھے ہونے کے باوجود وہ بالکل سرد تھا۔ آخر درویش نے کہا، 'مت جاؤ، اسد۔ تمھارے والد نے تمھیں تلوار نہیں سونپی، تم کبھی تلوار نہ چلا سکو گے، اسد۔ یہ بہت دشوار ہے، ہر وار کے ساتھ تم خود بھی مر جاؤ گے، اسد۔'

— پھر مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔ اسد نے کہا۔

— کہاں؟

— جہاں بھی آپ جا رہے ہیں۔ میں بھی آپ کی طرح درویشی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

— یہ راستہ تمھارے لیے نہیں ہے، اسد۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے جھولے سے ایک آئینہ نکال کر اسد کو دیا۔ آئینے میں اسد کو اپنا چہرہ دھندلا دھندلا دکھائی دیا۔

— پونچھو اسے، آئینے کو اچھی طرح سے صاف کرو۔

اسد آئینے کو پونچھنے لگا۔ درویش جھومتے ہوئے جیسے اپنے ہی نغمے میں کھو گئے۔

— پھر کیا ہوا؟

— اسد آئینے کو رگڑ رگڑ کے صاف کرتا رہا۔ وہ جتنا رگڑتا آئینہ اسی قدر چمکتا جاتا۔ آخر درویش کا نغمہ ختم ہوا۔ وہ بولے: 'ایک بار آئینے میں جھانک کر دیکھو۔'

اسد آئینے کو دیکھ کر چونک اٹھا، آئینے میں تو خود اُسے اپنا آپ دکھائی دینا چاہیے تھا، لیکن آئینے میں وہ نہیں تھا بلکہ اس میں تو اس کی والدہ کے پشمینے جیسا نیلا آسمان دکھائی دے رہا تھا، جس طرح پشمینے کی شال پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، اسی طرح کے نمونے پرندوں نے آسمان میں بنا رکھے تھے۔ ایک بڑے پرندے کے پیچھے چھوٹے چھوٹے ان گنت

پرندے اُڑے جا رہے تھے۔ ان کے الگ الگ رنگوں اور اڑنے کے انداز سے عجیب و غریب نقش و نگار بن گئے تھے۔ اسد نے اپنی نظریں اٹھائیں اور درویش کو دیکھا۔

— درویش نے کہا، اس پرندے کو پہچانتے ہو؟

— نہیں۔

— یہ ہُد ہُد ہے۔ اور یہ جو دوسرے پرندے دیکھ رہے ہو، یہ سب ہُد ہُد کے ساتھ اپنے بادشاہ کی تلاش میں جا رہے ہیں۔

— کون ہے ان کا بادشاہ؟

— سیمرغ۔

— وہ کہاں رہتا ہے۔

— کوہِ قاف پر۔

— سیمرغ کو تلاش کر لینے سے کیا ہوگا؟

— یہ تم بعد میں سمجھو گے۔ جتنا اس آئینے کو صاف کرو گے اتنا ہی صفائی سے تم دیکھ پاؤ گے کہ کیسے پرندے ایک کے بعد ایک وادی کو عبور کرتے جا رہے ہیں۔ انھیں سات وادیاں عبور کرنی ہیں، تب کہیں جا کر سیمرغ دکھائی دے گا، اور تب تک تمھیں مسلسل لکھتے رہنا ہوگا۔

— کیا لکھنا ہوگا؟

— عشق۔ وہ عشق تمھیں کبھی حاصل نہ ہوگا مگر تمھیں اسی عشق کے بارے میں لکھنا ہوگا۔

اور اس کے بعد؟ مرزا غالب کی آنکھیں جیسے کسی ویرانے میں بھٹک رہی تھیں، اور اس ویرانے میں تھیں بس نوکیلی جھاڑیاں، کانٹے اور گھوکھرو۔

۵

گل و آئینہ کیا، خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا اُدھر تیرا ہی رُو تھا

میری کشتی ایک بحرِ بیکراں میں تیرنے لگی، منٹو بھائی۔ جو کبھی دکھائی نہ دے اسی چیز کے پیچھے میری زندگی کی دوڑ شروع ہوگئی۔ بس پھر میرا قلم ہی میرا علم بن گیا۔ آپ جانتے ہیں میرے قلم کس چیز سے بنے ہوتے تھے؟ میرے سارے قلم میرے اجدا کے ٹوٹے ہوئے تیروں سے بنے ہوتے تھے، جس روز میں نے پہلا شعر کہا، مجھے محسوس ہوا جیسے روزِ اوّل سے میں اپنے سینے میں شاعری کے بیج لیے چلا آرہا ہوں۔ شاعری کوشش کرنے سے نہیں ہوتی۔ کیسے، ہوسکتی ہے کیا؟ شاعری خود آپ کے پاس آئے تبھی آپ شعر کہہ سکتے ہیں لیکن وہ کیوں اور کیسے آتی ہے، یہ ہم نہیں جانتے۔ پتا ہے مجھے کیا لگتا ہے، ہزاروں غزلیں لکھنے والا شخص بھی شاعر نہیں کہلا سکتا اور اگر کسی نے محض ایک شعر لکھا ہو، خونِ جگر میں ڈوبی کسی دردناک کراہ جیسا شعر، تو ہم اسے شاعر کہہ سکتے ہیں۔ شاعری مسجد کے منبر پر کھڑے ہوکر وعظ کرنا نہیں ہے۔ موت کے آمنے سامنے، کسی گھاٹی کے کنارے کھڑے ہوکر آخری الفاظ ادا کرنے جیسا عمل ہے۔ منٹو بھائی، میں ہفتوں تک خون آلود کاغذ پر اپنے عشق کا ماجرا لکھتا رہا، میرے ہاتھ شل ہوگئے لیکن میں پھر بھی لکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری غزلیں ایک دن بہت سے لوگوں کو سہارا دیں گی۔ یہ تکبّر نہیں تھا، منٹو بھائی، بلکہ یہ تو میرے زخم تھے — میں تو اپنے زخموں کے بارے میں لکھ رہا تھا، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میری

شاعری لوگوں کے دل کو نہ چھوتی۔

کس طرح جگر سے خون رِستا ہے، یہ میں نے بہت دنوں تک دیکھا تھا۔ اور یہی رِستا ہوا خون دل کے اندر جمتے جمتے پتھر بن گیا، جس کا بوجھ مجھے نیچے کھینچ لایا۔

معلوم ہے میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں کیا کہا تھا؟

شمعِ آخرِ شب ہوں سن سرگزشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

سچ ہے، میں آخرِ شب کا ہی چراغ تھا۔ تصور کیجیے، جب میں پیدا ہوا، ایک سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ کاش میں اکبرِ اعظم کے دور میں پیدا ہوا ہوتا، میں نے یہ خواب کتنی ہی بار دیکھا۔ یا پھر کہیں شہنشاہ جہانگیر یا شاہ جہاں کے زمانے میں ہی جنما ہوتا تو مجھے اپنی زندگی یوں سگ آوارہ کی مانند بسر نہ کرنی پڑتی۔ میرے گناہوں کی پاداش میں ہی خدا نے مجھے ایسے جنم میں دھکیلا جہاں دربارِ عالیہ کے نام پر بس بچے کھچے ٹکڑے ہی رہ گئے تھے۔ اور وہ بہادر شاہ ظفر، جو ایک مصرع بھی موزوں نہ کر پاتا تھا[1] مجھے اس کی خدمت میں ہاتھ باندھے کھڑا رہنا پڑا۔ اس پر کہا جاتا ہے کہ خدا رحیم و کریم ہے۔ شاید میرے لیے اس کی یہی منشاء رہی ہو۔

میں نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا۔ بہت سے لوگ کہتے تھے کہ میں ان سے ملتا ہوں جب ذرا بڑا ہوا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے چہرے کے عکس میں عبداللہ بیگ خاں بہادر کو ڈھونڈا کرتا۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس لڑائی میں مارے گئے تھے۔ امّی جان تو ان کی میت بھی نہ دیکھ سکیں۔ ایک انسان یوں یکا یک غائب ہوگیا، اس کا کوئی نشان تک نہ رہا۔ کسی نے ان کی کوئی تصویر بھی نہ بنا کر رکھی جو ان کی یاد دلا سکتی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے دور میں تو تصویر کشی ہی حرام سمجھی جاتی تھی۔ ورنہ سوچیے، مغل دربار جیسا تصویر خانہ کیا کسی نے دنیا میں دیکھا ہوگا؟ فارسی مصوروں سے بڑھ کر مصور دنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں کیا؟ آپ نے بہزاد کا نام سنا ہے؟ ہزار سال میں بھی اس جیسا فنکار پیدا نہیں ہوتا۔

ہائے میری امّی جان، ان کے لیے بھی ابّا جان کی کوئی تصویر موجود نہیں تھی۔ منٹو بھائی،

[1] یہ بات خلافِ واقعہ ہے، بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہے (مترجم)

امی جان کے بارے میں جانے بغیر آپ میرے بچپن اور جوانی کو نہیں سمجھ سکتے۔ بہت بعد میں جب میں تقریباً بوڑھا ہو چکا تھا، اپنی والدہ کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ ان کی ساری زندگی کا حاصل محض ایک لفظ تھا: انتظار۔ آپ جانتے ہیں نا انتظار کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔ افسردگی سے ٹپکتا ہوا نیلا رنگ۔ انتظار کے علاوہ ان کی زندگی میں تھا ہی کیا؟ نہ اپنا کنبہ، نہ اپنا گھر۔ وہ بس اس انتظار میں رہتیں کہ کب میرے والد گھر لوٹیں۔ وہ دو چار دنوں کے لیے آتے ہوں گے، چند راتیں ان کے ساتھ گزارتے ہوں گے تبھی میں، یوسف اور چھوٹی خانم پیدا ہوئے۔ معلوم نہیں ہم تینوں کے بیچ کوئی اور بھی پیدا ہوا تھا یا نہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیا واقعی عبداللہ بیگ خاں ہمارے والد تھے؟ کہتے ہیں کالے محل کی دیواروں میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ خیر چھوڑیے یہ سب، دلّی اور آگرہ تو رازوں سے بھرے ہوئے شہر تھے۔

میں امی جان کے بارے میں ایک داستان لکھنا چاہتا تھا، منٹو بھائی۔ لیکن داستان لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس طرح وزن ڈھونے والے مزدور کام کرتے ہیں، اسی طرح لکھنا پڑتا ہے۔ مجھ میں وہ طاقت کہاں تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب میں نے غدر کے بارے میں دستنبو لکھ ڈالی، خطوط کے پلندے لکھ مارے تو آخر امی جان کی داستان کیوں نہ لکھ سکا؟ شاید میں لکھ ہی لیتا۔ لیکن کبھی کبھار جب قلم لے کر بیٹھتا تو محسوس ہوتا جیسے کسی تھکن کے اندھیرے نے مجھے لپٹا لیا ہے۔ ایک لفظ بھی نہیں لکھ پاتا تھا میں — میری آنکھیں بھر آتی تھیں، یہی محسوس ہوتا جیسے ہمارا اس جہان میں کبھی کوئی گھر نہیں تھا — جیسے میری والدہ کا کبھی اپنا گھر نہیں تھا۔

آپ کو ایک دن کی بات بتاتا ہوں۔ آدھی رات کو اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کمرے کے کونے میں ایک چوکی پر میرے والد اور امی جان، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے ہیں۔ ان کے قدموں میں ایک خون آلود تلوار رکھی ہے۔ باہر سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں، کسی مسلسل آندھی کی طرح سنائی دے رہی ہیں۔ امی جان نے عبداللہ بیگ کے سینے پر سر رکھا ہوا ہے۔

— تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ ابا جان پوچھ رہے ہیں۔

— آپ کب، کہاں ہوتے ہیں، مجھے علم ہی نہیں ہو پاتا، اس لیے......

— میں بہت دور رہتا ہوں، بی بی۔

— کہاں؟

— جہاں صرف خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ ابا جان کی آواز پر تھکن کی دُھند چھا گئی۔

— آپ پھر کب آئیں گے؟

— معلوم نہیں۔ اگر کبھی میں شہید ہو جاؤں تو میری قبر مت تلاش کرنا۔ میں بس تمھارے دل میں دفن رہوں گا، بی بی۔

— کیا ہمارا کبھی کوئی گھر نہ ہوگا؟

— اگلی بار اگر میں کبھی نہ جانے کے لیے لوٹ کر آسکا تو......

— مجھے کالے محل میں بسر کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ میرا گھر تو نہیں ہے۔ آپ اپنا محل کیوں نہیں بنواتے؟

ابا جان زور سے ہنس پڑے۔ 'میرا محل تو میدانِ جنگ ہے، تم وہاں نہ جاسکوگی۔'

— میں جاؤں گی۔

— کہاں؟

— آپ کے ہمراہ۔ جہاں بھی آپ جائیں گے۔ میرا محل وہیں ہوگا۔ میں نے دیکھا عبداللہ بیگ خاں بہادر نے امی جان کو اور قریب کھینچ لیا۔ وہ جس طرح امی جان کی طرف دیکھ رہے تھے، یوں لگتا تھا جیسے ریگستان پر بادل سے گھر آئے ہوں۔ منٹو بھائی، آپ نے کبھی بارہ ماسے کی تصویریں دیکھی ہیں؟ جس میں سال کے بارہ مہینوں کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ میں نے ایک زمانے میں جانے کیسی کیسی تصویریں اور کتابیں دیکھی تھیں — ہر کتاب ایک تصویر ہی تھی۔ اس کی شروعات اکبرِ اعظم کے دور میں داستانِ امیر حمزہ سے ہوئی۔ اس کتاب کو میر سید علی نے مصوّر کیا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں انھیں ملکِ فارس سے لے کر آئے تھے۔ شہنشاہ کے محل کے کارخانوں میں کتنے ہی خطاط تھے۔ وہ سب ملکِ فارس سے آئے تھے۔ خواجہ عبدالصمد کو شیریں قلم کہا جاتا تھا۔ متعدد باتصویر قلمی نسخے تخلیق کیے گئے — رامائن، مہابھارت، نل دمینتی اور ہاں کیشو داس کی رسک پریا بھی۔ وہ ایک انوکھی کتاب تھی منٹو بھائی۔ 'رسک پریا' میں کیشو داس نے عورتوں کے

متعدد کرداروں کو الگ الگ طرح سے بیان کیا تھا اور مصوّروں نے ان میں سے ہر ایک کی تصویر کشی کی تھی۔ کتنی حسین تھیں وہ سب۔ جیسے چودھویں کے چاند کی روشنی۔ چکور کے بارے میں جانتے ہیں نا آپ؟ وہ چاندنی پر ہی جیتا ہے۔ چاندنی رات میں ان میں سے ایک حسینہ کو دیکھ کر چکور مخمصے میں پڑ جاتا ہے، وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ کس روشنی کی طرف دیکھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے سب کچھ ختم کر ڈالا۔ تصویر کشی اس کے نزدیک حرام تھی۔ مغلیہ کارخانے بند کر دیے گئے۔ مصوّر شاہجہان آباد چھوڑ کر پہاڑی علاقوں کے راجاؤں کے دربار میں چلے گئے۔ دلّی کے تصویر خانے خالی ہو گئے۔ گنے چنے چند ایک جو رہ گئے تھے انھیں نادر شاہ، مرہٹوں اور بعد ازاں گوروں نے دھو پونچھ کر صاف کر دیا۔ جانتے ہیں جب نادر شاہ نے دلّی کو لوٹا تو میر صاحب نے کیا کہا تھا:

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

آپ ہنس رہے ہیں، منو بھائی؟ آپ نے ٹھیک ہی پکڑا۔ میری بھی آپ ہی کی طرح بُری عادت ہے، بات شروع کرتے ہی کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں۔ یاد ہی نہیں رہتا۔ اصل میں جیسے ہی بات شروع ہوتی ہے پتا نہیں کہاں سے یہ سارے لوگ چلے آتے ہیں۔ میں تو تب دنیا میں بھی نہیں آیا تھا جب یہ لوگ تھے۔ میرے اندر یہ کون بولتا ہے۔ مجھے خود بھی تعجب ہوتا ہے، منو بھائی— سچ مچ تعجب— ایک انسان کے اندر کتنے سارے مختلف لوگ چھپے ہوتے ہیں۔ کیا پچھلے جنموں کے لوگ بھی آپ میں ہوتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟ جیسے دماغ پر، کہیں دور سے بہتی آ رہی، دُھند چھا رہی ہو۔

میں آپ کو بارہ ماسہ تصویر کی بات بتا رہا تھا، ہے نا؟ ان تصویروں کی ابتداء پہاڑی ریاستوں میں ہوئی تھی، جس طرح میرے والد میری والدہ کی طرف دیکھ رہے تھے، مجھے وہ تصویریں یاد آ گئیں۔ کبھی کبھی یہ مصوّر اپنی تصویریں بیچنے کی غرض سے نیچے اُتر آتے تھے، شاہ

جہاں آباد میں۔ انھی میں سے کسی ایک کے پاس میں نے بھادوں کے مہینے کی ایک تصویر دیکھی تھی۔ منو بھائی، پہلے آپ کو بھادوں مہینے کا راز بتاتا ہوں۔ اس پیار کے موسم میں کوئی بھی اپنے محبوب سے دور نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ جو لوگ تجارت کی غرض سے بیرونِ شہر ہوتے ہیں، وہ بھی بھادوں میں اپنی بیویوں کے پاس لوٹ آتے ہیں۔ آسمان گھنے بادلوں سے گھرا ہوا ہو، رات بھر سے درختوں کے پتوں سے شبنم برس رہی ہو، انگور کی بیلیں ہوا میں کانپ رہی ہوں، کیسے، کیا ایسے میں آپ اپنے معشوق سے دور رہ پائیں گے؟ جوہی اور چنبیلی کی خوشبو سے شرابور بارش کی بھیگی ہواؤں میں ایک بدن کو دوسرے بدن کی خواہش تو ہوتی ہی ہے۔ اس تصویر میں بجلی کی ایک سنہری لکیر گھنے کالے بادلوں کو چوم رہی تھی۔ پیاسے سارسوں کا جھنڈ بادل کی گہرائیوں میں اُڑا چلا جا رہا تھا۔ ہوا درختوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور ایک مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں دو پیار کرنے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ انھیں دیکھتے، منو بھائی، تو فوراً سمجھ جاتے کہ وہ رادھا اور کرشن ہیں۔ بجلی کی گرج سے رادھا ڈر کر کرشن سے لپٹی ہوئی ہیں۔ برآمدے کی نچلی منڈیر پر بیٹھا مور گھنے اور سیاہ بادلوں کی جانب دیکھ رہا ہے۔ نیچے کھلے آنگن میں ایک عورت بے سدھ سی بیٹھی ہے، جیسے وہ کسی کے انتظار میں ہو۔ شاید وہ عورت میری امّی ہوں۔ امّی، جیسے آسمان پر چھایا گھنا، کالا بادل ہوں اور عبداللہ بیگ خاں جیسے اُس سنہری بجلی کی طرح غیر متوقع طور پر ان کے پاس آ گئے ہوں۔ کتنے لمبے انتظار کے بعد دو لوگ اس طرح ایک دوسرے کو پانا چاہتے ہیں۔ جیسے اذان خدا تک پہنچانا چاہتی ہے۔ عبداللہ بیگ خاں نے اس دن اپنی بیوی کو بہت پیار کیا، وہ ان کے ساتھ ہم بستر تھے۔ میں نے کھلی آنکھوں سے یہ خواب دیکھا، مجھے اس پر ذرا بھی احساسِ گناہ نہ ہوا، منو بھائی، کرشن رادھا سے پیار کر رہے تھے۔ کیا اسے دیکھنا گناہ ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنے والد کو خواب میں بس یہی ایک بار دیکھا۔

مجھے کبھی موقع نہیں ملا کہ میں اپنی ماں کی توجہ حاصل کر پاتا۔ زنان خانے میں انھیں بہت کام رہتے تھے۔ ہم تینوں بہن بھائی اگرچہ ان کے آس پاس ہی ہوتے تھے لیکن انھیں کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ ویسے چھوٹی خانم رات کو ان کے پاس رہتی تھی۔ میں اور یوسف دیوان خانے میں رہا کرتے۔ میں بہت چھوٹی عمر ہی میں سمجھ گیا تھا، منو بھائی، کہ کالا

محل ہمارا گھر نہیں ہے، ہاں ہم یہاں رہتے ضرور ہیں۔ ہمیں وہاں سب سے الگ تھلگ رہنا پڑتا تھا۔ شاید اسی لیے یوسف پاگل ہو گیا تھا۔ چھوٹی خانم بھی زیادہ دن نہ جی سکی، خدا نے سزا دینے کے لیے بس مجھے ہی چنا۔ دوزخ کی آگ میں جلا جلا کر سیاہ کر دیا۔ اُس رحمٰن و رحیم کی مرضی کے خلاف تو انسان جا ہی نہیں سکتا۔ کالے محل کے اسد کے لیے ہی شاید میرؔ صاحب نے کہا تھا ۔

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

منٹو بھائی، دراصل اسد کو دو کھیلوں نے بچا رکھا تھا۔ پتنگ بازی اور شطرنج۔ دونوں ہی کھیلوں میں آپ کو تنہا لڑنا پڑتا ہے، کوئی ساتھ نہیں ہوتا۔ دونوں ہی کھیلوں میں آپ کی آنکھیں مرکز پر مرتکز ہونی چاہئیں — آسمان میں یا کالے سفید خانوں پر، ورنہ آپ ہار جائیں گے۔ کھیل میں تو میں جیتتا رہا، منٹو بھائی، لیکن زندگی میں شکست کے بعد شکست کھائی۔

پتنگ اور کبوتر بازی کے وہ دن اب بھی یاد آتے ہیں۔ میرا تُرک خون جوش مارا کرتا، منٹو بھائی۔ کالے محل میں بند ہو کے رہنا مجھے پسند نہیں تھا۔ اس لیے یا تو میں آگرہ کی گلیوں میں گھومتا رہتا، یا پھر کسی کی چھت پر جا کر پتنگ اُڑایا کرتا۔ کبھی رات گئے تک بنسی دھر کے گھر شطرنج کی بازی پر بیٹھا رہتا۔ کالے محل کے برابر واقع ایک بڑی سی حویلی کی چھت پر ہم پتنگ اُڑایا کرتے تھے۔ یوسف اور کنہیا لال بھی ہوتے تھے اور بھی کئی ہوتے تھے، اب مجھے سب کے نام یاد نہیں۔ میں اکثر راجا بلوان سنگھ کی پتنگ کے ساتھ پیچ لڑایا کرتا۔ اگر کسی دن میں ہار جاتا تو دل میں کہتا، اچھا، کل سہی۔ کل تو بلوان سنگھ کو ضرور ہی ہرا دوں گا۔ میری رگوں میں تُرک خون دوڑ رہا تھا، منٹو بھائی، روز روز بھلا میں ہار سکتا تھا؟ برسوں بعد کنہیا لال دلّی آیا اور ایک مثنوی مجھے دکھائی۔ یہ مثنوی میں نے تب لکھی تھی جب میری عمر بمشکل اٹھارہ یا اُنیس برس رہی ہوگی۔ یہ پتنگ بازی کے اسرار سے متعلق تھی ..

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

شطرنج کی جانب میرا دل پتنگ بازی سے بھی زیادہ کھنچتا تھا۔ جانتے ہیں، کیوں؟ دراصل

شطرنج ایک میدان جنگ کی مانند ہے۔ ہر بار جب میں بنسی دھر کے مہرے کو پیٹتا، مجھے خون کی سی بُو آتی۔ میرے شب و روز اسی طرح کٹ رہے تھے۔ پھر میں چوسر بھی کھیلنے لگا۔ مے خانہ، مشاعرے اور شراب۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی جانے لگا۔ اور کیا کرتا؟ مجھے کالے محل میں لطف نہیں آتا تھا — میں اپنی والدہ کو بھی کبھی کبھار ہی دیکھ پاتا تھا، وہ زنان خانے میں ہوتی تھیں، میرا اپنا اور کوئی نہیں تھا وہاں۔ میں میر اعظم علی کے مدرسے میں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ شیخ معظم مجھے پڑھایا کرتے، لیکن وہ لکھائی پڑھائی مجھے بالکل اچھی نہ لگتی، منٹو بھائی۔ کیسے کیسے حیرت انگیز الفاظ میرے دل کے دروازے پر دستک دیتے تھے، گلیوں میں گھومتے ہوئے میں ان لفظوں کو سجاتا رہتا، کوئی میرے اندر بولتا۔ میں چونک اٹھتا، ارے واہ — یہ تو شعر ہو گیا۔ ہاں منٹو بھائی، میں مرزا غالبؔ بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے محض نو برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد عبدالصمد صاحب دو برس تک کالے محل میں آ کر رہے۔ انھوں نے مجھے فارسی زبان کے حسن اور اسرار سے آشنا کیا۔ اگرچہ میں نے اردو میں بھی غزلیں کہی ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غزل کی حقیقی زبان فارسی ہی ہے۔ اسی طرح مصوری کا مطلب ہے وہ تصویر جو ملک فارس کے مصور نے بنائی ہو۔

— تم روز مکتب جاتے ہو نا؟ ایک دن مجھ سے والدہ نے پوچھ لیا۔

— جی ہاں۔

— خوب دل لگا کر پڑھو، اسد۔ تم یہاں اس محل میں ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔

— جی۔

— تم اپنا گھر بنانا۔ میں، یوسف اور چھوٹی خانم تمھارے پاس رہیں گے۔

منٹو بھائی، آپ تو جانتے ہیں، میرا گھر کبھی نہیں بنا۔ آخر ایک دن امی جان کو آگرہ میں چھوڑ کر میں شاہجہان آباد چلا آیا۔ اسی دوران امراؤ بیگم سے میری شادی ہو گئی اور میں پھر سے اسیر ہو گیا۔ منٹو بھائی، قبر میں لیٹے لیٹے میری اسیری کے بہت سے قصے سنتا ہوں گے آپ کو۔

٦

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

قصے کا رُخ اب ذرا موڑ دیا جائے، دوستو۔ قبروں میں لیٹے ہم دونوں کی بک بک سنتے سنتے آپ لوگ اُکتا گئے ہوں گے۔ اور پھر آپ خوامخواہ ہماری باتیں سنیں بھی کیوں؟ خود آپ لوگوں کی زندگی میں بھی تو کم داستانیں نہ ہوں گی۔ اگر کبھی آپ کچھ سنانا چاہیں تو خدا کی قسم ہم دونوں ہمہ تن گوش ہو کر آپ باتیں سنیں گے۔ چلیے فی الحال آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں جس کا مرزا صاحب یا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔ آپ کو یہ چھوٹا اور ملائم سا قصہ پسند آئے گا۔ اس کا مرزا صاحب کی ہستی سے کوئی تعلق نہیں، جسے مستقل بھاری پتھروں سے تولا جاتا ہے۔ دراصل قصوں کے بیچ تازہ ہوا کا گزر ہونے دینا چاہیے، جو ایسا نہیں کرتے میں انھیں حقیقی قصہ گو نہیں مانتا۔ ایسے قلم کاروں کی کہانیاں پڑھتے ہوئے دم گھٹنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے آپ کو کسی زنداں میں دھکیل دیا ہو، جہاں آپ کو ان کے احکامات بجا لانے ہوں گے۔ خدارا سمجھیے، لفظ پھولوں کی طرح ہیں، اگر آپ ان کے رنگ ہی نہ دیکھ سکیں یا خوشبو نہ سونگھ پائیں تو پھر وہ مردہ حرفوں سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ کیا حافظؔ نے نہیں کہا تھا۔

رونقِ عہدِ شباب است دگر بستان را
می رسد مژدۂ گل بلبلِ خوش الحان را

باغ کے لیے پھر جوانی کے زمانے کی رونق ہے۔ پھول کی خوشخبری خوش الحان بلبل کو پہنچی ہے

بلبل کا نغمہ اگر گلاب تک ہی نہ پہنچے تو پھر صفحے کالے کیوں کیے جائیں؟ زبان میں ایک طرح کا غرور ہوتا ہے، برادران۔

وہ درویش یاد ہے نا؟ جو جمنا کی سطح پر چلتے ہوئے اسد کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مرتبہ شمس الدین تبریز، جلال الدین رومیؔ کی زندگی میں چلے آئے تھے، اور اس کے بعد رومی کلی طور پر ایک اور ہی ہستی میں ڈھل گئے تھے۔ یہ شمس تبریز ایک غیر معمولی شخص تھے، میرے بھائیو۔ انھیں الوہی مجذوبیت حاصل تھی۔ ان کا ایک قصہ نوکِ زباں پر آ گیا ہے، شاید آپ لوگوں کو سنا دینا چاہیے۔ یہ مت سمجھیے گا کہ اس قصے کا مرزا صاحب کی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ میں تو ان کہانیوں کی گنتی بھی نہیں کر سکتا جو مرزا صاحب کی حیات سے وابستہ رہی ہیں۔ جب آپ شمس تبریز کی کہانی سنیں گے، آپ جان پائیں گے کہ مرزا صاحب اس کہانی میں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

عماد الدین کرمانی ایک صوفی شیخ تھے۔ ان کا یقین تھا کہ خدا کو ہم اسی دنیا میں پا سکتے ہیں، اس کی تخلیق کی ہر خوبصورتی میں۔ ایک شب وہ جھیل کے کنارے بیٹھے چاند کے عکس کو دیکھ رہے تھے۔ شمس تبریز نے ان کو وہاں بیٹھے دیکھ کر پوچھا، 'پانی کو کیوں دیکھ رہے ہیں، شیخ؟'

— میں چاند کے عکس کو دیکھ رہا ہوں۔

— لیکن کیوں؟ کیا آپ کی گردن میں کچھ درد ہے؟

— جی نہیں۔

— تو پھر آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ چاند کو دیکھنے کے لیے آسمان کی طرف دیکھیں یا پھر کہیں آپ نابینا ہو گئے ہیں۔ سادہ چیزوں کو سادہ طریقے ہی سے دیکھنا چاہیے۔

شمس تبریز کی بات سن کر شیخ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

— حضور، آپ میرے پیر ہیں۔ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔

'میری شرائط کو پورا کرنے کی طاقت تم میں نہیں۔' شمس تبریز نے جواب دیا۔

—مجھ میں طاقت ہے۔ حضور، مجھے اپنی راہ پر لے چلیے۔

شمس تبریز قہقہہ مار کر ہنس دیے اور بولے، 'تو پھر جا کر شراب لے آؤ، ہم بغداد کے بازار میں بیٹھ کر ایک ساتھ مے نوشی کریں گے۔'

لیکن اسلام میں تو شراب حرام ہے۔ اگر شیخ بازار میں بیٹھ کر مے نوشی کرے گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ اس کی ناموس خاک میں مل جائے گی۔ 'میں بھلا یہ کیسے کر سکتا ہوں، پیرزادے؟' شیخ بڑبڑائے۔

'تم کبھی خود کو موزوں ثابت نہیں کر سکتے۔' شمس تبریز دھاڑے۔ 'اللہ کے دربار میں پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں تم میں۔ میں تو اس انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں جو قادرِ مطلق تک رسائی کر سکے۔'

اور وہ انسان کہیں اور نہیں، جلال الدین رومی میں تھا جسے شمس تبریز نے ان میں پا لیا۔ کبھی کبھی میں دیکھتا ہوں کہ مرزا صاحب جامع مسجد کے سامنے شمس تبریز کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے ہیں اور ان دونوں کے سامنے مولانا روم بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے محبوب شمس تبریز اور مرزا صاحب کے بارے میں ایک نئی مثنوی لکھ رہے ہیں۔ ذرا تصور کیجیے، اگر یہ حقیقت ہوتی تو دنیا کسی جامہ وار کے دوشالے کی طرح حسین ہوتی۔

ارے نہیں، برادران، یوں بے یقینی سے میری جانب مت دیکھیے۔ میں کچھ بھی نہیں بھولا۔ میرا حافظہ بہت تیز ہے۔ دیکھیے میں جس دنیا میں پروان چڑھا، اور اگر آپ غور کریں کہ میں نے دونوں ملکوں کے مہاجروں کے سیلاب کا جو مشاہدہ کیا تو آپ جانیں گے کہ اگر یادوں کی جگمگاہٹ نہ ہوتی تو میں بچ نہ پاتا۔ اتنے مہاجرین— معلوم ہے میں کیا سوچتا ہوں، میرے خیال سے بیسویں صدی کا نام بے گھروں یعنی مہاجرین کی صدی ہونا چاہیے تھا۔ اپنا نام فراموش کر دینے کی صدی، اپنا نام تبدیل کر لینے کی صدی۔ کیا آپ میں سے کسی نے میرا افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' پڑھا ہے؟ اس افسانے کو لکھنے کی پاداش میں مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا کر، لاہور کورٹ میں مجھ پر مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ کیا کہا؟ آپ 'ٹھنڈا گوشت' افسانہ سننا چاہتے ہیں؟ لیکن آج تو میں نے کوئی اور ہی قصہ چھیڑ رکھا ہے۔ 'ٹھنڈے گوشت' کا قصہ کسی اور دن پر اٹھا رکھتے ہیں۔ یوں بھی نہ جانے کب تک ہمیں انھی قبروں میں رہنا ہے— شاید تب تک، جب تک کہ یہ دنیا ختم

نہ ہو جائے۔ تو کسی فرصت کے دن 'ٹھنڈا گوشت' کا قصہ سناؤں گا۔

ہاں تو، امید ہے آپ کو وہ درویش یاد ہوگا جس نے اسد کو آئینہ دیا تھا۔ اسد نے دیکھا کہ آئینے میں اس کی امی کے پشمینے کی شال کے رنگ جیسے نیلے آسماں میں، اڑتے ہوئے پرندوں کا نقش ابھر آیا تھا۔ پرندے اُڑتے چلے جا رہے تھے، اپنے بادشاہ سیمرغ کی تلاش میں۔ یہ بہت گہرا قصہ ہے، برادران، درویش نے جو آئینہ اسد کو دیا، اس میں اس قصے کا عکس کیوں ظاہر ہوا، یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ بھلا ہم خالقِ کائنات کی رضا کیسے جان سکتے ہیں؟ میرے خیال میں یہ جو ہم جان نہیں پاتے اسی سبب سے ہم اتنے لفظ لکھ پاتے ہیں۔ کہانی کا یہی تو مزہ ہے، لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ، کوئی چوتیا نقاد کیا کہہ رہا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کہانی تو کہانی ہے...... وہ خود بخود جیتی ہے اور خود بخود مر جاتی ہے۔

معاف کیجیے گا برادران، باتیں کرتے ہوئے میں لامحالہ کسی بھول بھلیاں میں داخل ہو جاتا ہوں۔ زندگی میں میں نے ہزاروں زندہ اور مردہ لوگوں سے باتیں کی ہیں۔ جب میں بات نہیں کر پاتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، گویا میں کسی پتھر کے نیچے دبا ہوا ہوں۔ عصمت میری بات سن کر ہنسا کرتی تھی۔ عصمت کو جانتے ہیں نا؟ عصمت چغتائی۔ اس کی موجودگی میں مجھ پر گویا باتیں کرنے کا نشہ طاری ہو جاتا تھا۔ عصمت بھی بہت خوبصورت گفتگو کیا کرتی تھی۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں کسی گہری جھیل کی مانند معلوم ہوتی تھیں۔ میں اس جھیل میں ڈوب کر بس باتیں ہی کیا کرتا تھا۔ عصمت بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہتی اور میرا جی چاہتا میں اس کی آنکھوں کو کھا جاؤں۔ ویسے عصمت کو میں نے یہ بات کبھی نہیں بتائی، اگر بتا دیتا تو وہ میرے سر کے بال نوچ لیتی۔

درویش کے دیے ہوئے آئینے میں پرندے اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ یاد ہے نا؟ فرید الدین عطار کا لکھا ہوا قصہ، درویش کے آئینے میں اُبھر آیا تھا۔ کتنی حیرانی کی بات ہے۔ ذرا غور کیجیے، آئینے کے اندر قصہ۔ ہر قصہ خود ایک آئینہ ہے۔ ہے نا؟ میں کبھی نہیں سمجھ پایا، کب آئینہ اور قصہ ایک ہو جاتے ہیں۔ چلیے چھوڑیے۔ لیکن پرندوں کے قصے سے پہلے عطار صاحب کے بارے میں کچھ بتانا چاہیے۔ وہ اللہ کے سفیر تھے۔ ایک صوفیِ کامل۔ لیکن جب قصہ گوئی کی بات آتی تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اگر کسی واحد شخص کے ساتھ ان کا تقابل کیا جا سکتا تھا تو وہ تھے

عبدالرحمٰن جامی۔ عطّار صاحب کی ولادت ملک فارس کے شہر نیشاپور میں ہوئی تھی۔ تقریباً آٹھ سو سال پہلے کی بات ہے۔ ان کا ایک مطب تھا جہاں دواؤں کے ساتھ ساتھ انواع و اقسام کے عطر بھی تیار کیے جاتے تھے۔ ان کا کام خوب چل رہا تھا۔ ایک دن ان کے مطب میں ایک درویش آیا۔ ان کی دکان بہت شاندار تھی۔ وہ منھ پھاڑے دکان میں رکھی اشیا دیکھ رہا تھا، پھر اس نے عطّار صاحب کو بغور دیکھا۔ یوں کوئی کسی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو سامنے والے کو الجھن ہوتی ہی ہے۔ 'حضور! آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟' عطّار صاحب نے پوچھا۔

درویش مسکرایا...... میں سوچ رہا تھا اتنا مال و دولت چھوڑ کر تم قبر میں کیسے جاؤ گے؟

عطّار صاحب نے درشتی سے کہا: 'آپ کی طرح میں بھی ایک دن مر جاؤں گا، اس میں کیا فرق ہوگا؟'

—لیکن میرے پاس تو اس بوسیدہ غزل اور اس کاسے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ تمھارے پاس تو بہت سا مال و دولت ہے، پھر بھلا کیسے تم میری طرح مر سکتے ہو؟

—میں بالکل آپ ہی کی طرح مروں گا۔

معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا، برادران؟ درویش اپنے کاسے کا تکیہ بنا کر وہیں لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور پڑھا: 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' دفعتاً جبرائیل ظاہر ہوئے اور درویش کی روح قبض کر لی۔ عطّار صاحب چھر کا بُت بنے اس حیرت انگیز موت کا نظارا دیکھا کیے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے مطب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور دین کی راہ میں نکل کھڑے ہوئے، جو مالکِ کائنات کا سچا راستہ ہے۔

درویش کے دیے ہوئے آئینے میں اسد نے جن پرندوں کو دیکھا تھا ان کا جنم عطّار صاحب کے قصّے ہی میں ہوا تھا۔ آپ لوگوں نے اتنی دیر تک بہت بکواس برداشت کی ہے، اب وہ قصّہ بھی سن لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے مجھے ایک قصّے سے دوسرے قصّے میں داخل ہو جانا بہت پسند ہے۔ ان قصّوں میں، میں کبھی درویش بن جاتا ہوں، کبھی عطّار صاحب تو کبھی کلّو۔ اور جہاں تک مرزا صاحب کا تعلق ہے، وہ تو میرے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے ان کا یہ شعر ضرور سُن رکھا ہوگا ؎

ہوئی مدّت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

سعادت حسن منٹو اگر مرزا غالب ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ ایک بار یہی بات میں نے اپنی بیگم صفیہ سے پوچھی تھی۔ برادران، جانتے ہیں صفیہ نے کیا کہا؟ 'ساری زندگی آپ کبھی ایک تو کبھی دوسرا کردار بن کر جیتے رہے۔ آپ خود اپنے آپ کو کب ظاہر کریں گے، منٹو صاحب؟ صفیہ یہی جانتی تھی کہ منٹو اپنے مختلف کرداروں کے اندر ہی تو زندہ ہے۔ ان کرداروں کے بغیر منٹو دراصل کوئی نہیں تھا۔ صفیہ نے ایک بار مجھے کہا تھا: 'منٹو صاحب، یہ سب کہانیاں لکھ کر آخر ملا کیا؟ اس کے صلے میں آپ کو کوئی کچھ نہیں دے گا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ آپ کوئی دکان کھول لیں۔'

—اور میں اپنے سر کے اندر کی دکان کا کیا کروں، بیگم؟

—سر کے اندر کی دکان؟

—ساری کہانیوں کی دکان، صفیہ۔ اِس دکان کے بند ہو جانے سے تو منٹو مر جائے گا۔

گستاخی معاف، برادران، باتوں باتوں میں میں پھر بہت دور چلا گیا۔ آپ کی توقع بھری آنکھیں چمک رہی ہیں، مجھے پتا ہے آپ لوگ قصّہ سننے کے لیے بیتاب ہیں۔ لیکن آپ اپنے منٹو بھائی کی خطا بخشیے گا، اتنی یادیں ہیں جو باتیں کرتے ہوئے مجھے پیچھے کی جانب کھینچتی رہتی ہیں۔ میں ان سے بچ نہیں پاتا۔ اگر بچ پاتا تو پاکستان میں مجھے ایک لاوارث کتّے کی موت نہ مرنا پڑتا۔

لیکن اب ذرا اُن پرندوں کی بات ہو جائے۔ اس دنیا کی سب سے معصوم روحوں کی بات۔ آپ جانتے ہیں ہمارے دل بھی پرندے ہیں۔ کبھی قفس میں بند تو کبھی آزادی سے آسمان میں اُڑتے ہوئے۔ میری بڑی خواہش تھی ساری رات کسی چڑیا کو سینے سے لگا کر سونے کی۔ لیکن ان کو تو پکڑنا محال ہے۔ وہ بڑی چنچل ہوتی ہیں، ایک پل بیٹھتی ہیں تو دوسرے ہی پل اُڑ جاتی ہیں۔ ابھی چہک رہی ہیں تو اگلے ہی لمحے اُداس ہو کر کہیں دیکھنے لگیں گی۔ چڑیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ دنیا بس گھومنے کی جگہ ہے، وہ فقط اتنا ہی جانتی ہیں۔ گھومو پھرو، اُڑو اور پھر اچانک کسی دن مر جاؤ۔

ایک دن سارے پرندوں نے مل کر مجلس منعقد کی کہ آخر ان کا کوئی بادشاہ کیوں نہیں ہے؟

انھیں اپنا بادشاہ ڈھونڈنا ہی ہوگا۔ کسی بھی تلاش میں کسی مرشد کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ کون ہوگا اُن کا مرشد؟ سب نے مل کر طے کرلیا کہ ہُد ہُد ہی اُن کا مرشد ہوسکتا ہے۔ ہُد ہُد حضرت سلیمان کا سب سے چہیتا پرندہ تھا۔ وہ شہر سبا سے ملکہ بلقیس کی خبر لایا کرتا تھا۔ اس لیے صرف ہُد ہُد ہی مرشد ہوسکتا ہے۔ وہی انھیں ان کے بادشاہ کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ ہُد ہُد کے سر پر پروں کا تاج تھا اور ہونٹوں پر بسم اللہ۔ ہُد ہُد نے پرندوں سے کہا: 'دیکھو تم لوگ بادشاہ کی تلاش میں جا تو سکتے ہو، لیکن یہ راستہ بہت طویل اور دُشوار ہے۔ اس راستے پر جانے کے لیے اپنی اب تک کی زندگی کو جھاڑ کر صاف کرنا ہوگا، اگر تم اُس ہر ایک کو چھوڑ سکو جس کو تم چاہتے ہو تو میں تبھی تم لوگوں کی رہنمائی کرسکتا ہوں۔'

یہ سُن کر پرندے بکھر گئے۔ ہر پرندہ کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرنے لگا، نہیں نہیں ہم اتنے لمبے سفر پر نہیں جاسکتے۔ سب سے پہلے بلبل نے کہا: 'میں کہیں نہیں جاسکتی۔ میری محبت کا بھید صرف گلاب ہی جانتا ہے۔ میں اس سے دور کیسے جاسکتی ہوں؟ میری زندگی گلاب کو چاہتے ہوئے ہی گزر جائے گی۔ ہُد ہُد نے بلبل سے کہا: 'تم صرف ظاہری حُسن کو دیکھ رہی ہو۔ گلاب ہنستا ضرور ہے لیکن تمھارے لیے نہیں۔ ایسا محض لگتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھتا ہے اور ہنستا ہے اور پھر جھڑ کر ختم ہوجاتا ہے۔ جانتی ہو وہ تمھیں دیکھ کر کیوں ہنستا ہے؟ اس لیے کیونکہ تم یہ بات نہیں جانتیں کہ وہ تھوڑی دیر میں جھڑ کر ختم ہوجائے گا۔'

— لیکن میں گل بہار کو نہیں چھوڑوں گی اور کہیں نہیں جاؤں گی مرشد۔

— تو لو، پھر ایک قصہ سنو۔

ہُد ہُد نے اپنے پروں کو دو چار بار پھڑ پھڑایا اور جم کر بیٹھ گیا۔ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'، اس نے بدبداتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ 'خدا مجھے توفیق دے کہ یہ قصہ میں بلبل کو ٹھیک سے سنا سکوں۔' پھر تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے تیز آواز میں کہا: 'بلبل سنو، اس قصے کو سنو۔ اس کے بعد جو تمھاری مرضی ہو وہ کرنا۔'

— جب گلاب کھلتا ہے تو کوئی قصہ اس کے مماثل نہیں ہوتا، پیر صاحب۔

— بے شک، لیکن پھر بھی سن لو۔ قصہ سننے سے تمھارا پیٹ خراب نہیں ہوجائے گا۔

— اچھی بات ہے۔ تو سنائیے۔ بلبل نے کہا۔

— ایک نواب تھا جس کی ایک لڑکی تھی۔ اس لڑکی کے حُسن کا بیان ممکن نہیں۔ اس کے بال اس آسمان کی طرح سیاہ تھے رات کے وقت جس میں کوئی ستارہ روشن نہ ہو۔ اس کے سارے بدن سے مہک آتی تھی جب وہ بولتی تو اس کی باتیں شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتیں، اور اس کی رنگت؟ اس کے سامنے تو پکھراج کا رنگ بھی پھیکا پڑ جائے۔ سچ تو یہ ہے جو بھی اس دوشیزہ کو دیکھتا اس کے عشق میں گرفتار ہوجاتا۔ لیکن خدا کی رضا تو کوئی نہیں جانتا۔ ایک دن ایک درویش نے اس لڑکی کو دیکھا اور اس پر فدا ہوگیا۔ درویش تب روٹی کھا رہا تھا۔ اس لڑکی کی خوبصورتی کو دیکھ کر اس کے ہاتھ سے لقمہ گر پڑا۔ وہ دوشیزہ یہ دیکھ کر ہنس دی۔ اس ہنسی میں خدا جانے ایسا کیا تھا کہ وہ درویش اپنا دل ہار بیٹھا۔

— اس کے بعد؟

— وہ سات سال تک اس نواب کی حویلی کے باہر پڑا رہا۔ وہ سڑک کے کتے بلیوں کے ساتھ وقت گزارتا۔ اپنے محبوب کو پانے کے لیے وہ درویش سات سال تک روتا رہا۔ ایک دن حویلی کے پہرے داروں نے اُس درویش کو جان سے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔

— کیا اُس کا خون کردیا؟

— یہ جان کر کہ درویش کو مار ڈالا جائے گا، لڑکی کے دل میں بہت رحم آیا۔ ایک دن وہ چھپ کر اس کے پاس آئی اور بولی: 'تم بھی عجیب آدمی ہو۔ میں ایک نواب کی بیٹی ہوں، مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں تم کیسے سوچ سکتے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی مت آنا۔ اگر تم کل تک اور یہاں رہے تو تمھیں مار دیا جائے گا۔'

— پھر درویش نے کیا کہا؟ بلبل نے بیتاب ہوکر اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا۔

— درویش نے کہا: 'جس دن سے میں نے تمھیں دیکھا ہے، میرے لیے زندگی اور موت ایک ہوگئی ہے۔ میں قتل ہونے سے نہیں ڈرتا۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے تمھاری حویلی کے دروازے سے ہٹا نہیں سکتی۔ تمھارے پہرے دار مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں نا؟ تو ایسا ہوجانے دو۔ بس اس سے پہلے تم مجھے ایک پہیلی کا جواب دے دو۔

— کون سی پہیلی؟

— تم میری طرف دیکھ کر ہنسی کیوں تھیں؟

— تم سچ مچ کوئی احمق ہو۔ تمھیں دیکھ کر مجھے رحم آ گیا تھا، مجھے دیکھتے ہی تمھارے ہاتھ سے لقمہ تک گر پڑا تھا، ہنستی نہیں تو اور کیا کرتی؟

— اور اس کے بعد؟ بلبل کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

ہُدہُد نے کہا، 'تمھارا گلاب اُس دوشیزہ کی طرح ہے۔ بس ظاہری طور پر خوبصورت۔'

اسی طرح ہُدہُد پرندوں کو طرح طرح کے قصے سنا کر، ان کے بیان کو ہوا میں اڑاتا رہا۔

تب پرندوں نے پوچھا، 'ہمیں اپنے بادشاہ کے لیے کوئی تحفہ لے جانا چاہیے، مرشد، آپ ہی بتائیے۔ ہمیں جہاں پناہ سیمرغ کے لیے کیا لے جانا چاہیے؟'

— ذکر، روح کا ذکر۔ جہاں پناہ کے دربار میں سب کچھ ہے لیکن وہ اُس روح کو چاہتے ہیں جو بہت سی تکلیفیں جھیل کر آگ میں جل کر، پاک صاف ہو چکی ہو۔

کتنے ہی سالوں تک وہ پرندے ہُدہُد کے پیچھے اُڑتے رہے۔ ایک دو نہیں، سات وادیاں پار کرنا تھیں۔ کتنے ہی پرندے بیچ میں مر گئے۔ کتنوں میں اُڑنے کی طاقت نہ رہی۔ آخر میں تیس پرندے ہی کوہ قاف پر واقع شہنشاہ سیمرغ کے محل میں پہنچ سکے۔ محل کے دربان انھیں کسی طرح اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔ لیکن اتنا طویل سفر طے کر کے وہ پرندے اتنا تھک چکے تھے کہ دربانوں کی گالیوں کا بھی انھوں نے بُرا نہ مانا۔ بس انتظار کرتے رہے۔ آخرکار جہاں پناہ کے خاص خدمت گزار آ کر انھیں دربار میں لے گئے۔ وہ ایک حیران کن واقعہ تھا۔ وہ پرندے جدھر بھی دیکھتے، بس اپنے آپ ہی کو دیکھ پاتے تھے۔ تیسوں پرندے ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تو پھر جہاں پناہ سیمرغ کہاں تھے؟ دوستو! فارسی میں سیمرغ کا مطلب ہے تیس پرندے۔ وہ اب اپنی ہی روح کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے بادشاہ تھے سیمرغ۔ پرندے بے اختیار گانے لگے: تیرے نام سے جی لوں تیرے نام پہ مر جاؤں

۷

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم

ہے خدا جانے یہ کب کی بات

اگرچہ کالے محل کی زندگی میں سونا پن تھا، منو بھائی، مگر تیرہ برس کی عمر تک آگرہ نے جو کچھ مجھے دیا، میں اُسے ساری زندگی نہیں بھول سکا۔ آگرہ کی آب و ہوا میری روح کا حصہ تھی۔ میری یادوں کے جواہرات اب بھی آگرہ کی گلیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ عشق کے جس کھیل نے میرے دل کو چیر ڈالا، اس کا میدان آگرہ ہی تو تھا۔ وہاں کے باغات کے ہر پھول سے غیر آزمودہ پیار ملتا تھا۔ ہر پیڑ کی پتیاں جیسے مجھے پیار کرنا چاہتی تھیں۔ سچ کہوں تو منو بھائی، آگرہ نے میرے اندر ایک نغمہ ابھارا، نیلا آسمان بھر دیا تھا اور اس آسمان میں اکثر ایک فلک آرا پتنگ اڑتی تھی اور اس کی ڈور کو بڑھا دیتی تھی۔ رنگوں کی کیا ہی بہار تھی۔ ایسے رنگ صرف شہنشاہ اکبر کے تصویر خانے کی تصویروں ہی میں دیکھے جا سکتے تھے۔ کون تھی وہ؟ پوری زندگی گزر گئی مگر نہ میں اسے پہچان سکا اور نہ ہی اس تک پہنچ کر اسے پوچھ سکا۔ ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ میں چہار باغ کی روش پر ٹہل رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا ایک بیگم صاحبہ، جو عمر میں مجھ سے بڑی معلوم ہوتی تھیں، باغ میں بیٹھی ہیں۔ شاید حافظ نے انھی کے بارے میں کہا تھا:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اگر وہ شیرازی معشوق ہمارا دل تھام لے تو اس کے سیاہ تل کے عوض میں سمرقند و بخارا بخش دوں

—تم میری طرف دیکھ کر ہنسی کیوں تھیں؟

—تم سچ مچ کوئی احمق ہو۔ تمھیں دیکھ کر مجھے رحم آ گیا تھا، مجھے دیکھتے ہی تمھارے ہاتھ سے لقمہ تک گر پڑا تھا، ہنستی نہیں تو اور کیا کرتی؟

—اور اس کے بعد؟ بلبل کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

ہدہد نے کہا: تمھارا گلاب اُس دوشیزہ کی طرح ہے۔ بس ظاہری طور پر خوبصورت۔

اسی طرح ہدہد پرندوں کو طرح طرح کے قصّے سنا کر، ان کے بیان کو ہوا میں اڑاتا رہا۔

تب پرندوں نے پوچھا: 'ہمیں اپنے بادشاہ کے لیے کوئی تحفہ لے جانا چاہیے، مرشد، آپ ہی بتائیے۔ ہمیں جہاں پناہ سیمرغ کے لیے کیا لے جانا چاہیے؟'

—ذکر، روح کا ذکر۔ جہاں پناہ کے دربار میں سب کچھ ہے لیکن وہ اُس روح کو چاہتے ہیں جو بہت سی تکلیفیں جھیل کر آگ میں جل کر، پاک صاف ہو چکی ہو۔

کتنے ہی سالوں تک وہ پرندے ہدہد کے پیچھے اُڑتے رہے۔ ایک دو نہیں، سات وادیاں پار کرنا تھیں۔ کتنے ہی پرندے بیچ میں مر گئے۔ کتنوں میں اُڑنے کی طاقت نہ رہی۔ آخر میں تیس پرندے ہی کوہ قاف پر واقع شہنشاہ سیمرغ کے محل میں پہنچ سکے۔ محل کے دربان انھیں کسی طرح اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔ لیکن اتنا طویل سفر طے کر کے وہ پرندے اتنا تھک چکے تھے کہ دربانوں کی گالیوں کا بھی انھوں نے بُرا نہ مانا۔ بس انتظار کرتے رہے۔ آخرکار جہاں پناہ کے خاص خدمت گزار آ کر انھیں دربار میں لے گئے۔ وہ ایک حیران کن واقعہ تھا۔ وہ پرندے جدھر بھی دیکھتے، بس اپنے آپ ہی کو دیکھ پاتے تھے۔ تیسوں پرندے ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تو پھر جہاں پناہ سیمرغ کہاں تھے؟ دوستو! فارسی میں سیمرغ کا مطلب ہے 'تیس پرندے' وہ اب اپنی ہی روح کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے بادشاہ تھے سیمرغ۔ پرندے بے اختیار گانے لگے: 'تیرے نام سے جی لوں...... تیرے نام پہ مر جاؤں......'

۷

کہتے ہیں آ گئے تھا بُتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

اگرچہ کالے محل کی زندگی میں سونا پن تھا، منٹو بھائی، مگر تیرہ برس کی عمر تک آگرہ نے جو کچھ مجھے دیا، میں اُسے ساری زندگی نہیں بھول سکا۔ آگرہ کی آب و ہوا میری روح کا حصّہ تھی۔ میری یادوں کے جواہرات اب بھی آگرہ کی گلیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ عشق کے جس کھیل نے میرے دل کو چیر ڈالا، اس کا میدان آگرہ ہی تو تھا۔ وہاں کے باغات کے ہر پھول سے غیر آزمودہ پیار ٹپکتا تھا۔ ہر پیڑ کی پتیاں جیسے مجھے پیار کرنا چاہتی تھیں۔ سچ کہوں تو منٹو بھائی، آگرہ نے میرے اندر ایک نکھرا ہوا، نیلا آسمان بھر دیا تھا اور اس آسمان میں اکثر ایک فلک آرا چمک اٹھتی تھی اور اس کی سج دھج کو بڑھا دیتی تھی۔ رنگوں کی کیا ہی بہار تھی۔ ایسے رنگ صرف شہنشاہ اکبر کے تصویر خانے کی تصویروں ہی میں دیکھے جا سکتے تھے۔ کون تھی وہ؟ پوری زندگی گزر گئی مگر نہ میں اسے پہچان سکا اور نہ ہی اس تک پہنچ کر اُسے چھو سکا۔ ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ میں چہار باغ کی روش پر اکیلا ٹہل رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا ایک بیگم صاحبہ، جو عمر میں مجھ سے بڑی معلوم ہوتی تھیں، باغ میں بیٹھی ہیں۔ شاید حافظؔ نے انھی کے بارے میں کہا تھا۔

اگر آں ترک شیرازی بہ دست آرد دل مارا
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اگر وہ شیرازی معشوق ہمارا دل تھام لے تو اس کے سیاہ تل کے عوض میں سمرقند و بخارا بخش دوں

اُن کی دید نے مجھے مدہوش کر دیا۔ باغ میں جا کر، ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر میں نے انھیں آواز دی، 'فلک آراء۔'

بیگم صاحبہ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ اپنے سر سے دوپٹے کو ہٹا کر انھوں نے اپنے گھنگریالے بالوں کو پھیلا لیا۔ منٹو بھائی، یوں لگا جیسے پیمانہ چھلک گیا ہو، اور شراب کی بوندیں زمین پر آ رہی ہوں۔ آہ، اُن زلفوں کو دیکھ کر میرؔ صاحب کا شعر یاد آ گیا ؎

اُس کے کاکل کی پہیلی کہو تم بوجھے میرؔ
کیا ہے زنجیر نہیں، دام نہیں، مار نہیں

'فلک آراء،' میں نے پھر آواز دی۔

اس بار بیگم صاحبہ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اُن کی مسکراہٹ کو بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ مجھے پھر حافظؔ کا شعر یاد آیا ؎

بادۂ گل رنگ تلخ و عذبِ خوش خوار و سبک
نقلے از لعل نگار و نقلے از یاقوتِ خام

پھول کے رنگ کی شراب، جو کڑوی اور شیریں اور خوش گوار اور ہلکی ہو۔ ایک نُقل محبوب کے ہونٹوں کا اور ایک نُقل جام کے یاقوت کا

— تم کون ہو؟ انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

میں جھجکتے ہوئے آگے بڑھا، وہ بھی آگے بڑھیں۔ میرا ہاتھ تھام کر انھوں نے سرگوشی میں پوچھا، 'فلک آراء کون؟'

اُس حُسن کے اتنے قریب آ کر بھلا میری آواز کیسے نکلتی۔ میں ایک لفظ نہ بول پایا۔ 'کون ہے فلک آراء؟' انھوں نے دوبارہ پوچھا۔

اس بار میں نے ہمت کر کے کہا، 'میں نہیں جانتا۔'

— یہ نام تم نے کہاں سنا؟

— آگرہ کے آسمانوں سے۔

بیگم صاحبہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

— تو گویا یہ نام آگرہ کے آسمانوں پر لکھا ہوا ہے؟

— جی ہاں۔

— کیا تم نے دیکھا ہے۔

— جی ہاں۔

— کب دیکھا؟

— ہر روز۔

— میرؔ صاحب کا وہ شعر سنا ہے؟

— کون سا؟

— ؎

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

سچ کہوں، منٹو بھائی، میرا دل بے قرار ہو اٹھا۔ میں کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا جو پھر سے میرے دل کو توڑ دے۔ اسے ڈھونڈنے کے سوا میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا؟ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا، مجھے ایک گھر چاہیے تھا، لیکن اس تلاش میں، میں ایک کے بعد ایک دوزخ کو پار کرتا چلا گیا۔ وہ راستہ ایک طویل سرد رات تھا، اے رحمٰن و رحیم، میں خاموشی سے چیخا کیا، مجھے بچا لے، اے البشیر، بس ایک بار مجھے خوش نصیبی کی بشارت دے دے۔

معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا، منٹو بھائی؟ میرا ہاتھ تھام کر، چہار باغ میں گھومتے ہوئے، وہ ایک قفس کے سامنے آن کر کھڑی ہو گئیں۔ قفس کے اندر بہت سی مینائیں اُڑ رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے میری طرف دیکھا۔ معلوم ہے وہ کیسی نظر تھی؟ وہ جس نظر کے بارے میں حافظؔ نے کہا ہے ؎

الا اے آہوئے وحشی کجائی
مرا باتست بسیار آشنائی

اے وحشی ہرن تُو کہاں ہے؟ میری تجھ سے بہت آشنائی ہے

اس شعر کو سننے کے بعد اگر کوئی شخص کسی نازنیں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکے، منٹو بھائی، تو میں کہوں گا اسے پتا ہی نہیں کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو صرف آپ اس نازنیں کی قدم بوسی کر سکتے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جی ہاں، منٹو بھائی، میری ایسی ہزاروں خواہشیں تھیں جن پر میرا دم نکلتا تھا۔ ان میں سے کتنی پوری ہوئیں؟ بہت سی — لیکن پھر بھی کم ہی ہوئیں۔ اسی سبب تو ہم زندہ رہتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ ہم انتظار کرتے ہیں، لیکن پھر بھی پیالہ نہیں بھرتا۔ میں ان کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں گانے لگا:

بھرا رہے، بھرا رہے، یادوں کے شہد سے
ہجر کا پیالہ......

میں نہیں جانتا کہاں سے یہ گیت تیرتا ہوا آیا تھا، منٹو بھائی۔ میں نے یہ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ جانے چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ ماضی بعید سے یا مستقبل بعید سے۔ کیا اس لیے کہ ماضی، مستقبل کو تھامے رکھتا ہے اور اسی سبب آسمان اتنا چمکتا ہے؟ لیکن ہماری زندگیاں، وہ تو انگاروں کی طرح جلتی بجھتی رہتی ہیں۔ کیا یوں جلتے بجھتے رہنے میں تکلیف نہیں ہوتی، منٹو بھائی؟

قفس کے اندر مینائیں چہچہا رہی تھیں اور اُڑ رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا، 'ان میں بھی ایک فلک آراء ہے۔ دیکھتی ہوں کیا تم پہچان پاتے ہو؟'

میں نے پرندوں کی طرف دیکھا۔ دفعتاً نہ جانے مجھے کیا ہوا، میں نے انگلی کا اشارہ کیا اور کہا: 'وہ رہی فلک آراء۔'

مینا پنجرے کی سلاخ پر بیٹھی تھی۔

میری طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے بیگم صاحبہ نے کہا: 'کیسے پہچانا تم نے؟ پہلے کبھی دیکھا تھا کیا؟'

— جی نہیں۔

— تو پھر؟

— وہ بہت کانپ رہی ہے۔

— کون؟

— فلک آراء۔

— کیوں؟ بیگم صاحبہ کی گردن پر ایک نیلی رگ ابھر آئی۔

— وہ کسی سے بات کرنا چاہتی ہے۔

— کس سے؟

واقعی، کس سے؟ میں بھلا کیا جانتا تھا منٹو بھائی۔ بیگم صاحبہ نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے یوں تھام لیا جیسے وہ کوئی پیالہ ہو، 'کون ہو تم؟' انھوں نے سرگوشی کی۔

میں انھیں کچھ نہیں بتا پایا منٹو بھائی، بس چپ چاپ وہاں کھڑا رہا، لیکن دل ہی دل میں بولا:

حافظ ایں حال عجب با کہ تواں گفت کہ ما
بلبلا نیم کہ در موسم گل خاموشیم

اے حافظ، یہ عجیب حالت کس سے کہی جا سکتی ہے کہ ہم وہ بلبلیں ہیں جو پھولوں کے موسم میں خاموش ہیں

حافظ نے گویا یہ میرے لیے ہی کہا تھا۔

— تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام بھی فلک آراء ہے؟ بیگم صاحبہ کی آواز یوں محسوس ہوئی جیسے عطر کی شیشی سے لطیف خوشبو نکل کر پھیل گئی ہو۔

— میں نہیں جانتا۔

— کیسے جانا تم نے؟ بتاؤ۔

— بس آپ...... ہی فلک آراء ہیں۔ دوسری کوئی نہیں۔

میرا خواب ٹوٹ گیا، منٹو بھائی۔ یہ سب سچ نہیں تھا۔ محض ایک خواب تھا جو میں نے دیکھا۔ اگر آپ میری زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو میرے خوابوں کے بارے میں بھی جاننا ہوگا، جیسے ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میاں تان سین میرا ہاتھ تھامے، فتح پور سیکری محل کے متعدد کمروں سے گزرتے ہوئے ایک میں داخل ہو رہے

ہیں۔ اُس روز محل پر مینہ برسا اور میں پسینے میں شرابور چیختا ہوا اٹھ بیٹا، 'کلو...... کہاں ہو تم...... کلو بیٹا......'

کلو فوراً حاضر ہو گیا۔ — جی حضور۔

— ترجمان الاشواق۔ میں بڑبڑایا۔

— حضور۔

— ہم ترجمان الاشواق ہیں۔

— جی حضور۔

— بار بار ہمیں حضور کیوں کہتا ہے؟

— کیا درکار ہے آپ کو؟

— صبح صبح کچھ پلائے گا، کلو؟

— شراب۔

— جی، حضور۔ میں مسکرایا۔

کلو نے یک دم میرے پاؤں پکڑ لیے۔ — معاف کیجیے حضور، لیکن...... صبح صبح......

— بس تھوڑی سی کلو۔

— لیکن کیوں؟

— ہمیں خواب دیکھنا ہے۔

— کیسا خواب، حضور؟

— فلک آراء کا۔

— مینا دیکھنا چاہتے ہیں، حضور؟ چلیے میرے ساتھ، کتنی مینائیں دیکھیے گا۔

— میں اپنی فلک آراء کو دیکھنا چاہتا ہوں، کلو۔ تُو نہیں سمجھے گا۔

کون تھی یہ فلک آراء، منو بھائی۔ ایک خواب محض۔ وہ آگرہ کے آسمان پر دکھائی دیتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ میں اُسے، اپنی فلک مینا کو، کبھی نہ پا سکوں گا۔ وہ کہیں کسی قفس میں قید ہی رہ جائے گی۔ میر صاحب نے کہا تھا۔

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

تو پھر بھلا کیونکر میں پنجرے کی سلاخ پر بیٹھی اُس مینا، اُس فلک آراء کو نہ پہچان پاتا؟ جب میں نے آگرہ کے فلک پر اسے مجسم دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں اسے پچھلے کتنے ہی جنموں سے جانتا ہوں۔ اور یہ کلو کہتا ہے مجھے مینا دکھائے گا۔ بھلا بتایئے، منو بھائی، کیا ہر مینا فلک آراء ہو سکتی ہے؟

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ بیگم فلک آراء کہاں سے میرے خواب میں چلی آئیں؟ میں نے ان جیسی خاتون پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے ایسا مشاہدہ شاید ہی کبھی کیا ہو کہ خواتین تو ہمیشہ پردے میں رہتی تھیں، تو پھر یہ بیگم صاحبہ کون تھیں؟

ایک شام میں نے انھیں موتی محل میں دیکھا۔ میں نے انھیں پکارا نہیں۔ بس دُور سے دیکھا کیا۔ وہ اپنی کان کی بالی سے کھیل رہی تھیں، کبھی اسے اتارتیں تو کبھی پہن لیتیں۔ پھر انھوں نے اپنی ناک کی لونگ اُتاری اور اس کی روپہلی چمک کو دیکھنے لگیں۔ دوبارہ پہنی، پھر اتارا اور پھر دیکھنے لگیں۔ کیا کوئی ناک کی لونگ میں چھپا بیٹھا تھا، منو بھائی؟ اگر نہیں تو وہ اسے بار بار کیوں اتار رہی تھیں۔ مجھے بہت اشتیاق ہوا۔ ایسا کیا تھا ناک کی اُس لونگ میں؟ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

'تم پھر آ گئے؟' وہ چونک اٹھیں۔

— بیگم صاحبہ......

— تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟

— آپ کی لونگ......

— کیا ہے اس میں؟

— آپ اسے بار بار کیوں دیکھ رہی تھیں؟

بیگم صاحبہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ — جانتے ہو، کوئی کتنی دیر تک خواب دیکھنا چاہتا ہے؟

— کتنی دیر تک؟

— جنت سے جہنم تک۔

—یہ دونوں تو ایک ہی ہیں، بیگم صاحب۔

—فلک آراہ کہو۔

ان کی آواز نے مجھے دھند میں لپٹا لیا، منٹو بھائی۔

—جی؟

—میرا نام فلک آراہ ہے۔ کیا تم نہیں جانتے؟

بیگم صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میرے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پوچھا، 'تم کیا کرتے ہو؟'

— کچھ نہیں۔

— کیا مطلب؟

— کالے محل کے اندر گھومتا رہتا ہوں اور آگرہ کی گلیوں میں پھرا کرتا ہوں۔

—اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟

—پتنگ بازی کرتا ہوں، شطرنج کھیلتا ہوں، پیتا ہوں......

—اور عورتیں؟

—میں ہنس دیا۔ میں تب تک عورت کا بدن چکھ چکا تھا، منٹو بھائی۔ میں جان چکا تھا کہ وہ کیسا ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک بدن کسی منفرد نقش و نگار والے پشمینے کی مانند تھا۔ آگرہ کی ایک طوائف کے ساتھ میری آشنائی رہ چکی تھی۔ وہ ایک حسنِ لب بام تھی۔ صبح کی مانند شگفتہ اور تر و تازہ۔ کبھی آپ نے پکا ہوا شریفہ دیکھا ہے؟ میں ایسا ہی تھا۔ جس طرح پھل خود بخود ٹپک جاتا ہے، میں بھی اسی طرح ٹپک چکا تھا۔ میں اپنے بدن میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ صاف سن سکتا تھا۔

—جی ہاں۔ میں نے کہا، میرا سر جھک گیا۔

— کیا، جی ہاں؟

—میں برت چکا ہوں۔

یہ ایک داستانِ گل ہے، منٹو بھائی۔ انھوں نے مجھے اپنی چھاتیوں میں کھینچ لیا اور جن کبوتروں کو میں مکانوں کی چھتوں پر دیکھا کرتا تھا، ان کبوتروں سے بھی انوکھے دو کبوتر انھوں نے

مجھے دکھائے۔ میں ان کبوتروں کی چونچوں پر اپنا منھ رگڑتا رہا۔ ان کے پروں کو ہاتھ سے سہلانے میں کتنا لطف تھا۔ کتنا لطف۔ جانتے ہیں تب مجھے کیا خیال آیا، منٹو بھائی؟ یہی کہ یہ دنیا انھیں بس ایک بار پاتی ہے۔ دوبارہ کبھی نہیں......

—پھر کہو، انھوں نے اپنی زبان سے میرے کان کی لو کو چھوتے ہوئے کہا، ایک بار پھر کہو، میاں......

ان کی گردن پر ایک تل تھا، منٹو بھائی، جو ان کے گھنگریالے بالوں کی گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ تل کا مطلب ہے نکتہ — نکتے ہی سے تو تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اس دن اس نکتے کو کھا لیا، اس نے میرے اندر ایک پیاس سی بھر دی جو پھر زندگی بھر نہ بجھ سکی۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی نگار خانے کی کوئی تصویر تھی جس کے بیچ سے میں گزرا تھا۔

کبھی لحظہ بھر کو بھی یہ تصور مت کیجیے گا کہ یہ سب مبنی بر حقیقت ہے، منٹو بھائی۔ اللہ رحم کرے...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری زندگی میں کچھ بھی حقیقت نہیں ہے، ہر چیز ایک کہانی ہے، ایک خواب ہے، ایک داستان۔ میں اس وقت بہت نوعمر تھا۔ بیگم صاحب کے سینے میں چہرہ گڑائے میں بولا، 'مجھے چھوڑ کر مت جائیے۔'

— کیوں؟

—آپ میری جان ہیں۔

—مجھے جان نہ کہو میری جان۔

— کیا کہوں؟

—فلک آراہ۔

جب میں نے آگرہ چھوڑا، منٹو بھائی، ستاروں کی یہ مالا میری زندگی سے کھو گئی۔ فلک آراہ بس ایک نام بن کر رہ گئی۔ ایک قطرہ، ایک نکتۂ آغاز۔ ایک ایسا آغاز جس کے اندر انجام بھی پوشیدہ تھا، منٹو بھائی۔

۸

دو ہفتوں سے تنہم کے گھر جانا نہیں ہوا۔ میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی بھی کام شروع کرتا ہوں پھر اچانک ہی اس میں دلچسپی ختم ہوجاتی ہے۔ میری بیوی اتنا ہی کہا کرتی ہے کہ مجھ میں کسی کام کو تکمیل تک پہنچانے کی قوتِ ارادی ختم ہوچکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، لیکن آخر قوتِ ارادی ہے کیا؟ کیا یہ کسی کام کو تکمیل تک پہنچانے کا تعین کرتا ہے؟ لیکن کیا یہ تعین آخرکار انسان کے کسی کام آتا ہے؟ میں جب اس بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے مہابھارت کے بعد جلتی ہوئی چتاؤں سے بھرے شمشان کی یاد آتی ہے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی انسانی لاشیں اور ان کی باقیات اور گدھ۔ انوساشن پرو[1] کی وہ کہانی بار بار واپس آجاتی ہے۔ یہ ایک گول مدار ہے۔ راج شیکھر باسو کی مہابھارت کھول کر میں پھر سے وہی کہانی پڑھنے لگتا ہوں۔

یدھشٹھر[2] نے کہا، پتامہہ[3]، آپ نے امن کی بات کی ہے، ذات پات کے لیے اپنے بھائیوں کا خون بہانے کا پاپ کرنے پر میرے دل کو شانتی نہیں مل رہی۔ آپ کو یوں تیروں سے گھرا ہوا اور زخمی دیکھ کر مجھے مایوسی ہورہی ہے۔ جو بُرے عمل ہم نے کیے ہیں اس کا پھل اور کیا ہوگا؟ میں دریودھن کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیں اس حالت میں نہیں دیکھ رہے۔ لگتا ہے بنانے والے نے جیسے ہمیں اس گناہ کا ارتکاب کرنے کے لیے ہی بنایا تھا۔ اگر آپ کو ہماری خیرخواہی منظور ہے تو کوئی ایسی ہدایت دیجیے جس سے ہم پرلوک میں اس پاپ سے مکت ہوسکیں۔

1۔ انوساشن پرو: مہابھارت کا ایک حصہ 2۔ یدھشٹھر: پانچ پانڈوں میں سے بڑے کا نام جو کنتی اور پانڈو کا بڑا بیٹا تھا

3۔ پتامہہ: دادا، جد۔ بھیشم جی کا لقب

بھیشم نے جواب دیا: انسان کی آتما، پرماتما کی عمل داری کے تحت ہے۔ تم اسے اپنے عمل کی وجہ، گناہ اور ثواب کا سبب کیوں سمجھتے ہو؟ جو عمل بھی ہم کرتے ہیں وہ ہمارے احساس کو بیان کرنے کے لیے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ میں تم کو قدیم تاریخ سے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ سنو۔

ایک بوڑھی براہمن عورت تھی جس کا نام گوتمی تھا۔ اس کا لڑکا سانپ کاٹنے کے سبب مرگیا۔ ارجنک نامی ایک شکاری نے غصے میں آکر اس سانپ کو جکڑ لیا اور گوتمی کے پاس لاکر کہا، یہ سانپوں میں سب سے اونچا سانپ ہے، یہ تمھارے بیٹے کا قاتل ہے، بولو میں کس طرح اس کی جان لوں، اسے آگ میں پھینک دوں، یا پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں؟ گوتمی نے کہا، ارجنک تم احمق ہو، اس سانپ کو مت مارو، اسے چھوڑ دو۔ اس کی موت سے میرا بیٹا دوبارہ زندہ نہیں ہوگا، اور نہ ہی اسے چھوڑ دینے سے تمھارا کچھ نقصان ہوگا۔ کسی ذی روح کی جان لے کر کوئی جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب کیوں بھگتے؟

شکاری نے کہا، تم نے جو کہا وہ عام صورتِ حال میں کسی انسان کے لیے مناسب ہوسکتا ہے، لیکن کسی غم زدہ انسان کو اس سے تسلی نہیں مل سکتی۔ کچھ لوگ اس طرح کے کاموں کو تقدیر کی مرضی سے منسوب کرکے اپنے دکھ کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انتقام کے حامی لوگوں کو تو اپنے غم سے راحت تبھی ملتی ہے جب وہ اپنے دشمن کو فنا کردیتے ہیں، اور اس سے گریزاں لوگ اپنے بچھڑ جانے والوں کے غم میں بس گریہ و فریاد ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس سانپ کا خاتمہ کرکے تم اس غم سے نجات پاسکتی ہو۔ گوتمی نے کہا، مجھ جیسے لوگ، جو دھرم کی پیروی کرتے ہیں، انھیں غم نہیں ہوتا۔ اس لڑکے کی جان اس لیے گئی کہ یہ اس کی تقدیر تھی اس وجہ سے میں اس سانپ کی جان نہیں لے سکتی۔ براہمن کے لیے غصہ لائقِ توجہ نہیں۔ اس سے محض اذیت حاصل ہوتی ہے۔ تم اس سانپ کو معاف کردو اور اسے جانے دو۔ شکاری بولا، اسے مارنے سے بہت سی زندگیوں کی حفاظت ہوگی، گناہگار کو ختم کردینا ہی مناسب ہے۔

شکاری کے بار بار کہنے پر بھی گوتمی اس سانپ کی جان لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ تبھی اچانک وہ سانپ انسانی آواز میں گویا ہوا اور نرمی کے ساتھ شکاری سے بولا، اے مورکھ ارجنک، اس میں میرا کیا دوش ہے؟ میں خودمختار نہیں ہوں۔ میں نے اس لڑکے کو جان بوجھ کر نہیں ڈسا۔ میں نے تو

یہ موت کے کہنے پر کیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی گناہگار ہے تو وہ موت خود ہے۔ شکاری نے کہا، خواہ تم کسی دوسرے کے تابع تھے لیکن اس خطا کے ذمّے دار تم ہی ہو، اس لیے قتل کے حقدار ہو۔ سانپ نے جواب دیا، صرف میں ہی اس کا ذمّے دار نہیں ہوں، اور بھی کئی وجوہات کی بنا پر ایسا ہوا۔ شکاری نے پھر کہا، تم ہی اس لڑکے کی موت کی اصل وجہ ہو، اس لیے قابلِ گردن زنی ہو۔

جب سانپ اور شکاری یہ بحث کر رہے تھے تب یکا یک موت وہاں نمودار ہوئی اور کہنے لگی، اے سانپ، میں نے تجھے وقت کے کہنے پر بھیجا تھا، لہٰذا تم یا میں اس لڑکے کی موت کے ذمّے دار نہیں۔ اس کائنات کی ہر شے، ساکت و جامد، سورج، چاند اور دیوتا، پانی، ہوا اور آگ سب وقت کے تابع ہیں، اس لیے تم مجھے الزام نہیں دے سکتے۔ سانپ نے جواب دیا، میں آپ کو قصوروار یا بے قصور نہیں کہہ رہا، میں نے آپ کے کہنے پر اس لڑکے کو ڈسا ہے۔ بس میرا اتنا ہی کہنا ہے، گناہ کا تعین کرنا میرا کام نہیں ہے۔ اے شکاری، تم نے موت کی بات سن لی، اب مجھے جانے دو۔ شکاری بولا، ابھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ تم بے قصور ہو، تم اور موت دونوں ہی اس لڑکے کے مرنے کا سبب ہو۔ تُف ہے تم دونوں پر۔

اتنے میں وقت نے خود نمودار ہو کر شکاری سے کہا، میں، موت یا یہ سانپ، کوئی بھی دوشی نہیں ہے، اس لڑکے کا اپنا عمل اس کی موت کا سبب ہے۔ جس طرح ایک کمہار بے جان مٹی سے اپنی مرضی کے مطابق چیزیں ڈھالتا ہے، اسی طرح انسان بھی اپنے اعمال کے نتائج کا تابع ہوتا ہے۔ یہ لڑکا اپنی موت کا ذمّے دار خود ہی ہے۔

گوتمی نے کہا، وقت، سانپ یا موت، کوئی بھی اس بچے کی موت کا ذمّے دار نہیں ہے، اس کی موت اس کے اپنے اعمال کے سبب ہوئی۔ میں نے بھی اپنے اعمال کے سبب ہی اپنے بیٹے کو کھویا ہے، لہٰذا وقت اور موت اب چلے جائیں اور تم اس سانپ کو رہا کر دو۔ یہ سنتے ہی وقت اور موت چلے گئے اور شکاری نے سانپ کو چھوڑ دیا۔ گوتمی کا سوگ ختم ہو گیا۔

بھیشم نے کہانی ختم کی اور کہا، جنگ میں جو قتل ہوئے ہیں ان سب نے وقت کے اثر میں اپنے اعمال کا پھل پایا ہے۔ تمھارے یا دُریودھن کے عمل کے سبب ان کی موت نہیں ہوئی، لہٰذا تم سوگ ترک کر دو۔

میں آج اس بات کو سمجھ سکا ہوں کہ ہمارے سارے اعمال تقدیر کے حکم کے تحت ہوتے ہیں—ایک سانپ جو اپنی ہی دُم کو کھائے جا رہا ہے، اپنے وجود کو مٹا کر اپنا دفاع کرنے کے اس عمل کی کوئی حد نہیں۔ میں تو بس کسی ان دیکھی ہستی کا حکم مان رہا ہوں۔ اگر قوتِ ارادی نام کی کوئی چیز ہے بھی، تو کیا وہ کسی کام آتی ہے؟ ہم ایک کہانی سے دوسری کہانی تک سوکھے ہوئے پتوں کی طرح اڑتے جاتے ہیں۔

اس دوران تبسّم کا ٹیلی فون آ گیا کیا حال ہے جناب؟ اب تو آپ کی خوشبو تک نہیں آتی۔

—ہوں ں...... مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔

— کیا منٹو کا ناول یونہی پڑا رہے گا؟

— کیوں؟

—میں دیکھ رہی ہوں آپ کو ترجمے سے کوئی غرض ہی نہیں۔

— نہیں، نہیں—دوبارہ شروع کرتا ہے۔

— کیا ہوا ہے آپ کو؟

— کچھ نہیں۔

تبسّم کی ہنسی لہراتی ہوئی مجھ تک آئی۔

—آپ اور آپ کا 'کچھ نہیں'۔ کیا ہے یہ 'کچھ نہیں' جو آپ کو قابو کیے رہتا ہے؟ آخر کیا ہے یہ، بتائیں تو؟

— کسی کورے کاغذ کے آگے بیٹھے رہنا۔

—مطلب؟ میں دیکھ سکتا تھا کہ تبسّم کی دونوں آنکھیں ناچ رہی ہیں، اور اس کی آنکھوں کے نیچے کھنچی گہرے سُرمے کی لکیریں بھی ناچ رہی ہیں۔

—ہاں، کورے کاغذ کے آگے ہی بیٹھے رہنا پڑتا ہے، نجانے کب دھیرے دھیرے لفظوں کے نقش ابھر آئیں۔

— کب ابھریں گے وہ لفظ؟

—آپ نے باشو کی شاعری پڑھی ہے؟

— کون باشو؟

— سترھویں صدی کا، ہائیکو لکھنے والا ایک جاپانی شاعر۔ باشو نے لکھا تھا، ہم جنگلی ہنسوں کی طرح بادلوں کے بیچ کھو جائیں گے۔

— جناب، میں آپ کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔ یہ ترجمہ مکمل نہیں ہوگا، یہ تو میں سمجھ سکتی ہوں۔

— کیوں؟

— آپ تو ابھی کورے کاغذ کے آگے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کون جانے کب الفاظ پھوٹیں گے اور نقش ظاہر ہوں گے۔

— کیا آپ مجھے غالب کی وہ غزل سنا سکتی ہیں؟

— کون سی؟

— ارے وہی: ہوں گرمیٔ نشاط......

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

تو کب بنے گا نغموں کے نشے میں چور بلبل کا باغ؟

— جب وہ اسے طلب کرے گی۔

— کون طلب کرے گی؟

— اس بار تو بادِ بہاری جاڑے ہی میں آ پہنچی ہے۔

تبسم ہنس پڑی۔ خیر تو ہے جناب؟ کیا کسی سے پیار ہوگیا ہے؟

—

آ نکلا ہے کبھو ہنستا تو ہے باغ و بہار
اس کی آمد میں ہے ساری فصلِ گل آنے کی طرح

— اوہو! تو کیا آپ میرؔ میں ڈوبے ہوئے ہیں؟

— آپ کو نہیں لگتا اردو غزل میں میر سب سے زیادہ ہوس پیشہ ہیں؟ غالب کے ہاں

ذکاوت کی چمک ہے، جبکہ میر جیسے لہو میں تر اپنا دل آپ کے ہاتھوں میں پکڑا دیتے ہیں۔ غالب کہیں خود کو چھپائے رکھتے ہیں۔ انھیں پردے کے پیچھے کی خوب صورتی مزید اپنی طرف کھینچتی ہے۔

— ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن پردہ داری کا ہنر آپ صرف غالب ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ آپ میر کے سینے پر ہاتھ رکھ سکتے ہیں، آپ اس میں خنجر بھی اُتار سکتے ہیں۔ غالب کہیں دور رکھا ہوا آئینہ ہے، جو محض آپ کے عکس کو قبول کرتا ہے اور تنہا کھڑا رہتا ہے۔ دیکھیے کتنا عجیب ہے یہ آئینہ۔ انسان ہر چیز پر اپنی چھاپ چھوڑ سکتا ہے، لیکن آئینے میں آپ کا عکس تبھی تک رہتا ہے جب تک آپ اس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کھو جاتے ہیں۔ غالب ایسا ہی ایک آئینہ ہیں۔ آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہی آپ پھر کہیں نہیں رہتے۔

— میں نے ایسا نہیں سوچا تھا، تبسم۔

— کیا نہیں سوچا تھا؟ تبسم کی آواز میں جیسے کسی پرندے نے اڑان بھری۔

— میں نے غالب کو آپ کی طرح نہیں سوچا کبھی۔

— ظاہر ہے، آپ اپنے طریقے سے سوچیں گے۔

— نہیں، تبسم، میں اس طرح کی انفرادیت پر یقین نہیں رکھتا۔ سوچو، ہم صوفی حکایتوں، زین کوان یا ایسکیمو کی کہانیوں میں مضمر تصورات اور محسوسات کی طرح کیوں نہیں سوچ سکتے؟ ہم کیوں ویاس دیو یا میرا بائی کی طرح نہیں سوچ سکتے؟ یا جتولکیہ نے کہا تھا، جب آپ ہر چیز سے ماورا ہو جاتے ہیں تو آپ کا انفرادی شعور قائم نہیں رہتا۔

— کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ تبسم کا سوال میرے سر سے ہوا کے پُرسکون جھونکے کی طرح گزرا۔ ایسی ہی ہوا کسی زمانے میں منی ایچر پینٹنگز میں بنے صنوبر کے درختوں پر بہتی تھی۔

— کیوں؟

— کیا آپ کسی بات سے پریشان ہیں؟

— نہیں۔ دراصل ہر روز بہت سے نئے پرانے لوگ آ کر مجھے گھیر لیتے ہیں۔ میں ان کی بات سننا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس وقت بہت کم ہے۔

— کیا مطلب؟

—اچھا چھوڑیے۔ ہم کل سے دوبارہ کام شروع کریں گے۔

—بات مت گھمائیے۔ آپ کے پاس وقت کم ہے، کیا مطلب ہے اس بات کا؟

—تو پھر میں آپ کو ایک نظم سناتا ہوں۔

— کس کی ہے؟

— کسی قدیم ملاح کی۔ سنیے......

میں نے دیکھا—اپنے بے حس محسوسات کے دھندلکے میں

میرا بدن بہتا جاتا ہے، سیاہ پانی کے بہاؤ میں

اپنے احساسات کا جھنڈ سمیٹے، اپنے گوناگوں رنج ساتھ لیے

جنم سے لے کر اب تک کی یادوں کو اکٹھا کیے، کسی نقشین غلاف میں

اپنی بانسری لے کر، دور ہوتے ہوتے، دور جاتے جاتے

کملا جاتا ہے اس کا روپ، مانوس ساحلوں پر

درختوں کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے سایوں میں گھر کے، مکانوں کے بیچ

مدھم پڑ جاتی ہے شام کی پوجا کی آواز

بھڑ جاتے ہیں گھروں کے دروازے رات کے لیے

بجھ جاتی ہیں چراغوں کی لویں، گھاٹ پر بندھ جاتی ہیں کشتیاں

ختم ہو جاتا ہے آخر دریا کا کٹاؤ، گہری ہو جاتی ہے رات

جنگل کی شاخوں پر پرندوں کی خاموش چہچہاہٹ پیش کرتی ہے

خود اپنی قربانی اس عظیم الشان سکوت کے قدموں میں

ایک شاندار جمال سیہ فام اتر آتا ہے تنوع سے بھری دنیا میں

پانی میں، خشکی پر، جسم ڈھل جاتا ہے سایہ بن کر، قطرہ بن کر

لامتناہی تاریکی میں۔ میں ستاروں کی قربان گاہ کے قدموں میں

کھڑا ہو جاتا ہوں، اوپر دیکھتا ہوں، دونوں ہاتھ جوڑتا ہوں

اور کہتا ہوں

اے سورج، واپس لے لیا تو نے اپنی کرنوں کا جال

ظاہر کر اب اپنا نیک نہاد روپ

دکھا وہ آدمی جو مشترک ہے ہم دونوں کے بیچ

— کیا آپ تھکے ہوئے ہیں؟

— نہیں۔ میں بہت خوش ہوں تبسم۔ یہ اپنے آپ کو کھو دینے کی خوشی ہے۔ اس ناول کا ترجمہ کرتے ہوئے میں کسی آثارِ قدیمہ میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں، ململ کے پھٹے چیتھڑوں، کتابوں کے پھٹے ہوئے اوراق اور عطر کی سوکھی شیشیوں میں بدلتا جا رہا ہوں۔ لکھنے کا عمل اسی طرح اپنے آپ کو کھو دینے کا عمل ہی تو ہے۔

اُس آئینے میں ہم، یعنی میں اور تبسم— سعادت حسن منٹو کے مُسوّدے کے آگے بیٹھے تھے۔ اس مسوّدے نے ہمیں ایک گہری الجھن میں ڈال دیا تھا۔ منٹو کے مسوّدے میں غالب اور فلک آراء کی کہانی چھٹے باب میں ہے۔ ساتواں باب منٹو نے نہیں لکھا۔ کچھ نکات لکھنے کے بعد منٹو نے لکھا ہے: 'بعد میں لکھا جائے گا۔ اس باب کو ابھی لکھنے میں مجھے دلچسپی نہیں۔' سچ میں، منٹو کو سمجھنا بہت مشکل ہے، گویا وہ قاری کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے لکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ براہِ راست آٹھویں باب پر جست لگاتے ہیں، جس میں مرزا غالب دلّی پہنچ رہے ہیں۔ لیکن ساتواں باب انھوں نے پھر کبھی نہیں لکھا۔ تو اب ہم کیا کریں؟

—آپ کیا سمجھتے ہیں، آخر ساتواں باب انھوں نے کیوں نہیں لکھا؟ مسوّدے پر جھکی ہوئی تبسم نے سوال کیا۔

—ہوسکتا ہے وہ لکھنے کی حالت میں نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے انھوں نے خوب وہسکی پی رکھی ہو۔ لیکن آخر وہ نکات کیا تھے جو انھوں نے لکھے؟

—مرزا صاحب کی شادی کے بارے میں۔

—پڑھیے تو۔ ذرا سنوں۔

— لکھا ہے: ان کا نکاح ۱۸۲۰ء میں، نواب الٰہی بخش خاں کی دختر امراؤ بیگم کے ساتھ

ہوا۔ تب غالب تیرہ اور امراؤ بیگم گیارہ برس کی تھیں۔[1] الٰہی بخش جھرک اور لوہارو کے نواب احمد بخش کے بھائی تھے۔

—اس کے بعد؟

—الٰہی بخش بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص 'معروف' تھا۔ وہ دلّی کے شرفاء میں سے تھے۔

—اور پھر؟

—اس شادی کو تسلیم کرنے پر مرزا خود کو آمادہ نہ کرپائے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب پھر سے کسی رئیس کے ہاں قید ہوجانے جیسا تھا۔ 'میرے پاؤں میں زنجیر پہنا دی گئی' انھوں نے خود لکھا تھا۔ بیڑیاں اور زنجیریں۔ منٹو صاحب نے لکھا، شادی وادی کے بارے میں پورا ایک باب لکھنے کی کوئی تک نہیں۔ جبکہ وہ اس بارے میں نہایت عمدگی سے لکھ سکتے تھے۔ مسلمان شرفاء کی شادی کا جلسہ۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکیاں، چراغاں، گانا بجانا، طعام اور مشروبات۔ اور منٹو صاحب نے کچھ بھی نہیں لکھا۔

—اور کچھ لکھا ہے؟

—نہیں—ارے ہاں، ایک کہانی لکھی ہوئی ہے۔

—اپنے سسر معروف سے متعلق۔

—پڑھیے۔ سنتے ہیں۔

—بہت دلچسپ کہانی ہے۔ معروف صاحب نے ایک دن مرزا کو اپنے شجرۂ نسب کی ایک نقل تیار کرنے کو کہا۔ مرزا صاحب نے نقل تو تیار کردی، لیکن پہلی نسل کے بعد تیسری نسل درج کردی، اس کے بعد پانچویں۔ انھوں نے دوسری، چوتھی اور چھٹی نسل کو یکسر چھوڑ دیا۔

معروف صاحب نے جب یہ دیکھا تو آگ بگولا ہوگئے۔ 'یہ تم نے کیا کیا ہے مرزا؟' مرزا نے رسان سے کہا، 'شجرہ ایک زینہ ہی تو ہے۔ زینے پر چڑھ کر ہی خدا کے پاس پہنچا جاسکتا ہے۔ اگر زینے کی ایک آدھ سیڑھی چھوٹ بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بس چڑھنے میں ذرا دقت اٹھانا ہوگی، اور کیا!'

---

[1] سن پیدائش ۱۷۹۷ء کے حساب سے غالب ۱۸۱۰ء میں تیرہ برس کی عمر کے تھے۔ (مترجم)

—اس کے بعد؟

—معروف صاحب نے غصے میں آکر اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ مرزا چھپ کر ہنستے رہے۔

—منٹو صاحب نے اور کچھ نہیں لکھا۔

—نہیں۔

—پاگل پن ہے۔ وہ آسانی سے اس باب کو لکھ سکتے تھے۔

—کیوں؟

—نواب کی بیٹی کے ساتھ شادی۔ کتنا اسکوپ تھا بتایئے تو؟ بنگالی ناول نگار تو ایسا موقع جھپٹ لیتے ہیں۔

چار صفحات پر امراؤ بیگم کی خوبصورتی کا بیان، دس صفحے شادی کی رسومات۔ تاریخ سے کھود کھاد کر نکالی ہوئی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بالکل True to lif، آپ سوچ سکتے ہیں قارئین کے لیے مکمل چٹخارا۔ اور منٹو صاحب نے یہ سب چھوڑ دیا۔ وہ اس میں پہلی نظر میں ہوجانے والی محبت کو بھی شامل کرسکتے تھے۔ طویل مکالمے لکھ سکتے تھے، جیسے کہ......

—آپ اس پر واقعی یقین کرتے ہیں؟

—کس پر؟

—اس طرح کی تفصیلات پر؟

—تبسم......

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی ایک نظر میں مجھے ہزاروں اڑتے ہوئے سارسوں کی تصویر دکھائی دی۔ اس پر سے نظر ہٹا کر میں آئینے میں اس کا عکس دیکھنے لگا۔

—ناول کیوں لکھے جاتے ہیں، تبسم؟

—کیوں؟

—اندھیرے میں بہت سی آوازوں کو سننے کے لیے۔

—کن کی آوازیں؟

—ان لوگوں کی جنھیں ہم نہیں جانتے۔

—اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناول نگار اپنے کرداروں کو نہیں جانتا؟

— نہیں۔

—تو پھر منٹو نے مرزا غالب کے بارے میں کیوں لکھا؟

— کیوں کہ وہ مرزا غالب کو نہیں جانتے تھے، اس لیے۔

—ناول لکھ لینے کے بعد جان پائیں گے؟

— نہیں۔

—تو پھر منٹو کا ناول کہاں پہنچے گا؟

— کہیں نہیں۔

—اور مرزا؟

—وہ بھی نہیں رہیں گے۔ بس اک پرچھائیں رہ جائے گی۔

— کس کی؟

بہت سوں کی۔ جو لوگ اب نہیں رہے۔ تبسم، اسی لیے اب میں مزید ناول نہیں لکھ سکتا۔ میں بہت سے بوجھ اٹھا سکتا ہوں، لیکن اس پرچھائیں کو ڈھونڈ نہیں سکتا جو میرے عقب میں ہے۔ چلیے، اگلے باب سے شروع کرتے ہیں۔

—آج رہنے دیجیے۔ چلیے کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔

میں اس آئینے میں تبسم کو دیکھتا ہوں۔ وہ اپنے پیروں پر کسی ماہر رقاصہ کی طرح وزن ڈال کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے دونوں بازو پنکھوں کی طرح پھیل جاتے ہیں— آپ کو کافی پسند ہے نا؟

—ہوں۔

—آج میں آپ کو اسپیشل کافی پلاؤں گی۔

—مرزا کو چھوڑ کر کافی پینے چلے جانا کیا ٹھیک ہوگا۔ ان کے احترام میں کافی کا ارادہ ملتوی کرنا زیادہ مناسب ہے۔ میں مسکرایا۔

— کم از کم میری موجودگی میں تو نہیں جناب۔

میں کبھی ایسی کافی شاپ میں نہیں گیا تھا۔ یہ شہر کی کسی نئی مشاعرہ گاہ جیسی تھی، لیکن یہاں حافظ یہ نہیں کہہ سکتے تھے۔

صبح ست ساقیا قدحے پُر شراب کن
دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن

اے ساقی، صبح ہے شراب سے ایک پیالہ بھر دے، آسمان کی گردش دیر نہیں کرتی ہے، جلدی کر

آپ یہاں بیٹھ سکتے ہیں، یا گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز بھی ہو سکتے ہیں۔ کافی شاپ میں دھیمے سروں میں جون بائیز یا کیلاش کھیر کے گیت بج رہے ہیں، کبھی کوئی بنگالی فلمی گانا بجنے لگتا ہے۔

تبسم نے جس کافی کا آرڈر دیا اس کا نام تھا: بلیک کافی ود دھنی۔ ایک کتھئی سا محلول ایک لمبے سے گلاس میں بھر کر پیش کر دیا گیا۔ پہلا گھونٹ بھرتے ہی محسوس ہوا جیسے منھ میں کسی کومل پنچھی نے اڑان بھری ہو، جس کے پنکھوں پر کیریمل کی خوشبو ہے۔

— کیسی ہے؟ تبسم نے اپنی آنکھوں کو نچاتے ہوئے پوچھا۔

—

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

—ارے واہ، کافی کا ذائقہ ایسا ہے کیا؟

— کیا آپ نے غور کیا، تبسم؟

— کیا؟

—جیسے جیسے کافی ختم ہو رہی ہے، ویسے ویسے گویا امرت کا ساگر سا بڑھ رہا ہے۔

— کیا واقعی؟

—ہوں۔

— کیا مرزا صاحب کو پسند آتی یہ کافی؟

—ہوسکتا ہے مرزا غالب کہتے......

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر وشبِ ماہتاب میں

پر تبسم، آپ مجھے آج اس آبِ حیات کے ذائقے کے پاس کیوں لائیں؟

تبسم دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر کہنے لگی، 'کل سے ہم بچ مچ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے، جناب'

— کیا واقعی؟

—اگلے باب میں غالب دلّی آرہے ہیں۔ یہ ایک بھیانک باب ہے۔ پتا نہیں منٹو صاحب نے کیسے لکھا ہوگا اسے۔ دلّی میں ہی پہلی بار مرزا کی بات چیت مُردوں کے ساتھ ہوئی۔ مُردوں نے انھیں راستہ دکھایا۔ جب میں نے پڑھا تو میں رو پڑی تھی۔ منٹو صاحب بہت شقی القلب ہیں۔

میں منھ میں کیریمل کے ذائقے کے ساتھ کھیلتا رہا۔

۹

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ
ہے پیارے ہنوز دلّی دُور

منٹو بھائی، میں حرماں نصیب روحوں کی آوازیں سنتا سنتا شاہجہاں آباد میں داخل ہوا تھا۔ سب اسے دلّی کہتے تھے لیکن مجھے شاہجہاں آباد کہنا اچھا لگتا تھا۔ بعض ناموں کے ساتھ ایک مخصوص خوشبو لپٹی ہوتی ہے۔ ہے نا؟ جہانگیری عطر جیسی خوشبو۔ لگتا ہے آپ نے اس کے بارے میں نہیں سنا، اور بھی کتنے لوگ جانتے ہوں گے یہ سب۔ شہنشاہ جہانگیر کا دعویٰ تھا کہ عطر کی ایجاد انھی کے دورِ سلطنت میں ہوئی۔ یہ سب بادشاہوں اور ملکاؤں کے خیال ہیں۔ ویسے معلوم ہے کس نے اس عطر کو بنایا تھا؟ ملکہ نور جہاں کی ماں عصمت بیگم نے۔ جہانگیر کو اس بات کا قلق تھا کہ اس کے والد شہنشاہ اکبر، جہانگیری عطر کی خوشبو سونگھے بغیر ملکِ عدم روانہ ہو گئے۔ منٹو بھائی، شہنشاہ اکبر تو گویا بابِ جنت تھے۔ اس بات میں کتنی حقیقت ہے، یہ میں نہیں جانتا، لیکن دلّی کے خاص الخاص لوگوں سے سنا تھا، جب عصمت بیگم عرقِ گلاب کشید کیا کرتی تھیں، تو پانی کے اُوپر جھاگ جم جایا کرتا تھا، اس جھاگ کو عطر دان میں وقفے وقفے سے، قطرہ قطرہ کر کے جمع کر لیا جاتا تھا۔ یوں بنتا تھا عطرِ جہانگیری۔ کہتے ہیں کہ اس عطر کی محض ایک بوند ہزاروں کے مجمعے میں پورا ایک گلستان کھلا دیتی تھی۔ اس کی خوشبو ایسی تھی کہ کھوئی ہوئی روحیں بھی اس پر کھنچی چلی آتی تھیں۔

میں بھی کسی بھٹکی روح کی طرح دلّی چلا آیا تھا۔ یا پھر کسی خواب کی طرح— کیا لگتا ہے

آپ کو، بتایئے؟ میری زندگی ایک خواب ہی تو تھی، اگرچہ میں گوشت پوست کا انسان تھا۔ ایسا نہیں تھا کیا؟ میں خدا کا خواب تھا — ایک خوابِ بد۔ آپ کو معلوم ہے خدا نے ایسا بُرا خواب کیوں دیکھا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ میں اس دنیا میں شاعری لے کر آؤں گا۔ اور اس شاعری کے ذریعے آپ میں سے ہر ایک آئینوں کے درمیان سے گزرے گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کی حقیقت کس طرح تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ میرا وجود خاک کی طرح آئینہ محل کے فرش پر بکھرا رہے گا، وہی خاک جس سے خدا نے پہلے انسان کو بنایا تھا۔

ہم ایک موضوع سے کیسے دوسرے موضوع پر آ جاتے ہیں! میں آپ کو شاہجہاں آباد اپنی آمد کے بارے میں بتا رہا تھا نا؟ ہاں یہی تو بتا رہا تھا ورنہ خوشبو کی بات کیسے نکلتی؟ لفظوں کی دنیا بڑی دلچسپ ہے۔ میں کہہ رہا تھا نا حرماں نصیب روحوں کی آوازیں سنتا سنتا میں شاہجہاں آباد آیا؟ وہیں تو خوشبو کا ذکر نکل آیا۔ روحیں خوشبو ہی ہوتی ہیں، لیکن یہ خوشبو آپ کسی مغل شہنشاہ کے خوشبو خانے میں نہیں پا سکتے۔ یہ خدا کی بنائی ہوئی خوشبوئیں ہیں۔ خالق نے ہر روح کو ایک الگ خوشبو عطا کی ہے۔ ان میں سے بعض ایسی ہوتی ہیں جو دنیا کی خوشبو سے ملتی جلتی ہیں، اسی لیے وہ جنت اور دنیا، دونوں جگہ پائی جاتی ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے، منو بھائی۔ شاہجہاں آباد آمد کی بات کرتے ہوئے مجھے کیوں بار بار آگرہ کے دنوں کی یاد آ رہی ہے؟ میر صاحب نے برسوں پہلے کہا تھا۔

وصیت میرؔ نے مجھ کو یہی کی

کہ سب کچھ ہونا، تُو عاشق نہ ہونا

جب عشق کی بات نکل ہی آئی ہے اور جب خود میر صاحب نے بھی کہہ دیا کہ جو جی چاہے بن جانا مگر عاشق ہرگز نہ بننا تو کیوں نہ میر صاحب کی دیوانگی ہی کی بات کی جائے۔ ہو سکتا ہے پھر میں بھول جاؤں اور کبھی یہ کہانی سنانے کا موقع ہی نہ ملے، اس لیے گستاخی معاف، میں اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر میر صاحبؔ کے درد کی بات کہہ ڈالتا ہوں۔ کیوں نہ اس بات چیت کو یونہی آگے بڑھنے دیا جائے، اے میرے دوزخ کے عزیز ساتھیو، کبھی آگے بڑھتے ہوئے — کبھی پلٹ کر واپس جاتے ہوئے تو کبھی راستہ کھو کر، جس طرح ایک لہر کے بعد دوسری لہر آ جاتی ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔ کیا ہوا، آپ سب اٹھ کر کیوں بیٹھ گئے؟ آپ لوگوں کے چہرے پہ سایہ سا کیوں اُتر

آیا؟ کیا ہوا، منو بھائی؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟ غلطیاں کرتے ہی تو میری ساری زندگی کٹی ہے۔ امراؤ بیگم نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا: آپ کون ہیں، مرزا صاحب؟

— کیا مطلب؟

— آپ کون ہیں؟

میں زور سے ہنس پڑا — ایک نقطہ، بیگم، میں محض ایک نقطہ ہوں۔

— نقطہ؟

کوئی نہیں کہہ سکتا منو بھائی کہ ایک نقطہ کب اور کہاں ظاہر ہوگا، یا کب اور کس رُخ پر اس نقطے سے لکیر کھینچی جائے گی۔ پر آپ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ اچھا، مجھے ذرا سوچنے کی مہلت دیجیے۔ میں اس پر دوبارہ غور کرتا ہوں، مجھے ضرور پتا چل جائے گا کہ میں نے کہاں غلطی کی ہے۔ مجھے ذرا سی مہلت دیجیے۔

ہاں، مجھے شاہجہاں آباد آمد کی بات پہلے بتانا چاہیے تھی۔ وہ سب ابھی ابھی مجھ سے بات کر کے گئی ہیں، وہ روحیں، دِلّی آتے ہوئے جن کی آوازیں میں نے سنی تھیں۔ انھوں نے کہا ہے احمق کہیں کے، اگر تم نے پہلے ہماری بات نہ بتائی تو تمھاری بات کوئی نہیں سنے گا۔

— کیوں؟

— زمین کی گہرائیوں کی بات ہی تو لوگ پہلے سننا چاہتے ہیں، اور یہ ہم ہی تو ہیں جو زمین کی گہرائیوں میں محوِ استراحت ہیں......

— تم لوگ کہاں محوِ استراحت ہو؟

— دِلّی کی خاک کے نیچے۔ پہلے ہماری بات بتاؤ۔ یہ شہر ہمارے ہی خاک و خون پہ کھڑا ہے۔ میر صاحب کو کون نہیں جانتا، لیکن ہم تو بے نام ہیں، اگر ہمارے بارے میں تم نہیں بتاؤ گے تو کون بتائے گا؟ تم جس دن شاہجہاں آباد آئے تھے، اس دن کس نے تم سے بات کی تھی؟ تمھیں کون پہچانتا تھا، اسد؟ وہ ہم ہی تو تھے جنھوں نے تم سے بات کی تھی۔

اب میں ان کے بارے میں بتاؤں گا، آپ لوگ ذہن کو حاضر رکھ کر، غور سے سنیے گا۔ یہ ایک شہرِ افسوس کا قصہ ہے۔ اس کا جنم دکھ میں ہوا اور دکھ ہی میں اس کی موت ہوگئی۔ اس موت کو

میں نے دیکھا ہے، منٹو بھائی۔ جو کچھ میں نے دیکھا، میں اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات آپ کو بتاؤں گا۔ مجھے بتانا ہی ہوں گی۔ یہ شہر میرا جسم تھا۔ میں ہرگز مبالغہ نہیں کر رہا۔ چاندنی چوک میری ریڑھ کی ہڈی تھی اور قلعۂ معلّی یہ میرا بدوضع کاسۂ سر۔ اور میرا دل؟ وہ تو جامع مسجد تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قلعۂ معلّی کا رُخ مغرب کی طرف، یعنی مکّے کی جانب تھا۔ چاندنی چوک بھی مغرب کی سمت تھا اسی طرح جامع مسجد کا رُخ بھی مغرب ہی کی سمت تھا۔ شہر کے داخلی دروازے ساری دنیا کی خوبصورتی سمیٹے ہوئے تھے۔ چاروں جانب کے داخلی دروازے دراصل جنت کے چار دروازے تھے۔ جامع مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ہی پہلی بار میں نے خواجہ معین الدین چشتی کے قصے سنے تھے۔ معلوم ہے خواجہ نے کیا کہا تھا؟ 'یہ آئینے میں کس کا جمال ہے؟ یہ کس حسن نے میری روح کے آئینے میں خود کو قید کر لیا ہے؟ کس نے اس کائنات کو سجایا ہے؟ ہر ایک جوہر میں یہ کون جھلکتا ہے؟ کون بھر دیتا ہے ریت کے ذروں کو روشنی سے؟ مجھے گوشت پوست دکھائی دیتا ہے، لیکن مغز میں کون چھپا ہے؟ کون نغمہ سرا ہے روح کی آسودگی کے لیے؟ وہ خود کو ہی دیکھتا ہے، خود سے ہی پیار کرتا ہے۔ کون ہے وہ؟ وہ کون ہے؟' وہ غریب نواز ہیں۔ بھوکے انسانوں کے دوست۔

جس دن میں شاہجہاں آباد پہنچا، وہ لوگ میرے پاس آئے، جن لوگوں کے بارے میں تاریخ میں رقم نہیں کیا جاتا، منٹو بھائی۔ شاہجہان آباد کو تعمیر کرنے کے لیے انھیں زندہ ہی دفنا دیا گیا تھا۔ تو پھر میں شروع سے یہ قصہ سناتا ہوں اگرچہ میں نہیں جانتا کہ اس کا آغاز کہاں سے ہے اور انجام کہاں پر۔ جانتے ہیں، میں وہ بوڑھا درخت ہوں جو ہزاروں سال سے زندہ ہے، جس کے تنے پر کوئی کلہاڑی سے وار بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ درخت اب کسی کے کام کا نہیں۔ کھڑا ہے تو بس کھڑا ہی ہے۔ مجھے لگتا ہے دراصل میرا سر اس کی جڑوں میں ہے جو آسمان کو چیرتی ہوئی جانے کہاں چلی جا رہی ہیں، نہیں، نہیں، جنت کی جانب تو بالکل نہیں، اور میرے پاؤں جہنم کی آگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پھر بھی میں خدا سے کہتا ہوں ۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، آپ تو جانتے ہی ہیں شاہجہاں آباد سے پہلے مغلوں کا دارالخلافہ

اکبرآباد یعنی آگرہ تھا۔ شہنشاہ اکبر سن ۱۵۵۸ء میں آگرہ میں آئے تھے۔ کیا آپ کو تاریخ کی باتیں لطف دیں گی؟ اس کے لیے تو بے شمار تاریخ کی کتابیں موجود ہیں۔ بادشاہ بہادر شاہ نے مجھے مغلوں کی تاریخ لکھنے کا کام تفویض کیا تھا، پہلی جلد کے بعد میں مزید نہیں لکھ سکا۔ میں قصے سن سن کر پروان چڑھا تھا، منٹو بھائی۔ کیا تاریخ مجھے ممکنہ طور پر جنت کی راہ دکھا سکتی تھی؟ اس کے برعکس، ہم تو ۱۸۵۷ء سے تاریخ کے دوزخ کی آگ میں جل جل کر خاک ہو چکے ہیں۔

پھر بھی، آگرہ کے بارے میں مجھے ایک آدھ بات تو آپ کو بتانی ہی چاہیے۔ میرے اوّلیں عشق کی داستان اس شہر کی دھول میں ملی ہوئی ہے۔ جمنا کی لہریں مجھ سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ میں چہار باغ اور موتی محل میں گھوما کرتا تھا۔ ظفر خان کے مقبرے کے پاس ہی بلند باغ واقع تھا۔ وہ ایک غیر معمولی باغ تھا۔ سچ کہوں تو منٹو بھائی، آگرہ باغات ہی کا شہر تھا۔ وہاں لاتعداد قہوہ خانے اور سرائیں تھیں۔ ایک سرائے تاج محل کے بالکل پاس تھی، جس کا نام تاج مقام تھا۔ یہی جگہ تھی جہاں ہم روز اکٹھے ہوتے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ تاج مقام ہم لوگوں کا قصہ خوانی باغ تھا۔ ایک شخص کوئی کہانی سنا رہا ہوتا تو دوسرا کوئی اور کہانی، ہماری ہنسی اور قہقہے آسمان پر بکھری ہوئی پتنگوں کی طرح چھا جاتے۔ میں نے میر سودا کا قصہ پہلی بار وہیں سنا تھا۔ سودا کو میں نے کبھی بڑا شاعر نہیں مانا لیکن اگر قصیدہ گوئی کی بات کی جائے تو ان کی مہارت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ سودا ایک بڑے مزے کی بات کہا کرتے تھے، ظاہر ہے میں نے یہ سب لوگوں کے منھ سے ہی سنا ہے، میں نے تو انھیں دیکھا نہیں، وہ کہتے تھے: 'یہ ٹھیک ہے کہ میں کسی باغ کا پھول نہیں، لیکن میں کسی کی راہ کا کانٹا بھی تو نہیں۔' سودا نے میر حسن کے والد میر زاہد سے متعلق یہ مزے دار قصہ لکھا تھا۔ میر زاہد کو اگر کھانے کو کچھ مل جائے تو پھر انھیں اور کچھ نہیں چاہیے ہوتا تھا۔ کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے انھیں کھانے کی اشتہا نہ ہوتی ہو۔ آپ یہ قصہ سن کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں گے، منٹو بھائی۔ ایک دن میر زاہد منھ پھاڑے اپنی بیگم کی انگیا کو دیکھے جا رہے تھے۔ انگیا سمجھتے ہیں نا؟ سینہ بند۔ جس سے عورتیں اپنا سینہ ڈھکا کرتی ہیں۔ بیگم حیران و پریشان تھیں، یہ کیا بے ہودگی ہے، آخر ان کا شوہر یوں بے شرمی سے ان کی انگیا کو کیوں گھور رہا ہے؟

شرمندگی کے ساتھ انھوں نے پوچھا: کوئی غلطی ہوگئی، صاحب؟'

— نہیں۔

— تو پھر آپ کیوں......

— دیکھ رہا ہوں، بیگم۔

— کیا؟

— انگیا کے اندر کیا ہے، بیگم؟

— کیا ہوگا، صاحب؟

— میر زاہد لپک کر بیگم کی دونوں چھاتیاں دباتے ہوئے چلائے، روٹیاں ہیں، بیگم، روٹیاں ہیں یہاں، مخمل کی طرح نرم۔

— اوئی اللہ، بیگم اُچھل پڑیں اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔ کبھی وہ بیگم کے زیرجامے میں ہاتھ ڈال دیتے اور پوچھتے، یہ کیا ہے، بیگم؟ اتنا نرم پھر بھی اتنا گرم۔ یہ تو توے کی سکی روٹی ہے، بیگم۔ مجھ سے کیوں چھپا رکھی ہے؟ مجھے دو، بیگم — اس روٹی کا ذائقہ ہی الگ ہے۔' ہاہاہا۔ ذرا سوچ کر دیکھیے منٹو بھائی کہ سرائیوں میں کیسی کیسی باتیں ہوتی تھیں۔ لاتعداد جانے انجانے لوگ ہر روز آتے جاتے رہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے اس زمانے میں اکبرآباد کی آبادی لندن شہر سے بھی زیادہ تھی۔ ایسا تھا اکبرآباد، رنگین دھاگوں سے بُنی ہوئی کسی تصویر جیسا — نہیں، بلکہ وہ تو کسی نگارخانے جیسا تھا، جہاں خدا نے اپنے موقلم سے ہمیں مصوّر کر دیا تھا۔ حافظ کا وہ شعر یاد آتا ہے، منٹو بھائی ؂

روزِ وصلِ دوستداراں یاد باد
یاد باد آں روزگاراں یاد باد

دوستوں کے وصل کا دن یاد رہے۔ یاد رہے وہ زمانہ یاد رہے

سن ۱۶۳۷ء میں شہنشاہ شاہجہاں دلّی چلے گئے۔ آگرہ کا تصویر خانہ ڈھے گیا۔ جیسا کہ میر صاحب نے کہا تھا ؂

بوئے گل یا نوائے بلبل تھی
عمر افسوس کیا شتاب گئی

پھر شروع ہوا شاہجہاں آباد کی تعمیر کا کام۔ شہنشاہ نے آگرہ اور لاہور کے درمیان، دارالسلطنت قائم کرنے کے لیے، کسی جگہ کا تعین کرنے کو کہا۔ دریائے جمنا کے کنارے، ایک جگہ مقرر کی گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ شہر کا زائچہ تیار کیا گیا تھا؟ نجومیوں نے سعد دن اور وقت طے کیا تھا۔ ۱۲ مئی ۱۶۳۹ء کو شہر کی تعمیر شروع ہوئی۔ جو قصہ میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں، منٹو بھائی، وہ اس شروعات سے پہلے کی شروعات کا قصہ ہے۔ کیسے ایک شہر بتدریج مُردوں کی بنیاد پر ایستادہ ہوگیا۔ وہی مُردے جن کی روحوں نے اس رات مجھے گھیر لیا تھا۔

دلّی پہنچ کر میں قلعۂ معلّی کے سامنے کھڑا تھا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا، قلعہ کسی بڑے سے بھوت کی طرح لگ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ ان دیکھے سائے مجھے چاروں جانب سے گھیرے چلے آتے ہیں۔ ان کی سانسوں میں سڑے ہوئے گوشت کی بدبو تھی۔

— اسد، کسی نے مجھے پکارا۔

میں نے اردگرد دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں تو حال ہی میں دلّی میں آیا تھا پھر بھلا مجھے یہاں کون جانتا ہوگا؟

— کون ہیں آپ؟ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

— قطب۔

— میں تو آپ کو نہیں جانتا۔ کہاں ہیں آپ؟ میں آپ کو دیکھ کیوں نہیں پا رہا؟

— ہم لوگ دکھائی نہیں دیتے، اسد۔

— کیوں؟

— انھوں نے ہمیں مٹا ڈالا ہے۔

— کس نے؟

— جنھوں نے شاہجہاں آباد تعمیر کیا ہے۔ وہ چُن چُن کر ہم لوگوں کو پکڑ لے گئے تھے۔

— پھر؟

—انھوں نے ہم سب کو مار کر دفنا دیا۔ اسی مٹی پر تو آج ایستادہ ہے شاہجہاں آباد۔

—آپ لوگوں کو کیوں مار ڈالا گیا؟

—میں انھیں اپنی زمین کا ایک چپّہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے مجھے راستے سے ہٹا دیا۔ شہنشاہ کے خلاف اس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہوسکتا، انھوں نے کہا۔ انھوں نے مجھے سنگین مجرم قرار دے کر ایک مدت تک کے لیے اندھیرے زندان میں قید کر دیا۔

—اسد بھائی......

—تم کون ہو؟

—میں یوسف ہوں۔

—تم نے کیا کیا تھا؟

—صرف آنکھ اُٹھا کر انھیں دیکھا تھا۔

—کس کو؟

—میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ وہ حویلی کے جھروکے میں کھڑی تھیں۔ میں نے صرف نقاب کے اندر سے جھانکتی ان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ معلوم ہے وہ دو آنکھیں کیسی تھیں، اسد بھائی؟ جیسے بلبل کا جوڑا۔ میں اس جوڑے کو دیکھنے روز حویلی کے سامنے جاتا، لیکن وہ پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔ اس کے باوجود انھوں نے مجھے زنجیروں سے جکڑ کر اندھیری کوٹھڑی میں قید کر دیا۔ اس کے بعد ایک دن......

—تم بھی اپنی قبر میں پہنچ گئے، یوسف؟

—جی۔

—کسی نے احتجاج نہیں کیا؟

—کوئی کیا کہتا؟ محبت حرام ہے، محبت دوزخ ہے۔ کوئی ایک لفظ بھی کہہ سکتا ہے، اسد بھائی۔ ہماری زندگیوں میں محبت ہے ہی کہاں؟

—میں بس گلیوں میں گھومتا رہتا تھا۔

—تم کون ہو؟

—حسن۔ معلوم ہے میں کیوں گھومتا رہتا تھا؟

—کیوں؟

—خاک کی تلاش میں۔

—خاک؟ کیوں؟ کیسی خاک؟

—جس خاک سے اللہ نے آدم کو بنایا تھا۔ اس خاک کو کسی نہ کسی کو تو ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے نا؟

—اس لیے وہ تمھیں پکڑ کر لے گئے تھے؟

—انھوں نے کہا، تم خاک کی تلاش میں ہو؟ تم خاک سے آدم بناؤ گے؟ تم خدا بننا چاہتے ہو؟ ملّاؤں نے میرا لباس چاک کر دیا۔ سنگ زنی کر کے مجھے مار ڈالا۔ میں نے انھیں کچھ نہیں کہا، اسد بھائی۔ میں بس سینہ تان کر کھڑا رہا۔ مارو۔ کتنا مارو گے تم لوگ، نوچ ڈالو میری آنکھیں، لے جاؤ کاٹ کر میرے جسم سے میرا گوشت، میں تو بہشت میں بھی خاک ہی تلاش کروں گا، تب تم میرا کیا کر لو گے؟ میں نے چیخ چیخ کر اُن سے کہا، مارو جتنا مار سکتے ہو، جتنی سنگ زنی کر سکتے ہو، کرو۔ میں الحلاّج ہوں۔ حلاّج کو بھی انھوں نے سنگ زنی کر کے مارا تھا نا؟ حلاّج نے کہا تھا، میں خدا ہوں، کوئی اور معبود نہیں سوائے میرے۔ میں نے تو بس مٹی سے آدم بنانا چاہا تھا، اسد بھائی۔ بس اسی میں منافق ہو گیا؟

اُس رات، میں سارا وقت ان روحوں کی باتیں سنتا رہا، منٹو بھائی۔ جنھیں کسی نہ کسی جرم میں مجرم قرار دے کر، مار کر دفنا دیا گیا تھا۔ اسی زمین پر شاہجہاں آباد کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کے نیچے ان کی قبریں تھیں۔ میں آنکھوں میں بہت سے خواب لیے دلّی آیا تھا۔ بڑا شاعر بنوں گا، مشاعروں میں میری غزلیں سن کر، رؤسا پکار اُٹھیں گے، واہ واہ، کیا بات ہے، مرحبا، مرحبا۔ لیکن اس کے بجائے یہ میں کس بھٹکتی ہوئی روحوں کے شہر میں آ نکلا ہوں؟ رات بھر میں نے ان کی زندگیوں کی کہانیاں سنیں۔ ان میں سے کوئی بھی مجرم نہیں تھا۔ لیکن ان پر مجرم کی مہر ثبت کر دی گئی تھی۔ کیونکہ ایک نئے شہر کو تعمیر کرنے کے لیے ایسے ہی مجرموں کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں بلاجواز قتل کر کے دفنایا جا سکے۔

صادق میاں کی روح نے مجھ سے پوچھا، 'آپ غزلیں لکھیں گے، اسد صاحب؟'

—میں کچھ اور جانتا بھی نہیں، میاں۔

— آپ ہم جیسی روحوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھیں گے؟

— لکھوں گا۔

— تب تو آپ کی غزلیں کوئی نہیں سمجھے گا، اسد صاحب۔ صادق نے ہنس کر کہا۔

— کیوں؟

— سب کو اس میں مُردوں کی مہک آئے گی۔

— جانتے ہیں، پھر کیا ہوگا؟ صادق میاں نے ہنستے ہنستے کہا۔

— کیا؟

— آپ ایک سگِ آوارہ کی موت مریں گے۔

روحوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا، منٹو بھائی۔ سگِ آوارہ ہی سہی، پر کسی وقت میں خوبرو ہوا کرتا تھا۔ کچھ چاہنے والے بھی تھے میرے، مغل جان، منیرہ بائی اور کچھ دوسریاں بھی مجھے چاہتی تھیں۔ ایک دن میں نے دیکھا۔ میرا بدن خارش زدہ ہوگیا ہے۔ سارے بدن پر کیڑے چل رہے ہیں۔ پھر ایک دن جسم کے سارے روئیں جھڑ گئے اور جھلسی ہوئی چمڑی کے نیچے بس چند ہڈیاں رہ گئیں۔ دیوان خانے میں پڑا میں بس ان ہڈیوں کو دیکھتا رہتا، پھر تھک کر سو جاتا۔ خواب میں دیکھا کرتا کہ دلّی چکنا چور ہوگئی ہے، صرف ریت ہی ریت اُڑ رہی ہے، میں ریگستان کے اندر دھنستا جا رہا ہوں۔ ذرا سوچیے تو منٹو بھائی، وہ کتنی ساری قدیم روحیں ہوں گی جن کا ہاتھ تھام کر میں دلّی پہنچا۔

۱۰

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدّت کا

گستاخی معاف، مرزا صاحب اور میرے دوستو، اب ذرا اس بدنصیب منٹو کی بات سنیے۔ الفاظ میرے اندر کھدبدا رہے ہیں، انھیں اب روکا نہیں جا سکتا۔ میں جب بھی بولنا شروع کرتا عصمت ہنسنے لگتی اور منہ میں رکھے برف کے ٹکڑے چوستی رہتی — اُسے برف چبانا بہت پسند تھا — اور میں پاگلوں کی طرح باتیں کیے جاتا۔ وقتاً فوقتاً صفیہ آ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور ہنسنے لگتی۔ مجھے پتا تھا وہ میری گفتگو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ ہر وقت میرے منہ سے گالیاں جو نکلتی رہتی تھیں، کسی بھی جملے سے پہلے یا بعد میں 'سالا' کہے بنا میں بات ہی نہیں کر پاتا تھا، کیا کرتا، بتائیے، میری زندگی بھی تو مرزا صاحب کی طرح گلیوں میں، چائے خانوں میں، کافی کی دکانوں میں کٹی تھی۔ ماں کے علاوہ اور کون تھا جو مڑ کر میری طرف دیکھتا؟ ابّا کے بارے میں کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے، مرزا صاحب۔ وہ رئیس آدمی تھے۔ لدھیانہ کے سرالے کے سرکاری افسر، انھوں نے دو دو شادیاں کی تھیں۔ میں ان کی چھوٹی بیوی کی اولاد تھا۔ میری طرف انھوں نے کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ میری ساری چہلیں اور شرارتیں بس اپنی ماں ہی کے ساتھ تھیں، میں انھیں 'بی بی جان' کہا کرتا تھا۔ اقبال میری سگی بہن تھی۔ میرے ابّا کسی جن کی پرچھائیں کی طرح تھے، مرزا صاحب، ایسی پرچھائیں جس نے زندگی بھر میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

بہت بعد میں، میں کافکا کی کہانی 'ججمنٹ' پڑھ کر چونک اٹھا تھا۔ اس کہانی میں بھی باپ ایک بدروح کی طرح تھا، جس کی وجہ سے اس کا بیٹا ندی میں کود کر خودکشی کر لیتا ہے۔ مرزا صاحب میری کہانی میں کوئی نہ کوئی کردار اُس بدروح باپ کی طرح ضرور ہوتا تھا، اور میں اسے قتل کر دینا چاہتا تھا۔

میرے والد مولوی غلام حسن نے اپنی پہلی بیوی کے تینوں بیٹوں کو پڑھایا لکھایا، بیرونِ ملک بھیجا، انھیں مستحکم کیا، اور اس منٹو کو سڑک پر چھوڑ دیا— جاؤ سالے، لاوارث کتے کی طرح گھومو اور لوگوں کے پھینکے ہوئے ٹکڑے چُن کر کھاؤ۔ ان کی پہلی بیوی کے تینوں بیٹے، محمد حسن، سعید حسن، سلیم حسن، انگلینڈ میں رہتے تھے، مرزا صاحب، اور میں سمرالہ کی سڑکوں پر، کیا کر رہا تھا بھلا؟ بندر کا تماشا دیکھ رہا تھا، آگ میں کودنے کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ میں نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ پڑھائی کا خرچ کون اُٹھاتا؟ آخر مولوی غلام حسن کو اپنے تینوں بیٹوں کو انگلینڈ میں امیر آدمی نہیں بنانا تھا کیا؟ مرزا صاحب، میں اور کیا کرتا، آخر ایک دن میں ایک شراب خانے میں جا گھسا۔ پولیس والے مجھے پیٹتے ہوئے جیل لے گئے۔ پتا نہیں کس طرح دو چار دنوں میں چھوٹ بھی گیا۔ اس کے بعد اکثر پینے لگا۔ اسی طرح میں نے بی بی جان کے پیسے چرانے شروع کیے۔ شراب کے بعد نیند، نیند میں خواب، اور خواب میں کون آ کر کھڑا ہوتا تھا، جانتے ہیں؟ مولوی غلام حسن، سالا سوٴر کا بچہ، میں اس پر پتھر پھینکتا۔ پاخانہ پھینکتا، کیچڑ پھینکتا، لیکن وہ آدمی پھر بھی ہاہا کر کے ہنستا رہتا۔ بڑا ہی بے شرم انسان تھا۔ خبیث۔ جانتے ہیں مرزا صاحب، وہ آدمی میری زندگی میں کسی شیطانی روح سے کم نہیں تھا۔ معلوم ہے وہ میری طرف کس طرح دیکھتا تھا؟ جیسے میں کوئی کیڑا ہوں، جو نالی سے نکل کر اس کے گھر میں گھس آیا ہے۔ جانتے ہیں وہ میری والدہ سے کیا کہتا تھا، 'تم کیوں اس لفنگے کو پیار کرتی ہو؟ اس پر تو مقدمہ چلنا چاہیے۔'

مقدمے، ہاں، میری ساری زندگی تو مقدموں ہی میں کٹ گئی، مرزا صاحب۔ محض کہانیاں لکھنے کی پاداش میں، نہ جانے کتنی بار عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا مجھے۔ میر کا وہ شعر یاد ہے، مرزا صاحب؟

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے، پر ہم سے بجھایا نہ گیا

اپنے بچپن میں، میں ایک ایسے ہی آتشِ ہجراں سے گزرا تھا۔ بس اُسی دن سے، مرزا صاحب، میں آگ کا مکین ہو گیا۔ یا آپ اسے آگ کا دریا کہیں گے؟ جو بھی کہہ لیجیے، پر مجھے اس آگ میں جلتے تینتالیس سال گزر گئے۔ صفیہ بیگم کہتی تھیں، 'اس طرح خود کو جلا کر آپ نے کیا پایا، منٹو صاحب؟'

— قصے، بیگم۔

— کس کے قصے؟

— ان کے، وہ جو سڑک کے اس پار کھڑے ہیں۔ کیا تمھیں نظر نہیں آتے؟ وہ جو دھوئیں کے مرغولوں میں گھرے کھڑے ہیں۔

— کون؟

— منٹو کی روحیں۔

پہلے میں آگ کی کہانی سناتا ہوں، مرزا صاحب۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، برادران، جان لیجیے۔ یہ منٹو تھا— سعادت حسن تو کب کا مر چکا تھا، یہ منٹو تھا جو آگ پر سے چل کر آیا تھا۔ یہ بات بالکل سچ ہے۔ ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ منٹو کو جھوٹ کا پتا نہیں تھا، وہ جھوٹ نہیں جانتا تھا، اسی لیے وہ لوگ اسے بار بار عدالت کے کٹہرے میں گھسیٹ لاتے تھے۔ بڑے بڑے جغادری ادیبوں کا کہنا تھا، 'منٹو کو کب لکھنا آتا ہے؟ اور کمیونسٹوں نے بھی کب اسے چھوڑا، سالا منٹو، سوٴر کا بچہ، ادب کے نام پر کیچڑ اُچھالتا ہے۔' جو لوگ میرے دوست ہونے کے دعوے دار تھے وہی میرا مذاق اڑاتے رہے۔ کہتے تھے کہ میں سنکی ہوں، رجعت پسند ہوں۔ میں مُردوں کی جیب سے بھی سگریٹ چُرا لیتا ہوں۔ میں بچپن میں جس آگ سے گزر کر آیا تھا، مرزا صاحب، پھر اُسی آگ میں چلے جانے کے سوا میرے پاس کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ آپ نے مدت پہلے کہا تھا۔

غمِ ہستی کا 'اسد' کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

فرض کیجیے، اگر میرا جنم ۱۹۱۸ء میں ہوا ہوتا؟ ویسے اگر مولوی غلام حسن اسے قبول کریں تو، میں تب محض دس بارہ سال کا بالا تھا۔ آپ لوگ نہیں جانتے لیکن اُس سال لندن کے پکاڈلی سرکس

میں ماسٹر خدا بخش نے آنکھوں پر کالا کپڑا باندھ کر گاڑی چلائی تھی اور اچھل مچادی تھی۔ بڑی سرگرمی رہی۔ سالا! ہم نے جیسے سارا جہان پالیا۔ پھر پتا ہے، ایک حادثہ ہوگیا۔ جیسے خدا نے ہی مجھے اس کی خبر دی ہو۔ مرزا صاحب، آپ تو جانتے ہی ہیں کبھی کبھی کوئی حادثہ زندگی کو چودھویں رات کے چاند کی طرح بدل دیتا ہے، جیسا کہ آپ کے معاملے میں بیگم فلک آراء۔ مجھے پتا ہے آپ دوبارہ ان کا ذکر نہیں کریں گے، عشق کیا ہے؟ یہ آپ نے انھی سے تو سیکھا تھا۔ اور حافظ نے یہ آپ ہی کے لیے کہا تھا۔

چو کحل بینش ما خاکِ آستانِ شماست
کجا رویم بفر ما ازیں جناب کجا

جبکہ ہماری بینائی کا سرمہ تمھاری چوکھٹ کی خاک ہے۔ تم ہی فرماؤ اس دربار سے کہاں جائیں

ہاں، کسی نہ کسی کو دل کی سب سے گہری درگاہ میں دفنانا پڑتا ہے، جو ایک زیارت گاہ کی مانند ہے، اس جسم کے اندر کی جنت۔ میں نے وہیں عصمت کو — عصمت چغتائی کو دفن کیا تھا۔ برف چبانا کتنا پسند تھا اُسے۔ خواہشات کی اُس درگاہ میں صفیہ نہیں تھی، اب نہیں تھی تو نہیں تھی، اس میں میں کیا کرسکتا تھا، مرزا صاحب؟ ہماری جنت اور جہنم میں کون رہے گا اور کون نکل جائے گا، یہ ہم طے نہیں کرسکتے، مرزا صاحب۔ طے تو وہ خداوند کرتا ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں نا؟

برادران! اس مسکین کو معاف کیجیے گا، منٹو اپنے قصے سے بار بار غائب ہو رہا ہے۔ یہی میری فطرت تھی۔ اگر آپ میرے افسانوں کو پڑھتے تو سمجھ پاتے کہ ان میں منٹو اب ہے اور اب نہیں ہے۔ وہ ایک کافر روح کی طرح بھاگتا پھرتا رہتا تھا۔ بھاگنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سعادت حسن، کبھی منٹو کا سامنا نہیں کر پاتا تھا۔ سعادت حسن کے کتنے ٹھاٹ تھے، خاندانی رعب داب، ایسے کپڑے ہونے چاہئیں، ویسے لاہوری جوتوں کے بغیر گزارا ہی نہیں۔ انارکلی کی کرنال بوٹ شاپ سے کم سے کم دس بارہ جوڑی چپلیں خریدنی ہوں گی۔ ایسی کتنی ہی اور خوش خیالیاں۔ اور منٹو اس کے کان کھینچتے ہوئے، اسے جھنجوڑتے ہوئے کہتا، سالے، سؤر کے بچے،

تو ابی جھاڑ رہا ہے، جو کچھ تُو لکھتا ہے، اس کی تقدیر جانتا ہے، کیا ہے؟ وہ کپڑے سے تیری آنکھیں منھ باندھ کر کسی گڑھے میں پھینک دیں گے تجھے۔ سارا ہندوستان تیری تحریر کی بدبو سے بھر جائے گا۔ سالے حرامزادے، سؤر کے بچے، تیری یہ جرأت کہ تو نے 'ٹھنڈا گوشت' لکھی؟ تیری مذہبی نافرمانی کی کوئی حد بھی ہے؟ سنا بھی ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟ جو بھی تُو نے لکھا ہے وہ بس مرد اور عورت کے گوشت کے تعلق کے بارے میں ہے، ریڈ لائٹ ایریا کے علاوہ بھی کچھ ہے تیری تحریروں میں؟ میں یہ تسلیم کرتا ہوں، مرزا صاحب، واقعی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، بس خون تھا، آبرو ریزی تھی، مردہ جسموں کے ساتھ مباشرت تھی، تجہیز دین کا سامان تھا — اور ان کے پیچھے تھا ایک خاص زمانہ — لہو میں بہتے ہوئے کچھ سال۔ ۱۹۴۶، ۱۹۴۷، ۱۹۴۸۔ No man's land، دو ملکوں کے درمیان وہ جگہ جہاں ٹوبہ ٹیک سنگھ مرا تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بارے میں آپ لوگوں نے نہیں سنا؟ سنیں گے بھی کیسے، وہ تو ایک پاگل تھا۔

نہیں، نہیں، برادران، آگ کی کہانی اب شروع ہوگی۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا قصہ نہیں چھیڑ رہا۔ لیکن جانتے ہیں، لوگوں نے منٹو کو الگ الگ ڈھنگ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آخر یہ سؤر کا بچہ تھا کون؟ — کیا یہ کوئی پاگل یا سودائی تھا، کوئی ذہنی مریض؟ یا کوئی فرشتہ؟ — لوگوں کی اس سمجھ پر میرا موتنے کو دل چاہتا تھا۔ سالو، کیسے سمجھ سکتے ہو تم؟ کیا تم نے کبھی میری طرح ڈوبتا ہوا سورج دیکھا ہے؟ تو پھر کیسے سمجھ سکو گے کہ میں عورتوں میں سب سے پہلی چیز جو دیکھتا تھا وہ ان کے پاؤں کیوں ہوتے تھے؟ اس لیے اپنی کوششیں چھوڑ دو، اگر منٹو کو ڈھونڈنا ہی چاہتے ہو تو اس کے افسانے پڑھو — وہ لوگ، وہ لڑکیاں جنھیں تم سڑکوں، کچی آبادیوں، چکلوں اور بمبئی کے فلم اسٹوڈیوز میں دیکھتے ہو — تم چاہو تو انھی میں منٹو کو پاسکتے ہو۔ وہ کہتے ہیں، یہ افسانے ہیں یا کیچڑ؟ ارے بھائی جس زمانے میں رہ رہے ہو اگر اس زمانے کو سمجھ نہ سکو تو میرے افسانوں کو پڑھو، اور اگر میرے افسانے تمھیں ناقابلِ برداشت لگتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ہی ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن یہ سب کہنے کا کیا فائدہ؟ انھوں نے تو منٹو کو سخنوں سے داغ دیا، کیا وہ افسانہ نگار ہے؟ وہ تو فحش نگار ہے۔ وہ تو صرف انسانوں کی زندگی کے گندے پہلو اُجاگر کرتا ہے۔ جبکہ میں نے جب بھی کوئی کہانی شروع کی، ۷۸۶ کے اعداد یعنی بسم اللہ لکھنا کبھی نہ بھولا۔

برادران، یہ سب میرا جلتے ہوئے انگاروں پر چلنے کا انعام تھا۔

آپ لوگوں کو ماسٹر خدا بخش کا کارنامہ یاد ہے نا؟ جس نے پکاڈلی سرکس میں آنکھوں پر کالا کپڑا باندھ کر گاڑی چلانے کا انوکھا کرتب دکھایا تھا؟ خدا بخش کے بعد امرتسر میں اللہ رکھا نام کا ایک شخص ظاہر ہوا۔ سنا ہے کہ وہ خدا بخش کے استاد تھے۔ وہ سڑک پر گڑھا کھود کر اس میں کوئلے بھر کر جلا دیتے، اور پھر ان سلگتے ہوئے انگاروں پر چلتے تھے۔ اللہ رکھا کا جادو دیکھنے کے لیے روز بہ روز بھیڑ لگنے لگی۔ ان کے بارے میں قصے کہانیاں پھیلنے لگیں۔ میں چپ چاپ بیٹھا اس آدمی کو دیکھتا رہتا تھا۔ کوئی آدمی جلتے ہوئے انگاروں پر کیسے چل سکتا ہے؟ چلنے کے بعد وہ اپنے پاؤں مجھے دکھاتے، جس پر کہیں کوئی پھپھولا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بی بی جان سے منصور بن حلاج کی کہانی سنی تھی۔ ایک بار حلاج بہت سے لوگوں کے ساتھ ریگستان کو پار کرتے ہوئے مکہ جا رہے تھے۔ مسافر بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے۔ انھوں نے حلاج سے کہا، پیر صاحب، کیا یہاں کھانے کو کھجوریں نہیں مل سکتیں؟

حلاج مسکرائے، 'تم کھجوریں کھانا چاہتے ہو؟'

—جی ہاں، ہم بھوکے ہیں، اب اور نہیں چل سکتے۔

— ٹھہرو، حلاج نے ہوا میں بازو لہرایا اور کھجوروں سے بھرا ہوا ایک تھال ان کے ہاتھ میں آ گیا۔

سفر پھر شروع ہو گیا۔ اور ایک بار پھر سب بھوک سے بے حال ہو کر ریت پر گر پڑے۔ برادران، ایک وہ وقت تھا، ہے نا مرزا صاحب؟ جب زندگی کا مطلب ایک کے بعد ایک ریگستان پار کرنا ہوتا تھا۔ اور صحرا کی راتیں آسمان کے ستاروں کی ہمراہی میں کٹا کرتی تھیں۔ یہ پیروں، ولیوں اور متقی پرہیزگاروں کی راہ تھی۔ مدت ہوئی ہم اس صراط مستقیم کو چھوڑ کر اس دوزخ کی طرف چلے آئے، اس شور شرابے میں، اس عذاب میں، سڑتے ہوئے گوشت کے اس تعفن میں۔

بھوک مٹانے کے لیے اس بار مسافروں نے حلوہ مانگا۔

حلاج نے مسکراتے ہوئے کہا، 'حلوہ کھا کر پیٹ نہیں بھرے گا، اور بھی کچھ چاہیے؟'

—جی نہیں، حضور۔ آگے سفر جاری رکھنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔

—یہ تو ٹھیک ہے۔ اگر جسمانی طاقت ہی نہ رہی تو تم حق کی راہ پر، دین پر کیسے چل پاؤ گے؟ یہ کہہ کر انھوں نے ایک بار پھر اپنا بازو ہوا میں لہرایا اور حلوہ حاضر کر دیا۔ سارا ریگستان حلوے کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ حلوہ کھا چکنے کے بعد ان میں سے ایک نے کہا، 'پیر صاحب، لیکن ایسا حلوہ تو بغداد کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا؟'

حلاج مسکراتے ہوئے بولے، 'بغداد ہو یا ریگستان، خدا کے لیے سب جگہ ایک ہے۔'

—اور کھجوریں کہاں سے ملی تھیں؟

حلاج کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر اٹھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے، جیسے وہ کوئی درخت ہوں۔ 'مجھے پکڑ کر ہلاؤ۔' انھوں نے کہا۔

— کیوں، پیر صاحب؟

—دیکھو تو سہی۔ حلاج مسکرائے۔

سب مل کر حلاج کو ہلانے لگے۔ وہ جیسے ایک درخت بن گئے اور ان کے بدن سے کھجوریں ٹپاٹپ زمین پر گرنے لگیں۔ گاڑھے کتھئی رنگ کی کھجوریں سورج کی روشنی میں جواہرات کی طرح چمک رہی تھیں۔

اللہ رکھا صاحب کا جادو دیکھتے ہوئے میں منصور حلاج کی اس کہانی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ مرزا صاحب، یہ تو صریحاً جادو تھا، ہاتھ کی صفائی کا کھیل نہیں تھا۔ ایک انسان اگر کھجور کا درخت بن سکتا ہے تو کوئی دوسرا جلتے ہوئے انگاروں پر کیوں نہیں چل سکتا؟ ایک انسان دنیا میں کتنی صلاحیتیں لے کر آتا ہے، لیکن اس کی طاقت کا کتنا چھوٹا سا حصہ اُجاگر ہو پاتا ہے۔ ہم بس تھوڑا سا دیکھ پاتے ہیں۔ ہم کیوں نہیں دیکھ پاتے، مرزا صاحب؟ میر صاحب کا وہ شعر یاد ہے آپ کو۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

دنیا میں رہو پر اسے سمجھنے کی کوشش مت کرو، برادران۔ یہاں یوں رہو گویا یہ ایک کتاب ہے اور اس کے صفحوں پر وہ سب لکھ دو جو ہو رہا ہے۔

بتاتا ہوں اس کے بعد کیا ہوا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہروں سے بیزاری جھلکنے لگی ہے۔

ایک دن اچانک اللہ رکھا نے کہا، 'کیا تم سب خدا پر یقین رکھتے ہو؟'

—جی، جناب۔ مجمعے نے یک زبان ہو کر کہا۔

—اور مجھ پر؟

—حضور آپ ولی ہیں، سب نے جواب دیا۔

اللہ رکھا صاحب قہقہہ مار کر ہنس پڑے—ولی؟ ولی کو دیکھا ہے کبھی؟ ولی کون ہیں، جانتے ہو؟

—ہمیں بتائیے، حضور۔

—تو پھر ایک قصہ سناتا ہوں۔ ابوسعید الخیر کے بارے میں سنا ہے کبھی؟ خراسان کے صوفی کامل۔ یہ بارہ تیرہ سو سال پرانی بات ہے۔ تب دنیا کیسی ہوتی تھی، جانتے ہو؟

— کیسی حضور؟

—ہزاروں طرح کی الگ الگ ہوائیں چلا کرتی تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک، لوگوں کو الگ الگ طرح سے دیوانہ بنا سکتی تھی۔ یہ کہتے ہوتے اللہ رکھا صاحب ہنس دیے—تو پیر ابو سعید ایک دن اپنے ایک مرید درویش کو لے کر ایک جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ جنگل میں زہریلے سانپوں کی کثرت تھی۔ اچانک ایک سانپ نے ابوسعید کی ٹانگ کو کس لیا۔ مرید یہ دیکھ کر خوف سے منجمد ہو گیا۔ ابوسعید نے اسے کہا، 'دوست، یہ سانپ مجھے سجدہ کرنے آیا ہے۔ یہ مجھے کاٹے گا نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو یہ تمھیں بھی سجدہ کرے؟'

—بے شک۔ مرید کھل اٹھا۔

—جب تک تم خود کو فراموش نہیں کر دیتے، یہ کبھی تمھیں سجدہ نہیں کرے گا۔

دوستو، یہ تھے ایک حقیقی ولی۔ ان کے پاس کچھ بھی اپنا نہیں تھا، صرف خدا کا پیغام پہنچانے وہ اس دنیا میں آئے تھے۔ تو لو، اب اپنا امتحان دو۔

— کیسا امتحان؟ اللہ رکھا صاحب، کیسی آزمائش چاہتے ہیں؟

مجمعے میں سب ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔

—تم لوگوں نے کہا تھا کہ تم خدا پر یقین رکھتے ہو اور مجھ پر بھی۔ تو جس کسی کو بھی یقین ہے، آگے آ جائے اور میرے ساتھ اس آگ پر چلے۔

اس پر مجمع دھیرے دھیرے چھٹنے لگا۔ کوئی چپ چاپ سرک گیا تو کوئی آگ پر ایک نظر ڈالتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ تب مجھ سے رہا نہیں گیا، مرزا صاحب، میں اللہ رکھا صاحب کی طرف بڑھا۔ میں نے جوتے موزے اُتارے اور اپنا کُرتا سمیٹ لیا۔

اللہ رکھا صاحب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا، 'بیٹا، تُو میرے ساتھ آگ پر چلے گا؟'

—جی۔

—تو پھر آ جا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا— کلمہ پڑھ۔ لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ۔

—لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ۔

جیسے ہی میں نے کلمہ پڑھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا ہو، مرزا صاحب۔ اللہ رکھا صاحب کا ہاتھ پکڑ کر میں آگ کے گھیرے میں داخل ہو گیا۔ میں ان کے پیچھے پیچھے سلگتے ہوئے انگاروں پر چلنے لگا۔ جی ہاں، مرزا صاحب، پہلی بار میں اپنے آپ کو ڈھونڈ پایا۔ اپنے باپ کے ڈراووں سے پرے، اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ سوتیلے بھائیوں کی حقارت سے پرے، اللہ رکھا صاحب کے پیچھے پیچھے، آگ کے گھیرے میں چلتے ہوئے میں اپنی راہ پر چل پڑا۔ نہیں، میرے پیروں میں چھالے نہیں پڑے، مرزا صاحب۔

سچ کہوں تو میرے دن لاوارثوں کی طرح بسر ہوتے تھے۔ اسکول کی پڑھائی لکھائی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن اسکول کے ہی دنوں میں کتابیں جیسے میرے خون میں شامل ہو گئیں۔ ہم کچھ دوستوں نے مل کر آغا حشر کا ڈراما اسٹیج کرنے کے لیے ایک تھیٹر گروپ بنایا تھا۔ ایک دن میرے والد نے آ کر ہارمونیم، طبلہ سب توڑ دیا۔ کہا، تم یہ سب نہیں کر سکتے۔ اور میری ضد اتنی ہی زیادہ بڑھ گئی۔ نصاب کی کتابوں کو چھوڑ کر میں رومانی کتابیں پڑھنے لگا، جو بڑوں کے لیے لکھی جاتی تھیں۔ میری عمر میں کوئی ایسی کتابیں نہیں پڑھتا تھا۔ میری خراب شہرت کی وجہ سے مجھے اسکول میں 'ٹوئی' کہہ کر پکارا جانے لگا۔ میں نے تین بار کوشش کر کے میٹرک کا امتحان تھرڈ ڈویژن

میں پاس کیا۔ اور مزے کی بات کیا ہے جانتے ہیں؟ میں اردو میں فیل ہوگیا۔ ہاہاہا۔ ذرا تصور کیجیے، مرزا صاحب، میں اردو میں فیل ہوگیا۔

کیا دن تھے وہ بھی، برادران پڑھائی لکھائی تو میں نے ترک کردی، اب میں جوئے خانے جانے لگا۔ کٹڑہ جمال سنگھ میں دینو اور فضلو کا جوئے کا اڈہ تھا۔ میں وہاں فلیش کھیلتا تھا۔ پہلے تو نوسکھیا ہی تھا لیکن بہت جلد میں ساری چالیں سیکھ گیا۔ میرے دن رات جوئے خانے میں بیتنے لگے۔ کوئی شمار نہیں کہ کتنے دنوں تک یہ چلتا رہا۔ معلوم ہے، ایک دن میں نہایت بیزار ہوگیا۔ ہر وقت خود کو داؤ پر لگانا بہت ناگوار تھا۔ تو کیا میں کچھ بھی نہیں تھا؟ بس ایک ایسی شے تھا جس پر بازی لگائی جاسکے؟ تب میں نے طے کیا، بس چلو منٹو، اب کسی اور راہ پر چلا جائے۔ زندگی کی ڈاگر بس ایک ہی تو نہیں ہوتی، تو پھر کیوں نہ اب کسی دوسری ڈگر پر چلا جائے؟ لیکن میں کیا کرتا؟ جوئے کے اڈے کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ سڑکوں نے ہی مجھے سہارا دیا، اِس راستے سے اُس راستے پر، اِس گلی سے اُس گلی میں، میں خوابوں میں بے سدھ گھومتا پھرتا۔ سڑک کے کتوں سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھا رہتا، انھیں پیار کرتا۔ وہ میرا بدن چاٹا کرتے۔ میں قبرستانوں میں گھومتا رہتا، فقیروں کے پاس بیٹھ کر کتنی ہی کہانیاں سنیں میں نے، مرزا صاحب، وہ سب کہانیاں بھی کھوگئیں، میں انھیں لکھ نہیں پایا۔

اس سے قبل، ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام ہو چکا تھا۔ تب میری عمر محض سات برس تھی، لیکن میں نے دیکھا، کیسے سارا پنجاب جاگ اٹھا تھا، امرتسر کی سڑکوں پر جلسے جلوس تھے اور نعرے گونج رہے تھے۔ بھگت سنگھ میرا آدرش تھا۔ میری میز پر بھگت سنگھ کی تصویر رکھی رہتی تھی۔ جن دنوں گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا، ایک دن جلیانوالہ باغ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے میرے ذہن میں آیا، کیا اس دنیا کو یوں تہس نہس نہیں کیا جاسکتا کہ جس سے یہ ٹوپی ہمارے اوپر بنا کچھ سوچے سمجھے اور گولیاں نہ چلا سکیں؟ جانتے ہیں، مرزا صاحب، کئی بار میرے دل میں بم بنانے کا بھی خیال آیا۔ سالے امرتسر کو ہی اُڑا دوں گا، گورے سؤر کے بچوں کو ملک سے بھاگنے پر مجبور کردوں گا۔ میں یہ سب باتیں بالے، عاشق، فقیر حسین، کپتان واحد اور گیانی ارور سنگھ کو بتایا کرتا تھا۔ وہ زور زور سے ہنستے۔ یہ سب میرے دوست تھے۔ ان کا کہنا تھا، موج مستی کر، عیش کر، مار گولی امرتسر کو۔ ہم سب عزیز کے ہوٹل میں بیٹھ کر گانجا پیتے تھے۔ عاشق فوٹو گرافر تھا۔ فقیر شاعری کرتا تھا اور گیانی اَرور سنگھ دندان ساز تھا۔ کپتان کیا کرتا تھا یاد نہیں۔ گانجے کا دم لگا کر عاشق، رفیق غزنوی کے اسٹائل میں گانے گایا کرتا تھا۔ انور جو ایک مصور تھا، فوراً واہ واہ کرنے لگتا۔ عزیز کے اس تاریک ہوٹل میں کبھی کبھی انور بھی گانے لگتا، 'اے عشق کہیں لے چل— 'اختر شیرانی کے اشعار کو اس نے ترنم میں ڈھال لیا تھا۔ کیا معلوم اب عزیز کا ہوٹل کون سی قبر میں ہوگا۔

II

محبت سے ہے انتظامِ جہاں
محبت سے ہے گردشِ آسماں

یا الٰہی، آپ کی زندگی بھی کیسی شروع ہوئی تھی، منٹو بھائی۔ خدا نے آپ کے مقدر میں دوزخ میں جانے کا سارا انتظام پکا کر رکھا تھا۔ جیسا کہ میرے معاملے میں بھی اس نے کیا تھا کہ یہ بندہ بھلا جنت میں جا کر کیا کرے گا؟ ٹھیک ہی تو ہے، میں وہاں جا کر کیا کرتا؟ ہوسکتا ہے مجھے کوئی حور پری دے دی جاتی۔ لیکن ایک ہی شکل میں کتنے دن دیکھ سکتا تھا۔ مر کے بھی میں جنت کی سزا نہ جھیل پاتا۔ یہ سب کچھ اس کاتبِ تقدیر کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ میں ساری زندگی اپنی کامیوں کی داستان کہنے کے لیے زبان نہیں تلاش کر پایا۔ اگرچہ میں نے اردو فارسی میں کتنی شاعری کی، منٹو بھائی۔ لیکن مجھے لگتا ہے میں ان زخموں کو چھونے میں کامیاب نہیں ہوا، ان زخموں کی اذیت میری غزلوں کی سطح پر نہ ابھر سکی۔ ویسے میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ تکلیف اٹھائے بنا کیا کسی حُسن کی تشکیل ممکن ہے۔ مثال کے طور پر، صنوبر کے درخت کو ہی لیجیے، اس کی شاخوں اور پتوں کو مسلسل کاٹا چھانٹا جاتا ہے تاکہ وہ خوب صورت نظر آئے— صنوبر کو خوبصورتی پانے کے لیے یہ تکلیف سہنی پڑتی ہے۔ اب شراب کو لیجیے، قلم تیار کرنے کے لیے سرکنڈے کو مناسب طریقے سے چھیلنا اور کاٹنا پڑتا ہے۔ اب سوچیے آپ کو خط لکھنا ہے، تو اس کے لیے آپ کو ناپ کے مطابق کاغذ کاٹنا پڑے گا۔ سیاہی سے اس کے سینے پر لکیریں ڈالنی ہوں گی۔ ہر لکیر ایک زخم

ہے، اور اس کا حاصل؟ آپ کے دلی جذبات آپ کے محبوب تک پہنچیں گے۔ میں نے دیکھا ہے ہم دکھ اٹھائے بنا کسی بھی طرح کی خوبصورتی تخلیق نہیں کرسکتے۔ تو کیا خدا کر سکتا ہے؟ اس کی دنیا میں جو یہ تعمیر و تخریب کے کھیل چلتے رہتے ہیں یہ نئی نئی خوبصورتیوں کی تخلیق کے لیے ہی تو ہیں۔ اُس نے مجھے ایک مشتِ خاک سے بنایا پھر آسمان میں اُچھال دیا، کچھ وقت تک میں وہاں رہا، پھر ایک دن اچانک اس نے مجھے دھرتی کے سینے پر لا پھینکا، میں یہاں آ گرا۔ میرا یہاں آ گرنا اس کی دنیا پر کسی زخم کی مانند تھا۔ دنیا کو یہ زخم ملا جس کا نام تھا مرزا غالب۔ لیکن منٹو بھائی، اس زخم کی خوبصورتی کا انکار کون کرسکتا ہے؟ دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے۔

ارے دیکھیے، یہ ہمارے دوست دوبارہ سونے لگے ہیں۔ کیا ہوا آپ لوگوں کو؟ ہم دو احمقوں کی باتیں بڑی بے رحمانہ معلوم ہورہی ہیں۔ ہے نا؟ ٹھیک ہے، چلیے پھر موضوع بدلتے ہیں، کیا خیال ہے منٹو بھائی؟ زندگی— چاہے وہ میری ہو، حضرت کی یا شہزادے سلیم کی— عموماً بہت بے لطف ہوتی ہے۔ اسے ڈھونے کے لیے آپ کو دھوبی کا گدھا بننا پڑتا ہے۔ بوجھ کھینچتے رہو، کھینچتے ہی چلے جاؤ۔ اسے سہنے کے لیے کبھی کبھی حکایتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے، کہانیاں نہیں، حکایتیں۔ کہانیاں ہماری زندگیوں کے بارے میں ہوتی ہیں جبکہ حکایتیں آئینے میں جھلکتے کسی اور جہان کے عکس کی طرح ہوتی ہیں۔ اپنی کہانیاں سنانے کے لیے میرے پاس ڈھیر سارا وقت ہے، ہم میں سے کوئی بھی اپنی قبر سے نکل کر بھاگنے والا نہیں۔ لیکن جب حکایت کی بات آ ہی گئی ہے تو کیوں نہ ایک حکایت سن ہی لی جائے۔ ایسے قصے اب آتے ہیں اور تب کھو جاتے ہیں۔

اس حکایت کا نام ہے 'سحرالبیان'۔ یہ سر کے بارے میں نہیں ہے لیکن اپنی سحر انگیزی سے آپ کا سر ضرور گھما سکتی ہے۔ دیکھیے، منٹو بھائی، وہ سب پھر سے اٹھ کر بیٹھنے لگے۔ یہ مثنوی میر حسن نے لکھی تھی۔ انھی میر ضاحک[1] کے بیٹے نے، سودا جن کا مذاق بنایا کرتے تھے۔ میر حسن میری پیدائش سے کوئی ستر سال قبل پیدا ہوئے تھے، لیکن وہ دلّی چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے تھے، ویسے وہ جانا نہیں چاہتے تھے، دلّی میں ان کی محبوبہ جو رہتی تھیں۔ لیکن کیا کرتے— غمِ روزگار اور غمِ عشق کب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلتے ہیں، تاہم سنا تھا کہ فیض آباد میں بھی حسن صاحب

[1] مصنف نے یہ نام میر زاہد لکھا ہے، جسے اس ترجمے میں درست کر دیا گیا ہے (مترجم)

کی زندگی زیادہ آسودہ نہ گزری۔ بڑی مشکل سے ان کا گزر بسر ہوتا تھا، لیکن جہاں تک شاعری کی بات تھی، وہ اس کے ماہر تھے۔ 'سحر البیان' اتنی مشہور ہوئی کہ اس کا نام ہی میر حسن کی مثنوی پڑ گیا۔ یہ مثنوی دراصل ایک حکایت تھی۔ میں نے سنا ہے یہ حکایت آسمانوں میں، ہواؤں میں یہاں تک کہ لوگوں کے ہونٹوں پر رواں رہتی تھی۔ ذرا تصور کیجیے، وہ حکایت میر حسن کی مثنوی بن گئی۔

ملک شاہ نامی ایک نواب تھا۔ کہاں؟ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ کیوں نہ فرض کر لیں کہ کسی آئینے کے اندر اُس کا خوبصورت نگر تھا۔ کیسا دکھائی دیتا تھا وہ نگر؟ لفظوں میں شاید یہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صبح کی اذان جیسا روحانی۔ چمکتی ہوئی سڑکیں، مکان سب برف کے گالوں کی مانند سفید، اور ان کے بیچ رنگا رنگ پھولوں کے باغیچے۔ اور باغیچے ہونے کا مطلب تھا قسم قسم کے پرندے اور ان کے نغمے۔ اس شہر میں ایسے بازار تھے جہاں جا کر واپس آنے کو آپ کا جی نہ چاہے۔ یہ بازار کی سیر نہیں تھی بلکہ یہ تو کسی شیش محل میں گھومنے جیسا تھا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کسی ایسے شہر میں نواب کا قلعہ کیسا رہا ہوگا۔ جی ہاں، برادران، ذرا تخیل پر زور دینا ہوگا کہ حکایت کا یہی قاعدہ ہے۔

نواب بہت دکھی رہتا تھا کیونکہ اس کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ آخری وقت آنے پر وہ تخت کس کو سونپ کر جائے گا؟ ایک دن اُس نے اپنے سارے وزیروں کو بلا بھیجا اور کہا، 'وقت آ گیا ہے کہ میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاؤں۔'

— کیوں جہاں پناہ؟ سب چلا اٹھے۔

— بتاؤ، اس مال و دولت کا کیا کروں گا میں؟ کس کے لیے چھوڑ کر جاؤں گا؟ اتنے برس میں نے بڑی توجہ کے ساتھ حکومت کی۔ خدا کی راہ کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی مجھے۔ بس اب اور نہیں۔ اب میں تخت سے دستبردار ہو کر خدا کی راہ میں نکلنا چاہتا ہوں۔

'آپ غلطی کر رہے ہیں جہاں پناہ،' وزیر اعظم نے کہا۔ 'خدا نے آپ کو سلطنت چلانے کی ذمے داری سونپی ہے۔ آپ کے لیے تو یہی خدا کی منتخب کردہ راہ ہے۔ اگر آپ یہ ذمے داری پوری نہیں کرتے تو، حضور، روزِ حشر خدا کو کیا جواب دیں گے؟'

— لیکن میرے بعد اس راج پاٹ کو کون دیکھے گا؟

— کس نے کہا کہ آپ کے ہاں اولادِ نرینہ نہ ہوگی؟ میں براہمنوں اور جوتشیوں کو بلواتا

ہوں۔ انھیں پیش گوئی کرنے دیجیے۔ بعد کی بات بعد میں سوچی جائے گی۔

نواب نے وزیر اعظم کی تجویز قبول کر لی۔ براہمنوں اور جوتشیوں نے آ کر نواب صاحب کا زائچہ تیار کرنا شروع کیا۔ بالآخر انھوں نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ نواب صاحب کی بیگم کے ہاں ضرور بالضرور بیٹے کی ولادت ہوگی۔ قسمت کے اس لکھے کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں سودا وہاں ہوتے تو غالباً یہ کہے بنا نہ رہتے کہ قسمت کا لکھا کہاں چھپا ہوا ہے؟ ذرا سا دکھا دو گے؟ شاید بیچارے کے نیچے؟ براہمنوں نے اعلان کیا کہ بیگم کے ہاں چاند کی طرح خوبصورت بچے کی ولادت ہوگی، لیکن ایک مشکل ہے۔ کیسی مشکل؟ مشکل یہ ہے کہ بارہ سال کی عمر تک لڑکے کو کڑی نگرانی میں رکھنا پڑے گا، کیونکہ بارہ سال کی عمر سے پہلے لڑکے کے کھو جانے کا اندیشہ ہے۔

— کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ؟ نواب کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

— نہیں، نہیں، خدانخواستہ ہم شہزادے کی موت کی بات نہیں کر رہے ہیں، لیکن شاید وہ کھو جائے۔ اس لیے اسے ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا ہوگا، حضور۔

— آپ لوگوں کے کہے کے مطابق سارا انتظام کیا جائے گا، لیکن کرنا کیا ہوگا؟

— بارہ سال کی عمر تک شہزادے کو محل سے باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی، حضور۔ یہاں تک کہ چھت پر بھی نہیں۔

— کیوں؟

— یہ ظاہر ہوا کہ کوئی پری شہزادے پر عاشق ہو جائے گی۔

— اور پھر؟

— شہزادے کسی اور مہ جبیں سے محبت کرنے لگیں گے۔

ذرا سوچیے، منٹو بھائی، لڑکا ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اس سے پہلے ہی اس کی آشنائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کیوں برادران، مزہ آ رہا ہے نا؟ سنتے رہیے، سر چکرانے والے اور کتنے ہی واقعات رونما ہوں گے۔ جس بات کی شروعات آشنائی سے ہو، وہ کھیل کیا آسانی سے روکا جا سکتا ہے؟ تو سال بھر کے اندر ہی، نواب کی بیگم نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ سارا شہر خوشی سے جھوم

اٹھا۔ حافظؔ کا یہ شعر سنیے ۔

شگفتہ شد گل حمرا و گشت بلبل مست
صدائے سرخوشی اے عاشقانِ بادہ پرست

سرخ پھول کھل گیا اور بلبل مست ہوگئی، اے بادہ پرست عاشقو، مستی کی صدا بلند کرو

اور معلوم ہے اس لڑکے کا نام کیا رکھا گیا؟ بے نظیر۔ نواب نے اپنی رعایا میں بے حساب دولت بانٹی۔ سارے شہر میں چھ دن تک رقص و سرور کا بازار گرم رہا، ضیافتیں، مے نوشی اور بدمستیاں چھائی رہیں۔ نواب اتنا خوش تھا کہ اس نے کئی زرخرید غلاموں کو بھی رہا کر دیا۔ یہ ہوتی ہے شاہانہ فیاضی۔ جہاں پناہ ظفر کے دور میں ایسی فیاضی کہاں تھی۔ وہ تو بس غریبوں کو ایک وقت اچھا کھانا کھلا دینے تک محدود تھی۔

شہزادے کے لیے ایک نیا محل تعمیر کروایا گیا جس کے گرد ایک باغ تھا۔ یہ ایک بے مثال محل تھا۔ باغ صنوبر اور دوسرے درختوں سے بھرا ہوا تھا جہاں ہمہ وقت پرندے نغمہ سرائی میں مشغول رہتے۔ لاتعداد خدام اور کنیزیں ہر وقت بے نظیر کو گھیرے رہتیں کیونکہ حکم تھا کہ شہزادہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ کچھ ہی برسوں میں بے نظیر نے لکھنے پڑھنے کے علاوہ گھڑ سواری، تیراندازی، نقاشی اور نشانہ بازی میں مہارت حاصل کر لی۔ لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کا دل بہت اچھا تھا، غلام اور خادمائیں گویا اس کے بھائی بہن تھے، وہ انھیں اپنے خاندان کے افراد سمجھتا تھا۔ کیا اس کا نام بالکل موزوں نہیں تھا، برادران؟ وہ واقعتاً حافظؔ کے بیان کردہ سرخ گلاب کی مانند تھا، جو اپنی مہک بکھیرنے اس دنیا میں آیا تھا۔

بے نظیر کی بارہویں سالگرہ کے موقع پر نواب ملک شاہ نے اعلان کیا کہ شہزادے اس دن شہر کا دورہ کرنے نکلیں گے۔ حسین کنیزوں نے بے نظیر کو خوشبودار تیل مل کر نہلایا اور اسے یوں آراستہ کیا کہ وہ مصور بہزاد کی کوئی تصویر نظر آنے لگا۔ بے نظیر نے جونہی محل سے قدم نکالا اس پر موتی نچھاور کیے جانے لگے، اپنا اپنا حصہ لوٹنے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ شہر کے ہر مکان اور ہر دکان کو نقش و نگار سے مزین پارچوں سے سجایا گیا تھا۔ چاروں طرف قدِ آدم آئینے

رکھے گئے تھے جن سے سورج کی روشنی منعکس ہو کر سات رنگ بکھیر رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ ان آئینوں میں جلوس کی سج دھج بھی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً شہزادے کا، شہر کا پہلا دورہ ہر ایک کی یادداشت میں حروفِ زریں سے نقش ہو گیا۔

لیکن ان سے حساب میں ایک ایسی غلطی ہوگئی تھی جس کے بارے میں نواب یا کسی اور نے سوچا بھی نہ تھا۔ اجتنا کے بارہ برس پورے ہونے میں ابھی ایک رات باقی تھی۔ یہ پورے چاند کی رات تھی، چاندنی سے سارا محل روشن تھا اور دن بھر کے ہیجان کے بعد بے نظیر پر نیند کا غلبہ تھا۔ ایسی چاندنی رات میں، اس کے دل میں، محل کی چھت پر سونے کی خواہش جاگی۔ یہ ہوتا ہے قسمت کا لکھا، منٹو بھائی۔ آپ کبھی نہیں جان سکتے کب کوئی خواہش خبردار کیے بغیر جاگ اٹھے اور آپ کو کس خمار میں لے جائے۔ تو چھت پر ہی شہزادے کے لیے پلنگ بچھا کر ایک بستر آراستہ کیا گیا، چاند کی نرم روشنی اور پھولوں کی لطیف مہک میں بے نظیر سو گیا۔ شہزادے کی نگہداری کے لیے متعدد خدام اور کنیزیں آس پاس موجود تھیں لیکن اچانک کہیں سے خوشبو بکھراتی ہوئی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، اور اس ہوا کے چلتے ہی سب سو گئے۔ بے نظیر کی زندگی میں کیا کچھ رونما ہونے والا تھا، اس کا مشاہدہ کرنے والا صرف آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھا۔

کیا آپ کو معلوم ہے، برادران! وہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کون لایا تھا؟ وہ ایک پری تھی۔ وہ آسمان میں رات کے اس پہر اپنے اُڑنے والے تخت پر بیٹھ کر گھومنے نکلی تھی۔ مجھے اجازت دیجیے، منٹو بھائی، کہ اس پری کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ یہاں بہت سے ایسے ہیں، جو میرے آنے کے بہت بعد ان قبروں میں آئے ہیں، ان کے لیے پری کا مطلب ہے مہین پروں والی حسین عورت۔ یہ سارا گوروں کا تخیل ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں فارسی میں ہم کسے پری کہتے ہیں؟ ایک غیر مرئی روح جو خوبصورت عورت کا روپ بدل کر کسی مرد کی زندگی میں آ جائے۔ جانتے ہیں کیوں؟ اصل میں محبت کا فریب دے کر وہ آدمیوں کو قیدی بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ انھیں اپنی خواہشات کے تابع رکھنا چاہتی ہیں، ان کی حکم عدولی کا مطلب ہوتا ہے موت۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے محبت اسی طرح تو ہماری زندگیوں میں آتی ہے، ہر معاشقے کا مطلب ہے، ایک موت۔ کیا یوں نہیں ہے کہ ہم سب ازل تک کے لیے کسی الگ الگ پری کے قیدی ہیں، منٹو بھائی؟

اُس پری کا نام ماہ رُخ تھا۔ بے نظیر کی وجاہت دیکھ کراس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کیا دنیا میں اتنا خوبرو مرد بھی ہوسکتا ہے؟ ہاں ہوسکتا ہے، جیسا کہ وہ دیکھ ہی رہی تھی۔ اوہ، یہ مجھے چاہیے، اگر میں اسے اسیر نہ کرسکی تو میں کیسی پری ہوں؟ ماہ رُخ چھت پر اُتر آئی، اُسے محسوس ہوا کہ یہ رات ماہِ کامل کی وجہ سے نہیں بلکہ بے نظیر کے حُسن کے نور کی وجہ سے اتنی طلسمی ہے۔ سوئے ہوئے بے نظیر کے لبوں کو اس نے اپنے لبوں سے چھوا۔ اور پھر؟ پھر وہ اسے دور اپنے پرستان میں اڑا لے گئی۔

جب کنیزیں اور خدام نیند سے جاگے تو انھوں نے دیکھا کہ شہزادہ غائب ہے۔ کہاں گیا وہ؟ سارا محل اور باغ چھان مارنے پر بھی اس کا سراغ نہ ملا۔ نواب اور اس کی بیگم رو رو کر بے حال ہوگئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ باغ کے سارے پیڑ پودے، پھول، پرندے اور آبشار رونے لگے۔ آہ، منتوں مرادوں سے پایا ہوا ان کا پیارا شہزادہ کہاں گیا؟ کون لے گیا اسے؟ سارے ملک میں ڈھونڈنے پر بھی اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

بے نظیر، پری ماہ رُخ کے پرستان میں قید رہا۔ برسوں گزر گئے لیکن وہ اپنے گھر کو نہ بھول پایا۔ ترغیبات کے ذریعے اسے حاصل کرنے کی ماہ رُخ کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ تب ایک دن اس نے بے نظیر سے کہا، 'تم میری قید میں ہو۔ جانتے ہو نا؟'

—جانتا ہوں۔

—تو پھر تمھیں میرا حکم ماننا ہوگا۔

—مجھے میرے گھر لے چلو۔

—یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں تمھیں اداس نہیں دیکھ سکتی، بے نظیر۔ میں تمھیں چاہتی ہوں۔

—تو پھر مجھے میرے گھر لے چلو۔ بے نظیر نے ماہ رُخ کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا۔

ماہ رُخ ہنس پڑی—قیدی گھروں کو نہیں لوٹا کرتے۔ بے نظیر، لیکن میں تمھارے لیے اتنا کرسکتی ہوں کہ روز شام کو جب میں اپنے والد سے ملنے جاتی ہوں، اُس وقت تم بھی گھوم پھر کے آسکتے ہو۔ میں تمھیں ایک جادوئی گھوڑا دیتی ہوں۔ تم اس گھوڑے پر چند گھنٹوں کے لیے سیر و تفریح کرسکو گے۔ اس سے تمھارا دل بہلا رہے گا۔ جہاں بھی تم جانا چاہو جادوئی گھوڑا تمھیں

لے جائے گا۔ لیکن تمھیں عہد کرنا ہوگا کہ تم چاہے جہاں بھی جاؤ، اپنا دل کسی اور کو نہیں دو گے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمھیں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔ یاد رہے مجھے تم سے چاہے جتنی بھی محبت ہو، آخر تم میرے قیدی ہو۔

بے نظیر نے ماہ رُخ کی تجویز قبول کرلی۔ اور چارہ ہی کیا تھا؟ آپ لوگوں کو پریوں کی دی ہوئی سزا کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں، برادران، وہ دوزخ سے بھی زیادہ بھیانک ہوتی ہے۔ ایک رات جادوئی گھوڑے پر سیر کرتے ہوئے بے نظیر کو نیچے ایک خوبصورت باغیچہ دکھائی دیا۔ اس باغ کے اندر، چاند کی روشنی میں ایک شاندار محل جگمگا رہا تھا۔ باغ میں اُتر کر بے نظیر یہ دیکھنے کے لیے ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا کہ کوئی کہیں ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک آبشار کے پاس کچھ نوجوان لڑکیوں کو دیکھا۔ اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس نے ان کے بیچ کیا دیکھا؟ تاروں کے جھرمٹ میں روشنی سے بھرے ہوئے چاند کا منظر۔ وہ شہزادی بدرِ منیر تھی۔ کسی نواب سعود شاہ کی دخترِ نیک اختر۔ ململ کی مہین پوشاک میں اس کا حُسن، کسی فانوس میں جلتی شمع کی طرح جھلک رہا تھا۔ بے نظیر کے لیے اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل تھا۔ پھر اسے پری ماہ رُخ کی بات یاد آئی۔ اپنا دل کسی کو مت دینا، بے نظیر۔ لیکن بے نظیر کیا کرتا؟ دل تو اُس نے پہلی نظر میں ہی دے دیا تھا۔ ہماری زندگیوں میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، برادران۔ نظروں سے نظریں ملیں اور چنگاری بھڑک اٹھی۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ درحقیقت ہماری زندگی قیدیوں ہی کی طرح کٹتی تھی۔ ہماری زندگیوں میں محبت اور شادی کے بیچ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ محبت کا مطلب ہی گناہ تھا۔ عورتوں کی جگہ زنان خانوں میں تھی۔ انھیں اپنے بھائیوں بیٹوں کے علاوہ کسی اور کی طرف دیکھنا بھی منع تھا۔ اور مرد کسی عورت کی طرف بھی نگاہ نہ کرسکتے تھے۔ اس لیے ایک بار اگر کسی سے آنکھیں چار ہوجاتیں تو بس کام ہوجاتا۔ محبت کرنا گناہ ہے۔ اس کی اجازت نہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہوسکے ان کی شادی کردو۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلتا تھا؟ مرد کوٹھوں پر جانے پر مجبور ہوجاتے اور عورتیں خفیہ تعلقات قائم کرلیتیں۔ یہ انسانی فطرت ہے، منٹو بھائی، انسانی فطرت— اسے بھلا کون روک سکتا ہے؟ کیا کوئی میر صاحب کو روک سکا؟ نہیں روک سکے اسی لیے تو انھیں دیوانہ قرار دے دیا گیا۔ سماج تو بس یہی کرسکتا ہے، منٹو بھائی۔ اگر آپ کو تسلیم نہیں کرسکتا تو آپ

پر پاگل ہونے کا ٹھپا لگا دے گا۔ تب آپ مہذب معاشرے سے باہر ہو جائیں گے۔ تمدن سے باہر۔ گونگے، بہرے، بے زبان۔

ہاں، بتاتا ہوں اس کے بعد کیا ہوا۔ اس دن پہلی بار بے نظیر کی نظریں بدر منیر سے ملیں۔ مجھے میر صاحب کا شعر یاد آرہا ہے ؎

گر میاں حصّل رہیں باہم
نے تساہل ہو، نے تغافل ہو

بے نظیر کی وجاہت دیکھ کر بدر منیر کے ہوش اڑ گئے۔ اس کی سہیلی نجم النساء وزیرِ اعظم کی دختر تھی اور خود بھی بے حد حسین تھی، اس نے اس پر عرقِ گلاب چھڑکا اور اسے ہوش میں لائی۔ جب شہزادی کے حواس بحال ہوئے تو وہ دکھاوے کا غصہ کرنے لگی اور بگڑ کر بولی: 'یہ کس کی جرأت ہے جو یوں میرے باغ میں گھس آیا؟' اصل میں تو اس غصے میں اور ہی طرح کی آگ جل رہی تھی۔ شروع شروع کی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہے نا؟ جھوٹ موٹ جھگڑنے کا کھیل ہوا اور بناوٹ دکھائی گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف چپ چاپ دیکھا کیے۔ بعد ازاں بے نظیر نے شہزادی کو اپنی ساری روداد کہہ سنائی — یہاں تک کہ پری ماہ رُخ کے پاس قیدی ہونے کا احوال بھی بتا دیا۔ معلوم ہے بدر منیر نے کیا کہا: 'میں تمھیں کسی کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔ تم اپنی پری کے پاس ہی رہو۔ یہاں دوبارہ مت آنا۔' بے نظیر نے شہزادی کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا: 'میں یہ جاننا بھی نہیں چاہتا کہ ماہ رُخ مجھے چاہتی ہے یا نہیں، میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس وقت مجھے واپس جانا ہوگا۔ میں اپنا دل تمھارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں، اب صرف یہ جسم ہی لوٹے گا ماہ رُخ کے قید خانے میں۔'

اگلے دن بے نظیر کی آمد پر ہر چیز نک سک سے درست تھی۔ بدر منیر یوں بج دھج سے تیار ہوئی تھی گویا یہ اس کی شادی کی رات ہو۔ اس کا حجلہ پھولوں اور عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ خاصہ چنا ہوا تھا اور صراحی اور پیالے سب تیار تھے۔ فارسی شاعروں جوہری اور نظیری کے دیوان بستر کے سرہانے رکھے تھے۔ بے نظیر وقتِ مقررہ پر آگیا۔ کچھ دیر گفت و شنید کے بعد دونوں بستر پر آگئے اور مے نوشی کرتے ہوئے ایک دوسرے سے یوں ہم آغوش ہوگئے کہ اس کی

تفصیلات سے انصاف کرنا ممکن نہیں۔ جب وہ حجلے سے باہر آئے تب بے نظیر اور بھی زیادہ دمک رہا تھا اور بدر منیر حیا سے سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن وقت پر لگا کر اُڑ گیا تھا اور بے نظیر کو لوٹ جانا پڑا۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔

لیکن انسان کی زندگی میں حقیقی مسرت زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ پری ماہ رُخ کو ساری بات کا علم ہوگیا، ایک دن اس نے اپنی آنکھوں سے بھی سب دیکھ لیا۔ اس دن جب بے نظیر لوٹا تو ماہ رُخ غضب ناک ہوگئی۔ اس کے منہ سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔ غدار، سزا کے لیے تیار ہو جا۔' اس نے ایک جن کو بلا کر حکم دیا: 'اسے لے جا کر تپتے ہوئے ریگستان کے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو اور کنویں کے منہ کو چٹان سے ڈھک دو۔' جن دن میں ایک بار اسے تھوڑا سا کھانا دے آتا۔ اس اندھے، خشک کنویں میں بے نظیر کی اسیری کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اُدھر بدر منیر انتظار کرتے کرتے کسی خزاں رسیدہ پھول کی مانند مرجھا گئی۔ آپ ایسے پھول کو ایک نظر دیکھ بھی نہیں سکتے۔ کتنے ہی دن اس نے بے خوابی میں گزار دیے۔ پھر ایک رات اسے آخر نیند آگئی ،اور اسے خواب میں ریگستان کا وہ کنواں دکھائی دیا۔ کنویں کے اندر سے بے نظیر کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ بدر منیر کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا خواب سن کر، اس کی سہیلی نجم النساء نے کہا، بس اب اور آنسو مت بہاؤ۔ اگر میں زندہ بچ گئی تو بے نظیر تمھیں ضرور ملے گا۔' اور جوگن کا بھیس بدل کر، کاندھے پر بین دھر کر نجم النساء نکل کھڑی ہوئی۔

پورے چاند کی ایک رات وہ ریگستان میں بیٹھی وینا بجا رہی تھی۔ چرند پرند اس کی بینا کی آواز سن کر اپنا سُر بھول جاتے تھے، ٹھنڈی ہوا درختوں سے لگ لگ کر چل رہی تھی اور چاند اس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جنوں کا شہزادہ فیروز شاہ اپنے اُڑن تخت پر بیٹھا وہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ نجم النساء کو دیکھ کر زمین پر اُتر آیا اور دیکھتے ہی پہچان گیا کہ جوگن کے بھیس میں دراصل یہ کوئی حسین دوشیزہ ہے، وہ پہلی نظر میں نجم النساء پر عاشق ہوگیا۔ اس کی نیت بھانپ کر نجم النساء نے کہا: 'خدا سے لو لگاؤ یا پھر یہاں سے لوٹ جاؤ۔' فیروز شاہ نے جواب دیا: 'ٹھیک ہے میں لوٹ جاؤں گا، لیکن میں تمھارا ساز سننا چاہتا ہوں۔' نجم النساء نے ساز بجانا شروع کیا، بجاتے بجاتے صبح ہوگئی۔ یہاں تک کہ فیروز شاہ جیسا مرد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

عورت کیا نہیں کر سکتی، منٹو بھائی۔ اس کے بعد کیا ہوا جانتے ہیں؟ فیروز شاہ، نجم النساء کو اپنے اُڑن تخت پر بٹھا کر اپنے والد کے دربار میں لے آیا۔ نجم النساء کو یہاں بھی شاہِ جنات کے حکم پر بینا بجانی پڑی اور اس کا ساز سن کر کوئی بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔ اور فیروز شاہ؟ اس عورت کے بغیر میری زندگی بے معنی ہے۔ اُس نے نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ نجم النساء شاہِ جنات کے محل ہی میں مقیم ہو گئی اور فیروز شاہ کے ساتھ کھیل کھیلنے لگی۔ کبھی اس کے ساتھ نرم ہو جاتی تو کبھی گرم۔ ایک دن فیروز شاہ اس کے پاؤں پڑ گیا، 'مجھے کیوں اتنا ستاتی ہو؟ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔' موقع کو بھانپ کر نجم النساء نے مسکراتے ہوئے کہا، 'جو میں کہتی ہوں وہ غور سے سنو۔ اگر تم میرے کہے پر عمل کرو گے تو اس کا فائدہ تمھیں بھی ہوگا۔'

— کہو مجھے کیا کرنا ہوگا؟

— تم تو جن ہو، تم اگر چاہو تو بہ آسانی پتا لگا سکتے ہو کہ ماہ رُخ نے بے نظیر کو کہاں قید کر رکھا ہے۔ تمھارے مدد کرنے سے بے نظیر بچ جائے گا اور تم بھی اپنے دل کی مراد پا سکو گے۔'

فیروز شاہ کے حکم پر جنات، بے نظیر کی تلاش میں چاروں طرف نکل پڑے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ ایک جن بے نظیر کا کھوج نکال لایا۔ فیروز شاہ نے سخت لفظوں میں ماہ رُخ کو ایک خط لکھا کہ اگر اس نے بے نظیر کو رہا نہ کیا تو اسے کڑی سزا ملے گی اور اسے قسم کھانا ہوگی کہ وہ آئندہ کسی انسان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھے گی۔ ماہ رُخ نے اپنا قصور تسلیم کرتے ہوئے یہ گزارش کی کہ اس بارے میں اس کے والد کچھ نہ جان پائیں۔ اس طرح آخر کار بے نظیر کو رہائی ملی۔

اس کے بعد تخت پر بیٹھ کر فیروز شاہ، بے نظیر اور نجم النساء، بدرِ منیر کے پاس پہنچے۔ یہ دیکھ کر کہ بے نظیر لوٹ آیا ہے، بدرِ منیر کے ہوش اڑ گئے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو نجم النساء نے اسے بتایا، 'بے نظیر کو تمھارے پاس واپس بلانے کے لیے مجھے کسی اور کو قیدی بنانا پڑا۔ اب مجھے اسے واپس بھیجنا ہوگا۔' اور پھر؟ پیار کرنے والے جوڑے ساری رات چہلیں کرتے رہے۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ باتیں بھی کیسا جال ہوتی ہیں، منٹو بھائی، اگر لوگ اسے سمجھ سکیں۔

بے نظیر نے بدرِ منیر کے والد شاہ مسعود کو ایک خط لکھا، جس میں اس نے اپنا تعارف کروایا

اور نکاح کا پیغام دیا۔ نواب نے بہ خوشی اس پیغام کو قبول کر لیا۔ مسعود شاہ کا نگر خوشی سے جھوم اٹھا۔ بے نظیر اور بدرِ منیر کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ کیسی تھی وہ شادی؟ میں تو مدت سے اس قبر میں سویا ہوا ہوں کہ اسے بیان کرنے والی زبان ہی بھول چکا ہوں۔ اس کے بعد بے نظیر کی درخواست پر، نجم النساء کے والد بھی اس کی شادی فیروز شاہ کے ساتھ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ فیروز شاہ اُڑن تخت پر بیٹھ کر نجم النساء کے ساتھ اپنی دنیا کو روانہ ہو گیا۔

برادران، کیسی لگی ہم دونوں کے بدنصیبی کے قصوں کے بیچ، خوشی پر ختم ہونے والی یہ پیاری کہانی؟ لیکن اس مثنوی کو لکھ کر میر حسن کو کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں۔ بس اتنے دنوں کے بعد، قبر کے اس اندھیرے میں، میں آپ لوگوں کو یہ حکایت سنا سکا۔ ایک شاعر کے نصیب میں اس کے علاوہ ہوتا بھی کیا ہے۔ بتائیے!

۱۲

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

کیا بات ہے، مرزا صاحب۔ دوزخ کو گلزار بنادیا۔ لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں، بے نظیروں اور بدر منیروں کی کہانیاں کہاں کھو گئیں؟ آپ نے غور کیا ہمارے دوست کتنے مستعد ہو گئے ہیں؟ جیسے کہ عزیز کے ہوٹل میں ہماری میز پر شاہی کبابوں کی پلیٹ رکھی گئی ہو۔ اب کباب اور چرس کے ساتھ موج مستی کا اور مزہ آئے گا۔ ہمارے کیپٹن واحد کسی اور لڑکی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، اچھی بات ہے، لیکن کسی لڑکی کے پیچھے ہروقت دیوانوں کی طرح پڑے رہنے کی کیا کوئی تک ہے، مرزا صاحب؟ کیپٹن کو ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ لڑکی اگر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تو؟ ارے بھاگتی ہے تو بھاگ جانے دو۔ کیا دنیا میں رنڈیوں کی کمی ہے؟ معاف کیجیے گا، مرزا صاحب، میں اپنی زبان کبھی سنبھال نہیں سکتا۔ اگر عصمت کی موجودگی میں ایسا کوئی لفظ میری زبان سے نکل جاتا تو وہ بس بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہتی، عصمت وہ واحد عورت تھی جو مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہہ سکتی تھی، 'ابے حرامی، رنڈی کسے بول رہا ہے؟ تجھے کس رنڈی نے جنا ہے؟' ویسے اس نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ عصمت کا حسنِ اخلاق بے مثال تھا۔ وہ بس بڑی بڑی آنکھوں سے گھورا کرتی تھی، اب آپ کو سب مطلب اسی سے اخذ کرنا ہوتے تھے۔ چلیے چھوڑیے عصمت کی باتیں، دیکھ رہے ہیں نا یہ سب لوگ عزیز کے جہنم کا قصہ سننے کے لیے بے چین

ہو رہے ہیں۔

تو ایک دن ہمارا کیپٹن آندھی سے ٹوٹی ہوئی کسی بیل کی طرح ٹیبل پر اوندھا پڑا ہوا تھا، شاید کئی دن سے لڑکی کے ساتھ اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اسے خوش کرنے کی کتنی کوشش کی، پر وہ سالا کچھوے کی طرح سکڑا ہی رہا۔ اس پر ہماری ہنسی مذاق اور گالیوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ خدا کی پناہ، یہ کیسا مجنوں تھا، اور ذرا اس کا نام تو دیکھیے، کیپٹن۔ کیپٹن واحد۔ ہماری ہزار کوششوں کے بعد آخرکہیں اس نے روہانسا ہو کر کہا، 'لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں، سعادت بھائی؟'

— کیا مطلب؟

— کیا وہ پیار کرنا جانتی ہیں؟

— مجھے کیا معلوم۔ مجھے طیش آ گیا۔

— ارے یار، بتا نا ہمیں— عاشق نے میری پیٹھ پر دھول جماتے ہوئے کہا، 'تو کیپٹن کو اپنی اُس بلّی کی کہانی سنا دے۔ پھر یہ ساری زندگی صرف ایک ہی لڑکی کے پیچھے دُم ہلاتا نہیں پھرے گا۔'

میز پر قہقہہ گونج اٹھا۔ نمناک آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کیپٹن بولا، 'مگر میں تو لڑکیوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا، اس میں بلّی کہاں سے آ گئی؟'

— یہ منٹو تجھے بتائے گا۔ عاشق نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری، دوسرے لفظوں میں وہ کہہ رہا تھا، جلدی بتا یار۔ سالے کیپٹن کے عشق کی ایسی تیسی۔ عاشق لوگوں کو تنگ کرنے میں استاد تھا۔ میں نے کیپٹن کو دلاسا دیتے ہوئے کہا، 'دیکھ کیپٹن، اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میں بلّیوں اور لڑکیوں کو کبھی نہیں سمجھ پایا۔'

— لیکن کیوں؟ بلّی بلّی ہوتی ہے اور لڑکی لڑکی۔ اس میں سمجھ نہ آنے والی بات کیا ہے؟

— ہمارے گھر میں ایک بلّی تھی، سمجھے۔ سال میں ایک بار وہ مردود بلّی یوں زور زور سے روتی تھی کہ کیا بتاؤں۔ بلّی کو روتے تو ضرور سنا ہوگا تم نے۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا بین کر رہی ہو۔ اس بلّی کا رونا سُن کر کہیں سے ایک بلّا آ جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد دونوں میں جھگڑا، مارا ماری ہوتی۔ یہاں تک کہ دونوں خونم خون ہو جاتے۔

—اس کے بعد؟

—اس کے بعد کیا ہوتا؟ وہ لڑکی چار بچوں کی ماں بن جاتی۔ اتنے رونے دھونے اور مار پیٹ کا نتیجہ—چار بچے۔

—تو سالا حرامی کی اولاد ہے۔ یہ کہتے ہوئے کیپٹن دوبارہ میز پر اوندھے منہ پڑ گیا، اور عزیز کا ہوٹل قہقہوں اور سیٹیوں کی آواز سے بھر گیا۔

لیکن مرزا صاحب، ان سب فضولیات کے باوجود مجھے مزہ نہیں آرہا تھا۔ میں جوا کھیل کھیل کر تھک چکا تھا، اور عزیز کے ہوٹل میں گزرنے والی محفلیں اور شامیں مجھے کچھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ معلوم ہے میرے ذہن میں کیا خیال آیا؟ یہ کہ اصل میں مجھے کچھ اور کرنا ہے۔ لیکن کیا؟ اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، مرزا صاحب۔ تب اچانک ایک دن گھڑی کی سوئیوں نے اپنی سمت تبدیل کر لی۔ شاید اسی طرح زندگی ہمیں بن مانگے بہت کچھ دیتی ہے۔ بشرطیکہ ہمارے اندر اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔

برادران، یہ وہی عزیز کا ہوٹل تھا جہاں میری زندگی نے ایک دوسرا موڑ لیا۔ میری ملاقات باری علیگ اور عطا محمد چغتائی سے ہوئی۔ یہ لوگ عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ کبھی کبھی عزیز کے ہوٹل میں چائے پینے آتے تھے۔ عبدالرحمٰن صاحب نے تب 'مساوات' کے نام سے ایک اخبار شروع کیا تھا۔ باری صاحب اسی اخبار میں کام کرتے تھے۔ ایک دن عزیز کے ہوٹل پر میں باری صاحب کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور بھی کئی لوگ تھے۔ اچانک سزائے موت کے حوالے بات چھڑ گئی۔ سزائے موت دینا صحیح یا غلط؟ کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی مجرم کو موت کی سزا سنا دے؟ ذرا ہمیں سمجھائیے ہمر۔ میں نے باری صاحب سے درخواست کی۔ اگر میں آپ کا قتل کر دوں تو مجھے کیوں قتل نہیں کیا جا سکتا؟ انھوں نے بھاری بھرکم دلیلیں پیش کر کے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ خون کے بدلے خون کوئی حل نہیں ہے۔ ایسا کوئی اخلاقی اصول نہیں ہے جو موت کی سزا کو جواز فراہم کر سکے۔ اسی دوران کسی نے وکٹر ہیوگو کی کتاب 'دی لاسٹ ڈیز آف کنڈیمنڈ' کا ذکر کیا۔ آپ نے وکٹر ہیوگو کے بارے میں نہیں سنا ہوگا، مرزا صاحب۔ وہ فرانس کا ایک عمدہ شاعر اور ناول نگار تھا۔ میں چونک پڑا کیونکہ یہ کتاب میرے گھر پر موجود تھی۔ 'یہ کتاب

میرے پاس موجود ہے۔' میں نے فوراً باری صاحب سے کہا۔ 'کیا آپ اسے ایک مرتبہ پھر پڑھنا چاہتے ہیں؟'

باری صاحب دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔ پتا نہیں وہ کیا دیکھ رہے تھے، پھر انھوں نے کہا: 'کل کتاب لے کر میرے دفتر آنا۔'

میں رات بھر نہ سو سکا، مرزا صاحب۔ عجیب سا فخر محسوس ہو رہا تھا۔ ہیوگو کی جس کتاب کا ذکر باری صاحب نے کیا، وہ کتاب میرے پاس ہے اور میں کل انھیں وہ کتاب دے سکوں گا۔ اچھا، کتاب تو میں دے دوں گا لیکن میں ان جیسے آدمی کے ساتھ بھلا کیا بات کروں گا؟ اور وہ بھی میرے ساتھ کیا بات کریں گے؟ سوچتے سوچتے میں نے ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا ایک خاکہ سا تیار کر لیا۔ کہانیاں بھی اسی طرح میرے اندر جنم لیتی تھیں، مرزا صاحب۔ ایک چہرہ میرے دماغ میں ابھرتا تھا اور میں ایک کہانی بُننے لگتا تھا، اور کردار زندہ ہوتے چلے جاتے تھے۔

باری صاحب نے مجھے اپنے پروں کے نیچے لے لیا۔ میں روز ان کے اخبار کے دفتر جانے لگا۔ میں ان کے دلائل، ان کی لیاقت اور چیزوں کو سراہنے کی ان کی قابلیت سے سرشار ہوا تھا۔ بعد میں، میں نے 'گنجے فرشتے' میں ان کا خاکہ لکھا۔ ایسے آدمی کو ساری زندگی نہیں بھولا جا سکتا۔ لیکن وہ ساتھ ہی تھوڑے سے بزدل بھی تھے۔ مگر جب آپ ان سے گفتگو کرتے تھے، جب آپ ان کے قہقہے سنتے تھے تو آپ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ باری صاحب میرے اندر کی بے قراری کو سمجھ گئے۔ انھوں نے مجھے اردو ادب کا مطالعہ کرنے کو کہا۔ انھی کی ہدایت پر میں نے گورکی اور گوگول اور پشکن اور چیخوف اور آسکر وائلڈ کو پڑھنا شروع کیا۔ یہ سب دنیا کے بڑے بڑے ادیب ہیں، مرزا صاحب، ان لوگوں کی تحریریں پڑھتے ہوئے مجھے اپنی راہ صاف اور سامنے نظر آنے لگی—میں بھی ادیب بنوں گا، لکھنا ہی میرا مقصد ہو سکتا ہے۔ معلوم ہے اس کے بعد باری صاحب نے کیا کیا؟ مجھ سے ہیوگو کا 'دی لاسٹ ڈیز آف کنڈیمنڈ' کا اردو ترجمہ کروایا۔ میں لگاتار دو ہفتوں تک اس کام میں لگا رہا۔ شراب کی ایک بوند نہیں چھوئی۔ اس کے بعد میرا ترجمہ 'اسیر کی سرگزشت' کے عنوان سے لاہور کے 'اردو بک اسٹال' سے شائع ہوا۔ اب میں بھی کچھ تھا۔ تو تم سمجھتے تھے میں بیکار ہوں، سالے حرامزادے۔ یہ دیکھو سالو، یہ دیکھو۔ اس

کتاب کے اوپر سعادت حسن منٹو کا نام ہے۔

میں نے 'مساوات' کے لیے باقاعدگی سے فلموں پر تبصرے لکھنا شروع کیے۔ باری صاحب کا کہنا تھا کہ افسانہ نگار منٹو کا جنم انھی تبصروں کے بیچ ہوا تھا۔ تب میں ایک ساتھ کئی کام کرنا چاہتا تھا، مرزا صاحب۔ میں نے حسن عباس کے ساتھ مل کر آسکر وائلڈ کے ڈرامے 'ویرا' کا ترجمہ کیا۔ میں نے شراب کی ایک بوتل لی اور اختر شیرانی کے پاس پہنچ گیا۔ ساری رات شیرانی صاحب نے شراب پی اور میرے مُسوّدے کو درست کیا۔ اسی زمانے میں، میں نے متعدد روسی کہانیوں کا بھی ترجمہ کیا، جو 'ہمایوں' اور 'عالمگیر' نامی رسالوں میں شائع ہوئیں۔

اچانک ایک دن 'مساوات' بند ہو گیا۔ باری صاحب ایک اخبار کی ملازمت کے لیے لاہور چلے گئے۔ میں ابوسعید قریشی، عباس اور عاشق، باری صاحب کے ساتھ امرتسر کی گلیوں میں گھوما کرتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو 'فری تھنکرز گروپ' کہا کرتے تھے۔ ہم جو چاہتے کر سکتے تھے۔ جو چاہتے سوچ سکتے تھے۔ ہم نے انقلاب کے بارے میں بھی سوچا۔ میں نے اور عباس نے تو نقشہ دیکھ کر، بذریعہ سڑک روس جانے کا بھی منصوبہ بنایا۔ لیکن باری صاحب کے لاہور چلے جانے کے بعد میں پھر سے بیکار ہو گیا۔ لکھنے پر بھی توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ کسی کسی وقت جوئے کے اڈّے پر جانے کا خیال آتا۔ لعنت ہو، کم از کم وہاں وقت تو آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ لیکن تب مزید جوا کھیلنے کا جوش نہیں رہا تھا، مرزا صاحب۔

ہمیں خبر ملی کہ باری صاحب نے نیا ہفتہ وار رسالہ 'خلق' شروع کیا ہے۔ میں اور حسن عباس جا کر ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ رسالے کے پہلے شمارے میں باری صاحب کا مضمون 'فرام ہیگل تو مارکس' شائع ہوا— کیا ہوا؟ آپ سب لوگ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ آپ لوگوں کی آنکھوں سے لگتا ہے جیسے آپ سب کو نیند آ رہی ہے۔ کیا آپ کو بھی مرزا صاحب؟ معاف کیجیے گا، برادران، مجھے آپ کو کہانیاں سنانی تھیں، لیکن میں یہاں تاریخ کی گرفت میں آ گیا، پتا ہی نہیں چلا۔ مجھے خود پر ہنسی آ رہی ہے، لعنت ہے، ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خودنوشت لکھنے بیٹھا ہوں۔ اسی لیے میں بیچ بیچ میں اپنے آپ کو کہتا رہتا ہوں...... سالے سؤر کے بچے، تو یہاں اس قبر میں اپنی آپ بیتی سنانے آیا ہے؟ لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے بس ایک

بات اور کہہ لینے دیجیے، 'خلق' کے پہلے شمارے میں میرا پہلا افسانہ 'تماشا' شائع ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کہانی بہت خام ہے اس لیے میں نے اس افسانے پر اپنا نام نہیں دیا۔ اس افسانے کی کہانی ایک سات سالہ بچے کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے زمانے کے بارے میں تھی۔ آپ لوگوں کو ضرور یاد ہوگا۔ ۱۹۱۹ء میں میری عمر سات سال ہی کی تھی۔ میں ہمیشہ اپنے افسانوں کا حصہ رہا ہوں۔

اچھا، چلیے میں آپ کو اپنی شراب نوشی کے کچھ قصے سناتا ہوں۔ دیکھیے، دیکھیے، مرزا صاحب، اب ان سب کی آنکھیں کیسے چمکنے لگیں۔ لیکن کیا فائدہ؟ یہاں ان قبروں میں ہمیں شراب تو ملنے سے رہی، جس طرح گائے جگالی کرتی ہے نا، آپ لوگ بھی اپنی مے نوشی کے دنوں کی یاد کی جگالی کرتے رہیے، ہو سکتا ہے تھوڑا بہت نشہ چڑھ جائے۔ باری صاحب کہا کرتے تھے عباس اور مجھ سے بڑا مے نوش کوئی نہ ہوگا۔ سچ کہوں تو، بدکلامی کے لیے معذرت چاہتا ہوں، وہ جسے کہتے ہیں نا چوتڑ پلٹ کر کھانا، میں اور عباس اسی طرح شراب پیتے تھے۔ بوتل کا ڈھکن ہمیشہ ابو سعید قریشی کھولا کرتا تھا۔ پھر بھلا کون رُکتا۔ اور جہاں تک باری صاحب کا تعلق ہے، وہ تو یوں بھی ہر وقت بولتے رہتے تھے، ایک گلاس پیٹ میں پڑتے ہی ان کی باتوں کا فوارہ پھوٹ پڑتا۔ میں اور عباس ایک نمبر کے حرامی تھے، دل ہی دل میں کہتے جتنا چاہے بولتے رہیے، حضور، ادھر تب تک بوتل کی دیکھ بھال ہم کر لیں گے۔ تقریر کا موقع ملتے ہی باری صاحب کو نشہ چڑھ جاتا تھا لیکن ان میں کسی اجلاس سے خطاب کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ سب صرف ہمارے لیے تھا، جب تک کہ ہم شراب چڑھا رہے ہوتے۔

لیکن وہ اتنے مزیدار آدمی تھے کہ ان کے بغیر پینے پلانے کی محفل جمتی نہیں تھی۔ ایک شام وہ میرے ہاں تشریف لائے، میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ 'کیسے ہو، میاں؟' انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

— سوکھا پڑا ہوا ہے۔

آنکھوں میں شرارت بھر کر، مسکراتے ہوئے وہ بولے، 'ایک منٹ رکو، میں کچھ لاتا ہوں۔' تھوڑی دیر میں وہ دوبارہ لوٹ آئے، ہاتھ میں، کپڑے میں لپٹی ہوئی شراب کی بوتل تھی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انھوں نے بوتل کا ڈھکن کھول دیا۔ تب تک عباس بھی آ گیا۔ ہم نے سب

کھڑکیاں دروازے بند کردیے۔ عباس باہر کنویں سے ایک برتن میں پانی لے آیا اور محفل جم گئی۔ کچھ دیر بعد، باری صاحب کو اکساتے ہوئے عباس نے کہا،' اس گھر میں سب آپ کا احترام کرتے ہیں، یہاں تک کہ بی بی جان بھی کیونکہ آپ نمازی ہیں، اگر وہ اچانک آجائیں تو آپ کیا کریں گے؟'

باری صاحب کرسی سے اچھل پڑے، بولے،' میں کھڑکی سے کود کر بھاگ جاؤں گا اور پھر کبھی انھیں اپنا منہ نہیں دکھاؤں گا۔'

یہ تھی باری صاحب کی وہ بزدلی جس کی میں بات کر رہا تھا۔ اور اسی بزدلی کی وجہ سے، باری صاحب جیسا قابل آدمی جو کرسکتا تھا، وہ سب نہیں کر پایا۔

برٹش ہائی کمشنر کے دفتر میں ملازمت ملنے کے بعد وہ ہم سے دُور ہوگئے۔ کبھی کبھار سڑک پر آمنا سامنا ہوجاتا لیکن وہ یوں ظاہر کرتے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہ ہوں۔ ان کے انتقال سے کچھ دن پہلے زہرہ چوک پر میری ان سے ملاقات ہوئی۔ سمجھوتا کرتے کرتے کوئی انسان کس حد تک ٹوٹ سکتا ہے، یہ اس دن انھیں دیکھ کر سمجھ میں آیا۔ سچ میں مجھے بہت دکھ ہوا۔ کیا یہ وہی باری صاحب تھے جن کے سہارے سے منٹو کا نیا جنم ہوا تھا؟

حوصلہ رکھیے، برادران، میں باری صاحب کے بارے میں' گنجے فرشتے' میں وضاحت کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ انھیں مصلحِ قوم بننے کا شوق تھا۔ وہ چاہتے تھے سارا ملک انھیں پہچانے۔ وہ ایک ایسے قابلِ احترام رہنما ہوں جو قوم کو راہ دکھائے۔ وہ ہر وقت کچھ ایسا کر گزرنے کا خواب دیکھا کرتے جس سے آنے والی نسلیں انھیں یاد رکھ سکیں۔ لیکن اس کے لیے جس طاقت کی ضرورت تھی وہ باری صاحب میں نہیں تھی۔ وہ بس یہی کرسکتے تھے کہ دو چار پیگ پی کر ہیرا منڈی کی عورتوں کے ساتھ ملک کی موجودہ صورتِ حال پر بحث کرلیں۔ جب وہ لوٹتے تو وضو کرکے نماز پڑھنے لگتے۔ مجھے سچ مچ بہت دکھ ہوتا تھا، مرزا صاحب، کیا کوئی آدمی اپنی پیٹھ کی چمڑی بچانے کے لیے اتنا نیچے گرسکتا ہے؟ یہاں قبروں میں کہیں تو باری صاحب بھی سوئے ہوئے ہوں گے، ہوسکتا ہے میری باتیں بھی سن رہے ہوں، لیکن یہاں سے بھاگنے کے لیے کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ ہمیشہ ایک کھڑکی ہوتی ہے جس سے کود کر ہم بھاگ سکیں۔ یہاں نہیں ہے نا مرزا صاحب؟ یہ وہ

جگہ ہے جہاں زندگی کی قیمت، اصل کے ساتھ سود سمیت چکانی پڑتی ہے۔ معاف کیجیے گا، برادران، میں پھر فلسفہ بگھارنے لگا۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں، میں ان سے کبھی نفرت نہیں کرسکا۔ مجھے ان پر ترس آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں ترس کھانے والا آدمی اس آدمی سے بھی زیادہ بُرا ہوتا ہے جس پر ترس کھایا جائے۔

نہیں، نہیں، بس اور نوٹنکی نہیں کروں گا۔ اس سے بہتر ہے ہیرا منڈی کا ذکر کیا جائے۔ کیا آپ جانتے ہیں تقسیم سے پہلے لاہور کیا کہلاتا تھا؟ مشرق کا پیرس۔ اور ہیرا منڈی اس کا دل تھی۔ بہت سے لوگ اسے شاہی محلہ بھی کہتے تھے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

دیوار کے گھیرے کے اندر پرانے لاہور کی جگمگاہٹ کا ایک اور نام تھا، ہیرا منڈی۔ یہیں تو میں نے سلطانہ، سوگندھی اور کانتا کو ڈھونڈا تھا، برادران۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہیرا منڈی گوشت کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھی تو آپ غلط ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب نوابوں، بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کی اولاد، یہاں کی طوائفوں سے ادب اور تہذیب سیکھنے آتی تھی۔ طوائفیں اخلاق تربیت کے لیے بہترین استاد تھیں اور اس کا ذریعہ تھا ان کا ناچ گانا، ان کے ناز و ادا اور ان کی گفت و شنید۔ آپ میں سے جس جس نے مرزا رُسوا کی' امراؤ جان ادا' پڑھ رکھی ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ درحقیقت میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اور ہمارے مرزا صاحب تو سب جانتے ہی ہیں۔ یہ اپنی زندگی میں کتنی ہی مشہور طوائفوں سے ملے تھے۔ طوائف کا کوٹھا محض ایسی جگہ نہیں تھی جہاں آپ صرف مزہ لوٹنے جاتے ہیں۔ ان محافل کا حصّہ بننے کے لیے آپ کو باجی طور طریقے سیکھنے پڑتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ جو آپ کو پسند آجائے، آپ اس پر ہاتھ رکھ دیں۔ آشنائی ضروری تھی۔ ہم بستری کا سوال تبھی اٹھ سکتا تھا اگر آپ کسی کے دل میں شعلہ بھڑکا سکیں، ورنہ ٹھمری سنیے، دادرا سنیے، غزل سنیے، کتھک دیکھیے، اور پیسے پھینک کر گھر لوٹ جائیے۔

ہاں، تو اب آپ ہیرا منڈی کے کسی کوٹھے پر کھڑے ہیں، یہاں دلاّل ہیں، پھول والے ہیں۔ دلاّل کے ساتھ سودا طے کرکے ہی آپ کوٹھے میں داخل ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے،

پھول والے سے موتیے کا ہار لے کر کلائی پر لپیٹنا ہوگا، پھر آپ سیڑھیاں چڑھ کر رنگ محل میں پہنچیں گے۔ فانوسوں کی روشنی، دیواری آئینے، قدیمی تصاویر، پھولوں اور عطریات کی مہک لمحہ بھر میں آپ کے دل کو گلزار بنادے گی، کوئلیں درختوں پر گانے لگیں گی۔ ایک اجلی سفید چاندنی فرش پر بچھی ہوگی۔ سہارے کے لیے گاؤ تکیے لگے ہوں گے۔ طوائف داخل ہوگی اور کمرے کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ جائے گی۔ اس کے پیچھے سازندے بیٹھے ہوں گے۔ سارنگیا، وینا بجانے والا اور طبلچی۔ آپ کو ایک ادھیڑ عمر کی عورت دکھائی دے گی جو ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوگی، یہ نائیکہ ہے۔ اس کوٹھے کی مالکہ۔ کبھی یہ بھی ایک طوائف ہوا کرتی تھی۔ اب یہ سارا انتظام چلاتی ہے۔ نئی لڑکیوں کو ریاض کرواتی ہے اور انھیں دلربائی کے گُر بتاتی ہے۔ نائیکہ کے آگے چاندی کا ایک پاندان رکھا ہوگا جس میں سونے چاندی کے ورق میں لپٹی پان کی گلوریاں بھری ہوئی ہوں گی۔ سنگِ مرمر کی تپائی پر طلائی گلاب پاش رکھا ہوگا۔ ایک کٹورے میں زعفران میں لپٹی ہوئی چھالیہ کے ٹکڑے، زردہ اور قوام رکھے ہوں گے۔ نائیکہ ہر آنے والے مہمان سے چھوٹے بڑے جملوں کا تبادلہ کر کے ان کی حیثیت کا اندازہ لگائے گی۔ پھر ایک نوجوان لڑکی سارے کمرے میں گھوم کر سب کو گلوریاں پیش کرے گی۔ تب آپ کو کیا کرنا ہوگا؟ کم سے کم اس کے ہاتھ پر ایک چاندی کا سکہ تو رکھنا ہی ہوگا۔ اس کے بعد ریشم کی شلوار اور کُرتا زیب تن کیے، طوائف کمرے میں داخل ہوگی۔ اس کی قمیض کے سامنے کے حصے پر سونے یا چاندی کا زری کا کام کیا ہوا ہوگا۔ مہین سے دوپٹے کے نقاب میں اس کا چہرہ چھپا ہوگا۔ جیسے اس نے چہرے پر کہرے کا بادل اوڑھ رکھا ہو۔ فانوسوں کی روشنی میں اس کے زیورات جگمگ جگمگ کر رہے ہوں گے۔

اب طوائف گانا شروع کرے گی۔ ہر مہمان کے لیے ایک گیت۔ گاتے ہوئے وہ آپ کی طرف انداز دلبرانہ سے دیکھے گی اور مسکراہٹ لٹائے گی۔ جب گانا ختم ہوگا، آپ اسے قریب آنے کو کہیں گے اور نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ پر رکھیں گے۔ اس کے بعد وہ دوسرے مہمان کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے آپ اس کا ناچ دیکھنے کے بھی متمنی ہوں۔ گھنگرو چھنک اٹھیں گے۔ 'واہ وا' اور 'بہت خوب' اور 'مرحبا، مرحبا' کی صدائیں گیت، ساز اور رقص کی تال کے ساتھ گھل مل جائیں گی۔ اگرچہ گوروں کی آمد کے بعد ہیرا منڈی کی شان و شوکت معدوم ہوگئی تھی، پھر بھی

ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی ابھی آسمان پر باقی تھی۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے زمانے سے تو ہیرا منڈی گوشت کے قید خانے میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ تب کون لوگ گاہک تھے؟ نو دولتیے بزنس مین، ٹھیکیدار، جنگ کے بازار میں مفت کا پیسہ بنانے والے شہدے، جنھیں 'تمیز' لفظ کا مطلب بھی معلوم نہیں تھا۔ برادران، میں نے یہ دونوں ہیرا منڈیاں دیکھی تھیں۔ میں نے کوٹھے کی طوائفوں کو 'کال گرلز' بنتے دیکھا تھا، جو پیسے لے کر آپ کے ساتھ کسی بھی ہوٹل کے بستر پر سونے کو تیار تھیں۔ لیکن میرے لیے تو ہیرا منڈی کوئی زرنگار تصویر تھی۔

میں نے یہاں ایک آدمی کو برباد ہوتے دیکھا تھا، جسم کے لیے نہیں، بلکہ محبت کے لیے۔ میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا، وہ پنجاب کا ایک زمیندار تھا۔ ہیرا منڈی کی زہرہ جان کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ وہ اکثر اس کے پاس آ کر ٹھہرا کرتا تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اسی نے زہرہ جان کو کلی سے پھول بنایا تھا۔ اس کا مطلب سمجھے، برادران، یا نہیں سمجھے؟ زمیندار کو یکا یک موٹر خریدنے کا شوق پیدا ہوا، تا کہ وہ زہرہ جان کو موٹر میں بٹھا کر لاہور کی گلیوں میں گھومے پھرے۔ مانا کہ وہ زمیندار تھا لیکن اس کے پاس رُپیہ پیسہ نہیں تھا۔ اس نے زہرہ کے خاندان کے پیچھے بے اندازہ دولت لٹائی تھی۔ لیکن موٹر تو اسے خریدنی ہی تھی۔ آخر اس نے قرض پر ایک موٹر کمپنی سے موٹر خرید لی۔ اپنی زمین کی فصل کے عوض، ایک سال میں دو قسطیں ادا کرنے کا وعدہ کیا، تین سال میں ساری رقم ادا کرنی تھی۔ موٹر کمپنی کو دو قسطیں تو وقت پر ملیں۔ اس کے بعد زمیندار کا کچھ پتا نہ چلا۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں غائب ہو گیا۔ بس اتنا پتا چل سکا کہ وہ اپنی زمین جائیداد بیچ کر، زہرہ جان کو ساتھ لے کر کلکتہ چلا گیا۔ گاڑی اس کے گھر پر ہی کھڑی تھی۔ کمپنی کو کم سے کم گاڑی تو واپس مل گئی۔

تقریباً دس سال گزر گئے۔ اس موٹر کمپنی کا منیجر ایک دن اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ہیرا منڈی میں ایک رنگین شام گزارنے کے لیے آیا۔ ایک کوٹھے کے سامنے اس نے اُس مفرور زمیندار کو دیکھا۔ وہ چہرے سے بیمار نظر آتا تھا اور اس کی آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں۔

— حضور، زہرہ کا گانا سنیں گے؟ زمیندار نے آگے بڑھ کر منیجر سے پوچھا۔

— یہ آپ کی کیا حالت ہو گئی؟ کہاں رہے اتنے دن؟

—سب نصیب کا لکھا ہے، حضور۔ میں زہرہ کو کلکتہ لے گیا تھا۔ کتنی کوشش کی اسے فلموں میں ڈالنے کی۔

—پھر؟

—کچھ نہیں بنا۔ میرے پاس جتنا روپیہ پیسہ تھا وہ بھی اُڑ گیا۔ انھوں نے زہرہ جان کو فلموں میں کام نہیں دیا۔

—تو آپ واپس آ گئے؟

—اور کیا کرتا؟ زہرہ کی زندگی تو چلانی تھی۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ اس لیے اب اس کے لیے گاہک لاتا ہوں۔

ہیرا منڈی میں جتنی روشنیاں تھیں، وہاں کے کچھ لوگوں کی زندگیوں میں اتنا ہی اندھیرا بھی تھا۔ لیکن اس اندھیرے میں بھی میں نے ایک جگنو کو چمکتے دیکھا تھا، برادران، محبت کا جگنو۔ اگر چہ وہ شخص کنگال ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوجود زہرہ جان کو چھوڑ کر نہیں گیا۔ عاشق دلال ہو گیا لیکن اس کی محبت نے دم نہیں توڑا۔

باری صاحب جیسے لوگ ہیرا منڈی میں یہ سب نہیں دیکھ پاتے تھے اور میں ہیرا منڈی جاتا تھا گوشت کے اندر چھپے جواہرات ڈھونڈنے۔ ایسی جگنوؤں کی روشنی دیکھنے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں منٹو نے کبھی ان کے ساتھ سونا نہیں چاہا۔ کیا یہ سچ ہے؟ یا یہ بھی جھوٹ کہا میں نے؟

۱۳

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میری ہی طرح، یہ شہر دلّی بھی بار بار برباد ہوا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے خدا نے ہماری قسمت—— میری اور دلّی کی—— ایک ہی قلم سے لکھی تھی۔ میں جب دلّی پہنچا، اس وقت تک یہاں کچھ سکون لوٹ آیا تھا، لیکن وہ درحقیقت قبرستان کا سناٹا تھا، دلّی کی رونقیں تو کب کی کھو چکی تھیں۔ آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ کس طرح فارسی، افغان اور مراٹھوں کے پے در پے حملوں اور دربار کے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے دلّی کھنڈر بن چکی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ میر اور سودا جیسے شاعر دلّی چھوڑ کر لکھنؤ جانے پر مجبور ہو گئے۔ انھیں کیوں جانا پڑا؟ میں آپ کو میر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں۔

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

دلّی اسی طرح ایک بار میری آنکھوں کے سامنے بھی اُجڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کربلا میں ہوں، پھر بھی میں اس شہر کو چھوڑ کر نہ جا سکا۔ جبکہ بہت بار سوچا، بھلا کون پوچھتا ہے مجھے اس شہر میں، میرے لیے تو یہ ایک قید خانے کی طرح تھا، پھر بھی میں اسے الوداع نہ کہہ سکا۔ جانتے ہیں کیوں؟ جیسا کہ میں نے کہا، کیونکہ خدا نے میری اور دلّی کی قسمت ایک ہی قلم سے لکھی تھی۔ اسے

چھوڑ کر کہاں جاتا میں؟ زندگی نے جو کچھ مجھے دیا اور جو کچھ بھی مجھ سے لیا، وہ سب اس شہر کی روح میں تراشا جا چکا تھا۔ لوگ شاید اسے پاگل پن کہیں، لیکن اس جنون کے بنا میں کس طرح زندہ رہتا؟ میری پیٹھ دیوار سے لگ گئی تھی، تو کیا ہوا۔ میں اپنے آپ سے کہتا، چلاؤ اور گولیاں چلاؤ۔ دیکھوں تو تم کتنا خون بہتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو۔ اور کتنا میرا مغز نکالنا چاہتے ہو۔ جتنا ذلیل کرنا چاہتے ہو، کرو، لیکن تم میرے اندر کی خوشبو کو نہیں چھو سکو گے، تم ان لفظوں کو بھی ضرر نہ پہنچا سکو گے، جنھیں جوڑ جوڑ کر میں غزلیں کہتا ہوں۔ ایک دن آئے گا میرے گناہ باقی نہ رہیں گے، اور تمھارے حملے بھی لوگ بھول جائیں گے۔ باقی رہیں گے تو لفظ اور متوازن آہنگ —— جن کا نام ہے، مرزا غالب۔ چلیے، چھوڑیے یہ سب، لوگ ہنسیں گے، کہیں گے، اپنی صفائی دینے میں شاعروں کا جواب نہیں۔ جب میں کلکتہ میں تھا، میں نے کسی کو کہتے سنا، 'آپ ایک ہی وقت لکشمی اور سرسوتی کو اپنے گھر نہیں رکھ سکتے۔' میں بھی لکشمی کے ساتھ گھر نہیں بسا پایا۔ سرسوتی کی محبت میں جو گرفتار ہو گیا تھا۔ یا اللہ، میں بھی کیا کچھ کہہ جاتا ہوں۔ گستاخی معاف۔ دراصل میں نے اور کسی ہندو دیوی کے ہاتھ میں وینا نہیں دیکھی تھی نا۔ مجھے منیرہ بائی سے اس کی موسیقی کے سبب ہی محبت ہوئی تھی۔ امراؤ بیگم تو میرے کانوں میں صرف قرآن اور حدیث ہی پھونکا کرتی تھیں۔ ذرا اُس پاکیزہ پھول کا تصور کیجیے، منٹو بھائی، جس پر کبھی کوئی بھونرا نہ آ کر بیٹھا ہو۔ اگر بھونرا آ کر اس رس کو نہ پیے جسے پھول اپنے اندر سمیٹے رکھتا ہے تو تکمیل کیسے ہوگی؟ میرے سُسر نواب الٰہی بخش خان جب مجھے یہ کہتے سنتے تو آگ بگولہ ہو جاتے تھے۔ وہ بھی شعر کہا کرتے تھے، آپ جانتے ہی ہوں گے ان کا تخلص معروفؔ تھا۔ جانتے ہیں مجھے کس بات پر ہنسی آئی تھی؟ کیا آپ آج معروف کا کوئی ایک شعر بھی ڈھونڈ کر دکھا سکتے ہیں؟ لیکن تاریخ میں درج ہے وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ میں ایسے دین دار کو سلام پیش کرتا ہوں، اللہ نے شاعر معروف کے بارے میں اپنی کسی کتاب میں ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہے کیوں؟ اللہ شاعری سمجھتے ہیں، بتائیے، نبی اکرم کی کتنی ازواج تھیں؟ اور قرآن؟ نبی اکرم کو یہ اللہ کی جانب سے شاعرانہ موزونیت کے ساتھ ملا تھا۔ میری نظر میں قرآن شاعری کا غیر معمولی نمونہ ہے۔ منٹو بھائی، موت اور پیدائش، محبت اور تقدیر، تمام کائنات اسی ایک کھیل میں مشغول ہے۔ جیسا کہ آپ وید، اُپنیشد، بھگوت گیتا یا ژنداوستا

میں پائیں گے۔ اپنی شاعری کے ذریعے سے جب میں نے اس کھیل میں داخل ہونے کی کوشش کی تو ہانپ کر رہ گیا۔ کیا میں ذوقؔ اور مومنؔ کی طرح نہیں لکھ سکتا تھا؟ لیکن میں نے اپنی زندگی کی بازی لگائی تھی۔ میں نے اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہؔ سے کہا تھا، دیکھو، غزل محض خوبصورت الفاظ اور قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے، جب تک دل سے خون نہ بہے، غزل نہیں لکھی جا سکتی۔ میرا ایک ایک لفظ کیسے خون میں لتھڑا ہوا ہے، یہ میں نے اپنے عالمِ تنہائی میں محسوس کیا ہے، منٹو بھائی۔

میں باتوں باتوں میں بھٹک گیا۔ اے میرے قبروں کے دوستو، آپ میں سے جو بھی میری باتیں سُن رہے ہیں، مجھے معاف کریں۔ اصل میں میری زندگی کی ناکامیاں انھی بے سروپا باتوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ میں تو ان کے ذمّے داروں کو بھی کبھی کچھ نہ کہہ پایا۔ اصل میں میری یادداشت کمزور تھی۔ میرے لیے ہر دن ایک نیا دن تھا۔ زندگی ایک دن ہی کی ہوتی ہے —— اگلے دن کیا ہوگا، ہم نہیں جانتے۔ میں بغیر تحفظات کے اس بات کو قبول کرتا ہوں کہ میں نے بہت گناہ کیے —— کہ شریعت میں ایسے کاموں کو گناہ کہا جاتا ہے۔ جبکہ گناہ اور ثواب کا حساب اس دنیا میں نہیں ہوتا، وہ تو روزِ قیامت، اللہ کے دربار میں ہوگا۔ لیکن میرے دل میں کسی کے لیے حسد نہیں تھا۔ معلوم ہے کیوں؟ آپ شاید ہنسیں، پھر بھی بتاتا ہوں۔ خوش نصیبی سے میں شاعری کے ساتھ ہمبستر ہوا۔ خوش نصیبی سے میں نے دلّی میں اپنی حویلی بنانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ خوش نصیبی سے مجھے ایک کے بعد ایک مشاعرے میں ذلیل کیا گیا۔ خوش نصیبی سے مجھے اپنی پنشن کی رقم پانے کے لیے دوڑ بھاگ کرنے کے باوجود کچھ نہیں ملا۔ خوش نصیبی سے مجھے نوابوں مہاراجاؤں کی فیاضانہ سرپرستی پر انحصار کرنا پڑا۔ خوش نصیبی سے مجھے بار بار یاد دلایا گیا کہ، غالب، تمھارے والد کا کوئی گھر نہیں تھا، اور تمھارا بھی کوئی گھر نہیں ہے۔ خوش نصیبی سے میں یتیم کی طرح پیدا ہوا اور یتیموں ہی کی طرح ساری زندگی گزار دی۔ خوش نصیبی سے جُوا کھیلنے کی وجہ سے مجھے جیل ہوئی۔ اسی وجہ سے میں اس قابل ہو سکا کہ انسانوں کے بارے میں جان سکوں۔ اصل میں تو وہ سب کٹھ پتلیوں کے سایوں جیسے تھے، جانتے ہی نہیں تھے کہ زندگی انھیں کس راہ پر لے جا رہی ہے۔ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا کہ وہ مکّہ کے راستے پر ہیں۔ میں اس راستے پر کبھی بھی جانا نہیں چاہتا تھا منٹو بھائی، آپ کو وہ شعر یاد ہے۔

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

گستاخی معاف، میں بس وہی، اپنے باطن کی تاریکی کے بارے میں باتیں کیے چلا جا رہا ہوں۔ اب ذرا کچھ رنگین باتوں پر آیا جائے۔ گہرے سنسان راستوں کی باتیں کسی کو بھی اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے بھی نہیں۔ ہنسی اور ظرافت کے بغیر کیا کوئی اس ناقابلِ یقین زندگی کو برداشت کر سکتا ہے؟ زندگی بڑی نازک چیز ہے— ہم سب جلد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، کیونکہ ہم زندگی کو جھیل نہیں پاتے۔ کیا کوئی یقین کرے گا، منٹو بھائی، کہ میں مرجھائے ہوئے پھول کی ایک پتی کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ جب لوگ یہ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ یہ بدذات اپنے لفظوں سے لوگوں کو لبھانا تو خوب جانتا ہے، لیکن اس نے اپنی بیوی کے لیے کیا کیا؟ اتنی اولادیں پیدا ہونے کے باوجود، آخر کیوں اس کی کوئی اولاد پندرہ ماہ سے زیادہ نہ جی سکی؟ اس بدبخت نے اپنے بیٹے بیٹیوں کے لیے آخر کیا کیا؟ میں ایسے لوگوں کو ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ آپ نے رابعہ کا نام سنا ہے؟ میں مشہور صوفیہ رابعہ بصری کی بات کر رہا ہوں۔ وہ گداگروں کے گھر پیدا ہوئی تھیں اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اپنی زندگی کا بڑا حصّہ لونڈی بن کر گزارنے پر مجبور ہوئیں۔ عطّار صاحب نے 'تذکرۃ اولیاء' میں ان کا ایک دلچسپ قصّہ تحریر کیا ہے۔

رابعہ بصری سے کسی نے پوچھا؛ 'کہاں سے آئی ہیں آپ؟'

— دوسرے جہان سے۔ رابعہ بصری نے مسکرا کر جواب دیا۔

— اور کہاں جا رہی ہیں؟

— ایک اور جہان میں۔

— تو پھر اس جہان میں کیا کر رہی ہیں؟

— میں یہاں کھیلنے آئی ہوں، برادر۔

یہ کہانی میں نے آپ کو سنائی ہے اس لیے مجھے صوفی سمجھنے کی غلطی مت کیجیے گا۔ میرے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ میں تو وہ آدمی ہوں جو زندگی بھر آئینے کے سامنے بیٹھا اپنے عکس کو دیکھتا رہا۔ میں بھلا راہِ سلوک پر کیسے چل سکتا تھا؟ میں نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن جب وہ لوگ،

جنھوں نے اپنی ساری زندگی اتنی نیکی اور احتیاط کے ساتھ گزاری کہ کہیں کوئی دھبا نہیں لگا، مجھے بتاتے ہیں کہ بس وہ ہی دین کی راہ پر چل رہے ہیں، تو میں دل ہی دل میں ہنس دیتا ہوں۔ اگر ایسا ہی تھا تو خدا نے آدم کو مٹی سے کیوں بنایا؟ کیوں اسے گناہ کے راستے پر دھکیلا؟ اگر خدا اپنے ہی خول میں بند رہتا تو خود کو کیسے جان پاتا؟ آدم کے ذریعے اس نے خود کو دیکھا۔ گناہ کے عمل میں اس نے دیکھا کہ ثواب کہاں ہے۔ نہیں، نہیں، میں عذر تلاش نہیں کر رہا۔ میں نے مہابھارت کی بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔ ان میں کون سا کردار ثواب کا سب سے زیادہ حق دار تھا؟ صرف یدھشٹر، جس کی ساری زندگی ہی گناہوں کی داستان ہے۔ پانڈووں میں اور کسی نے اتنے گناہ نہیں کیے تھے۔ پھر بھی دھرم راج کتے کے روپ میں ان ہی کے ساتھ رہے۔ کیوں؟ مجھے بھی اس کا جواب نہیں معلوم، منٹو بھائی۔ میں آپ کو ایک اور شخص کی بات بتاتا ہوں۔ کیا آپ نے پنگلا کسبی کے بارے میں سنا ہے؟ 'اَدھو گیتا' میں نے اس کا ذکر ہے۔ میں نے جامع مسجد کے کسی داستان گو سے یہ قصّہ سنا تھا۔ دتا ترے اَودھوت راجشری 'اَدھو گیتا' میں یادو کو اپنے چوبیس گروؤں کے بارے میں بتا رہے ہیں، پنگلا ان میں سے ایک تھی۔ اَودھوت نے ایک شام اسے دیکھا جب وہ اپنے گھر کے سامنے کسی گاہک کے انتظار میں کھڑی تھی۔ شام سے رات ہو گئی، کوئی نہیں آیا۔ آج رات کوئی بھی گاہک نہیں، پنگلا نے سوچا، یہ اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ میں بھگوان کو یاد نہیں کرتی۔ ہوتے ہوتے اس کی مایوسی ایک طمانیت میں تبدیل ہو گئی اور وہ پو پھٹتے کو سو گئی۔ پنگلا نے اودھوت کو کیا سکھایا؟ یہ کہ اُمید ترک کر دینے سے ہی سکون ملتا ہے۔ ذرا تصوّر کیجیے، ایک جسم فروش عورت بھی گُرو ہو سکتی ہے۔

لیکن میرے سسر کے پاس دنیا کی ہر بات کا جواب تھا۔ دلّی آمد پر میں اور امراؤ بیگم انھی کی حویلی میں اترے۔ کچھ مدت وہاں قیام بھی کیا۔ لیکن انھیں برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ پائی پائی کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ اس طرح کسی انسان کو کیسے تولا جا سکتا ہے؟ اس لیے میں بھی ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ایسے لوگ جو قدم قدم پر آپ کو ٹوکتے ہوں یہ کرو اور یہ نہ کرو، آپ ان کا مذاق نہ اڑائیں گے تو اور کیا کریں گے؟ جتنی آپ ان کی ہنسی اڑائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ آئینے میں ان کی تصویر کرچی کرچی ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے ایسے پرہیزگار لوگ صرف

ایک ہی کام میں ماہر ہوتے ہیں کہ کیسے اور کس کس طرح سے لوگوں کی توہین کی جائے۔ میرے والد کا مکان نہ بھی رہا ہو، میری رگوں میں تو ترک خون ہی دوڑتا تھا، کیا میں یہ ذلت برداشت کرسکتا تھا؟ اس لیے میرا ٹرپ کا پتہ تمسخر ہی تھا۔ خبیث معروف صاحب کا اتنا تمسخر اڑاؤ کہ ان کا بُت ٹوٹ کر پاش پاش ہوجائے۔

مجھے بچپن ہی سے سڑک کے کتوں کے ساتھ پیار تھا، منٹو بھائی۔ اکبرآباد کے کتے ہر جگہ میرے پیچھے پیچھے آیا کرتے۔ میں ان سے لپٹ جاتا، ان سے باتیں کیا کرتا۔ میں تہہ دل سے اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ جس طرح سڑک کے کتے آپ کے دوست بن جاتے ہیں، کوئی نہیں بن سکتا۔ وہ بھی میرے بدن کے ساتھ لگ لگ کر بیٹھتے تھے، مجھے سونگھتے تھے، اور مجھے یوں تکتے تھے جیسے سچ مچ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتے ہوں۔ لیکن مجھے ان کی زبان نہیں آتی تھی۔ اگر خدا نے مجھ پر مہربانی کی ہوتی اور مجھے یہ صلاحیت بخشی ہوتی تو میری زندگی یوں بد سے بدتر نہ ہوتی جاتی۔ معروف صاحب کتوں کو بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا، میاں، تم حویلی میں رہتے ہو، پھر یہ سڑک کے کتوں سے اتنی محبت کیوں؟

میرے دل میں آیا کہوں، تم کتے کہیں کے، لیکن میں نے نہیں کہا۔ جس کے گھر میں پڑا ہوا ہوں اسے تو ایسا نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر میں ان کی میزبانی کا لطف اٹھا رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کا زرخرید غلام ہوگیا ہوں۔ اس لیے میں نے ان کا تمسخر اڑانا شروع کردیا۔

—انھوں نے آپ کا تو کچھ نہیں بگاڑا۔

—اس سے زیادہ ناپاک جانور بھی کوئی ہوتا ہے؟ اس کی تو پرچھائیں بھی پڑ جائے تو غسل کرنا پڑ جاتا ہے، تم کرتے ہو؟

—جی نہیں۔

—توبہ، توبہ۔ کیا تم قرآن پاک کی کسی ہدایت پر عمل نہیں کرتے۔

—بے شک کرتا ہوں۔

تو پھر کتوں کے ساتھ یہ میل جول کس لیے؟

میں ہنس پڑا۔ میں بھی تو ایک کتا ہی ہوں، معروف صاحب۔

— کیا مطلب؟

—میرے والد کا کوئی گھر نہیں تھا۔ میں دادا کی حویلی میں پلا بڑھا۔ اب آپ کی بیٹی سے نکاح کے بعد آپ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ تو پھر آپ مجھے کتا کیوں نہیں کہیں گے؟ اصولی طور پر تو مجھے سڑک پر ہی ہونا چاہیے۔

—تمھاری زبان بہت لمبی ہے، میاں۔ جس کا کھاتے ہو اسی کے سر پر ہگنا چاہتے ہو۔ معروف صاحب غصے میں غرانے لگے۔

—کتے ہی کی زبان کی طرح۔

—زبان سنبھال کر بات کرو، میاں!

—کیا آپ نے کبھی بورایا ہوا کتا دیکھا ہے، معروف صاحب؟ آپ نے دیکھا ہے سڑکوں پر وہ کیا کرتا ہے؟ اسی طرح کا ایک بورایا ہوا کتا انسانوں کے اندر بھی چھپا ہوتا ہے۔ ایسے انسان ہزاروں بار غسل کرنے کے بعد بھی خود کو پاک نہیں کرسکتے۔

—تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

—پہلے خود اپنے آپ کو پاک کیجیے۔

منٹو بھائی، جس کی زبان پر ہر وقت قرآن اور حدیث رہتی ہو، گھر میں بیوی موجود ہو، پھر وہ کوٹھوں پر کیوں جاتا ہے؟ کیا ایسے آدمی کو کسی دوسرے کی پاکی ناپاکی پر انگلی اٹھانے کا حق ہے؟ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں بہت نیک انسان ہوں۔ سچ کہوں تو میں اپنے لالچ کی وجہ سے دلّی آیا تھا۔ معروف صاحب کا خاندان دلّی کے شرفاء میں شمار ہوتا تھا، جس کے شاہی دربار کے ساتھ مراسم تھے، مجھے توقع تھی کہ ایک شاعر کے طور پر مجھے دربار میں جگہ مل جائے گی، اور یوں میں اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزار سکوں گا۔ ان دنوں میں شراب اور عورتوں کا رسیا تھا، بیگم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا میرا۔ وہ قرآن اور حدیث میں مشغول رہتی تھیں اور روز بہ روز ان کا یہ شغل بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر یہاں تک ہوا کہ انھوں نے اپنے کھانے پینے کے برتن بھی علیحدہ کرلیے۔ اس لیے کہ میں شراب پیتا تھا اور شعر کہتا تھا، اور یہ دونوں ہی چیزیں ان کے قرآن کی رُو سے حرام تھیں۔ ویسے وہ اپنی ذمے داریوں سے کبھی نہیں چوکیں۔ ہمیشہ اس بات پر نظر رکھتی

تھیں کہ میری کسی ضرورت میں کمی واقع نہ ہو۔ لیکن اسے محبت نہیں کہا جاسکتا۔ یا پھر، میں نہیں جانتا، شاید یہی بیگم کے پیار کا انداز ہو۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں، میری عمر جتنی بڑھتی گئی، اتنا ہی لفظِ محبت پر میری بداعتمادی بڑھتی گئی۔ کیا واقعی میرا اعتبار اٹھ گیا تھا؟ بس اتنا جانتا ہوں، روز بہ روز میرے اندر خالی پن بڑھتا گیا۔ کیوں؟ شاید میرے ہی اندر محبت نہیں تھی۔ میں ہی کسی کو پیار نہ کرسکا۔ آج قبر میں لیٹے ہوئے محسوس ہوتا ہے میں پیار کا بھکاری تھا، لیکن میں نے خود کسی کو پیار نہیں کیا۔ میں میر نہیں ہوں — سوچیے، محبت کے لیے انھوں نے کتنی اذیتیں سہیں۔ لیلیٰ مجنوں کی کہانی تو ہم سب نے سن رکھی ہے، لیکن میر صاحب کی زندگی کے ان دنوں کے بارے میں کتنے لوگ جانتے ہیں؟ عشق میں دیوانہ ہونا کسے کہتے ہیں، میر صاحب نے یہ اپنی زندگی کے ذریعے دکھادیا۔

جی ہاں، اب میں میر صاحب ہی کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ایک ہی انسان کی زندگی کا رونا دھونا آپ لوگوں سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہوسکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اپنی زندگی کی کہانی بہت تفصیل سے بیان کر رہا ہوں، لیکن اگر میں اسے محض ایک لفظ میں سنانا چاہوں تو مجھے کاغذ پر محض ایک سوالیہ نشان بنانا ہوگا۔ اس کے بجائے، چلیے میر صاحب کی زندگی کے اُن دنوں میں لوٹ چلتے ہیں۔

میر صاحب کا دل ایک شہرِ داغ دار تھا۔ انھوں نے اس شہر کا تذکرہ، اپنی مثنوی 'معاملاتِ عشق' میں کیا تھا۔ میری نظر میں، میر صاحب نے جتنی بھی عشقیہ مثنویاں لکھیں، 'معاملاتِ عشق' ان میں سب سے عمدہ ہے۔ وہ شیش محل میں گونجتی کسی فریاد کی طرح ہے۔ جانتے ہیں وہ فریاد تھی کس لیے؟ وہ چاند کے لیے تھی۔ بچپن میں جب ان کی نانی، شام کو ان کا منھ دھلاتے ہوئے کہتیں، 'اوپر دیکھو بیٹا، وہ رہا چاند' تبھی سے چاند ان کی زندگی میں شامل ہوگیا، اور پھر اسی چاند کی وجہ سے انھیں فنا ہونا پڑا۔ انھیں چاند میں اپنی محبوبہ کا چہرہ نظر آتا تھا، اسی وجہ سے وہ ایک دن پاگل ہوگئے۔ کون تھی ان کی محبوبہ؟

میں ان کا نام نہیں جانتا، منٹو بھائی۔ جس معاشرے میں ہم رہتے تھے، وہاں کسی عورت کا نام بس قصے کہانیوں میں ہی ملتا تھا۔ اور نام کی ضرورت بھی کسے تھی؟ ملاؤں نے انھیں برقعے

میں ڈھک دیا تھا، ایک آزاد انسان کی حیثیت سے ان کی شناخت ہی مٹادی تھی۔ لیکن آج ہم ان کا کوئی نام رکھ سکتے ہیں۔ کیا نام دیا جائے، بتایئے؟ مہر نگار کیسا رہے گا؟ خوبصورت نام ہے نا؟ تو ہوا یہ کہ میر صاحب اس مہر نگار کے عشق میں گرفتار ہوگئے، جب وہ ابھی محض اٹھارہ برس کے تھے۔ مہر نگار، جو کہ ایک شادی شدہ خاتون تھیں، میر صاحب سے عمر میں کچھ بڑی — یا پھر کچھ چھوٹی تھیں۔ لیکن چونکہ دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں رشتے دار تھے اس لیے ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا۔ وہ میر صاحب سے بغیر کسی پابندی کے مل سکتی تھیں۔

سارا خاندان بیگم کے حسنِ اخلاق کی تعریفیں کیا کرتا۔ یہ تعریفیں سن سن کر ہی ایک دن میر صاحب ان کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے۔ وہ انھیں چھپ چھپ کر دیکھا کرتے لیکن بات کرنے کی ہمت نہ کرپاتے۔ کہتے بھی کیا؟ منٹو بھائی، جب کہنے والی بہت سی باتیں اندر جمع ہوجائیں تو کچھ کہتے بنتا ہے کیا؟ رفتہ رفتہ حجاب اٹھ گیا۔ حتیٰ کہ میر صاحب نے انھیں چھوا بھی۔ 'معاملاتِ عشق' میں میر صاحب نے لکھا ہے، میں اس کے حسن کو بیان نہیں کرسکتا — وہ جیسے میری ہی خواہشات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ان کے چلنے پھرنے کے انداز، نظریں اٹھانے کی ادا اور گردن کے لوچ کو دیکھ کر میر صاحب اپنی غزلوں کی بحریں دریافت کیا کرتے۔ معلوم ہے ایک دن کیا ہوا؟ مہر بیگم پان کھا رہی تھیں، ان کے ہونٹ شفق کے رنگوں میں رنگے ہوئے تھے۔ جب میر صاحب نے وہ ہونٹ دیکھے تو خود کو سنبھال نہیں پائے۔ انھوں نے ان کا رس پینے کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے تو مہر بیگم نے مسکرا کر انکار کردیا، آخرِ کار انھوں نے خود ہی میر صاحب کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پھر کیا ہوا ہوگا۔ میر صاحب ان سے خلوت میں ملنا چاہتے تھے، وہ بھی یہی چاہتی تھیں۔ جب کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا تو مہر بیگم نے کہا، 'اس محبت کا کوئی انجام نہیں ہے، میر، ہم اسے آگے نہیں بڑھا سکتے۔'

مہر بیگم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور میر صاحب جیسے کسی خواب ناک نیم مدہوشی کی حالت میں چلے گئے۔ اپنے خیالوں میں، وہ ہر شب مہر بیگم کے ساتھ گزارا کرتے لیکن دن گزارنا ان کے لیے عذاب ہوجاتا۔ اس کے بعد، سالہا سال دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ ایسی صورتِ حال میں آدمی کا کیا حال ہوجاتا ہے؟ ساری دنیا جھوٹی لگنے لگتی ہے۔ اس کا کوئی وجود نہیں رہ جاتا۔

ایک دن سب کو اس معاملے کی خبر ہوگئی۔ خاندان کے لوگوں اور دوست احباب نے میر صاحب سے منہ پھیر لیا اور انھیں پاگل کہنا شروع کر دیا۔ منٹو بھائی، ہاتھی اگر گڑھے میں گر جائے تو چیونٹی بھی اسے لات مار سکتی ہے۔ میر صاحب کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ پھر ایک دن مہر بیگم چھپ چھپا کر خود ان کے پاس آئیں۔ 'ہمیں الگ ہونا ہی ہوگا، میر۔' انھوں نے کہا: 'ہم جیسے بھی چاہنے والوں کو ایک دن الگ ہونا پڑتا ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں، تم میرے دل میں رہو گے۔' اب جدائی تکمیل کو پہنچ چکی تھی، صرف یادیں اور یادوں کا بوجھ باقی رہ گیا تھا۔ میر صاحب دیوانے ہوگئے۔ 'خواب و خیالِ میر' میں میر صاحب نے اپنی دیوانگی کے ان دنوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ چاند کی جانب دیکھنے سے ڈرتے تھے لیکن پھر بھی ان کی آنکھیں چاند پر جمی رہتی تھیں۔ انھیں چاند میں مہر بیگم دکھائی دیتی تھیں۔ یقین کیجیے، ان کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی، وہ سو نہیں پاتے تھے۔ انھیں کھانا پینا بھول گیا، جدھر بھی وہ دیکھتے انھیں مہر نگار نظر آتیں۔ وہ شبیہوں کے گھیرے میں کھو گئے۔

کتنے ہی حکیم ان کا علاج کرنے آئے، کتنے جھاڑ پھونک کرنے والے بلوائے گئے لیکن کوئی نہ سمجھ سکا کہ انھیں چاند میں اپنی محبوبہ دکھائی دیتی ہے اور یہ چاند میر صاحب کی زندگی سے جا چکا ہے۔ بہت کوششوں کے بعد بھی جب ان کا علاج ممکن نہ ہوا تو کیا کیا گیا، جانتے ہیں؟ میر صاحب کو ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ جی ہاں، میں بتا رہا ہوں۔ وہ جگہ کسی قبر سے بھی تنگ تھی۔ لوگ صحیح الدماغی کا کیا مطلب سمجھتے ہیں؟ کھاؤ، ہگو، کھاؤ، ہگو۔ اور جن پر تمھیں خود بھی یقین نہ ہو وہ باتیں کیے جاؤ۔ اس کے بعد کیا ہوا، معلوم ہے۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے جسم سے فاسد خون خارج کر دینا چاہیے۔ میر صاحب بے ہوش ہوگئے، لیکن کسے فرق پڑتا تھا؟ فاسد خون تو نکالنا ہی تھا۔ بعد میں میر صاحب نے ایک شعر کہا تھا، چاہے غلام ہو جاؤ یا قید خانے میں سڑ کر مرو، لیکن محبت کے چکر میں کبھی مت پڑو۔ ایک بار ان کے عشق کی آگ بھڑکی تھی اور اس کے بعد بس راکھ ہی بچی۔

میر صاحب نے اس آگ کی تپش کو محسوس کیا تھا۔ لیکن میں تو محض اس کی راکھ کو اپنے بدن پر مل سکا۔ میں کسی سے ایسا عشق نہ کر سکا جیسا میر صاحب نے کیا تھا۔ معلوم ہے کیوں؟ یا تو خدا نے مجھے عشق کی توفیق ہی نہ دی تھی یا پھر یتیموں کی طرح زندگی کاٹتے کاٹتے میں پیار کا مطلب ہی بھول گیا تھا، میں نے لفظوں سے پیار کرنا سیکھا، لیکن یہ نہ سیکھ سکا کہ لفظ لوگوں کو کیسے چھو سکیں گے۔

شادی شدہ زندگی کے ابتدائی دنوں میں، امراؤ بیگم نے ایک بار پوچھا تھا: 'آپ بات کیوں نہیں کرتے، مرزا صاحب؟'

— کس بارے میں؟

— کیا مجھ سے باتیں کرنے کو آپ کا دل نہیں چاہتا؟

— ضرور چاہتا ہے، لیکن......

— لیکن کیا؟

— تم مجھ سے بہت دور ہو، بیگم۔

— کتنی دور؟

میں نے آسمان میں ایک ستارے کی طرف اشارہ کر دیا۔

۱۴

نغمہ ہے، محو ساز رہ، نغمہ ہے، بے نیاز رہ
رندِ تمام ناز رہ، خلق کو پارسا سمجھ

مرزا صاحب، ارے او مرزا صاحب، یہ دیکھو، بڑے میاں پھر سے سوگئے۔ اتنے برسوں سے قبر میں سوئے ہوئے ہیں پھر بھی ان کی نیند پوری نہیں ہوئی۔ یا ہوسکتا ہے یونہی ڈھونگ کیے پڑے ہوں۔ برادران، ان بڑے میاں کو سمجھنا مشکل ہے: بالکل ان کی غزلوں کی طرح۔ اگر آپ ظاہر سے متاثر ہوجاتے ہیں تو آپ کبھی نہیں جان سکتے کہ باطن میں کیا ہے۔ جس وقت مومن اور ذوق گل وبلبل کی گردان کر رہے تھے، ماہتاب ومعشوق کی باتیں دہرا رہے تھے، یا شاہ کے قصائد تصنیف کر رہے تھے، تب مرزا صاحب نے شاعری کے افق پر نمودار ہوکر غزل کے مردہ بیان میں روح پھونک دی۔ کوئی فنکار کیسے اتنی شان دار تخلیق کرسکتا ہے؟ فن کی یہ بلندی تبھی حاصل ہوسکتی ہے جب کوئی شخص اپنے تخلیقی الاؤ کو بھڑکانے کے لیے خود اپنے آپ کو آگ میں جھونک دے۔ ایسے لوگ نہایت ناقابلِ یقین ہوتے ہیں، یعنی کہ پہنچ سے باہر۔ ہماری روزمرہ زندگی کے پیمانے سے مرزا صاحب کو ماپنا بڑی غلطی ہوگی۔ کبھی کبھی لگے گا کہ وہ ایک شیطان سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھے۔ ہوسکتا ہے وہ ایسے ہی ہوں، ایک ایسا شیطان جو خود اپنی زندگی کے ساتھ بھی کھیل کھیل سکتا ہے۔ مجھے مرزا صاحب کا ایک دلچسپ قصہ یاد آگیا۔ اگر ظرافت کی بات کی جائے تو ان کا کوئی بھی ہم عصر ان کی ہمسری نہیں کرسکتا تھا لیکن اپنے طنز کا نشانہ اکثر وہ خود اپنی ہی ذات کو بنایا

کرتے تھے۔ نہیں برادران، پریشان نہ ہوں، میں قصہ سنا رہا ہوں۔ براہِ کرم یہ مت سمجھیے کہ میں مرزا صاحب کے لیے عذر تلاش کر رہا ہوں۔ میں ان کے لیے عذر تلاش کرنے والا کون ہوتا ہوں؟ اور پھر اب مرزا صاحب کی حیات تو ایک قصے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ صرف زندہ رہ گئی ہیں ان کی غزلیں؛ ہم غلطی پر ہیں، برادران، زندگی میں کسی فنکار کو ہرا دینا بہت آسان ہے، لیکن فنکار کی اصل زندگی اس کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے، وہ زندگی جسے ابراہیم ذوق جیسے لوگ بھی، ہزار کوششوں کے باوجود دھندلا نہیں پاتے۔

اب قصہ سنیے۔ سارا دن مرزا صاحب جس کمرے میں گزارتے تھے، وہ کمرا مکان کے داخلی دروازے کی چھت پر واقع تھا۔ اس کے ایک جانب ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھری تھی، جس کا دروازہ بہت ہی نیچا تھا، اندر جھک کر جانا پڑتا تھا۔ کمرے میں بچھی ہوئی جازم پر مرزا صاحب صبح دس بجے سے سہ پہر تین چار بجے تک بیٹھے رہتے۔ اکثر اکیلے ہی اور اگر کبھی کوئی آجاتا تو اس کے ساتھ چوسر کھیل کر وقت کاٹ لیتے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک سہ پہر مولانا آزردہ تشریف لے آئے۔ وہ مرزا صاحب کے چہیتے لوگوں میں سے تھے۔ مرزا صاحب اس دن اپنے کسی دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔ رمضان کا مقدس مہینہ اور چوسر؟ مولانا کے لیے تو یہ گناہِ کبیرہ تھا۔ کہنے لگے، 'میں نے حدیث شریف میں پڑھا تھا کہ رمضان میں شیطان کو بند کردیا جاتا ہے۔ مجھے اب اس حدیث پر یقین نہیں ہے۔'

— کیوں؟

— جب آپ چوسر کھیل رہے ہیں تو میں اس حدیث پر یقین کیسے کروں؟

— کیا آپ دیکھ نہیں پا رہے کہ حدیث میں کیسی غیر متزلزل حقیقت بیان کی گئی ہے؟ مرزا صاحب مسکرائے۔

— کیا مطلب ہے آپ کا؟

— حدیث بالکل صحیح ہے۔ شیطان واقعی اس کوٹھری میں قید ہے، آپ کو دکھائی نہیں دے رہا؟ تم کیا کہتے ہو، میاں۔ آخری فقرہ مرزا صاحب نے اپنے چوسر کے ساتھی سے مخاطب ہوکر کہا اور قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

—آپ اپنے کو شیطان کہہ رہے ہیں؟

—اور نہیں تو کیا؟ مجھ جیسا شیطان نہ ہوتا تو آپ مفتی کیسے بنتے؟

— کیا مطلب؟

—اتنی آسان بات نہیں سمجھتے؟ شیطان کا وجود ہے تبھی تو شریعت کو اتنے قوانین کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے، آزردہ صاحب، کہ میں آدھا مسلمان ہوں۔ شراب پیتا ہوں لیکن سور نہیں کھاتا۔

میں بھی کچھ ایسی بات کہا کرتا تھا۔ ایک بار ایک دوست نے مجھ سے پوچھا تھا میں کتنا مسلمان ہوں۔ میں نے جواب دیا، 'میں خوشی سے اُچھل پڑوں گا اگر اسلامیہ کالج، ڈی اے وی کالج کے خلاف گول کردے، میں بس اتنا ہی مسلمان ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔'

ایک اور قصہ سنیے، برادران۔ یہ مرزا صاحب کے بڑھاپے کے زمانے کی بات ہے، دلّی میں ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی، میر مہدی مجروح نے خط لکھا، 'کیا شہر سے وبا ختم ہوگئی، حضرت، یا ابھی موجود ہے؟' مرزا صاحب نے جواباً لکھا، 'میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسی وبا ہے، جو وبا ستر سال کے بڈھے بڑھیا کو بھی نہیں مار پا رہی، اس کے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟'

ان مرزا صاحب کو سمجھنا میرے آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن آدمی دوسرے آدمی کو سمجھنا تو چاہتا ہے۔ اور یہیں وہ غلطی کرتا ہے۔ جہاں ایک آدمی خود اپنے آپ کو بھی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتا — پہاڑ کی صرف برف پوش چوٹی ہی دیکھ پاتا ہے — وہاں کسی دوسرے آدمی کو سمجھنے کی کوشش کیا مضحکہ خیز نہیں ہے؟ ہماری بات تو جانے دیجیے، فریدالدین عطار جیسے صوفی بھی عمر خیام کو نہیں سمجھ پائے تھے۔ جانتے ہیں کیوں؟

خیام سمجھتے تھے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ مشہور فلسفی ابن سینا کی طرح خیام کا بھی اس خیال پر یقین تھا کہ خدا خوشبو کو محسوس کر سکتا ہے، لیکن ہر پھول کی الگ الگ خوشبو اس تک پہنچ نہیں پاتی۔ ابن سینا کا کہنا تھا اس کائنات کا خالق کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی خدا ہی کی طرح ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ اور خیام نے ایک رباعی میں کہا، جب اس دنیا میں میرے رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تو شراب اور معشوق کے بغیر رہنا غلطی ہوگی۔ یہ کائنات کسی نے تخلیق

کی ہے یا ہمیشہ سے یونہی موجود تھی، یہ تشکیک بھی اور کتنے دن رہے گی؟ میرے مرنے کے بعد ایسے سب سوالات بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لیے عطار صاحب نے روزِ حشر، خیام کا جس طرح تصور کیا اس کے مطابق وہاں خدا کے دربار میں خیام جیسے شیطان کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی، کیوں نہیں تھی؟ خیام کی ایک داشتہ نے شیخ سے ایک ایسا ہی سوال کیا تھا۔ ذرا اس کی ہمت کا اندازہ کیجیے۔ شیخ نے اس فاحشہ سے کہا تھا، 'تم ایک مے نوش عورت ہو جو ہر وقت لوگوں کو فریب دینے میں مشغول رہتی ہے۔' فاحشہ نے جواب دیا، 'بے شک میں ویسی ہی ہوں، جیسا آپ نے فرمایا، لیکن کیا آپ ویسے ہیں جیسا آپ خود کو تصور کرتے ہیں؟'

خیام خود ہی اس بات کی نشان دہی کر گئے تھے کہ ان کی موت کے بعد کیا ہوگا۔ ان کے ایک شاگرد تھے، نظامی۔ نظامی نے خیام کو آخری بار ان کے ایک دوست کے گھر دیکھا جو اس بازار میں واقع تھا جہاں غلاموں کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ بہت سے لوگ وہاں خیام کو سننے کے لیے موجود تھے۔ شاید انھوں نے کہا تھا، 'میں وہاں دفن کیا جاؤں گا جہاں سال میں دو بار درختوں سے پھول جھڑیں گے۔' نظامی کو اس بات پر یقین نہ آیا۔ خیام کی وفات کے چار سال بعد وہ اپنے استاد کی قبر پر حاضری دینے نیشاپور پہنچے اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر دیکھ کر رو پڑے۔

معاف کیجیے گا، برادران، میں بہک گیا۔ دراصل مرزا صاحب کی جو کہانیاں میں آپ کو سنا رہا ہوں، وہ صرف ان کی کہانی نہیں ہے۔ خدا نے آخر ہمیں مٹی سے بنایا ہے۔ سوچیے کتنی قدیم اور دور دراز کی مٹی اور اس کی یادیں ہم سنبھالے ہوئے ہیں۔ میں یہ سوچ کر دنگ رہ جاتا ہوں کہ ہم ازل سے کہیں نہ کہیں، اس خاک سے پیوستہ رہے ہیں۔

[مترجم کی طرف سے: اس مقام پر آ کر منٹو اچانک رُک جاتے ہیں، کہانی دوبارہ شروع کرنے سے پہلے، ایک صفحے پر انھوں نے جو کچھ لکھا میں اسے ازسرِ نو تحریر کر رہا ہوں۔ اسے بہ آسانی چھوڑا جا سکتا تھا۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ جس حد تک بھی ممکن ہو ہم اصل کے ساتھ جڑے رہیں۔ اس لیے منٹو کے اس بیان کو بھی ناول کا ایک جزو نہ ماننے کی میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں۔ اس ناول کے اندر اور باہر منٹو نے جو لکھا ہے میں اسے ہو بہو یہاں نقل کر رہا ہوں]

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کیا یہ ناول واقعی غالب کی زندگی سے متعلق ہے؟ پہلے مجھے اتنا وہم نہیں تھا، جتنا اب ہے۔ لیکن لاہور آنے کے بعد میری شراب پینے کی لت بہت بڑھ گئی تھی، جسم اور روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے میں ہر طرح کے مکروفریب سے کام لے رہا تھا۔۔۔ گھر کی طرف میری نظر ہی نہیں تھی، آپ کہہ سکتے ہیں کہ خودحفاظتی کے لیے یہ سب فریب تھا۔۔۔ جس کا اب میں حساب بھی کھو بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب کے بارے میں جو فلم کی کہانی میں نے لکھی تھی وہ ایک فراڈ تھا، پوری فلمی دنیا ہی فراڈ ہے۔ وہ مرزا غالب کے کسی ناجائز تعلق کے بارے میں کہانی چاہتے تھے۔ میں نے لکھ دی۔ سینما کے لیے اسکرپٹ اور کہانیاں تو میں صرف پیسے کمانے کے لیے لکھتا تھا۔ لیکن میرے ناول کے غالب تو 'گوگول' کی کہانی 'اوورکوٹ' کے آدمی کی طرح تھے جنھیں میں پکڑ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس لیے میں نے صفیہ کو بلا کر، جہاں تک لکھا تھا سنایا۔ لاہور آنے کے بعد کوئی ایسا نہیں تھا جسے میں اپنا لکھا پڑھ کر سناتا۔ اس لیے اسی کو یہ سزا جھیلنی پڑی۔

— کیا خیال ہے تمھارا، صفیہ؟ میں نے پوچھا۔

— میں بھلا ادب کے بارے میں کیا جانتی ہوں؟ صفیہ مسکرائی۔ 'عصمت ہوتی تو سمجھتی'

— عصمت تو نہیں ہے، تمھی بتاؤ۔

— بے ادبی معاف کیجیے گا، منٹو صاحب۔

— کہو۔

— آپ خود کو مرزا صاحب پر حاوی کیے دے رہے ہیں۔

— تم ایسا سمجھتی ہو؟

— جی ہاں۔

میں نے بیگم سے اور بھی کچھ باتیں پوچھیں۔ وہ بار بار یہی کہتی رہی۔ 'میں بھلا ادب کے بارے میں کیا جانتی ہوں؟ اگر عصمت یہاں ہوتی تو......' عصمت، عصمت، عصمت۔ بار بار بس ایک ہی نام۔ میری سب سے اچھی دوست اور سب سے بڑی دشمن۔ وہ جانتی تھی کہ میں مر رہا ہوں پھر بھی وہ میرے خطوں کا جواب نہیں دیتی تھی۔ میں جانتا تھا پاکستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ پر عصمت تو عصمت تھی۔ 'لحاف' جیسی کہانی اور کون لکھ سکتا

تھا۔ کیسی اتھل پتھل مچائی تھی اس نے۔ ملاؤں سے لے کر ترقی پسندوں تک، سب اس پر چڑھ دوڑے۔ ہم جنس پرستی کے بارے میں کہانی؟ اور وہ بھی عورتوں کے درمیان؟ عصمت نے واقعی بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا۔

آخرکار میں نے مرزا صاحب کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھایا۔

— کیا بات ہے میاں؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟ مرزا صاحب ہنسنے لگے۔

— میں آپ کے بارے میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ کیا میں اس میں سے کچھ حصے پڑھ کر سناؤں؟ اگر آپ نے کہا کہ بات نہیں بن رہی تو سلام بجا لا کر پیچھے ہٹ جاؤں گا۔

— تو پڑھو۔ اپنا قصہ کون نہ سننا چاہے گا۔

جب میں نے پڑھنا ختم کیا، مرزا صاحب کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ 'کیسا لگا آپ کو؟' میں نے پوچھا۔

مرزا صاحب اب بھی اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے، پھر انھوں نے ایک شعر پڑھا۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئنہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

پھر بولے، لکھتے رہیے، منٹو بھائی۔ زندگی میں کوئی کسی کو نہیں چھو پاتا، یہ توقع لاحاصل ہوگی کہ اپنی کہانی میں آپ مجھے چھو پائیں گے۔ پھر بھی لکھتے رہیے۔ لکھنا ہی تو صراطِ مستقیم ہے۔

تو کیا میرے لیے بھی کوئی صراطِ مستقیم تھی؟ اتنے گناہوں کے باوجود بھی؟

منٹو کے ناول کا یہ حصہ پڑھ کر مجھے بہت مزہ آیا۔ میں نے تبسم کو بتایا کہ مرزا غالب کے بارے میں ناول تو میں لکھ نہیں پایا، منٹو سے متعلق ناول لکھنے کو دل ضرور چاہتا ہے۔

— وہ کیوں، جناب؟ تبسم نے مسکرا کر پوچھا۔

— ایسا شیطان صفت آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ شیطان کی بازیافت کا اپنا ہی مزہ ہے۔

— آپ کی خود اپنے بارے میں کیا رائے ہے؟

— تم کیا سمجھتی ہو؟

—آپ بتائیے؟

—اگر جانتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جیسے منٹو ہر ایک کو اور ہر چیز کو فراڈ کہا کرتے تھے، سمجھ لو میں بھی ایک فراڈ ہوں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ لکھنا، میرا فراڈ کا دھندا ہے۔

مرزا صاحب کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ اپنے سُسر معروف صاحب کے گھر زیادہ دن نہیں رہے۔ ایک تو وہ انھیں برداشت ہی نہیں کر پاتے تھے، دوسرے دلّی آ کر وہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھنے لگے تھے۔ جی ہاں، یہ چیز ان کی شخصیت میں موجود تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا تھا، وہ کبھی نہیں بھول پاتے تھے کہ وہ ترک سپاہیوں کی نسل سے ہیں۔ رئیسانہ مزاج ان کے خون میں شامل تھا، اس لیے سسرال میں رہنا ان سے برداشت نہ ہوا۔ چاندنی چوک کے قریب حبش خاں کا پھاٹک تھا، اسی کے پاس انھوں نے شعبن خاں کی حویلی کرائے پر لے لی، تو کہیں جا کر اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ زندگی گزارنے کی صورت بنی۔ ادھر امراؤ بیگم، زنانہ محل میں اپنا قرآن اور حدیث لیے پڑی رہیں۔

اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا، دوستو، کہ مرزا صاحب نے اپنی بیگم کی طرف کبھی نگاہ نہیں کی۔ وہ ہر وقت اپنی شاعری، شراب نوشی، مشاعروں، طوائفوں اور اپنی دوسری رنگ رلیوں میں مشغول رہتے تھے۔ کیا ایسا کبھی نہ ہوا ہوگا کہ امراؤ بیگم نے اپنے شوہر سے بات کرنا چاہی ہو یا ان کے قریب آنا چاہا ہو؟ ضرور ہوا ہوگا۔ لیکن مرزا صاحب کی بے پروائی اور سنگ دلی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ بیگم کے ساتھ ہم بستر ہوئے۔ دو ایک نہیں، سات سات اولادیں پیدا کیں، یہ اور بات کہ ان میں سے کوئی بھی ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ جیا، لیکن وہ اپنے رئیسانہ مزاج کے نشے میں چور رہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ کیوں امراؤ بیگم نے رفتہ رفتہ خود کو قرآن کے اندر بند کر لیا۔ کیوں آخر کار انھوں نے اپنے کھانے کے برتن تک الگ کر لیے تھے۔ ہر بچے کی پیدائش اور پھر اس کی موت، ان کے اندر کے اندھیرے سے انھیں کسی اور زیادہ گہرے اندھیرے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ مرزا صاحب ان پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے بلکہ اُلٹا ان کا مذاق بنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب حویلی بدلنے پر مُصر ہوگئے۔ خود جا کر نئی حویلی دیکھ بھی آئے۔ امراؤ بیگم نے پوچھا، حویلی کیسی لگی، مرزا صاحب؟

—دیوان خانہ تو اچھا ہے لیکن میں نے زنانہ محل نہیں دیکھا۔

—وہ کیوں؟

—میں دیکھ کر کیا کرتا؟ وہ تو تمھاری مسجد ہے۔ تم جا کر دیکھ آؤ۔ مرزا صاحب ہنسنے لگے۔

—مسجد؟

—اور نہیں تو کیا۔ زنانہ محل کو تو تم نے مسجد ہی بنا ڈالا ہے۔ اب بات مت بڑھاؤ، جا کر ایک بار دیکھ آؤ۔

شوہر کی بات مان کر امراؤ بیگم حویلی دیکھ آئیں۔ مرزا صاحب نے پوچھا، کیسی لگی؟ پسند آئی تمھیں؟

—جی، لیکن......

—لیکن کیا؟

—سب کہتے ہیں اس حویلی میں جن ہے۔

— کس نے کہا کہ جن ہے؟

—جو لوگ حویلی کے آس پاس رہتے ہیں۔

—اُن لوگوں نے تمھیں دیکھا ہے؟

—جی۔

مرزا صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا— ارے بیگم، دنیا میں تم سے زبردست جن کوئی اور ہے کیا؟

اپنے شوہر کے منھ سے ایسی بات سننے کے بعد کسی عورت کے پاس کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے، امراؤ بیگم زنانہ محل لوٹ گئیں۔ میں ان مرزا صاحب کو کبھی معاف نہیں کر سکتا، برادران۔ ایسا نہیں ہے کہ بطور شوہر میں وہ سب صفیہ کو دے پایا جو مجھے دینا چاہیے تھا لیکن کم از کم میں نے اس طرح اس کی توہین کبھی نہیں کی۔ مرزا صاحب بڑی آسانی سے کسی کو بھی ذلیل کر دیتے تھے۔ کم از کم اپنی جوانی کے دنوں میں تو کرتے ہی تھے۔ ظاہر ہے، اگر آپ کسی کی توہین کرتے ہیں تو خود آپ کو بھی اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، تاہم وہ اپنی توہین

برداشت نہ کر پاتے تھے۔ لیکن ان باتوں کی بنا پر آپ مرزا صاحب کے بارے میں فیصلہ صادر نہیں کر سکتے۔ زندگی محض کالی سفید تصویر نہیں ہوتی، اس میں طرح طرح کی پرچھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اور مرزا صاحب کی زندگی ہماری روزمرہ کی زندگی سے کہیں بڑی تھی۔ وہ انگریزی میں کہتے ہیں نا 'لارجر دین لائف'۔ آپ ان کی زندگی پر تنقید کر سکتے ہیں، اس پر سوال اٹھا سکتے ہیں لیکن شارک سے بھرے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔

دلّی میں شاعر کے طور پر مقام پانے کے لیے مرزا صاحب کو کم ذلت نہیں سہنی پڑی۔ ایک کے بعد ایک مشاعرے میں ان کے کلام کو اور خود انھیں بے عزت کیا گیا۔ کس لیے؟ کیونکہ ان کے کلام کو سمجھنے والے تب تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بونے شاعر ایسے میں کیا کرتے ہیں؟ کلام پر کیچڑ اُچھالتے ہیں، مہمل گوئی کا الزام چسپاں کر دیتے ہیں، مذاق بناتے ہیں۔ میں آپ کو ایسے ہی ایک مشاعرے کا قصہ سناتا ہوں۔ اس مشاعرے میں دلّی کے نامی گرامی شاعر اور رؤسا موجود تھے۔ شاعر سلسلہ وار اپنا کلام سنا رہے تھے۔ 'کیا بات ہے، کیا بات ہے' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ تالیاں بج رہی تھیں، لیکن مرزا صاحب دیکھ سکتے تھے کہ شاعری نہایت معمولی تھی۔ پُرتکلف لفظیات سے سجی ہوئی، اس عورت کی طرح جس کی خوبصورتی ڈھیروں زیورات تلے دب کر کھو گئی ہو۔ جب مرزا صاحب کے پڑھنے کی باری آئی تو حکیم آغا جان عیشؔ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا، 'اتنے بڑے شاعر کے غزل پڑھنے سے پہلے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

'ارشاد فرمائیے۔' مجمعے سے ایک شور بلند ہوا۔

— عرض کیا ہے......

— ارشاد، ارشاد۔

آغا جان عیشؔ نے شعر پڑھنا شروع کیا۔

کلام میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مشاعرہ گاہ میں قہقہے بلند ہو گئے۔ کیا اس کے بعد کوئی شاعر اپنا کلام پڑھ سکتا ہے، برادران؟ ایک بار اور کیا پیش آیا، سنیے۔ رام پور کے مولوی عبدالقادر ایک مرتبہ حاضر ہوئے اور کہا، 'مرزا

صاحب میں آپ کا ایک اردو شعر سمجھنے سے قاصر ہوں، اگر آپ اس کی وضاحت فرما دیں۔'

— کون سا شعر، جناب؟

— وہ جو آپ نے کہا ہے ۔

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

— قادر صاحب، یہ تو میرا شعر نہیں ہے۔

— لیکن میں نے تو یہ آپ کے دیوان ہی میں پڑھا تھا۔ کیا آپ ایک بار کھول کر دیکھیں گے؟

مرزا صاحب سمجھ گئے کہ دراصل وہ ان کے کلام کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے دوست فضلِ حق کی تنقید کو قبول کیا تھا۔ آپ کسی فنکار پر حملہ کر کے اسے بدلنے پر شاید ہی مجبور کر سکیں۔ ہاں اگر آپ ایک دوست کی طرح اسے بتائیں، وہ بھی تب جب آپ میں اس موضوع پر بات کرنے کی اہلیت ہو، تو ایک فنکار اسے مان سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے فضلِ حق کی تنقید پر اپنی شاعری کی زبان کو بدلنا شروع کیا، کیونکہ ایک دوست کی تنقید مذاق کی بات نہیں، بلکہ پیٹھ تھپتھپاتا ہوا ہاتھ ہوتا ہے اور پھر فضلِ حق زبان کی باریکیوں کو سمجھتے تھے۔ لیکن جسے اس سب کی سمجھ ہی نہ ہو کیا اسے مرزا صاحب کی شاعری پر تنقید کا حق تھا؟ علم طبعیات اور علم کیمیائی پر بات کرنے کے لیے آپ کو ان پر مہارت کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن جب شعر و شاعری کی بات آئے تو جو آپ کے دل میں آئے آپ وہ کہہ سکتے ہیں، شاعری کی زبان کس طرح جنم لیتی ہے، اس کی تاریخ اور نشوونما کے بارے میں جانے بغیر کیا آپ کو کسی طرح کی رائے زنی کا حق ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ شاعر کے ہاتھ میں محض قلم ہوتا ہے اور سائنس دان متعدد اوزاروں سے لیس ہوتا ہے، آپ کسی شاعر کے بارے میں غیر ذمے داری سے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں؟ اتنی ذلت برداشت کرنے کے بعد ہی شاید مرزا صاحب نے یہ شعر کہا ہوگا ۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

مرزا صاحب بہت امیدیں لے کر دلّی آئے تھے۔ کچھ دنوں میں ہی وہ سمجھ گئے کہ ان کی امیدوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا۔ دلّی کے دربار میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ تنہا اپنے دیوان خانے میں پڑے، نشے کی پینک میں وہ بڑبڑاتے رہے۔

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

۱۵

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
محبت نہ ہوتی نہ ہوتا ظہور

آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا، منٹو بھائی۔ میں سویا نہیں تھا۔ بس یونہی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ باتیں کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے مجھے اور جاگتے رہنے کی خواہش نہیں رہ گئی تھی، سچ تو یہ ہے کہ خدا سے تب میں ایک ہی دعا کرتا رہا تھا کہ اے میرے مالک، مجھے اب قبر کی راہ دکھا دے۔ لیکن اپنے رشتے داروں اور دوست احباب کو کھو چکنے کے بعد بھی مجھے بارہ برس مزید جینا پڑا۔ یہ تو ہونا ہی تھا، آخر میری زندگی میں کب کچھ ٹھیک ہوا تھا اس لیے آہستہ آہستہ میں نے اپنے آپ کو ایک غیر کے طور پر دیکھنا سیکھ لیا، اپنی تباہی کو دیکھ کر خوشی محسوس کرنے لگا۔ ہوسکتا ہے آپ کو ہنسی آئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنے آپ کو دشمن کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ قسمت کے ہر تازیانے پر میں چلّایا، 'دیکھو، یہ دیکھو کتنے غالب کو پھر تازیانہ لگا۔ بہت ناز تھا نا تمھیں خود پر غالب، کہ فارسی میں تم جیسا کوئی شاعر نہیں؟ اور اب دیکھو تمھارے نام کے ساتھ کیا لکھا ہے، کہ تم دوزخی ہو، سؤر کہیں کے۔' خود کو مطعون کرتا میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آخر آنسو بھی خشک ہو گئے اور میری آنکھیں کسی صحرا کی طرح بے آب و گیاہ ہو گئیں۔ میں دعائیں مانگتا تھا، اے اللہ، آنسو نہیں، اب تو میری آنکھوں سے جوئے خون رواں ہونی چاہیے۔ میں کسی یتیم کی طرح، اپنے چہرے اور ہاتھوں پر خون مل کر مرنا چاہتا ہوں، لیکن خدا نے مجھے دنیا

ہی میں جہنم دکھا کر قبر میں بھیجا۔ جانتے ہیں، کیوں؟ میرا ایک ہی گناہ تھا۔ جب خدا اس فانی زندگی کو پوری طرح مٹا دینا چاہتا تھا، میں نے اس زندگی کو، اپنی غزلوں کے ذریعے، کچھ غیر فانی لمحات مہیا کر دیے۔ پھر بھلا خدا مجھے اس کی سزا کیوں نہ دیتا؟ بے شک، اسے دینی ہی چاہیے تھی۔ کیا سمجھتے ہو، کون ہو تم، مرزا غالب؟ تم خدا کی دنیا کے مساوی اپنے لفظوں سے ایک نئی دنیا تخلیق کرنا چاہتے ہو؟ بے وقوف۔ تم شاعری کرتے ہو، قصے گھڑتے ہو، تصویریں بناتے ہو، سُر باندھتے ہو۔ تم بے وقوف نہیں تو اور کیا ہو؟ لیکن میں کیا کرتا، منٹو بھائی؟ مجھے تو لفظوں سے پیار تھا۔ میں لفظوں سے رنگ کشید کرتا تھا، ان کی گہرائی میں ڈوب کر ان کا ترنم سنتا تھا۔ اندھیرے میں بھی دیکھ پاتا تھا — یہ سب جو میں کر پاتا تھا، یہ تو اللہ ہی کی ودیعت تھی۔ کیا پھر بھی وہ مجھے سزا دے گا؟ مجھے اس سزا کی رمز بہت بعد میں سمجھ آئی۔ جسے دیکھا نہیں جاسکتا آپ اسے دیکھ لیتے ہیں، جسے سنا نہیں جاسکتا، آپ اسے سن لیتے ہیں؛ جسے محسوس نہیں کیا جاسکتا آپ اسے محسوس کر لیتے ہیں؛ اس کے لیے آپ کو سزا تو ضرور ملنی چاہیے۔ کیونکہ آپ نے لافانیت کا مزہ چکھ لیا، تو اب آپ کو یہ زندگی جہنم میں گزارنی ہوگی۔ جس طرح الحلاج کو سزا جھیلنی پڑی تھی۔ تم ایک نئی کائنات تخلیق کرنا چاہتے ہو، لیکن تم اس کا بوجھ نہ اٹھا پاؤ گے — یہ بھلا کیسے ممکن ہوگا؟

لیکن دِلّی آنے کے بعد، ابتدائی دس بارہ برس تک ایسا کچھ واقع نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے جو آپ کہہ رہے تھے کہ میں دیوان خانے میں بیٹھا رویا کرتا تھا، تو اس میں کچھ غلو سے کام لیا آپ نے۔ نہیں منٹو بھائی، میں نے تب تک رونا نہیں سیکھا تھا۔ ہاں، نا امید ہو جاتا تھا، پریشان ہوتا تھا، کبھی کبھی بہت اکیلا پن بھی محسوس ہوتا تھا لیکن تب تک میری آنکھوں میں بادلوں نے ڈیرا نہیں ڈالا تھا۔ پہلے زمین بھیگے گی، بھاپ اٹھے گی اور آسمان تک پہنچے گی۔ تب کہیں جا کر بادل نمودار ہوں گے؛ اس عمل میں تو وقت لگتا ہے اور وہ تو میری نوخیزی کا دور تھا۔ ہر کوئی مجھے نظر بھر کے دیکھتا تھا۔ جانتے ہیں، کیوں؟ میری رنگت چمپئی تھی۔ یہ آپ جس کرخیدہ اور جھریوں سے بھرے ہوئے غالب کو دیکھ رہے ہیں، اسے دیکھ کر آپ اُس غالب کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتے۔ طویل القامت اور چھریرا، گھنے گھنگھریالے بال، میں جب ان میں اپنی انگلیاں پھیرتا تھا تو مجھے مخملی احساس ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چلمنوں کے پیچھے سے کتنی ہی عورتیں مجھے جھانکا کرتی

تھیں، منٹو بھائی اور کیوں نہ جھانکتیں؟ دِلّی شہر میں میرے مقابلے کے لوگ ہی کتنے تھے؟ سب کے سب ایک جیسی ہی پوشاکیں پہنتے تھے، سب نے لمبے بال اور گھنی داڑھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بھیڑوں کا ریوڑ۔ سمجھے آپ؟ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ جب مرزا غالب پالکی پہ سوار ہو کر راستے سے گزریں تو لوگ ان کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھیں؟ پاجامے کے اوپر مہین کرتا، جس پر جامدانی کام سے پھول بوٹے اور دوسرے نقش و نگار بنے ہوتے تھے۔ سر پر لمبی استرخانی ٹوپی۔ میں نے ہر چیز سے اپنی انفرادیت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ سب 'مرزا نامہ' سے سیکھا تھا، کیا عمدہ کتاب تھی وہ، برادران۔ اس میں وہ سب قاعدے تحریر تھے جو صحیح معنوں میں ایک شہزادہ، ایک مرزا بننے کے لیے اختیار کرنا ضروری تھے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، کوئی بھی اٹھ کر مرزا بن سکتا ہے؟ اس کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ آپ کا پہناوا ہی اس راز کو آشکار کر دیتا ہے کہ آپ مرزا ہیں یا نہیں۔ اپنے ہم چشم کے سوا، مرزا کسی ایرے غیرے سے ہمکلام ہی نہ ہوگا۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ عام لوگوں سے مختلف ہے، مرزا پیدل چل کر کبھی کہیں نہیں جائے گا، بلکہ ہمیشہ پالکی پر سوار ہوگا۔ بازار میں اگر کچھ پسند آجائے تو مرزا اُسے خریدے گا، قیمت چاہے جو بھی ہو۔ وہ دوسروں کی طرح بھاؤ تاؤ نہیں کرے گا۔ اور کیا کیا ہے جو وہ ضرور کرے گا؟ وہ اپنی قیام گاہ پر امیروں اور رئیسوں کو محفل آرائی کے لیے ضرور مدعو کرے گا۔ ایک بات سمجھ لیجیے: جو قوام محفل میں پیش کیا جائے گا وہ خوشبودار ہوگا اور اس میں حشیش کی آمیزش ہوگی۔ شراب میں موتی پیس کر شامل کیے گئے ہوں گے۔ مرزا ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ آپ یادداشت کے سہارے سعدی کی 'گلستان' اور 'بوستان' سے کچھ ٹکڑے سنائیں۔ اور سب سے اہم بات، جب آپ گفتگو کریں تو آپ کی زبان اغلاط سے پاک ہو۔ بیچ بیچ میں آپ کو غزلوں کے اشعار پڑھنا ہوں گے۔ پھولوں میں آپ کا پسندیدہ پھول ہوگا نرگس۔ اور پھلوں میں پسند ہوگا سنگترہ۔ مرزا کے لیے دنیا کی سب سے عظیم عمارت آگرے کا قلعہ ہوگی اور دنیا کا سب سے نفیس شہر ایران کا شہر اصفہان۔ سر پر بڑی بڑی پگڑیاں باندھنے والوں سے مرزا کو ہمیشہ نفرت ہوگی۔

جب میں بوڑھا ہو گیا تو اس مرزا غالب کو دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آتی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب انسان کسی خواب میں کھویا ہوا ہوتا ہے، وہ اسی طرح خود کو سب سے منفرد تصور کرتا

ہے،اور پھر جب خواب ٹوٹنے لگتا ہے تو وہ دھیرے دھیرے زمین پر پاؤں رکھنا سیکھتا ہے۔ سمجھ جاتا ہے کہ سب سے منفرد نظر آنے کی خواہش جوانی کے گھمنڈ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر انسان ہی منفرد ہوتا ہے۔کوئی کسی کے جیسا نہیں ہوتا، سب الگ الگ ہیں۔ اس سچ کو سمجھنے کے لیے زندگی کی راہ میں بہت سی کربلائیں پار کرنی پڑتی ہیں، منٹو بھائی۔

نہیں، نہیں، براہِ مہربانی پریشان مت ہوں، برادران۔ جس چمپئی رنگت والے مرزا غالب کا قصہ آپ سننا چاہ رہے ہیں وہ میں آپ کو سناؤں گا، لیکن یاد رکھیے، جب آپ خود اپنی زندگی کے باہر کھڑے ہو کر اس زندگی کو دیکھتے ہیں تو کہانی سیدھی لکیر پر نہیں چلتی — لفظوں کی کتنی ہی شاخیں مختلف سمتوں سے آ کر اس میں جڑ جاتی ہیں۔ میں ایک ایسی زندگی کی طرف مڑ کر دیکھ رہا ہوں جس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس زندگی پر اب مزید کوئی نئی راہ نہ کھلے گی، کتنی ہی دوسری ممکنہ چیزیں یاد آئیں گی، اگر یہ یوں نہ ہوا ہوتا بلکہ یوں ہوتا، تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ میں اس وقت کسی خیال کو بھی جھٹک نہیں سکتا۔

آپ نے ٹھیک کہا، منٹو بھائی، معروف صاحب کا گھر چھوڑ دینے کے بعد بالآخر مجھے اپنے پَر پھیلانے کا موقع میسّر آیا۔ وہاں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ ایسے آدمی کو زیادہ دیر برداشت کرنا مشکل ہے، جو شعر تو کہنا چاہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو وعظ بھی کرتا رہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی ناپ کے فیتے کی طرح ہوتی ہے اور وہ اس فیتے کے ناپ سے دوسروں کی زندگی بھی کاٹ چھانٹ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن میں ٹھہرا ایک یتیم۔ باپ کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ میرے لیے زندگی ایسی چیز نہیں تھی جس کی پیائش کی جا سکے۔ جب میں کرائے پر، شعبن خاں کی حویلی میں اُٹھ آیا تو میں نے خود مختار زندگی کا ذائقہ چکھا۔ شراب پینے، جوا کھیلنے اور قحبہ خانوں میں جانے سے مجھے اب بھلا کون روک سکتا تھا؟ کسی کسی رات بیگم کے ساتھ ہم بستر ہو جاتا، اور کسی مشین کی طرح وظیفۂ زوجیت ادا کرتا، بیگم اس سے زیادہ کی متمنی بھی نہ تھیں۔ ان کے مطابق دو جسموں کے ملاپ کا مقصد محض افزائشِ نسل تھا۔ تو بچے پیدا ہوئے لیکن وہ ایک ڈیڑھ سال کے اندر ہی مر جاتے تھے۔ بچتے بھی کیسے، بتائیے؟ وہ محبت کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان کے بچنے یا مرنے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ ان میں سے اگر کوئی زندہ رہتا تو بیگم کے ساتھ میرا تعلق اتنا سرد

مہری کا شکار نہ ہوتا لیکن میں تو تب انفرادیت کی خواہش کے نشے میں چور تھا۔ یہ ایسا نشہ ہوتا ہے جس میں آپ دوسرے انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اس کی تضحیک کرتے ہیں اور اسے تمسخر میں اڑا دینا چاہتے ہیں اور میرے اندر اس کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔ چلیے، آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں، ایک شام ایک ملّا جی نے شراب نوشی کے بارے میں مجھ سے ہولناک باتیں کیں، مثلاً یہ کہ شراب حرام ہے، تم دوزخ میں جاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔ وہ دیر تک زوردار آواز میں بولتے رہے، اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ 'شراب پینے میں آخر کیا خرابی ہے، مولانا؟' میں نے پوچھا۔

—شرابی اس بات کو نہیں سمجھ سکتا۔

—تو کون سمجھتا ہے؟

—خدا سب حساب کتاب رکھتا ہے۔

— کیا حساب کتاب رکھتا ہے؟

—یہی کہ شرابی کی دعا کبھی قبول نہ ہو۔

میرے اندر دیر سے رُکی ہوئی ہنسی کسی فوارے کی طرح پھوٹ پڑی۔ مولانا، میرے پاس مئے ہے، جو سب کچھ بھلا دیتی ہے، پھر بھلا مجھے دعا مانگنے کی کیا حاجت؟

آج مجھے بھی لگتا ہے کہ شرابی کی دعا واقعی قبول نہیں ہوتی۔ شرابی کا احساس ایسی جگہ اٹک جاتا ہے، جہاں اسے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی میں شراب نہ چھوڑ سکا۔ نشہ آپ کے گرد ایک ایسی بند گلی بنا دیتا ہے جہاں سے پھر آپ کبھی فرار نہیں ہو پاتے۔ بس اس کے اندر ہی چکر کھاتے رہتے ہیں اور اس بھنور کے بیچ آپ ہر گزرتے دن کے ساتھ تنہا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سچ کہوں تو میں بڑی امید لے کر شاہ جہاں آباد آیا تھا۔ شاعر کے طور پر میری نیک نامی بڑھ رہی تھی لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو ہر مشاعرے میں مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ میں ذوقؔ اور مومنؔ کی طرح بندھے ٹکے انداز کی غزل نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ میرے لیے ہر ایک لفظ کسی بلور کی مانند تھا، جب دل کی روشنی کسی لفظ پر پڑتی تو جیسے قوسِ قزح نمودار ہو جاتی تھی۔ جن دنوں میں کالے محل میں گھوما کرتا تھا یا اکبر آباد کی گلیوں میں مارا مارا پھرا کرتا تھا، میں لفظوں کے اندر چھپے آنسوؤں کے جھرنے کی آواز سن پاتا تھا۔ منٹو بھائی، کیا آپ کو معلوم ہے کون روتا تھا ان لفظوں

تک نہیں تھا۔ان کا سجاؤ اور گفتگو کا ڈھنگ نہایت پست ہوتا ہے۔لیکن منیرہ — منیرہ بائی ان سب سے الگ تھی۔

ان دن سے منیرہ بائی ہی نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔وہ صرف میری غزلیں گایا کرتی۔جب منیرہ بائی گاتی، شفق کے بادلوں کی روشنی اس کے سانولے چہرے پر پھیل جاتی۔

— منیرہ۔

— جی۔

— میری غزلیں تم نے کہاں سنیں؟

منیرہ بائی مسکرائی۔'یہ جنت سے اُتری ہیں۔'

— آسمان سے؟

— جی۔

— وہ آسمان، وہ ستارے کہاں ہیں؟

— 'یہاں' منیرہ مسکراتی ہے اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھ دیتی ہے۔'وہ یہاں میرے سینے میں ہیں، جناب۔'

آسمان اس کے سینے میں تھا اور میری غزلیں آسمان سے اُتر کر آئی تھیں — کسی نے ان کی ایسی تشریح تو کبھی نہیں کی تھی۔یہ صرف منیرہ بائی ہی کہہ سکتی تھی۔میری غزلوں کے ساتھ اس کا تعلق کسی مالی منفعت کا نہ تھا۔میں نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔وہ میرے جسم کی اوٹ لے کر بے لباس ہوگئی۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی نم آلودہ اور گھنگھور بادل کو لپٹا لیا ہو۔بیگم فلک آراء میری زندگی میں ایک دھوپ بھرے چمکیلے دن کی طرح تھیں، منو بھائی، اور منیرہ موسلا دھار بارش، مسلسل گرتی ہوئی۔میرے بدن پر کتنے ہی نئے سبز پتے اُگ آئے؛ یقین مانیے، جب میں منیرہ کے سامنے بیٹھا، میں صرف اس کی آنکھیں ہی دیکھ سکا؛ ہرنی کی طرح پھرتیلی لیکن کبھی کبھی ساکت و جامد۔ان ساکت آنکھوں میں مجھے ڈر دکھائی دیتا تھا، جیسے زقندیں بھرتا ہوا ہرن ٹھٹھک کر کھڑا ہو جائے۔

انھوں نے مجھ پر بہتان لگائے، منو بھائی۔ٹھیک ہے تم مرزا غالب ہو، تم کوٹھوں پر جا سکتے

ہو، طوائفوں کے ساتھ رات بھی گزار سکتے ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ایک ڈومنی کے گھر رہنے لگو۔کیا تم اپنی حیثیت کو بھول چکے ہو؟ حیثیت کسے کہتے ہیں، منو بھائی؟ جب مشاعروں میں میری تذلیل کی جاتی تھی، ایک وہی تو تھی جس کے پاس میں جا سکتا تھا۔وہ کچھ نہیں کہتی تھی، بس میری غزلیں گاتی رہتی تھی:

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

جہاں آسرا ہے، وہیں نجات ہے۔اس لیے مجھ پر جتنا بھی کیچڑ اُچھالا گیا، میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔لوگ مجھ پر پتھر پھینکیں گے اس لیے میں دُم دبا کر بھاگ جاؤں؟ میں ایسا آدمی ہرگز نہیں تھا۔اپنے آباؤ اجداد کی طرح میں کبھی میدانِ جنگ میں تو نہیں اُترا، لیکن میری زندگی خود ایک میدانِ جنگ بن گئی تھی، اور یہ لڑائی مجھے اکیلے ہی لڑنا تھی۔بھاڑ میں جائیں لوگوں کی باتیں۔منیرہ جب میرے بستر میں ہوتی تھی تو میں ہر تذلیل کو بھول جاتا تھا، ایسا منیرہ ہی کروا سکتی تھی، اور میں ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ مزید اس سے لپٹتا جا رہا تھا۔اس کی آواز میں ایک کے بعد ایک اپنی غزل سُن کر مجھے محسوس ہوتا تھا، مشاعروں میں میرا ہزار تمسخر اڑایا جاتا ہو، کم از کم ایک عورت تو ہے جو اپنی آواز کے ذریعے میری غزلوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔میں منیرہ کو صرف اپنے لیے پانا چاہتا تھا، میں اسے کہیں اور گانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا، نہ ہی کسی اور کو اس کے گھر آنے کی اجازت دے سکتا تھا۔میں نے اس کی بود و باش کی ذمے داری اٹھالی۔ایسا نہیں تھا کہ میں بہت متمول تھا۔کُل ملا کر باسٹھ روپے پچاس پیسے کی پنشن تھی جو انگریز سرکار سے آتی تھی۔اسی میں گھر چلانا ہوتا تھا، اوپر سے شراب اور جوا اور اب منیرہ کے اخراجات بھی۔ویسے میری خالہ کبھی کبھار مجھے کچھ روپے پیسے بھیج دیا کرتی تھیں، گاہے بہ گاہے لوہارو سے احمد بخش بھی کچھ پیسے بھیج دیتے تھے، یہاں تک کہ میری والدہ بھی آگرہ سے کبھی کبھار مجھے پیسے بھیج دیا کرتی تھیں۔لیکن میری فضول خرچیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے وہ بھی کم پڑ جاتے تھے۔اس لیے قرض لینا پڑتا تھا۔اس وقت متھرا داس یا درباری مل یا خوب چند جیسے لوگ بھی تھے جو قرض مانگنے پر کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔غرض یہ کہ دن موج مستی میں گزر رہے تھے، اور منیرہ

کے تصور سے نہ جانے کتنی غزلیں تخلیق ہو رہی تھیں:

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

لیکن ایک دن کچھ لوگ منیرہ کے گھر میں گھس آئے، اسے مارا پیٹا اور چیزیں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ جانتے ہیں کیوں؟ تاکہ وہ مجھے اپنے گھر نہ آنے دے، لیکن میں پھر بھی گیا، میں ضد میں آ گیا تھا۔ منیرہ نے میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر روتے ہوئے کہا،'مرزا صاحب، آپ چلے جائیے۔ اگر ان لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا......'

—تو کیا کریں گے وہ؟ ماریں گے مجھے؟

—میں آپ کی رسوائی نہیں چاہتی۔

—تم بھی یہی چاہتی ہو کہ میں پھر کبھی نہ آؤں؟

میرے چہرے کو اپنے سینے کی خلوت نشینی میں کھینچ کر، وہ روتے ہوئے کہنے لگی،'میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، مرزا صاحب، آپ میری جان ہیں، لیکن......'

اس کے بغیر تو میں بھی جینے کا تصور نہیں کر سکتا تھا، منٹو بھائی۔ میں منیرہ کی طرف یوں کھنچا چلا گیا تھا جیسے پروانہ شمع کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ اس کے جمال کے بنا میری زندگی ادھوری تھی۔ جانتے ہیں میرے دل کی حالت کیسی تھی؟ جیسے کسی بھی لمحے کوئی اسے مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ میں تو اس کے ساتھ باغ کی سیر کو بھی جاتا تھا، مجھے ڈر تھا مبادا نرگسِ شہلا اسے دیکھ کر اپنی خوبصورتی بھول جائے اور اسے اپنا ہی انسانی روپ سمجھ کر اس کی طرف دوڑا چلا آئے۔ جتنی زیادہ گہرائی سے میں نے منیرہ کو جاننے کی کوشش کی، اتنا ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں اُسے پوری طرح نہیں جان پایا:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

میں ٹھیک ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ اس کے ساتھ پورا وصال میری قسمت میں نہیں تھا۔ اگر اور زندہ رہوں بھی تو اس کا انتظار ہی کرنا ہوگا۔ زندگی میں پہلی بار میں اس طرح پیار کر سکا تھا منٹو

بھائی۔ شعراء میں فردوسی، فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں—یہ تین آدمی دنیا کے مینارۂ نور ہیں۔ اگر آپ مجنوں کی طرح عشق نہ کر سکیں تو میں اسے عشق نہ کہوں گا۔ میں نے ایسا کرنا چاہا، منٹو بھائی، لیکن میں مجنوں جیسا عشق نہ کر سکا۔ میرے لیے وہ راستہ بہت دشوار تھا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو خود کو فراموش کر دینے کی ریاضت کر پاتے ہیں؟ میں بھی نہیں کر پایا۔

پہلے پہل مجھے شدید صدمہ پہنچا اور میں نے منیرہ بائی کے پاس آنا جانا کم کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ غم مٹ گیا اور اس کے ساتھ وہ بھی ختی چلی گئی۔ مغل خون بڑا سنگ دل ہوتا ہے، منٹو بھائی۔ میری رگوں میں بھی تو یہی خون دوڑ رہا تھا۔ جانتے ہیں یہ خون کیا کرتا ہے؟ جس پر مرتا ہے اسی کو مار دیتا ہے۔ میں اسے بھول جانے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی زندگی میں نئے طور پر مشغول ہو گیا۔ لیکن منیرہ نے گویا خود کو میرے اندر قید کر رکھا تھا۔ اس کے لیے کوئی نئی راہ نہ کھلی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں، ایک بار جسے چاہتی ہیں، پھر اس کی چاہت کے پنجرے سے باہر نہیں نکل پاتیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کا وجود ختم ہو جائے اور وہ فنا ہو جائیں تب بھی وہ خود کو اسی پنجرے میں قید کیے رکھتی ہیں۔ ایک وقت تھا جب میں سوچا کرتا تھا کہ میری پسند کے حساب سے ان کی دنیا بہت چھوٹی ہے، لیکن کسی شخص کی محبت میں جب کوئی جان بھی دے سکتا ہو تو دراصل وہ قطعیت کی راہ پر چل رہا ہوتا ہے۔ خود کو پا کر کسی دوسرے میں کھو جانے کا عمل۔ خدا نے مردوں کو ایسی عظیم ریاضت وائی زندگی نہیں دی، منٹو بھائی۔ ہم پتنگوں کی طرح ہیں اور وہ شمع کی لو—وہ اُجالا کرنے کے لیے خود کو جلاتی ہیں اور فنا کر دیتی ہیں۔ آپ اس عشق کو میرا بائی کے گیتوں میں دیکھ سکتے ہیں، منٹو بھائی۔ گردھاری کے بنا میرا کا جیون اندھیر تھا۔'کیسے جیوں ری مائی، ہَری بن کیسے جیوں۔'

ایک دن میں نے سنا کہ منیرہ بائی فوت ہو گئی۔ اس کی موت کے ساتھ اس بے خود محبت نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن اس کی آنکھیں مجھے چھوڑ کر نہیں گئیں۔ اس کی وہ آنکھیں، جیسی مور کے پنکھ پر بنی ہوتی ہیں، بار بار میرے پاس لوٹ آتی تھیں۔ بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے میں نے ان آنکھوں کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا تھا۔ جب موت نے آ کر میرا ہاتھ پکڑا، تب میں نے جانا کہ میں منیرہ کو مجنوں کی طرح پیار کرنا چاہتا تھا، ورنہ میری زندگی کے ان آخری لمحات میں وہ کبھی نظر نہ آتی:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

منیرہ بائی چلی گئی۔ تباہ حال اور بھی تباہ حال ہو گئے۔ منو بھائی، بیگم فلک آرا میرے وجود کے آسمان پر بجلی کی کڑک کی طرح تھیں اور منیرہ بائی اس ستارے کی مانند جس کی روشنی فنا ہو جانے کے کروڑوں سال بعد بھی ہمارے آنگن میں برستی رہتی ہے۔

شب در شب میں اس کی موت کے اندھیرے کو دیکھتے ہوئے میر صاحب کا یہ شعر دہرایا کرتا۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

منیرہ بائی، میری جان! تم عُجلت میں اس دنیا کو چھوڑ گئیں۔ تم نے دیکھا ہی نہیں، یہاں تو ہر قدم پر ایک نئی دنیا تھی۔

۱۶

آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل، کہ چلے دن بہار کے

اچھا مرزا صاحب، کبھی آپ نے سوچا، ایک ساتھ کتنے غالب آپ کے اندر چھپے ہوئے تھے؟ ان میں سے کتنوں کو آپ جانتے تھے؟ شاید کچھ کو تو آپ ساری زندگی نہ پہچان پائے ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ سماج آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اصلی مرزا غالب کون ہے۔ مثال کے طور پر اس خط کو ہی لیجیے جو آپ نے مرزا حاتم علی صاحب مہر کے نام لکھا تھا۔ کچھ یاد ہے ۱۸۶۰ء میں آپ نے انھیں کیا لکھا تھا؟ مرزا مہر کی معشوقہ وفات پا گئی تھیں، خط میں انھوں نے آپ سے اپنا غم بیان کیا تھا، آپ نے جواب میں لکھا، 'مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔' یاد ہے آپ نے اور کیا لکھا تھا، مرزا صاحب؟ آپ نے مزید لکھا تھا، 'کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور

اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ ہے ہے وہ طور اجیرن ہوجائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی شاخ۔ چشم بددور، وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ ۔

زن نو کن اے دوست در نو بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار!'

دعا ہے کہ ہر نئی بہار میں نئی نئی پریاں تمھاری زندگی میں آئیں ساری زندگی ایک ہی چیز میں پھنسے رہنے سے بڑھ کر بچکانہ بات اور کیا ہوگی؟

مرزا صاحب! آپ کیوں کسی کے غم کا مذاق اُڑاتے تھے؟ نہیں، مجھے اس طرح مت دیکھیے۔ آپ خود کو کیا سمجھتے تھے؟ کیا سب آپ کے کھیلنے کے لیے کھلونے تھے؟ اب آپ مرزا مظہر کے نام لکھے ایک اور خط کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں نا؟ ہاں، میں نے بھی اس خط کو پڑھا ہے۔ اس میں آپ نے تسلیم کیا ہے کہ بالواسطہ طور پر آپ ہی منیرہ بائی کی موت کا سبب تھے۔ جب میں وہ خط پڑھتا ہوں، میری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر اُبھر آتی ہے، ایک شکستہ آدمی—یعنی کہ آپ۔ مرزا مہر کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے ہیں:

'خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ با آنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانۂ محض ہوگیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑ دو ۔

سعدیؔ اگر عاشقی کنی و جوانی
عشقِ محمدؐ بس ست و آلِ محمدؐ

اللہ بس، ماسوئی ہوس۔'

یہ دونوں خط جو ایک ہی زمانے میں لکھے گئے تھے ان میں سے کون سا خط اصلی غالب کا لکھا ہوا تھا؟ کون سا چہرہ تھا اور کون سا نقاب، مرزا صاحب؟ مجھے آپ سے پیار ہے لیکن مجھے

چہرے اور نقاب کے مابین یہ مقابلے کی لڑائی قبول نہیں۔ میں ایک صاف گو آدمی ہوں، آپ کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہوں۔ میں آپ کو شیطان صفت کہہ کر رد نہیں کرسکتا، اگرچہ کبھی کبھی تو آپ اس سے بھی نیچے گر جاتے ہیں۔ آپ اس لمحے جسے پیار کررہے ہیں، اگلے ہی لمحے اس کا تمسخر اڑا سکتے ہیں۔ شاید اسی کو شاہانہ مزاج کہتے ہیں۔ یہ کیا، آپ پھر سے کیوں سونے جارہے ہیں؟ میری باتیں برداشت نہیں ہورہی ہیں۔ ہے نا؟ میں جانتا ہوں مرزا صاحب، آپ اپنے خلاف ایک فقرہ بھی نہیں سن پاتے تھے۔ امیر خسرو کے بعد آپ ہی سب سے اعلیٰ تھے، درمیان میں کوئی بھی نہیں۔ میں بھی یہ مانتا ہوں، مرزا صاحب، کہ خسرو کے بعد ایک آپ ہی تھے جو ایسا شعر کہہ سکتے تھے ۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

لیکن آپ کیوں بار بار طرح طرح کے نقاب پہن لیتے تھے؟ کس کا ڈر تھا آپ کو؟ آپ کس سے خود کو بچانا چاہتے تھے؟

— منٹو بھائی۔

— جی، مرزا صاحب۔

— محض اس لیے کہ آپ مجھ پر قصہ لکھ رہے ہیں، آپ مجھے چیر پھاڑ کر میری دھجیاں نہیں اُڑا سکتے۔

— لیکن میں تو آپ کو سمجھنا چاہتا ہوں۔

— مت کوشش کریں، جانتے ہیں میں معروف صاحب کے گھر سے کیوں چلا آیا تھا؟ میں تو وہاں بہت آرام سے تھا۔ لیکن وہ ہر قدم پر مجھے سمجھنا چاہتے تھے۔ مجھے ماپنا چاہتے تھے۔ آپ کو کیا حق ہے مجھے پوری طرح سمجھنے کا؟

— لیکن ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھنا چاہتا ہے، مرزا صاحب۔

— بکواس بند کیجیے۔ میں یہ وعظ برداشت نہیں کرسکتا۔ سمجھنے کا حیلہ کرکے آپ لوگ اصل میں ایک انسان کو شطرنج کے چوخانے میں قید کردینا چاہتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے آپ میرے بارے میں کیا سمجھ سکتے ہیں؟ کیا آپ کبھی میرے خوابوں اور ان کی دہشت میں داخل

ہوسکیں گے؟ کیا آپ کبھی سمجھ پائیں گے کہ کیوں میں ساری ساری رات نیند میں اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا؟ میں اپنی تکلیف کی بات نہیں کر رہا۔ میری اتنی تذلیل کی گئی تھی کہ آخر میں نے اس کی پروا کرنی چھوڑ دی۔ انسان سب سے زیادہ خوشی دوسرے انسان کی تذلیل کر کے محسوس کرتا ہے۔ معلوم ہے وہ کس طرح کرتا ہے؟ جب وہ کہتا ہے، میں تمھیں بے حد چاہتا ہوں۔ لکھ لیجیے — میں نے کبھی کسی کو نہیں چاہا۔ اسی لیے میں لوگوں کی توہین کرتا تھا، ان کا تمسخر اڑاتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی کسی کو 'میں تمھیں چاہتا ہوں' کہہ کر موری میں نہیں دھکیلا۔ میں نے آپ سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک ہی آدمی مجرم بھی ہو اور جلاد بھی، منٹو بھائی؟ وہ میں ہوں — مرزا غالب۔ جس طرح لکھتے ہوئے سیاہی چھلک کر کاغذ پر دھبا بنا دیتی ہے اسی طرح میری قسمت کی کتاب بھی جلا وطن رات کے نشانات سے بھری پڑی ہے۔

— مرزا صاحب۔

— کہیے۔

— میں آپ کی چیر پھاڑ نہیں کر رہا۔

— منٹو بھائی، اگر کوئی زیادہ دیر تک میری طرف دیکھتا رہے تو میں پریشانی محسوس کرنے لگتا تھا۔ جانتے ہیں کیوں؟ ہر کوئی اصلی مرزا غالب کو ڈھونڈنا چاہتا تھا، لیکن میں تو ایک پرچھائیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

— کس کی پرچھائیں مرزا صاحب؟

— میں اپنی ساری زندگی میں اسے ایک بار بھی نہیں دیکھ پایا۔ میں جب فجر کی اذان سنتا، مجھے یوں لگتا وہ موجود ہے، کہیں موجود ہے، اور میں محض اس کی پرچھائیں بن کر اس دنیا میں پڑا ہوا ہوں۔

— میں بھی اسی کا سایہ ہوں، مرزا صاحب۔

— بہت خوب! چلیے اب ہم آپ کی داستانِ محبت سنتے ہیں۔ امید ہے کچھ نہ کچھ تو آپ کے دامن میں بھی ہوگا۔ آپ کسی عصمت کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں ذرا دراز ہو جاؤں پھر سنائیے۔

دھند کا ایک پردہ سا لہراتا ہے، جس کے پیچھے کہیں میری زندگی ہے۔

عصمت کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا، برادران۔ آج اگر قبر میں لیٹے ہوئے میں یہ تسلیم کر لوں کہ میں عصمت سے پیار کرتا تھا — تو کیا وہ مجھ سے پیار نہیں کرتی تھی؟ اوپر والی دنیا کے لوگ اگر یہ سن پائیں تو بہت ہنسیں۔ درحقیقت ہم دونوں ہی اس قصے سے بچ کر رہتے تھے، ہم نے اسے دبا کر رکھنے کی کوشش کی؛ ورنہ ہماری دوستی بھی نہ بچ پاتی۔ ہم محبت کے بارے میں بہت باتیں کیا کرتے تھے، لیکن میرا موقف ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ محبت محض ایک لفظ ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔ 'تمھارا کیا خیال ہے، محبت کیا ہے؟' میں نے ایک بار اس سے پوچھا۔

— یہ تو میں آپ سے سننا چاہتی ہوں، منٹو بھائی۔

— مجھ سے؟ مجھ سے کیوں؟ میں تو تمھیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ میں اس پیار و یار کو نہیں مانتا۔

— زیادہ بننے کی کوشش مت کیا کریں، ہر وقت۔

عصمت کی جھڑکی سن کر مجھے ہنسی آ گئی — اچھی بات ہے، تو پھر میں تمھیں بتاتا ہوں، سنو، مجھے اپنے زری کے جوتوں سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے۔ یہی ہے محبت۔

— آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے، منٹو بھائی؟

— کچھ بھی نہیں۔ میں کتنی بار تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں ایک فراڈ ہوں۔

— پھر وہی بات۔

— اب تم بتاؤ کہ پیار کیا ہے؟

— وہ جو ایک جوان لڑکے اور جوان لڑکی کے بیچ ہوتا ہے۔

— اوہ، یہ بات ہے! تب تو تم کہہ سکتی ہو کہ میں نے بھی پیار کیا ہے۔

— کیا کہا؟ عصمت نے بڑی بڑی آنکھوں سے یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ ہو۔

میں یہ قصہ آپ سب کو سناؤں گا، مرزا صاحب۔ میری زندگی کی اولین قوسِ قزح۔ میری عمر بائیس تئیس برس کی ہوگی۔ تیسری کوشش میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے لینے کے بعد مجھے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بھیج دیا گیا۔ میرے ساتھ میرا دوست سعید قریشی بھی تھا، جو جان بوجھ کر امتحان میں فیل ہوا تھا۔ لیکن میں یونی ورسٹی کے کڑے قواعد و ضوابط نہیں نبھا سکتا تھا، اگرچہ وہاں

کے کتنے ہی طالب علم اور استاد مجھے پسند کرنے لگے تھے۔ لیکن خود کو اس ماحول میں نہ ڈھال پانے کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی۔ کئی سالوں سے میرے سینے میں درد اور بخار بھی رہتا تھا۔ اب یہ بہت بگڑ گیا— درد اتنا شدید ہوگیا کہ مجھے دونوں گھٹنوں کو موڑ کر، سینے کے ساتھ دبا کر بیٹھنا پڑتا۔ بیٹھنے کا یہ ڈھنگ زندگی بھر کے لیے میرا ساتھی بن گیا۔ درد پر قابو پانے کے لیے میں نے بہت زیادہ شراب پینا شروع کر دی۔ لیکن نشے کی حالت کے سوا، درد سے نجات نہ مل سکی۔ علاج کی غرض سے دہلی چلا گیا۔ ایکس رے کرنے پر پتا چلا کہ مجھے ٹی بی ہو چکی ہے۔ مجھے یونی ورسٹی چھوڑنی پڑی۔ علاج کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ میری بہن اقبال بیگم نے مجھے آ کر بچایا۔ اس نے سارا خرچ اٹھایا اور مجھے بتوت کے ایک ہسپتال میں بھیج دیا۔ بتوت ایک حیرت انگیز جزیرہ تھا جو پہاڑوں کے دامن میں جموں سرینگر شاہراہ پر واقع تھا۔ برادران، یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری موقع تھا جب میں نے دنیا کی اعلیٰ ترین خوبصورتی کا مشاہدہ کیا۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ، ذرا فاصلے پر صنوبر اور چنار کے جنگلات اور بید مجنوں کے درخت جنھیں گویا ہاتھ بڑھا کر چھوا جا سکتا ہو، ہمالیہ کی بے شمار برف پوش چوٹیاں۔ اگر میں اپنی ساری زندگی کسی ایسی جگہ بسر کر سکتا، اگر میں کبھی لکھنے پر مجبور نہ ہوتا، تو مجھے کبھی اس ذلت اور تشدد اور خوں ریزی کی تاریخ سے نہ گزرنا پڑتا۔ صرف اگر میں کسی پہاڑی گاؤں میں بیگو کے ساتھ رہ سکتا۔

اس کا اصل نام کیا تھا، مجھے بھول گیا۔ ہاں، میں شاید اسے بیگو کہہ کر ہی پکارتا تھا، کبھی وزیر اور کبھی بیگو۔ وہ پہاڑن تھی، اس کی رنگت بالکل گلاب جیسی تھی، اور جب وہ شرماتی تو اس کا چہرہ شفق کی طرح لال ہو جاتا۔ بیگو بھیڑ بکریاں چراتی تھی۔ اگر کبھی اس کی کوئی بکری کھو جاتی، وہ اپنے دونوں ہاتوں کو منھ کے پاس لا کر اُسے پکارتی: اس کی آواز کی گونج سے جیسے پہاڑ زندہ ہو اُٹھتے۔

دنیا میں ایسی عورت بس ایک ہی بار آتی ہے۔ پتلی، لمبی ناک، اور اس کی آنکھیں؟ ایسی آنکھیں میں نے کم ہی دیکھی ہیں۔ جیسے ان آنکھوں نے خود میں پہاڑوں کی گہرائی کو سمیٹ رکھا ہو۔ لمبے گھنے ابرو۔ جب وہ میرے پاس سے گزرتی، لگتا سورج کی روشنی اس کی پلکوں پر اٹکی ہوئی ہے۔ اس کے کاندھے چوڑے تھے اور ہاتھ گول۔ اس کی چھاتیاں پہاڑی مرغیوں کی تھیں، میں ذرا بھی بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کر رہا، برادران۔ ایسا حسن آپ کو صرف پہاڑی منی ایچر تصویروں

ہی میں دکھائی دے گا۔ اس کے حسن کا بیان کرنے کے لیے مجھے رادھا کی ایفائے عہد والی تصویروں کا ذکر کرنا ہوگا۔ پہاڑی راستوں پر اس کا وہ چلنا، اس کا وہ گنگنانا، آپ ہی مسکرا اٹھنا— جیسے وہ کسی سے ملاقات کا وعدہ پورا کرنے جا رہی ہو بے شک، وہ خفیہ ملاقاتوں کا سفر ہی تو تھا۔

میں نے جب پہلی بار بیگو کو دیکھا، مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر مدت سے جمے ہوئے اندھیرے میں بجلی کوند گئی ہو۔ کئی دنوں تک میں اسے درختوں کی اوٹ سے چھپ چھپ کر دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بھیڑ بکریوں کو گا گا کر بلاتی، جیسے وہ کسی گیت کی کلیاں ہوا میں بہا رہی ہو، اس کی آواز کی گونج سے میرے اندر جھرنا سا پھوٹ پڑتا تھا۔ ایک دن میں خود کو مزید نہ روک سکا۔ دوڑ کر جا کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح وہ مجھ ہی سے لپٹ گئی۔ میں اسے چومنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے گرد اپنے بازو حمائل کر کے اسے چومنے کی کوشش بھی کی لیکن ایک جھٹکے کے ساتھ بیگو نے مجھے پرے دھکیل دیا اور وہاں سے بھاگ گئی۔ میں نے پھر کبھی ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن پھر ایک دن خود ہی وہ میرے پاس چلی آئی اور بات چیت شروع کر دی۔ اس کے بعد ہم کتنے ہی دنوں تک باتیں کرتے رہے۔ اب مجھے یاد نہیں، برادران، کہ ہم نے کیا کیا باتیں کیں، آپ تو جانتے ہیں کہ شراب پہلے دماغ کو متاثر کرتی ہے، پھر یادداشت کے ساتھ کھیل کھیلنے لگتی ہے، زندگی میں جو واقع نہیں ہوا ہوتا، وہ بھی سچ لگنے لگتا ہے۔

میں نے بیگو سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اپنے دوپٹے کا کونا چباتے ہوئے بولی، 'لیکن تم تو اس سرائے سے جلد ہی چلے جاؤ گے، کیا تب بھی مجھے پیار کرو گے؟'

— کون سی سرائے؟

— یہی سرائے؟

— یہ پہاڑ کی سرائے؟ میں اس کی بات پر ہنس پڑا۔

— دادی نے بتایا تھا......

— کیا بتایا تھا اس نے؟

بیگو نے آگے اور کچھ نہ کہا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ ساری بات کہنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن وہ محسوس کر پا رہی تھی۔ بیگو کی بات میں تب سمجھ سکا، مرزا صاحب، جب

بہت عرصے بعد میں نے ایک کہانی سنی۔

گستاخی معاف، برادران، لیکن مجھے یہ دوسری کہانی ضرور سنانی چاہیے ورنہ آپ لوگ ہرگز نہ سمجھ سکیں گے کہ یقیناً وہ ایک سرائے ہی تھی جہاں بیگو اور میں ملے تھے۔

ایک دن ابراہیم ابن آدم دیوانِ عام میں بیٹھے تھے۔ ان کے وزراء اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ یکایک ایک لمبی داڑھی والا فقیر، جس نے پھٹا پرانا چوغا پہن رکھا تھا سیدھا آ کر بادشاہ کے تخت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

— کیا چاہتے ہو؟ ابراہیم نے پوچھا۔

— مجھے ذرا دم تو لینے دیجیے، ابھی ابھی تو آپ کی سرائے میں پہنچا ہوں۔

— کیا تم پاگل ہو؟ ابراہیم نے اونچی آواز میں کہا۔ 'یہ سرائے نہیں ہے، یہ میرا محل ہے۔'

— آپ سے پہلے یہ محل کس کا تھا؟ فقیر نے پوچھا۔

— میرے والد کا۔

— اور ان سے پہلے؟

— ان کے والد کا۔

— اور ان سے پہلے؟

— یہ کئی پشتوں کی بات ہے۔

— وہ سب لوگ اب کہاں ہیں؟

— کیا اب تک وہ زندہ ہوں گے؟ وہ سب اپنی قبروں میں چلے گئے۔

— جہاں انسان آتے اور جاتے رہتے ہیں، وہ جگہ سرائے نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ کہتے ہی فقیر وہاں سے غائب ہو گیا۔

بیگو کی دادی نے ٹھیک کہا تھا۔ ایک کے بعد ایک سرائے خانوں کے تسلسل کو یاد کرتے ہوئے ہی ہم موت کی جانب بڑھتے ہیں۔ ایک دن بیگو نے کہا، 'تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہونا؟'

— کس لیے؟

— وہ اس دن......

— اس دن کیا؟

— میں نے تمھیں چومنے نہیں دیا تھا نا۔

— وہ تو میں بھول بھی چکا، بیگو۔

— جانتے ہو، سب میرے ساتھ اسی طرح پیش آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے تمھاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں؛ میں جب تمھارے ہونٹ دیکھتا ہوں تو چومنے کو جی چاہتا ہے۔ میں کیا جواب دیا کروں، بتاؤ؟ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ میں نے تمھیں بھی ان جیسا ہی سمجھا تھا۔

— تو پھر میں کیسا ہوں؟

بیگو اپنے گالوں پر دونوں ہتھیلیاں رکھے مجھے دیکھتی رہی۔ 'تم ان جیسے نہیں ہو۔' وہ مسکرائی۔ 'تم شریف ہو۔'

ایک دن میں نے دیکھا بیگو کے کُرتے کے گریبان میں کچھ بھرا ہوا ہے۔ 'یہ تمھارے گریبان میں کیا ہے؟' میں نے پوچھا۔

— نہیں بتاؤں گی۔ بیگو اپنی چوٹی کو لہراتے ہوئے مسکرائی۔

— نہیں بتاؤ گی؟ ذرا ٹھہرو، میں نے اس کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا— دکھاؤ کیا ہے تمھارے پاس۔ تمھیں دکھانا ہی ہوگا۔

— چھوڑ دو نا۔

— نہیں، تمھیں دکھانا ہی پڑے گا۔

بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے، بیگو اپنے گریبان سے ایک کے بعد ایک عجیب عجیب چیزیں نکال کر ڈھیر کرنے لگی۔ چنار کے سوکھے پتے، ماچس کی خالی ڈبیا، کچھ سنگ ریزے، اخبار سے تراشی ہوئی ایک زرد پڑ چکی تصویر، بالوں کا ربن۔ لیکن ایک چیز وہ کسی طرح دکھانے پر آمادہ نہ تھی، جسے اس نے کس کر اپنی مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔

— یہ کیا ہے؟

— نہیں، میں نہیں دوں گی۔

— چلو ٹھیک ہے۔ میں ہنس پڑا۔ تم اب جا سکتی ہو۔

کافی دور جانے کے بعد بیگو پلٹی۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ذرا فاصلے سے اس نے اپنی مٹھی میں دبائی ہوئی چیز میری طرف اچھالی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ جانتے ہیں وہ کیا چیز تھی؟ مصری کی ایک ڈلی، میں حیران رہ گیا۔ وہ یہ مصری کی ڈلی دکھانے سے کیوں انکار کررہی تھی؟ اور پھر وہ اسے مجھے دینے کے لیے واپس کیوں پلٹی؟ اس دن میں نے آخری بار بیگو کو دیکھا تھا، مرزا صاحب۔ پھر کبھی نہ دیکھ سکا۔ کچھ دنوں بعد میں نے بتوت کو الوداع کہہ دیا۔ وہ مصری کی ڈلی میری جیب میں پڑی رہی۔ گھر آکر اسے میں نے میز کی دراز میں رکھ دیا۔ بیگو کی اکلوتی یادگار۔ لیکن یادیں بھی آخر کب تک قائم رہتی ہیں۔ ایک دن دراز کھولا تو دیکھا کہ چیونٹیوں کا ایک جھنڈ اس میں شاہی ضیافت اڑا رہا تھا۔

میں نے ایک دن عصمت کو بیگو کے بارے میں بتایا۔ اس نے ساری بات سن کر کہا،'یہ کیسی محبت ہوئی، منٹو بھائی؟ میں نے تو آپ سے ایک زبردست لو اسٹوری کی امید کی تھی۔ یہ تو بڑی بچکانہ سی ہے۔'

— کیوں بچکانہ ہے؟

— بالکل روّی، تھرڈ ریٹ، مرگھلا عشق۔ آپ وہاں سے مصری کی ڈلی جیب میں ڈال کر چلے آئے اور خود کو ہیرو سمجھنے لگے۔ چھی چھی۔

میں چپ ہوگیا۔

— کیا ہوا؟ کچھ تو کہیے۔ عصمت مجھے چھیڑنے لگی۔

— تو اور کیا کرتا، عصمت؟ تم کس بات سے خوش ہوتیں؟ اس کے ساتھ سو جاتا اور ایک حرامی پلّا اُس کی گود میں چھوڑ آتا۔ تب یہ کہانی زبردست کہلاتی۔ ہے نا؟ تب میں اپنے بازوؤں کی مچھلیاں پھلا کر یہ اعلان کرسکتا تھا کہ مجھ جیسا مرد دنیا میں نہیں ہے۔ ہاہا۔ کیا تم مجھے ایسا دیکھنا چاہتی ہو، عصمت؟

عصمت نے میرے ہاتھ تھام لیے، اس کی دونوں آنکھیں جیسے کہیں کھوئی ہوئی تھیں۔

۱۷

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

منیرہ بائی مجھے چھوڑ کر چلی گئی، میری اردو غزلیات کا پہلا دیوان تیار ہوا، اس کے ساتھ ہی میں نے طے کیا کہ اب میں فارسی ہی میں شعر کہوں گا۔ فارسی کے بغیر غزل میں چمک پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن سب بگڑ گیا، منٹو بھائی، تقدیر میرے ساتھ کھیل کھیلنے لگی۔ دل اور خوشی کے مابین جو رشتہ تھا، وہ ٹوٹ گیا، کہیں نہاں خانے میں، قطرہ قطرہ میرا خون رسنے لگا۔ خوشی کے ساتھ عام طور پر ہمارا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے، ہے نا منٹو بھائی؟ ہم زندگی سے خوشی کے علاوہ اور کیا چاہتے ہیں؟ لیکن ذرا ان زبردست قوتوں کے بارے میں سوچیے جو آکر ہمارے اس رشتے کو توڑ پھوڑ دیتی ہیں۔ ایک رات میں نے اپنے دل سے کہا—ہاں، ہم بس اپنے دل ہی کو تو کہہ سکتے ہیں۔ ایک وہی تو ہماری عبادت گاہ ہے۔ میں نے اپنے دل سے کہا،'مجھے بولنے کی طاقت دو، تاکہ میں جہاں پناہ کو جاکر کہہ سکوں، حضور میں بھید بھرا آئینہ ہوں، مجھے چمکا دیجیے۔ شاعری میرے اندر جنم لیتی ہے، مجھے تھوڑا آرام دیجیے۔' میرا دل چپکے سے ہنسا۔ ضعیف العقل کہیں کے۔ اس طرح کی باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ اگر کچھ کہنا ہی چاہتے ہو تو یہ کہنا کہ "میں زخموں سے چور ہوں، میرے زخموں کے لیے مرہم عنایت کیجیے، مر چکا ہوں، مجھے پھر سے زندہ کردیجیے۔" میں گویا کسی بلبل کی، ہاتھ سے بنائی ہوئی ایسی بے رنگ تصویر کی طرح تھا جس کے دل میں ہزاروں گلابوں کی خوشبو بھی

گانے کی اُمنگ پیدا نہیں کرسکتی تھی۔

نہ، نہ، برادران! یوں اداس چہرے لے کر سومت جایئے گا، اب جبکہ آپ لوگوں نے دوحرماں نصیب روحوں کی داستان سُننی شروع کر ہی دی ہے تو پھر اسے اس کے انجام تک پہنچانے کی ذمے داری بھی آپ کو لینا ہوگی۔ لیکن ہماری محبتوں کی کہانیاں سنتے سنتے آپ لوگ جس خماری میں ڈوب چکے ہیں، میں اس خماری کو ابھی توڑنا نہیں چاہتا۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک ہمارے اندھیروں کے یہ قصے چلتے رہیں گے، آپ لوگوں کو بیچ بیچ میں روشنی اور تازہ ہوا کے جھونکے ملتے رہیں گے — جہاں تہاں میں آپ لوگوں کو ایسے قصے اور حکایتیں سناتا رہوں گا، ایسے داستان گوؤں کے پاس لے جاتا رہوں گا کہ یہ زندگی آپ کو کو گراں محسوس نہ ہوگی۔ ہاں، تو محبت کی ان کہانیوں کے لیے اٹھ کر بیٹھ جایئے جو میں اب آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔ سچ کہوں تو زندگی میں جس قدر میں دوزخ کی گہرائیوں میں ڈوبتا گیا اسی قدر محبتوں کی یاد نے مجھے بچایا۔ یہ ہماری زندگی — ہمارا جنم لینا — عشق کے سوا اور کیا ہے؟ یہ ہے عشقِ مجازی۔ دنیا والی محبت۔ اور جوں جوں ہم موت کی طرف بڑھتے ہیں، عشقِ حقیقی کی راہیں ہم پر کھلنے لگتی ہیں۔ عشقِ حقیقی آپ صرف خدا کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت آپ کے سامنے بیگم فلک آرا نہیں ہوتیں، نہ منیرہ بائی اور نہ ہی منٹو بھائی کی بیگو یا عصمت، صرف وہ ہوتا ہے۔ الحمدللہ۔ لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس راہ پر واقعی قدم بڑھا پاتے ہیں؟ مولانا روم بڑھا پائے تھے۔ ہم سب پروانے ہیں جو عشقِ مجازی کے دام کے گرد گھوم رہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی قسمت کی ستم ظریفی پر غور کیا ہے، منٹو بھائی؟ عشقِ مجازی دنیادارانہ محبت ہے، جیسے کسی تصویر یا علامت سے پیار کرنا۔ اور عشقِ حقیقی صرف خدا کے لیے ہے، یہی سچا عشق ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ ہم سب چیلوں کی پرچھائیاں ہیں جو عشق کے علامتی جنگل میں چکر کاٹ رہی ہیں۔ اگر ہم عشقِ حقیقی کی راہ پر نہ بھی جا سکیں، منٹو بھائی، تو بھی یہ کم اہم بات تو نہیں؟ ایک تصویر سے پیار کرنا کم تو نہیں۔ اتنا بھی اس دنیادارانہ زندگی کو کارآمد بنانے کے لیے کافی ہے۔ کچھ لوگ تصویر سے پیار کرتے ہوئے موت کو چُن لیتے ہیں — کیا اس موت کا رُخ عشقِ حقیقی کی جانب نہیں ہوتا؟

تو پھر، برادران، میں آپ کو میر صاحب کی ایک مثنوی کی بابت بتاتا ہوں۔ اگر ہم عشق کی

بات کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بار بار میر صاحب ہی کی بات کرنی پڑے گی۔ ان کے لیے چوٹ کھایا ہوا اور ہارا ہوا انسان، کسی پنجرے میں قید بلبل کی مانند تھا۔ اس کا گریہ وفریاد سنتے ہوئے انھیں لگتا تھا جیسے وہ خود اس قفس میں بند ہیں۔ کیا آپ نے کبھی 'دریائے عشق' پڑھی ہے، منٹو بھائی؟ یوں بیچارگی سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کوئی بات نہیں، میں سمجھ گیا، آپ نے نہیں پڑھی۔ میں دلّی اور کلکتہ میں کتنے ہی لوگوں سے ملا تھا جنھوں نے کبھی کوئی ہندوستانی کتاب نہیں پڑھی تھی، ان کے لیے تو بس گوروں کی لکھی تصانیف ہی حرفِ آخر تھیں۔ ایک زمانے میں میں بھی گوروں اور ان کے تمدن کا بہت گرویدہ تھا۔ میں تو انھیں دوست سمجھتا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ تہذیب کے پردے میں درحقیقت وہ اس ملک میں قتل و غارت کا میدان سجانے آئے تھے۔

نہیں نہیں، برادران، زیادہ جوش میں مت آیئے، میں اب آپ کو 'دریائے عشق' کا قصہ سنا دیتا ہوں۔ سوچا نہیں تھا کہ آپ یہ قصہ سنیں گے۔ اگر آپ نے پھر سے جنم لیا تو آپ اس قصے کی یادیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ بہرحال میں چاہے کتنا ہی بدنصیب رہا ہوں، پھر بھی اس دنیا میں دوبارہ جنم لینے کی خواہش ضرور کرتا ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ خدا کی بہترین تخلیق، آدم۔ حتیٰ کہ جبرئیل نے بھی ہمیں سجدہ کیا تھا۔ اور جب ابلیس نے انکار کیا تو اُسے بہشت سے نکال باہر کیا گیا۔ ہم سب ایک آئینہ ہیں، میرے بھائیو، جس میں خدا خود اپنی جھلک دیکھتا ہے۔ اور عشق اس آئینے کی گہرائی میں چھپا وہ سایہ ہے جسے آپ کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔

پہلے مجھے دو ایک باتیں کہہ لینے دیجیے۔ یہ ہرگز مت سمجھیے گا کہ اس بڑھو غالب کے جو کچھ دماغ میں آرہا ہے، یہ کہے جا رہا ہے۔ قصہ سنانے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ پہلا اصول تو یہ ہے کہ آپ وہ قصہ نہیں سنا سکتے جس میں آپ خود نہ ہوں۔ لیکن آپ کس طرح اس قصے میں ہو سکتے ہیں؟ آپ بڑے دل سے اپنے باغ کے درخت کے بارے میں بتاتے ہیں کیونکہ آپ اس درخت سے پیار کرتے ہیں۔ آپ اس محبت کی شکل میں اس کہانی میں موجود ہیں، آپ محض گوشت پوست کا جسم نہیں ہیں، آخر آپ اتنے اسراروں سے بھرے ہوئے ہیں جو اس درخت

کے لیے آپ کی محبت کا جزو ہے۔اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس کی وضاحت کر دوں۔میر صاحب کی مثنویاں میں نے نہیں لکھیں۔لیکن ایک قاری کے طور پر کسی نہ کسی طرح میں بھی ان میں شامل ہوں، یہی موجود ہونا ہے،اسی طرح ایک شاعر اپنی شاعری میں موجود ہوتا ہے۔جب باز آسماں میں پرواز کرتا ہے تو اس کا سایہ زمین کے سینے پر پڑتا ہے۔کہانی کا حصّہ ہونا،سایہ ہونے جیسا ہی ہے۔میں کہانی میں نہیں، پھر بھی میں کہانی میں ہوں، کسی دوسری شکل میں۔

محبوب بھی آپ کی زندگی میں اسی طرح رہتا ہے۔وہ آپ کی ساری زندگی کے لیے ساتھ نہیں ہوتا۔حتیٰ کہ جب وہ پاس لگتا ہے، تب بھی وہ پاس نہیں ہوتا،صرف اس کا سایہ ہوتا جسے آپ زندگی بھر پیار کرتے رہتے ہیں۔یہ سایہ برسوں سے رستے لہو کی مانند ہے! کسی عریاں دوشیزہ کی طرح—نرم و ملائم، جو بس ابھی سو جانے کو ہو۔

'دریائے عشق' اسی طرح سو جانے والے کسی لڑکے کا قصّہ ہے۔کیا وہ یہی نیند تھی جو اُس لڑکے نے چاہی تھی جب اُسے عشق ہوا؟ کوئی نہیں جانتا۔لڑکی بھی نہیں جانتی کہ اسے سونے کے لیے اپنے عشق کے پاس جانا ہوگا۔وہ لڑکا بہت خوب صورت تھا، میرے بھائیو،صنوبر کے درخت کی طرح دراز قد، اس کا دل موم کی طرح نرم تھا جس کی ہر رگ، ہر شریان میں پیار بہتا تھا۔ایسے لوگ دنیا میں صرف مرنے ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ورنہ انھیں قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے یا مرنے کے لیے پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے۔میں اکثر میر صاحب کو خواب میں دیکھا کرتا تھا، اُسی کوٹھڑی میں جہاں انھیں قید کر کے رکھا گیا تھا، وہ کتے کی طرح سکڑے ہوئے پڑے ہیں۔ایک دن مہرنگار ان کے سامنے نمودار ہوئیں۔

— تم؟ میر صاحب بڑبڑائے۔

— کیا تم اسی طرح جینا چاہتے ہو؟

— خواب و خیال میں، بیگم۔

— صرف میری خاطر؟

— نہیں۔

— تو پھر؟

— مہرنگار۔ایک نام جس نے مجھے چاہا تھا، بیگم۔یہ وہ ہے جس کے لیے میں زندہ ہوں۔

— اور میں؟

— تم کوئی نہیں ہو۔تم تو خوف زدہ تھیں۔تم نے سب سے کہہ دیا۔

— وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے، میر۔وہ مجھے قبر میں گاڑ دیتے۔

— جانتا ہوں۔

— تم مجھ سے نفرت کرتے ہو؟

— نہیں۔میں مہرنگار کو اب بھی دیکھ سکتا ہوں۔وہ اب بھی میرے دل کے محل میں رہتی ہے۔وہ میری زندگی میں مدت پہلے آئی تھی۔

— کہو کہ تمھیں مجھ سے نفرت ہے۔

— نہیں۔

— کیوں؟

— تم آج میری زندگی میں شامل نہیں ہو، بیگم۔بس ایک نام باقی ہے، خدا کا دیا ہوا ایک نام۔یہ وہ نام ہے مجھے جس سے محبت ہے۔خدا کے دیے ہوئے ایسے کتنے ہی نام محبت کے دریا میں بہہ جاتے ہیں۔نہیں۔میں آپ لوگوں سے دھوکا نہ کروں گا۔میں اس حسین نوجوان کے قصّے کی طرف لوٹتا ہوں جو 'دریائے عشق' میں ڈوب کر مر گیا تھا۔اس کا نام بھی یوسف تھا۔خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن چلتے چلتے اس کی نظریں ایک مکان کی کھڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔کون تھا اس کھڑکی میں؟ اسے قسمت کہہ لیجیے یا اس کی معشوقہ، وہ اُس کا چہرہ تھا جو اس نے دیکھا۔کسی شکاری کی مانند، دو آنکھیں تھیں جو اُسے تاک رہی تھیں۔یوسف کو محسوس ہوا وہ ان آنکھوں کی محبت میں اس لیے گرفتار ہوا ہے کہ اپنی جان دے سکے۔وہ پتھر کی طرح راستے کے درمیان جم کر کھڑا ہو گیا۔لڑکی نے دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اپنے چہرے کو نقاب سے چھپائے وہ کھڑکی سے اوجھل ہو گئی۔لیکن اُس وقت تک یوسف اس کے عشق میں گم ہو چکا تھا، وہ بے تاب ہو اٹھا۔حافظ گویا پہلے ہی اشارہ پا چکے تھے کہ اس کے دل میں کیا ہو رہا ہے:

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید
بکسائت تربتم رابعد ازوفات وبنگر
کز آتشِ درونم دود از کفن برآید

میں طلب سے دست بردار ہونگا جب تک کہ مقصد پورا نہ ہو، یا جان، جاناں تک پہنچے، یاں جان جسم سے نکل جائے، مرنے کے بعد میری قبر کھول اور دیکھ کہ اندرونی آگ کی وجہ سے کفن سے دھواں نکل رہا ہے

اس دن سے یوسف، اس انتظار میں وہیں بُت بنا کھڑا رہا کہ شاید اس ماہِ تمام کی ایک اور جھلک نظر آ جائے۔ آتے جاتے لوگ اسے حیرانی سے دیکھتے، انھیں یقین ہو جاتا کہ یہ نوجوان ضرور دیوانہ ہو چکا ہے۔ کسی کسی کو اس پر افسوس بھی ہوتا، وہ پوچھ بیٹھتا، کیا ہوا ہے دوست، کس غم نے تمھیں یوں پتھر بنا دیا ہے؟ یوسف کچھ نہ کہتا، بس کھڑکی کی طرف اشارہ کر دیتا۔ ایک دن سب اس راز سے واقف ہو گئے۔ ارے، یہ لڑکا تو بلقیس کو دل دے چکا ہے۔ میں یہ بتانا بھول گیا، برادران، کہ اس دوشیزہ کا نام بلقیس تھا۔ تو بلقیس کے باپ بھائیوں نے پہلے تو اُسے قتل کرنے کی ٹھانی پھر انھیں خیال آیا کہ اسے مارنے کے بعد اگر وہ پکڑے گئے تو لوگ ان سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ معلوم ہے انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ یوسف پاگل ہے۔ اب کسی کو پاگل قرار دینے سے تو کوئی ذمّے داری عائد نہیں ہوگی۔ کسی شخص کی زندگی کو جہنّم بنا دینے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہوگا؟ یہ شخص پاگل ہے؟ ٹھیک ہے، تو تھوکو اس پر، پتھر مارو اسے، زنجیروں سے باندھ دو۔ کوٹھڑی میں بند کر دو۔ لیکن یوسف کو سنگسار کرنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا، حتیٰ کہ وہ لہولہان ہو گیا لیکن وہ وہیں جما کھڑا رہا:

ہزار دشمنم ار می کنند قصدِ ہلاک
گرم تو دوستی از دشمناں ندارم باک
مرا امیدِ وصالِ تو زندہ می دارد
وگرنہ ہر دم از ہجر توست بیم ہلاک

مجھے ہلاک کرنے کا اگر ہزاروں دشمن قصد کرتے ہیں۔ اگر تُو میرا دوست ہے، مجھے دشمنوں کی پروا نہیں ہے۔
مجھے تیرے وصال کی امید زندہ رکھتی ہے۔ ورنہ مجھے ہر وقت تیرے ہجر سے ہلاکت کا ڈر ہے۔

پھر بلقیس کے والدین نے فیصلہ کیا کہ اُسے دریا پار اس کے چچا کے ہاں بھیج دیا جائے۔ بلقیس کو ایک قابلِ اعتماد دایہ کے ہمراہ ایک پالکی میں سوار کر کے، چھپ چھپا کر روانہ کیا گیا۔ یوسف نے اپنے محبوب کی خوشبو سونگھ لی، وہ چیختا چلاتا پالکی کے پیچھے دوڑنے لگا: 'مجھ پر رحم کرو میری جان، بس ایک بار کلام کر لو مجھ سے۔' بلقیس کچھ نہ بولی، لیکن اس کی دایہ کا دل دہل گیا۔ اس نے پالکی سے سر باہر نکالا اور کہا: 'اک ذرا انتظار کرو، تم ضرور بالضرور میری بیٹی سے ملو گے۔' پالکی دریا کے کنارے پہنچی تو بلقیس کشتی پر سوار ہو گئی۔ یوسف ساحل پر بیٹھا اسے دیکھا کیا، جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو بلقیس کی دایہ نے ایک جوتی پھینکی اور یوسف سے چلاتے ہوئے کہا، اگر تمھیں واقعی میری بیٹی سے عشق ہے تو اس جوتی کو نکال کر واپس لاؤ۔ وہ دایہ واقعی چاہتی تھی کہ بلقیس اور یوسف مل جائیں؛ اسے اس بات کا مطلق علم نہ تھا کہ یوسف تیرنا نہیں جانتا۔ لیکن یوسف پانی میں کود پڑا، اور غوطے کھاتا ہوا دریا کی گہرائی میں سما گیا۔ بلقیس نے کشتی سے یوسف کو ڈوبتے دیکھا۔ کون تھا وہ؟ کس بہشت کا پھول تھا، جو اسے اتنا پیار کرتا تھا؟ بلقیس کچھ نہ کہہ پائی، اسے محسوس ہوا شاید بہار کا موسم آ چکا ہے، شاخوں پر پھول کھل اٹھے ہیں، لیکن پھر بھی، اے میرے دل پسند باغ، اسے کیوں چھین لیا مجھ سے؟

باغ اور بہار۔ یہ دو لفظ دہراتے ہوئے میرا گلا کیوں رُندھ جاتا ہے؟ میں جب یہ دو لفظ اکثر ادا کرتا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے گلاب کی پنکھڑیاں میرے منھ میں اپنے پَر پھیلا رہی ہیں۔ پھر بھی یہ لفظ کیوں موت کے کہرے میں گھرے ہوئے ہیں؟ باغ اور بہار۔ کیوں باغ اور بہار بار بار مجھے موت کی یاد دلاتے ہیں؟

گھبرائیے مت، برادران، میں قصّے کو نہیں بھولا، لیکن قصہ کہتے ہوئے، بعضے الفاظ مجھے اس قدر دُکھ بھرے لگتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے، انھیں بازوؤں میں بھر کر سو جاؤں۔ تو جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، یوسف پانی میں ڈوب کر مر گیا۔ جب بلقیس کو اپنے چچا کے ہاں رہتے کچھ وقت

گزر گیا تو اس کے والدین نے سوچا، لڑکا تو مر ہی گیا ہے، اب لڑکی کو گھر واپس لے آنا چاہیے۔ وہ اسی دریا کے راستے واپس لوٹ رہے تھے۔ کشتی پر سوار بلقیس نے ملازمہ سے کہا، 'دایہ! مجھے ذرا اس دریا کو دیکھنے دو، میں نے ایسا دریا کبھی نہیں دیکھا۔'

—دیکھو بیٹی، جی بھر کے دیکھو۔ ایک بار دریا کو دیکھو گی تو بس دیکھتی ہی رہ جاؤ گی۔

بلقیس نے دریا کے بارے میں کتنے ہی سوال پوچھے، کہ دریا کے کنارے آباد بستیوں میں کون رہتا تھا، وہ کیسے لوگ تھے، کیا کرتے تھے—وہ پوچھتی چلی گئی۔ بالآخر اس نے پوچھا، 'خانم، وہ جگہ جانتی ہو جہاں وہ ڈوبا تھا؟

— کیوں، بیٹی؟

— کیا وہاں پانی بہت گہرا ہے؟

—ہاں، بیچ دریا جو ہے۔

—مجھے دکھاؤ گی؟

— کیا دیکھنا چاہتی ہو؟

—میں دیکھنا چاہتی ہوں بیچ دریا میں پانی کتنا گہرا ہے۔

—دکھادوں گی، بیٹی۔ وہاں پانی بہت گہرا ہوتا ہے۔ بہت تیز بہاؤ ہوتا ہے—پھر بھی دریا پرسکون ہوتا ہے۔ خدا ہی جانے ایسا کیوں ہے۔

بلقیس منھ ہی منھ میں اپنے آپ سے کچھ کہے جا رہی تھی جسے خانم نہ سن پائی۔ معلوم ہے وہ کیا کہہ رہی تھی؟

موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
تھا تلاطم سے کس طرف ہم دوش

خدا ہی جانتا ہے میر صاحب کو ایسے الفاظ کہاں سے ملے جو انھوں نے بلقیس سے کہلوائے۔ کیا آپ نے یہ شعر سنا ہے، منٹو بھائی؟

جب کشتی بیچ دریا پہنچی، خانم نے بلقیس کو باہر بلایا۔ 'وہاں، بیٹی، وہ رہی وہ جگہ جہاں یوسف ڈوبا تھا۔' بلقیس کچھ دیر اس مقام کو دیکھتی رہی اور پھر اس سے پہلے کہ خانم اس کا ارادہ سمجھ پاتی وہ پانی میں کود گئی۔ دریا کی تہہ کھنگالی گئی اور یوسف اور بلقیس کی لاشیں ڈھونڈ نکالی گئیں۔ وہ پانی کے نیچے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سو رہے تھے۔ جو زندگی نہ دے سکی وہ انھیں موت نے بخش دیا۔ اسے کہتے ہیں، میرے بھائیو، عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی جانب جانا۔ ہمیں اپنی زندگی میں یوسف جیسی شہادت نصیب نہیں ہوتی۔ جانتے ہیں کیوں؟ ہم عمر بھر علامتوں کے جنگل میں گھومتے رہتے ہیں، بھٹکتے رہتے ہیں اور کھو جاتے ہیں۔ صرف وہی عشق کے قرب و جوار میں پہنچ سکتا ہے، جو زندگی کی بازی لگا سکتا ہو۔ اس کا کوئی نام نہیں، اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں، اس کائنات کا حُسن لامحدود ہے۔ ہم کن چیزوں کو حُسن کہتے ہیں؟ شراب، بہار، جوانی، عشق۔ یہ سب بہت جلدی مرجھا جاتے ہیں۔ جس گلاب کی خوبصورتی کو آپ سراہ رہے ہوتے ہیں، ممکن ہے وہ کسی حسینہ کی قبر پر کھلا ہو۔ جس طرح وہ ایک دن اپنی قبر میں چلی گئی، یہ بھی مرجھا جائے گا۔ بلبل کا نغمہ کسی مردہ شاعر کی شاعری کو زندہ کر سکتا ہے، لیکن یہ بلبل بھی ایک دن مرجائے گا۔ خوبصورتی زیادہ دیر اس دنیا میں قائم نہیں رہتی، میرے بھائیو، گلاب کی مہک، بلبل کا نغمہ اور ہماری جوانی، یہ سب بڑی سرعت کے ساتھ ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ خصوصاً جوانی، زندگی کی یہ بہار تو اور بھی جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ صرف اُس مالک کی دنیاداری کا حُسن ہی لازوال ہے۔

یہ حُسن آپ سڑک کی دھول میں دیکھ سکتے ہیں، منٹو بھائی۔ اسی دھول سے آدم کا جنم ہوا تھا اور اسی دھول میں ایک دن سب کو مل جانا ہے۔ صرف ایک چیز ہے جو میں سمجھ سکا ہوں، میرے بھائیو، اگر ہم اُس مالک کی راہ پر قدم نہ بھی بڑھا سکیں تو کوئی بات نہیں، لیکن عطر کی شیشی کو تکلیف مت دیجیے۔ کیا ہوا، منٹو بھائی، یوں حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہیں مجھے؟ کیا یہ سیدھی سی مشاہدے کی بات بھی نہیں سمجھ سکے؟ ظاہر ہے، میں دل کی بات کر رہا ہوں، دل عطر کی شیشی ہے یا نہیں، بتائیے؟ میر صاحب سے یہ بات کسی پیر نے کہی تھی، 'بیٹا، کسی کی عطر کی شیشی کبھی مت توڑنا کہ اس میں خدا رہتا ہے۔' ہمارے جسم کے حجم کے مقابلے میں اس کا حجم کتنا مختصر ہے، پھر بھی اس میں بیکراں سمندر اور بسیط ریگستان، دونوں چھپے رہتے ہیں۔ جو اس بات کو جانتا ہے، وہی کہہ سکتا ہے، مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم بادشاہ ہو یا وزیر—دیکھو مجھے، کیا میں فقیر نہیں؟

میں تو اُن درویش بابا کا ہاتھ پکڑ کر کسی انجان راہ پر نکل جانا چاہتا تھا، جو جمنا کی سطح پر ظاہر

ہوئے تھے، لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ انھوں نے کہا، اپنے آئینے کو بار بار پونچھتے رہو، لفظوں کا کالا جادو اپنی مہلک دلکشی لیے تمھارا منتظر ہے۔ پھر ایک دن آخر کار وہ آئینہ ٹوٹ گیا، اور آپ کو معلوم ہے میں نے کیا دیکھا؟ جیسا فقیر میں پیدا ہوا تھا، ویسا ہی تھا، بس بیچ میں کچھ خطابات در آئے تھے جو سے نوشی کے، عورتوں کے اور بادشاہوں کے عطا کردہ تھے۔ ان سب کو مرجھانے میں بھلا دیر ہی کتنی لگی؟

یہ ۱۸۵۷ء کے کافی بعد کی بات ہے، ایک فقیر میرے دروازے پر آیا اور گا بجا کر خیرات مانگنے لگا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ میری ہی غزل تھی۔ 'یہ نغمہ کس کا لکھا ہوا ہے؟' میں نے اس سے پوچھا۔

— حضور، یہ سب تو راہ چلتے چلتے لکھ لیا جاتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں فقیر بننے میں کامیاب ہو سکا یا نہیں، لیکن منٹو بھائی، میری شاعری تو فقیری کی راہ پر چل نکلی۔ وہ اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ سکی جس نے دھول کو روندا تھا۔ یہی تو باغ رضواں ہے۔

۱۸

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

باغ رضواں۔ نہیں مرزا صاحب، مجھے باغ بہشت میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں تھا، اس کی تو خوشبو بھی مجھ تک کبھی نہ پہنچی تھی۔ پھر بھی میں اللہ سے دعا کیا کرتا تھا، کالی روح والے اس سعادت حسن منٹو کو دنیا سے اٹھا لے، جو ہمیشہ خوشبو کے بجائے بدبو کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اسے تمتماتے ہوئے سورج سے نفرت ہے اور وہ ہمیشہ اندھیری گلیوں کی بھول بھلیوں میں گھسا رہتا ہے۔ تہذیب اور شرافت کے منھ پر لات مار کر، وہ ننگے سچ سے لپٹا رہتا ہے۔ اسے کڑوے پھل کھانا ہی پسند ہے۔ خانہ دار عورتوں کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے وہ ویشاؤں کے ساتھ مسرت کے ساتویں آسمان پر پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ ہنسنے لگتا ہے جب دوسرے رو رہے ہوں اور جب وہ ہنستے ہیں تو یہ رونے لگتا ہے۔ منٹو کالک سے آلودہ چہروں کو پونچھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ اصل چہرہ ڈھونڈنا چاہتا ہے جو کہیں نیچے چھپا ہوا ہے۔ اے خدا، اس شیطان کو، اس گمراہ فرشتے کو بچا لے، بس ایک بار۔

نہیں، میرے بھائیو، خدا نے میرے عذر کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تو پھر میں کیا کرتا؟ میں نے اپنی جیبوں میں کہانیاں اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ دوسرے لوگ اپنی کہانیاں اپنے دماغ میں جمع کرنا شروع کرتے تھے مگر میری کہانیاں میری جیبوں میں ہوتی تھیں۔ جانتے ہیں کیوں؟ میں

اپنی کہانیوں کے لیے پیشگی لینے کا عادی تھا۔ پیسوں ہی کی طرح، میری کہانیاں بھی میری جیب سے نکل آتیں۔ لوگ سمجھتے یہ آدمی جادوگر ہے۔ یہ اتنی ساری کہانیاں کہاں سے لے آتا ہے؟ ارے، کہانیوں کی کوئی کمی ہے؟ اگر تمھاری آنکھوں پر پٹی نہ بندھی ہو تو تم کوئی بھی کہانی، کہیں بھی ڈھونڈ سکتے ہو۔ اگر تم پیائش کا فیتہ لیے نہ بیٹھے ہو تو ہر شخص کی کہانی تمھاری کہانی ہے۔ اسی وجہ سے نہ ترقی پسند مجھے برداشت کرتے تھے اور نہ ملّا۔ ان کے ہاتھ میں تو ہر وقت پیائش کا فیتہ ہوتا تھا۔ صرف وہی کہانی لکھی جاسکتی تھی جو ان کے پیمانے پر پوری اترتی تھی — باقیوں کو زندگی سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔ میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ منٹو خود کو ایک ادیب ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار ہے جس کا پلستر جھڑ رہا ہے اور فرش پر نامانوس نقش بنتے جارہے ہیں۔ میں ایسی ہی ایک دیوار تھا۔ میں اُس پانچویں پہیّے کے مانند ہوں جو گاڑی کے پیچھے لگا ہوتا ہے، جو کام میں آبھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ یقین مانیے، مجھے کبھی سکون نہیں ملا، مجھے کبھی تکمیل کا احساس نہیں ہوا۔ کہیں کوئی مستقل کمی تھی، برادران، جیسے کچھ رہ گیا ہو، جیسے میں نامکمل ہوں۔ میرا درجۂ حرارت نارمل سے ایک ڈگری مستقل اوپر رہتا تھا۔ میں کسی گرداب میں پھنسا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہوسکتا ہے آپ یہ سُن کر ہنسیں لیکن مجھے لگتا تھا کہ ایسے لوگ جن کا درجۂ حرارت ہمیشہ نارمل رہتا ہے، وہ تو کسی درخت یا کسی دریا سے بھی محبت نہیں کرسکتے۔ شاعری کرنا اور افسانے لکھنا تو ایک طرف رہا۔ میری بات لکھ رکھو، میرے بھائیو، دیوانگی کے بغیر، ابنارمل رویّے کے بغیر کچھ بھی تخلیق نہیں کیا جاسکتا، محبت بھی نہیں۔ محبت ناپ تول کر نہیں ہوتی: اگر تم مجھے یہ دو گے تو میں تم کو وہ دوں گا، یہ محبت نہیں ہے، یہ تو دنیاداری ہے — اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ اس حساب کتاب کو محبت سمجھتے ہیں۔ میں نے اصل محبت دیکھی ہے، ہیرامنڈی میں، فارس روڈ پر — یہ سارے ریڈ لائٹ ایریاز ہیں۔ یہاں لوگ محبت کے پیچھے کنگال ہوجاتے ہیں، قتل بھی ہوجاتے ہیں، لیکن شریف زادوں کی نظر میں تو وہ سب ویشیائیں تھیں۔ اپنے بدن کا دھندا کرنے والیاں۔ انھیں محبت کا کیا پتا؟ نہیں، مرزا صاحب، یوں بے بسی سے میری طرف مت دیکھیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ، ایک آپ ہی طوائفوں کے دل تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ میں نے بھی یہی دیکھا تھا، ایک کوٹھے سے دوسرے کوٹھے تک بکتا ہوا گوشت — جبکہ اس گوشت کے اندر

کا نور — اور وہ مہکتے ہوئے دل — محبت کے لیے خود کو جلا کر راکھ کررہے تھے۔

ہیرامنڈی میں میرا آنا جانا تب شروع ہوا جب میں باری صاحب کے ساتھ کام کرنے کے لیے لاہور گیا۔ تبھی میں ان عورتوں سے ملا جن کی ساری زندگی میں لفظ 'گھر' ایک خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے ہر ایک منفرد تھی، اپنی الگ کہانی کے ساتھ۔ ٹالسٹائی نے کہا تھا، سارے سکھی گھرانے ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن ہر دکھی گھرانہ اپنی طرح کا دکھی ہوتا ہے۔ جب میں ہیرامنڈی کی رنگین دنیا میں داخل ہوا مجھے محسوس ہوا میں نے کتنے ہی دھڑکتے ہوئے دلوں کو تھاما ہوا ہے — اگر ایک مالکونس تھا تو دوسرا بہاگ، یہ بھیروی ہے تو وہ پوروی۔ کیسا میلہ تھا راگ راگنیوں کا۔ راگوں میں ہر آواز ہوتی ہے — اشکوں کی، لہو کی، ناامیدی کے واویلے کی، اور چاقو کو دھار دینے کی۔ باری صاحب کے ساتھ تو میں ہیرامنڈی جاتا ہی تھا، اس کے علاوہ بھی، میں وہاں اکیلے ہو آتا تھا۔ ویشیائیں تو وہاں ہوتی ہی تھیں لیکن میں دلّالوں کے ساتھ بھی گپیں ہانکا کرتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوش ہوجاتے، 'منٹو بھائی آگئے، اب مزہ آئے گا۔' اور آپ کی دعا سے، برادران، موج مستی میں میرا ثانی کوئی نہیں تھا۔ لیکن جب یہ ہلا گلا ختم ہوجاتا تو میں دیکھتا منٹو کے اندر جو بنجر پن تھا اس میں سرِمو کوئی فرق نہیں آیا۔ گھاس کی ایک پتّی بھی اس پر نہیں اُگی۔ اور یہ تو میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ اس زمین پر کبھی سبزہ نہ ہوسکے گا۔ جب تک جیتے ہو ہر چیز کا مشاہدہ کرو، اور جو کچھ دیکھو اسے تحریر کرلو۔ ہوسکتا ہے آپ کو کہانیوں میں گلستان ہی مل جائے، یہ اور بات ہے کہ وہ کانٹوں اور نوکیلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہو۔

ہیرامنڈی میں ہم بادشاہوں کی طرح جایا کرتے تھے، ایک دفعہ کی بات بتاتا ہوں آپ کو۔ ایک دن ہم نے افسانہ نگار بلونت گارگی کو گھیر لیا۔ بلونت نہایت شریف اور بھولا آدمی تھا، ہم نے اسے نہیں بتایا کہ ہم اسے کہاں لے جارہے ہیں۔ ہم نے ایک پشاوری تانگہ کرائے پر لے لیا۔ 'ہم کہاں جارہے ہیں، منٹو بھائی؟' بلونت بار بار پوچھ رہا تھا۔

باری صاحب دھیمے دھیمے مسکرا رہے تھے۔ میں نے کہا، 'بلونت، اگر تم سارا وقت اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر گزار دو گے تو کبھی ادیب نہیں بن سکو گے، چلو آج ذرا سا ئرا کام کر آتے ہیں۔'

— کیا مطلب؟

—بلونت، یونہی ذرا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے آج رات منٹو کی بات مان لے۔ وہ تجھے دوزخ میں تو لے جائے گا نہیں، اُس سے تو بہتر جگہ ہوگی۔ باری صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

ہمارا تانگہ شاہی مسجد کے پاس جا کر رُک گیا۔ زندہ گوشت کا بازار سامنے ہی تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا اور سڑک پر ویشیاؤں، دلالوں، پھول بیچنے والوں اور کلفی والوں کی بھیڑ تھی۔ تکّے کبابوں کی خوشبو نتھنوں میں گھس رہی تھی، سارنگی کے سُر ہوا میں تیر رہے تھے، ٹھمری کے بول بھی سنائی دے رہے تھے۔ میرا بازو پکڑتے ہوئے بلونت نے کہا، 'یہ کہاں لے آئے ہو، منٹو بھائی؟'

—ہیرامنڈی۔ کبھی سنا نہیں اس کے بارے میں؟

—تم ڈر رہے ہو؟

—نہیں۔ بلونت نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ تم ہو نہ میرے ساتھ؟

—بھروسا رکھو، میرے یار۔ منٹو پر یقین رکھو۔

اس دوران، باری صاحب ایک پٹھان دلاّل کے ساتھ بھاؤ تاؤ شروع کر چکے تھے۔ عجیب عادت تھی ان کی، عیش کے وقت بھی بحثا بحثی سے باز نہیں آتے تھے۔ سالا، آرام کرسی کا انقلابی، پائی پائی گنے بغیر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے تو میں ان حرامی کیمونسٹوں کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ اور سب کی طرح یہ بھی عیاشی کرنے کے آرزومند ہوں گے، چھپ چھپا کر سب کریں گے بھی، لیکن ماتھے پر ہتھوڑے اور درانتی کا تلک لگا کر— پھر ہر بات پر سودے بازی بھی کریں گے۔ اگر آپ نے ان کی سوچ سے ہٹ کر کچھ بھی کہا تو آپ ری ایکشنری کہلائیں گے۔ انقلابی دلاّل۔ کس نے تمھیں ذمّے داری سونپی ہے سب کو ایک برابر بنانے کی؟ ایسا صرف تصوف کی ریاضت ہی سے ممکن ہے۔ یہ راہ فقیروں اور درویشوں کی ہے، یہاں اشتراکیت کی کوئی جگہ نہیں۔ جن کا مقصد طاقت کا حصول ہو، سب کے لیے برابری ان کا نظریہ نہیں ہو سکتی۔ معافی چاہتا ہوں، برادران، میں پھر بہکنے لگا۔ آپ جانتے ہیں، میں ایک جدّت پسند آدمی ہوں۔ سیدھے سبھاؤ کبھی کوئی کہانی نہیں کہہ پاتا۔ گیان دینے کا بھوت ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔

میں نے باری صاحب سے کہا، 'میں ہزار بار آپ سے کہہ چکا ہوں کہ اگر بحثا بحثی کرنی ہو تو آپ اکیلے آیا کیجیے۔'

—لیکن یہ حرام زادے......

—کیا میں اور آپ کم حرام زادے ہیں؟ کیا آپ بھول گئے؟ میری گالی گلوچ سن کر باری صاحب گم سم ہو جاتے تھے۔

جب پٹھان دلاّل نے میری بات سنی، وہ پھرتی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ 'آیئے، اوپر چلیے، صاحب، میرے پاس ایک قیامت کی لڑکی ہے۔ ایک دم ڈم پخت۔

اُس کوٹھے پر ہم اس دن پہلی بار گئے تھے۔ پہلی منزل کے ایک کمرے میں ہم نے دیکھا ایک پینتیس سالہ پٹھان عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہ ضرور نائکہ ہوگی۔ فربہ اندام، بالوں میں موتیے کے پھولوں کا موٹا ہار پڑا ہوا، پان سے رنگے ہوئے ہونٹ۔ ہر لحاظ سے دل کش لگ رہی تھی۔

—کیا دیکھ رہے ہو، میاں؟ اُس نے مصنوعی خفگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

میں بھی کم بدمعاش نہیں تھا۔ میں نے اپنا کھیل دکھایا۔ آپ کا ایک شعر پڑھ دیا، مرزا صاحب ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

—کیا بات، بہت خوب! جبار...... جبار میاں......

—جی مالکن؟ مکان کے اندر سے آواز آئی۔

—مہمان آئے ہیں۔ گلاس لے آؤ۔

گلاس لائے گئے۔ میں نے جبار میاں سے کہا، کچھ سوڈا اور تکّے کباب لے آئے۔ بلونت چونکہ گوشت نہیں کھاتا تھا، اس کے لیے ایک آملیٹ منگوایا۔ دس منٹ کے اندر ہی جبار نے سارا انتظام کر دیا۔ باری صاحب اپنی جانی واکر اپنے ساتھ لائے تھے۔ تینوں گلاسوں میں سوڈے اور برف کے ساتھ وسکی انڈیلی گئی۔ میں جانتا تھا بلونت نہیں پیے گا۔ میں نے ایک گلاس نائکہ کی طرف بڑھایا اور اس کی ران پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، 'پیو، میری جان۔'

اس کی نظریں چھری کی نوک کی طرح مجھ پر گڑ گئیں۔ گلاس پکڑتے ہوئے وہ بولی، 'میری جان' کا مطلب معلوم ہے، جناب؟'

—جانتا ہوں۔

—تو بتائیے مجھے۔

—

صورت آئینے میں، تک دیکھ تو، کیا صورت ہے
بدزبانی تجھے اس منہ پہ سزاوار نہیں

—میر صاحب، ہے نا؟

—ہاں، میری جان۔

—

وہ تو کل دیر تک دیکھتا ادھر کو رہا
ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا

—ماشاءاللہ۔ میں نے جھک کر اس کے پاؤں کا بوسہ لے لیا۔

—یہ کیا کر رہے ہیں، میاں؟

—محبت پیروں میں بستی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

—وہ کیسے؟

—تم نے دیکھا نہیں کیسے میرا کے گردھر لال رادھا کے پیروں کی طرف مائل ہوتے ہیں؟ ہم انسان اوپر سے نیچے آتے ہیں، اوّلاً ہونٹوں کو چومتے ہوئے، لیکن موہن نیچے سے اوپر بڑھتے ہیں، پیروں کو چومنے سے شروعات کرتے ہوئے۔ اسی سبب ہماری محبت آخرِ کار مٹ جاتی ہے، جبکہ ان کی محبت ایک سچی لیلا بن جاتی ہے۔

—سبحان اللہ۔ ہیرا منڈی میں یہ کون فرشتہ آیا ہے آج؟

باری صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے—دیکھ، بلونت، کیسا معجزہ ہے، ابلیس ہیرا منڈی میں آ کر فرشتہ بن گیا۔ اُس پینتیس سالہ ویشیا نے میرا بازو تھام لیا، اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، جیسے میں ہی میرا کا گردھر لال ہوں۔ 'مال کہاں ہے؟' میں نے گلا کھنکار کر کہا۔

وہ کچھ نہ کہہ پائی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تیر رہی تھی۔

—مال تو دکھاؤ۔ کیا ہم رات اسی طرح گزاریں گے؟ میں نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس ختم کر دیا۔

نائکہ نے نظر اٹھا کر پٹھان دلّال کی طرف دیکھا، وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گلابی جارجیٹ کی ساڑھی میں لپٹی ایک نوجوان لڑکی کو لیے لوٹا۔ میں نے غور سے اس لڑکی کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ بلونت بھی ترچھی نظروں سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی کافی دبلی پتلی تھی، چہرے پر چمکیلا غازہ پتا ہوا تھا اور آنکھوں میں موٹا موٹا کاجل تھا۔ اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے، یونہی کچھ کہنے کے لیے، مجھ سے کہا:

—کہاں سے تشریف لائے ہیں آپ؟

—تمھاری امّاں جان کے گاؤں سے۔

—کیا؟ اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔

—تم کہاں سے آئی ہو؟

—جی......

گفتگو کرنا تو درکنار، ایسی لڑکیوں کے ساتھ تو سویا بھی نہیں جا سکتا۔ میں نے اسے مسترد کر دیا۔ دلّال ایک کے بعد ایک کتنی ہی لڑکیاں لے کر آیا۔ مجھے ایک بھی پسند نہیں آئی۔ اس وجہ سے باری صاحب، ہر بار مجھ پر غصہ ہوتے تھے۔

—یہ کیا بات ہے، منٹو۔ ہمیں ان کے ساتھ سونا ہے۔ پھر اس تفتیش کا کیا مطلب؟

—آپ کسی کو لے کر چلے جائیے۔

لیکن میں جانتا تھا میری منظوری کے بغیر باری صاحب بھی کسی کو لے کر نہیں جائیں گے۔

اس کے بعد جو لڑکی آئی وہ خاصی دراز قد تھی اور دمک رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کو ہیجان خیز کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں کالے چشمے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے سامنے یوں دوزانو ہو کر بیٹھ گئی جیسے نماز ادا کر رہی ہو۔ مجھے وہ خاصی پسند آئی۔ اس سے پہلے آنے والیوں سے میں نے کچھ سوال و جواب کیے تھے—ان میں سے کوئی بھی جواب دینے کے لائق نہ تھی—سب کی سب احمق تھیں۔ مجھے لگا یہ لڑکی کامیاب ہو جائے گی۔ 'ایک پہیلی بوجھو گی؟' میں

نے پوچھا۔

—جی، کہیے۔

—ایک عورت تھی، جس کا نام بھورن تھا۔ اس کی آرزوئیں اور خواہشات سب سے جدا تھیں۔ ایک دن اس نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے نام ایک خط لکھا، 'میں آپ کی محبت کے لیے بے قرار ہوں، لیکن آپ بہ یک وقت چار کو چاہتے ہیں، میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ کسی عورت کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ چار لوگوں کو چاہے۔' بتاؤ مرزا صاحب نے اسے کیا جواب دیا ہوگا؟

—بارہ کو چاہنے کے بجائے چار سے محبت کرنا زیادہ مذہبی بات ہے۔

اس کی بات سن کر میں حیرت میں پڑ گیا— تم نے کیسے جانا؟

لڑکی نے مسکرا کر کہا، 'چار کو جو پیار کرتا ہے، وہ سنّی ہے۔ وہ چار خلفاء کو مانتا ہے۔ اور جو بارہ کو پیار کرتا ہے وہ شیعہ ہے، اس کی قیادت بارہ امام کرتے ہیں۔'

—یہ کہانی تم نے کہاں سنی؟

لڑکی ہنس دی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے پسند آ گئی۔ آپ ایسی ویشیا کے ساتھ رات کیسے گزار سکتے ہیں جس سے آپ بات بھی نہ کر سکیں۔ لیکن اس نے شام کے وقت یہ کالا چشمہ کیوں پہن رکھا ہے؟ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

وہ بڑی چرب زبان تھی۔ فوراً بولی، 'آپ کا حسن دیکھ کر میری بینائی چلی گئی ہے، جناب۔'

— کیا بات! تمھارے ساتھ سو کر تو میں بہشت میں پہنچ جاؤں گا، میری جان۔

—تو پھر پہلے مجھے جانے دو، باری صاحب نے پکار کر کہا— جنت کی سیر کا موقع پہلے مجھے دو، منٹو بھائی۔

—دے دیتا ہوں لیکن پہلے مجھے تو حقیقت سے واقف ہو لینے دیجیے۔

میں نے لڑکی کی آنکھوں سے کالا چشمہ اُتار دیا۔ بھینگی، وہ لڑکی صریحاً بھینگی تھی۔ اس کا چشمہ لوٹاتے ہوئے میں نے کہا، 'اگر تم یہ چشمہ پہن کر نہ آتیں، تو میں تمھارے بھینگے پن کے باوجود تمھارے ساتھ رات گزارنے پر راضی ہوتا، لیکن میں جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا، میری جان۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ دھوکا دہی مجھے قبول نہیں۔

وہ لڑکی بھی چلی گئی۔ اب رات کے لگ بھگ گیارہ بج چکے تھے۔ مزید کباب منگوائے گئے۔ ہم پانچ پانچ پیگ چڑھا چکے تھے۔ میں نے جونہی چھٹا پیگ بنانے کے لیے شراب گلاس میں انڈیلنی چاہی، نائیکہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، 'اور نہیں، جناب۔'

— کیوں؟

—اس کی بات مان لیجیے، منٹو بھائی۔ بلونت نے کہا— یہ آپ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہے۔

—میرے بھلے کے لیے؟ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے، بلونت۔ یہ باقی کی شراب دلّال کے لیے بچا کے رکھنا چاہتی ہے۔ خدارا، ارے اگر اس کے لیے چاہیے تو مجھے کہہ دو۔ میں پوری بوتل منگوا دوں گا۔ تم ان حرام زادیوں سے واقف نہیں ہو۔

میں نے ایک چسکی بھری، نائیکہ نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا— 'خدا کے لیے اور مت پیجیے، جناب۔ آپ جیسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'

—واقعی؟ اور تم جیسی حسین اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا، اس نے مجھے نہیں روکا۔ اس کی گردن کو چومتے ہوئے میں نے کہا، 'تم کلوپیٹرا ہو، ہیلن ہو۔ تم جانتی ہو؟ تم نہیں جانتیں؟ منٹو سے جان لو۔'

میں نے وہ رات کوٹھے پر ہی گزاری۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں باری صاحب اور بلونت کب رخصت ہوئے۔ نائیکہ میرے گرد اپنے بازو حمائل کیے بیٹھی رہی۔ میں شراب کے خمار میں تھا۔ اس کے آنسوؤں نے مجھے بحرِ مردار کی طرح گھیر لیا تھا۔ جب صبح میرا خمار اترا تو میں نے خود کو اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا پایا، اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مگر میرا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اپنا چہرہ اس کے پیٹ میں دھنسا کر میں سسک سسک کر، اونچی آواز سے رونے لگا۔ وہ میرے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

میں اس کے کوٹھے پر ہی نہایا۔ وہ میرے لیے چائے ناشتا لے کر آئی۔ سرخوشی کے عالم میں، میں نے اس کی اصل شکل و صورت پہلی بار دیکھی۔ اس کی رنگت اب ہلکی زرد تھی، لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کا بدن کبھی ہاتھی دانت کی طرح دمکتا ہوگا اور وہ کبھی صندل کی طرح ہوتی۔

اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے، لیکن یہی آنکھیں کبھی زمرد کی طرح چمکتی ہوں گی۔ اس کا بدن اب ڈھلک رہا تھا لیکن کبھی یہ بدن چنار کے درخت کی طرح گٹھا ہوا رہا ہوگا۔

— تمھارا نام کیا ہے؟

— کانتا۔

— یہاں کب آئیں؟

— یاد نہیں۔

— تمھیں کیا یاد ہے، کانتا؟

— کچھ نہیں، جناب۔

— کسی کی یاد نہیں آتی؟

کافی دیر چپ رہنے کے بعد کانتا نے کہا: 'کبھی کبھی خوشیا کی یاد آتی ہے۔'

— کون خوشیا؟

— میرا دلاّل تھا۔ میرے لیے گاہک لایا کرتا تھا۔

— کیا وہ مر گیا؟

— پتا نہیں۔

— تمھیں نہیں معلوم وہ کہاں ہے؟

— نہیں۔

— خوشیا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

— خوشیا نے مجھے غلط سمجھا۔

— کیوں؟

— کیونکہ مجھے اس کی موجودگی سے کوئی شرم نہیں تھی۔ ہوتی بھی کیوں؟ وہ تو خوشیا تھا۔ میرے کوٹھے ہی کا تھا۔

— خوشیا نے کیا کیا تھا؟

— بہتر ہوگا کہ آپ چلے جائیں، جناب۔ آپ کو دن کے وقت اس محلّے میں نہیں ہونا

چاہیے۔ میں بھی اب ذرا سوؤں گی۔

— کسی دن خوشیا کے بارے میں بتاؤ گی مجھے؟

— بتاؤں گی۔ اگر آپ دوبارہ آئے۔ لیکن اکیلے آئیے گا، دوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں۔

— وہ کیوں؟

کانتا ہنسنے لگی — ایک ویشیا کیا کہہ سکتی ہے؟ وہ تو صرف اپنے کپڑے اتار سکتی ہے۔ کچھ لوگ مجھ سے میرا اصلی نام پوچھتے ہیں، میں دھندا کیوں کرتی ہوں۔ معاف کیجیے گا، جناب، ہمُران کتوں کے منہ پر پیشاب کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تم یہاں مجھے چودنے آئے ہو، تو چود دو۔ مجھے جاننا کیوں چاہتے ہو؟ گھنٹے بھر کے لیے یہاں آئے ہو — اپنی آنکھوں سے میرا جسم جھنجھوڑو، جو کرنا ہے کرو، اور دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ لیکن آپ دوبارہ آئیں گے، ہے نا؟ میں آج تک نہیں سمجھ پائی، خوشیا نے ایسا کیوں کیا، جناب۔

۱۹

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تُو بوتا ہے کیا

ایک صبح میں ڈراؤنے خواب کی دہشت سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا حلق دکھ رہا تھا، ہاتھ اور پاؤں تھرتھر کانپ رہے تھے، میں نے کلّو کو بلانا چاہا لیکن گلے سے کوئی آواز نہ نکلی۔ میں ساری زندگی اس خواب کو نہیں بھول پایا۔ ریگستان میں ایک قافلہ چلا جا رہا ہے اور ایک نیلی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اونٹ اور وہ لوگ اصلی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پرچھائیوں کا کوئی جلوس ہو۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف دور سے ان کی اجتماعی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جیسے کہیں گھمسان کا رن پڑ رہا ہو۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ چیخیں موت سے دوچار ہونے کی آوازیں ہیں۔ میں شدت سے چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی مسافروں سے بات کروں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس قافلے کے ساتھ کہاں جا رہا ہوں۔ میں اس قافلے میں کیوں تھا؟ 'ہم کہاں جا رہے ہیں، جناب؟' میں نے برابر والے آدمی سے پوچھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کسی دوسرے آدمی سے استفسار کیا، 'اور کتنی دور جانا ہے؟'

اس نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔

کیا یہ لوگ بات نہیں کر سکتے؟ یا پھر مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟ اگر ایسا ہے تو انھوں نے مجھے اپنی جماعت میں شامل ہی کیوں کیا؟

میرے دل پر ایک تاریک سایہ پھیلتا چلا گیا۔ میں نے کچھ لوگوں سے پانی مانگا، لیکن وہ صرف میری طرف دیکھ کر رہ گئے، نہ پانی دیا اور نہ کوئی لفظ ادا کیا۔ میں نے فیصلہ کیا مجھے یہاں سے فرار ہونا ہوگا۔ میں نے اپنے ناقے کا رُخ دوسری جانب موڑنے کی کوشش کی، لیکن اس نے قافلے سے علیحدہ ہونے سے انکار کر دیا۔ آخر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے اپنی پیٹھ سے گرا دیا۔ ریت پر پڑے پڑے میں نے دیکھا، قافلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن ناقابلِ یقین طور پر مجھ میں اٹھ کر کھڑا ہونے کی سکت باقی تھی، میرے بھائیو؛ لگتا تھا جیسے یہ صحرا مجھے ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا ایک گھنی تاریکی کا ڈھیر مجھ پر اُترتا چلا آ رہا ہے۔ ہاں، وہ قوی ہیکل پروں والا کوئی پرندہ تھا۔ اس کی لمبی گردن کانٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں نے ایسا پرندہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کہاں سے آیا تھا یہ اور کیوں میری طرف جھپٹتا چلا آ رہا تھا؟ میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا مجھ میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں بچی۔ وہ پرندہ میرے سینے کے اوپر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں پر پھیلے ہوئے تھے، اور وہ میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نہیں تھیں، صرف دو گڑھے تھے۔ اب اس کی لمبی چونچ میرے سینے کی طرف بڑھی، اور پرندے نے مجھے ٹھونگیں مارنا شروع کر دیں۔ وہ میرے سینے کو چھید کر میرا خون اور گودا کھانا چاہتا تھا؛ وہ مجھے نوچتا گیا اور میرا گوشت پھٹتا گیا......

تبھی میری آنکھ کھل گئی۔ میں آپ سے سچ کہوں، منٹو بھائی، زندگی میں پہلی بار مجھے ڈر لگا۔ اس خواب کا کیا مطلب تھا؟ کیا میرا یومِ حساب آ پہنچا تھا؟ میں خاصا خوش خوراک تھا، لیکن میں دن بھر کچھ نہ کھا سکا۔ جب بھی میں کھانے کی طرف دیکھتا، مجھے اس خونی پرندے کی نوکیلی چونچ نظر آنے لگتی۔ شاید کلّو نے یہ بات زنانہ محل میں جا کر کہہ دی تھی، اسی لیے شام کو بیگم میرے پاس آئیں۔

—میں نے سنا ہے آپ نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ طبیعت خراب ہے کیا؟

—نہیں بیگم۔

—تو پھر کیا بات ہے؟

آپ جانتے ہیں امراؤ بیگم کے ساتھ میری بات چیت عملاً بند ہو چکی تھی، لیکن میں انھیں

اپنے خواب کی بابت بتلانا چاہتا تھا۔ شاید وہ مجھے کچھ تسلی دے سکیں، چاہے معمولی سی ہی سہی۔ مرد بھی کبھی کتنے مجبور ہو جاتے ہیں، منٹو بھائی، خدا کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے کسی عورت کا سہارا ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

—ایک ڈراؤنے خواب نے میرا جی متلا دیا ہے۔

—مجھے بتایئے آپ نے کیا دیکھا؟

—میں نے بیگم کو خواب کا قصہ کہہ سنایا۔ ایک بل دار مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل گئی—آپ ایسے ہی خواب کے مستحق ہیں، مرزا صاحب۔

—جی......

—آپ کچھ کھا نہیں سکے کہ جی متلا رہا تھا، لیکن شراب تو پی ہوگی نا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

—آپ شراب اور جوئے میں ڈوبے رہتے ہیں، اور کس خواب کی توقع کرتے ہیں آپ؟ اچھے خواب آپ کے نصیب میں نہیں، اور وہ تو آپ چاہتے بھی نہیں۔

—میں نے دل ہی دل میں اپنے منہ پر طمانچہ مارا۔ کیوں سنایا تھا بیگم کو اپنا خواب؟ اب سننا پڑے گا کہ میں کتنا منحرف آدمی ہوں، اور یہ کہ وہ جو شریعت کو نہیں مانتا، اس کے لیے تو یہ ساری زندگی ہی ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ایسی صورت حال میں اپنے دفاع کے لیے میرے پاس ایک ہی حربہ ہوتا تھا کہ ساری بات کو ہنسی میں اُڑا دو۔ بات کو رفع دفع کرنے کا ایک یہی وسیلہ تھا۔ میں نے بیگم سے کہا، 'اے حضرتِ موسیٰ کی ہمشیرہ، تو پھر میرے لیے دعا فرمایئے۔'

—دعا اور آپ کے لیے؟ آپ شریعت کو مانتے ہی کب ہیں۔ روزہ رکھنا تو دور کی بات ہے، نماز تک نہیں پڑھتے۔ میں آپ کے لیے دعا کروں؟ خدا ہی جانتا ہے آپ کا کیا ہوگا؟—

میں نے مسکرا کر کہا، 'میرا حشر تم سے زیادہ برا نہیں ہوگا، بلکہ درحقیقت بہتر ہی ہوگا۔'

—یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

—میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

—کیا دیکھ رہے ہو؟

—یہی کہ حشر میں تمھارے ساتھ گنجے سروں والے، پرہیزگار لوگ نیلی پوشاکیں پہنے ہوئے، کمر کے ساتھ مسواک باندھے، وضو کے لوٹے اٹھائے ہوئے، بدمزاج شکلیں بنائے ہوئے۔

واقعی؟ بیگم بھی ہنس دیں—اور آپ کے ساتھ کون ہوگا؟

—خوفناک اور ظالم و جابر بادشاہ، سارے کے سارے۔ فرعون، نمرود۔ کمر سے تلواریں باندھے ہوئے۔ اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا، میں اکڑ کر ان کے ساتھ چلوں گا۔ دونوں طرف فرشتے میری ہمراہی میں ساتھ چل رہے ہوں گے۔

—بہت خوب۔ ایسے ہی جایئے گا۔ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

—میں اب جا رہی ہوں۔ رات کو کچھ کھا لیجیے گا۔ خالی پیٹ شراب پینا اچھا نہیں۔

—بیگم؟

—کہیے۔

—کیا شریعت اتنی سخت ہوتی ہے کہ جو اسے نہ مانے اس کی بات سننا بھی کفر ہے؟ ایک قصہ سننے کا وقت ہوگا آپ کے پاس؟

—کس کا قصہ؟

—شیخ ابوسعید کا۔ خراسان کے صوفی کامل تھے۔ ایک دن شیخ سے ان کے طالب علموں نے پوچھا، اس شہر میں سب سے پاک انسان کون ہے؟ شیخ بولے، ظاہر ہے، لقمان۔ کیوں، کیا کوئی ان جیسا پاک ہے؟ شاگرد حیران رہ گئے۔ لقمان تو مخبوط الحواس تھے۔ اُلجھے ہوئے بال، ایک گندہ اور پھٹا ہوا چوغا پہنے ہر وقت مغلظات بکتے رہتے تھے۔ شیخ نے وضاحت کی، جانتے ہو پاک آدمی کون ہوتا ہے؟ ایسا آدمی جو کسی بھی چیز میں بالکل شامل نہ ہو۔ اسی لیے لقمان سے زیادہ کوئی پاک نہیں۔

—کیا آپ خود کو بھی اتنا ہی پاک تصور کرتے ہیں؟

—نہیں، بیگم۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تنہا تمھاری شریعت کا اتباع کرنے میں کوئی پاکی نہیں ہے۔ اگر سچائی پتھر کی طرح آ کر لگتی ہے تو میرے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔ بہتر ہے کہ جھوٹ کے ساتھ ہی رہا جائے۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ حشر کے دن ہم کہاں کھڑے

ہوں گے۔

بیگم کچھ دیر کھڑی رہیں پھر محل سرا چلی گئیں۔

میں اُس وقت انتیس برس کا تھا، منٹو بھائی۔ کتنی جلدی خواب میں قیامت کا دن دیکھ لیا میں نے۔ یہ وہی سال تھا جب میرا بھائی یوسف پوری طرح سے پاگل ہوگیا۔ سال بھر پہلے ہی میرے سسر معروف صاحب چل بسے تھے۔ پنشن کی معمولی رقم اور کچھ خیرات اور قرضوں کے طفیل میری زندگی اچھی بسر ہو رہی تھی۔ لیکن اب میں ایک اندھے گلیارے میں پہنچ چکا تھا۔ معروف صاحب کی موت نے میری جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے قرض خواہ اپنے قرضوں کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگے۔ جس طرزِ زندگی کا میں عادی ہو چکا تھا چونکہ اُسے بدل پانا تو ممکن نہیں تھا، اس لیے اب ایک ہی حل تھا— کسی نہ کسی طرح، کہیں سے بھی پیسوں کا بندوبست کیا جائے۔ اپنی آمدن بڑھاؤ میاں، میں مستقل خود سے کہتا تھا، ورنہ جیو گے کیسے؟ اور اگر جیسے جینا چاہتے ہو ویسے نہ جی سکے تو شعر کیسے کہو گے؟ کیا کوئی فاقہ کشی کر کے بھی حسن کی تخلیق کر سکا ہے، منٹو بھائی؟

اب میں مجبور ہوگیا کہ گوروں سے ملنے والی پنشن کا حساب لے کر بیٹھوں۔ یہ مت سوچیے کہ مجھے صرف اپنے اخراجات کی فکر تھی۔ مجھے یوسف مرزا کے کنبے کو بھی دیکھنا تھا، ان کے نوکر، مامائیں اور ان کے بچے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ میں اپنی موج میں جیتا تھا، لیکن کسی کو چھوڑ دینے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سوچ بھی کیسے سکتا تھا؟ ان لوگوں کی موجودگی ہی سے تو میرا وجود قائم تھا۔ اکیلے میری طاقت ہی کیا تھی؟ یہ آپ بھی جانتے ہیں، منٹو بھائی، کہ چند سطریں لکھنے کے لیے بھی دوسرے لوگوں کی رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ مجھے مالی معاملات میں الجھنا پڑے گا۔ ظاہر ہے، زندگی میں عیش و عشرت کے لیے پیسوں کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے، لیکن جب یہ سوال سامنے آتا کہ پیسے آئیں گے کہاں سے تو گویا میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ لیکن آدمی کرنے پر آئے تو کیا نہیں کر سکتا؟ وہ بادلوں کے ساتھ بادل بن کر تیر سکتا ہے، کسی کیڑے کی طرح زمین کے نیچے گھس سکتا ہے۔ اس لیے میرے پاس بھی انگریزی پنشن کو کھنگالنے کے سوا کوئی دوسرا حل موجود نہ تھا۔ مجھے ذرا یہ وضاحت کے ساتھ بتانا ہوگا، ورنہ آپ اسے سمجھ نہ پائیں گے۔ ہمیں انگریزی پنشن لوہارو

فیروز پور کے نواب احمد بخش خاں سے ملا کرتی تھی۔ وہ میرے سسر معروف صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خاں مرہٹہ فوج میں کام کرتے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب مرہٹوں کو انگریزوں سے شکست ہوگئی تو ان کی صورتِ حال بھی دگرگوں ہوگئی۔ احمد بخش خاں کی بہن کی شادی میرے چچا کے ساتھ ہوئی تھی۔ احمد بخش ایک نہایت مہذب اور شریف آدمی تھے۔ وہ لارڈ لیک اور انگریزوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے، الور کے راجا کی طرف سے سفیر مقرر ہوئے۔ بیک وقت راجا اور انگریزی سرکار کی خوشنودی حاصل کر کے وہ لوہارو اور فیروز پور کے نواب مقرر ہوگئے۔ یوں میرے چچا کو انھوں نے انگریزی فوج میں ملازمت دلوادی۔ ۱۸۰۶ء میں جب میرے چچا کا انتقال ہوا تو احمد بخش خاں نے انگریزوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ مرحوم نصراللہ بیگ خاں کے کنبے کی کفالت کرنا ان کی ذمّے داری ہے۔ اور یہ کہ انگریزی سرکار کی جانب سے وہ خود اس ذمّے داری کو اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ انھیں پچیس ہزار روپے کی وہ سالانہ رقم جو نوابین کو ادا کرنی ہوتی ہے، معاف کردی جائے۔ اس کے بدلے میں وہ نہ صرف نصراللہ بیگ خاں کے کنبے کی کفالت کریں گے بلکہ انگریزوں کے لیے پچاس گھڑسواروں کی ایک ٹکڑی بھی تیار کریں گے۔

پنشن کے معاملے کی جانچ پڑتال کی تو مجھے معلوم ہوا کہ اگرچہ میرے چچا کے کنبے کی کفالت کے لیے دس ہزار روپے کی رقم مختص کی گئی تھی، تاہم محض پانچ ہزار روپے ہی مہیا کیے گئے۔ مجھے سات سو پچاس روپے ملتے تھے اور میرے بھائی کو کچھ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں، کوئی خواجہ حاجی نامی شخص جس کا میرے چچا سے کوئی تعلق نہ تھا، بقیہ رقم ہتھیا رہا تھا۔ یہ ایک الجھی ہوئی گتھی تھی، اور آپ تو جانتے ہیں منٹو بھائی، روپے پیسوں کی گتھی آسانی سے نہیں سلجھائی جا سکتی۔

ادھر ایک پریشانی اور بھی تھی۔ احمد بخش خاں کی دو بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیوی کا بیٹا تھا شمس الدین، جبکہ امین الدین اور ضیاالدین دوسری بیوی سے تھے۔ امین الدین اور میں گہرے دوست تھے۔ ۱۸۲۲ء میں احمد بخش خاں نے، الور کے راجا اور انگریزوں سے اجازت لینے کے بعد اپنے وارث کے طور پر شمس الدین کے نام کا اعلان کردیا۔ دونوں چھوٹے بھائی اس

پر برہم ہو گئے۔ ان کی ماں کا تعلق مسلمان اشرافیہ سے تھا اور شمس الدین کی ماں تھی ایک عام سی میواتن۔ شمس الدین بھلا کیسے وارث بن سکتا ہے؟ چونکہ امین بھائی میرے دوست تھے اس لیے میں بھی مشکل میں پڑ گیا۔ شمس الدین میرے ساتھ چالیں چلنے لگا۔ کبھی وہ مجھے کم رقم بھیجتا، کبھی مہینوں تک کوئی رقم ہی نہ بھیجتا۔ معروف صاحب کے انتقال کے بعد میں جیسے کسی ہیبت ناک کھائی میں گر چکا تھا۔ اتنے لوگوں کا پیٹ بھرنے کا جتن اور قرض خواہوں کے تقاضے اس پر مستزاد۔ میں نے احمد بخش خاں کو متعدد خط لکھے، اس امید پر کہ وہ کچھ بندوبست کریں گے، لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ایک دن میں فیروز پور پہنچ گیا۔ ان کی حالت بہت بُری تھی۔ پورا جسم ناسوروں سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے تیسے وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے انھیں صاف صاف کہہ دیا، 'یا تو آپ اپنی زبان کا پاس کیجیے، اور یقین دلایئے کہ ہمیں ہمارے بقایاجات مل جائیں گے، بصورتِ دیگر میں سرکار میں عرضی پیش کرنے جاتا ہوں۔' میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر وہ رونے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ احمد بخش خاں اس سلسلے میں کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ وہ شمس الدین کے حکم کے پابند ہیں۔ میں نے شمس الدین سے ملنے کا فیصلہ کیا تاکہ ایک ہی بار اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے نمٹا لیا جائے۔ مجھے اب اپنی کارروائی کا تعین کرنا تھا۔ احمد بخش خاں اور انگریزی سرکار کے مابین ہونے والا ۴ مئی ۱۸۰۶ء کا معاہدہ یہ بتاتا تھا کہ نصر اللہ بیگ کے ورثاء کو دس ہزار روپے وظیفہ ادا کیا جائے گا۔ لیکن جون کے مہینے کے ایک اور معاہدے میں اس رقم کو گھٹا کر پانچ ہزار روپے کر دیا گیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ ضرور یہ دستاویز جعلی تھی۔ میں شمس الدین سے ملا۔ وہ میرے ساتھ نہایت شائستگی سے پیش آیا جب میں نے اپنے آنے کا سبب بیان کیا تو اس نے کہا، 'مجھے معاہدے کے بارے میں کچھ علم نہیں، مرزا۔'

—تو پھر میں کیا کروں؟

— تمھیں جو مناسب معلوم ہو وہ کرو۔

— لیکن آپ تو پیسے وقت پر بھیجتے نہیں۔

— پیسے کیا آسمان سے ٹپکتے ہیں؟

— کیا مطلب؟

— پیسے ملیں گے تبھی تو بھیجوں گا نا؟

— لیکن میں اپنا گھربار کیسے چلاؤں؟

— کیسا گھربار، یار؟ شراب رنڈیاں اور غزلیں — بس یہی نا؟ تم بڑے شاعر ہو ہم سب تمھاری عزت کرتے ہیں، پیسہ پیسہ کیوں کرتے ہو؟ کچھ دن یہاں ہمارے ساتھ رہو، مزے کرو۔

— یوسف میاں کی طبیعت سازگار نہیں۔ اکثر تپ کا زور بڑھ جاتا ہے، ہذیانی کیفیت ہو جاتی ہے۔

— جونکیں لگواؤ۔ فاسد خون نکلوا دو۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔

— ہم سب ٹھیک ہو جائیں گے، شمس بھائی، اگر آپ پیسے وقت پر بھیج دیا کریں۔

— دیکھو۔ جو خدا کی رضا۔

شمس الدین کا یہ فقرہ 'جو خدا کی رضا' میرے تابوت میں آخری کیل تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے دارالسلطنت کلکتہ جانا ہوگا اور شاہی عدالت میں اس جعلی معاہدے کی قلعی کھولنا ہوگی۔ میں نے خود سے کہا، مرزا، تم جو آسمان میں اُڑتے پھرتے ہو اور شاعری فرماتے ہو اب ذرا ایک بار زندگی کا سامنا کرو اور اپنے واجبات وصول کرو۔ ذرا دیکھیں تو تم کس قابل ہو، دیکھیں تو آسمانوں میں اُڑتے ہوئے، بہ یک وقت تم سطحِ زمین پر مالی حساب کتاب سے بھی نمٹ سکتے ہو یا نہیں، صرف تبھی تم خود کو ایک شاعر ثابت کر سکو گے۔ اگر میر صاحب صرف مہر نگار کی محبت کے لیے اتنی ذلت اٹھا سکتے ہیں، دیوانہ ہو جانے کی سزا برداشت کر سکتے ہیں، تو کیا تم نہیں کر سکتے؟ کتنے سارے لوگ دو وقت کی روٹی کے لیے تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ غزل کا حسن اور ایک آسودہ زندگی کا حسن الگ الگ تو نہیں ہے، مرزا۔ اس لیے عدالت میں عرضی پیش کرنے کے لیے کلکتہ جانا ہی ہوگا۔

لیکن کیسے جاتا؟ ہاتھ میں پیسہ نہیں تھا؛ سفر خرچ کے علاوہ مجھے اپنے کنبے کے روزمرہ اخراجات کی بھی فکر تھی۔ شمس الدین کب رقم بھیجے، اس کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ اوپر سے یوسف میاں پوری طرح خبط الحواس ہو چکے تھے۔ انھیں دیکھ کر دکھ ہوتا تھا، وہ اکیلے بیٹھے رہتے اور ناقابلِ فہم

---

۱ ادرار: عطیہ ۲ تخا استو: آمین، ایسا ہی ہو

الفاظ دُہراتے رہتے۔ اکثر کئی کئی دن کے لیے غائب ہوجاتے پھر خود ہی لوٹ آتے۔ کبھی کبھار میرا دل چاہتا کہ انھیں پاگل خانے میں داخل کرآؤں۔ لیکن وہاں تو لوگوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھتے ہیں۔ یوسف بہت چھوٹے دل کے تھے، منٹو بھائی، میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ انھیں زنجیروں میں جکڑا جائے اور ان پر کوڑے برسائے جائیں۔ دنیا میں پاگلوں سے بڑھ کر بے سہارا کوئی نہیں ہوتا، لوگ ان کے ساتھ جو چاہے کرسکتے ہیں؛ لیکن کیا ہمیں ایسا کرنے کا حق ہے؟ وہ آدمی جو دنیا کو ہمیشہ منطق کے زور پر پرکھتا ہے، کیا کم پاگل ہے؟ وہ شخص جو دلیلوں کے بل پر جیتا ہے، وہ اپنی ذات میں خود ایک پاگل خانہ ہے۔ بتایئے، کون سمجھائے کہ ایک فاتر العقل اور ایک صحیح العقل میں صرف بال برابر کا فرق ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ سکتے ہیں، کچھ ایسا نہیں کرپاتے اور جو ایسا نہیں کرپاتا وہ پاگل ہوجاتا ہے جبکہ دوسرا ایک ٹھیک آدمی کی طرح برتاؤ کرتا رہتا ہے، لیکن وہ جس چیز کو چھپا رہا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دن سامنے آجائے، کہ اس پر اس شخص کا کوئی اختیار ہی نہیں۔ اسی لیے میں سوچتا تھا کہ سارے انسان دیوانگی کی راہ پر گامزن ہیں، اگرچہ اس بات کی پیشین گوئی کوئی نہیں کرسکتا کہ کب یہ جن ان پر سوار ہوجائے۔

ایک دن میں نے یوسف میاں کو پکڑ کر بٹھا لیا۔ ان کے سر کو سہلاتے ہوئے میں نے پوچھا، 'آپ کو کیا پریشانی ہے، مجھے بتایئے؟'

وہ بس ہنستے رہے جیسے میری بات انھیں سمجھ ہی نہ آئی ہو۔

—یوسف......

—جی۔

—آپ کیا سوچتے رہتے ہیں، یوسف میاں؟

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کتنے ہی سوال پوچھے لیکن وہ بس میرا منھ دیکھتے رہے۔ مجھے اندازہ ہوا، منٹو بھائی، کہ چاہے ہمارا استدلال کتنا ہی مؤثر ہو، ہم کسی پاگل کے ذہن تک کبھی رسائی نہیں پاسکتے۔ ان کی زبان ہماری زبان سے مختلف ہوتی ہے؛ اور یوسف میاں بھی ہماری زبان کھو چکے تھے۔

میرے پاس کچھ اور سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے بس کلکتہ پہنچنا تھا۔ پنشن کے قضیے کو ہمیشہ کے لیے نمٹانا تھا۔ مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ جون میں طے پانے والا معاہدہ جعلی تھا۔ میں تمام روداد بیگم کو بتانے کے لیے گیا۔

—آپ کلکتہ جائیں گے؟ سنا ہے بہت دور ہے وہ۔

—جانا ہی ہوگا۔ ورنہ ایک دن ہم بھوکوں مرجائیں گے۔

—کیا آپ کامیاب ہوپائیں گے، مرزا صاحب؟

—کامیاب ہونا ہی ہوگا، بیگم۔

امراؤ بیگم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا، 'لیکن روپے پیسے کے لیے جھگڑنا آپ کو زیب نہیں دیتا، مرزا صاحب۔'

—لیکن یہ کام مجھے اب ہر صورت کرنا ہوگا۔

—اور آپ کی شاعری؟

—میری شاعری؟ کیا آپ کو اس سے کچھ وابستگی ہے، بیگم؟

—نہیں، لیکن اس سے آپ کو خوشی ملتی ہے، اتنا تو میں سمجھتی ہوں۔

—میں نے اس دن بیگم کا ایک نیا ہی روپ دیکھا، برادران۔ پہلی مرتبہ انھوں نے میری شاعری کا ذکر کیا تھا۔

میں نے کہا، 'چند برسوں کے لیے سب کاموں کی نگرانی آپ کو کرنا ہوگی، بیگم۔'

—اس کی آپ فکر مت کریں۔ لیکن اتنے طویل سفر کے لیے تو اچھی خاصی رقم کی ضرورت پڑے گی۔ اس کا کیا ہوگا؟

—قرض لے لوں گا۔

—پھر قرض؟

—میں فتح یاب ہوکر لوٹوں گا، بیگم۔ سارا قرض چکادوں گا۔

—کوئی آپ کو مزید قرض دے گا بھی؟

—بے شک دیں گے۔ میں اپنے واجبات کو صاف صاف سمجھنے کے لیے ہی تو کلکتہ جارہا

ہوں، مجھے ایک مدت فریب دیا جاتا رہا ہے، اب وہ مجھے اور فریب نہیں دے سکتے۔

— لیکن آپ کو تو فریب کھانا پسند ہے، مرزا صاحب۔ بیگم مسکرائیں۔

— نہیں، بیگم۔ نہیں، مجھے کوئی فریب نہیں دے سکتا۔ مانا کہ میں شاعری کرتا ہوں لیکن کیا میرے پیٹ نہیں ہے؟

متھرا داس، درباری مل اور دوسروں نے جب یہ سنا کہ میں کلکتہ جا رہا ہوں، انھوں نے میری کامیابی کے امکانات پر شرطیں باندھ لیں۔ میں نے انھیں قائل کرلیا کہ میں یہ مقدمہ ضرور جیتوں گا۔ اور انھیں ان کی رقم سود سمیت واپس مل جائے گی۔ یہ سب دلچسپ لگ رہا تھا۔ اس لیے کھیل رفتار پکڑ رہا تھا۔ مجھے جیتنا ہی ہوگا۔ میں نے جب آئینے میں خود پر نظر ڈالی، مجھے لگا میں کسی گیدڑ کو دیکھ رہا ہوں۔ چلو، میاں، چلو کلکتہ چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہماری تقدیر بدلتی ہے یا نہیں۔

۲۰

اُٹھ بیٹھیے، برادران، اب میں آپ حضرات کو اُن روپ متیوں کے قصے سنانے جا رہا ہوں جن کا حُسن اور جوانی ہیرا منڈی اور فارس روڈ کے چکلوں میں جل جل کر راکھ ہوگئی۔ میں نے بمبئی کی فلمی صنعت میں لاتعداد فلمی ہیروئنیں دیکھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے دل کی کتاب پر ہلکا سا نشان بھی نہ چھوڑ پائی، اور جہاں تک دلھن کی سی تصویروں کا انداز دکھاتی، گھریلو عورتوں کی بات ہے، انھیں تو میں بالکل برداشت نہیں کر پاتا تھا، وہ سب کی سب ایک جیسی لگتی تھیں — لبوں پر محبت کے ترانے اور اندر بالکل کھوکھلا، وہاں سوائے روپے پیسے کے حساب، سونے اور زیورات کے اور کچھ نہ تھا۔ ارے بھئی، محبت دیوانگی مانگتی ہے، آپ اپنی محبت کا ناپ تول نہیں کر سکتے۔ یقین جانیے، چکلوں کی وہ لڑکیاں جانتی ہیں کہ عشق کیا ہوتا ہے، معلوم ہے کیوں؟ وہ روٹی کے لیے اپنا بدن بیچتی ہیں، اس لیے وہ محبت اور تصنع میں فرق کرنا جانتی ہیں۔ میں نے اُن سے ہی جانا کہ کیسے عورت کے اندر جنت چھپی ہوتی ہے؛ لیکن وہی عورت چادر اور چار دیواری کی حدود اور اپنی ہستی کے گنبد میں رہ کر ایک خون چوسنے والی جونک بن جاتی ہے۔ یہ مت سمجھیے گا کہ میں ان کی عظمت بتانے کی کوشش کر رہا ہوں، برادران۔ عظمت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ سب زندگی کی بکھری ہوئی سچائیاں ہیں، اور یہ بھی ہے کہ ایک آدمی کی سچائی، دوسرے کے کسی کام کی نہیں ہوتی۔ اگر ہم یہ مان لیں تو ہماری زندگیاں بہت سہل ہوجائیں۔ ان کی زندگیاں سہل ہوچکی تھیں۔ آپ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ وہ کبھی بنتی نہیں تھیں؛ وہ اسی طرح نظر آنا چاہتی تھیں جیسی کہ وہ حقیقت میں تھیں۔

چلیے، آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ اس کو سننے کے بعد میں کافی دنوں تک کچھ کھا پی نہیں

سکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں رینگنے والے جانوروں کے ساتھ کسی سرنگ میں رہ رہا ہوں۔ایک شام ایک شخص قیصر روڈ کے آگے سڑک پر، ایک لیمپ پوسٹ کے سامنے جھکا ہوا کھڑا تھا۔نہیں، وہ میں نہیں تھا۔میری سنائی ہوئی ہر کہانی کو میری زندگی سے مت جوڑیے۔اس کا نام؟ وہ تو بھول گیا میں، لیکن نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یا پڑتا ہے؟ اچھی بات ہے، چلیے ہم اسے سجاد کہہ لیتے ہیں۔تو سجاد وہاں کسی دوست کا انتظار کر رہا تھا۔وہ بار بار اپنی گھڑی پر نظر ڈالتا تھا کہ دوست کی آمد کا وقت کافی پہلے ہی گزر چکا تھا۔دل ہی دل میں دوست کو بُرا بھلا کہتے اس نے وہ سڑک پار کرنے کا سوچا، تاکہ سڑک پار والے چائے خانے میں جا کر چائے کی پیالی پی سکے۔دفعتاً کسی نے اُسے پکارا،'صاحب......صاحب......'

سجاد نے ایک مریل سے آدمی کو دیکھا۔اس نے تیل کے دھبوں سے بھرا ہوا کُرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا، جسے شاید مدت سے دھویا نہیں گیا تھا۔'تم مجھے بلا رہے تھے؟' سجاد نے پوچھا۔

—جی۔

— کیا چاہیے؟

— کچھ نہیں، حضور۔وہ آدمی آگے بڑھا اور اس کے ساتھ ہی بدبُو کا ایک جھونکا آیا جس سے سجاد کو قے آ گئی۔کیا آپ کو کچھ چاہیے، جناب؟

—چاہیے؟ کیا مطلب؟

—زنانہ، حضور۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد سجاد بولا،'کہاں ہے تمھاری زنانہ؟'

جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں سجاد کو اس وقت کسی بھی طرح عورت کی ضرورت نہیں تھی۔لیکن اُسے مہم جوئی پسند تھی۔یہی تو اس کی کمزوری تھی— کچھ نیا کرو، اس راہ پر قدم رکھو جس سے تم واقف نہیں۔

—یہاں پاس ہی ہے، حضور۔وہ وہاں سڑک کے پار جو مکان ہے نا......

—اتنا بڑا مکان؟

—جی، حضور۔وہ آدمی اپنے سڑے ہوئے دانت نکال کر مسکرایا— میں آگے چلتا ہوں،

آپ میرے پیچھے پیچھے آیئے۔

دلاّل کے پیچھے چلتے ہوئے سجاد ایک عمارت میں داخل ہوا۔اسے کھنڈر کہنا زیادہ مناسب تھا۔پلستر جھڑ چکا تھا اور اینٹوں کا ڈھانچہ دکھائی دے رہا تھا۔ہر طرف لوہے کے زنگ آلود پائپ اور کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔مکان کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔وہ دلاّل کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔سیڑھیوں سے نصف اوپر جانے کے بعد دلاّل مڑا اور بولا،'ذرا رُکیے صاحب، میں ایک منٹ میں آیا۔'

سجاد انتظار کرنے لگا۔دلاّل کا کچھ پتا نہ تھا۔اُسے سیڑھیوں کے اوپر روشنی نظر آئی، وہ پھر سے سیڑھیاں چڑھنے لگا، جب وہ روشنی کے قریب پہنچا تو اُسے دلاّل کی آواز سنائی دی۔'سالی، تُو اٹھے گی یا نہیں؟'

ایک زنانہ آواز سنائی دی—'میں نے تجھے کہہ دیا ہے، نہیں، مجھے سونے دے۔'

—میں تجھے کہہ رہا ہوں، اٹھ جا، نہیں تو......

— نہیں تو کیا کرے گا؟ مار ڈال مجھے۔میں نہیں اٹھوں گی۔اس بار چھوڑ دے مجھے۔

—اٹھ جا، اٹھ جا، میری جان، خدمت کر، دیکھ اگر تو ایسے کرے گی تو ہم جئیں گے کیسے۔ ہیں؟

—مجھے نہیں جینا۔میں فاقوں سے مر جاؤں گی۔مجھے اب سو لینے دے۔

—تو تُو نہیں اٹھے گی، کتیا؟

— کہہ تو دیا ہے، نہیں، نہیں، نہیں۔

—چلاّ مت۔کوئی سن لے گا۔دیکھ، اب اٹھ جا۔دیر ہی کتنی لگے گی؟ تمیں چالیس روپے مل جائیں گے۔

وہ عورت رونے لگی—'میں تیری منت کرتی ہوں، میں کب سے سو نہیں سکی۔بس آج مجھے ذرا سو لینے دے۔'

— بکواس بند کر۔دیر ہی کتنی لگے گی؟ بہت ہوا تو دو ایک گھنٹے۔بعد میں سوتی رہنا، جتنا چاہے۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔سجاد دبے پاؤں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں یہ ساری

گفتگو ہو رہی تھی اور اس نے دروازے کے شگاف میں سے جھانک کر دیکھا۔ چھوٹے سے کمرے کے فرش پر ایک جوان عورت لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں سوائے دو چار برتنوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دلال اس کے سامنے بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا، پھر دانت نکالتا ہوا کہنے لگا، 'دیکھ، اُٹھ جا، گھنٹے دو گھنٹے میں تو واپس آ جائے گی۔ اس کے بعد جتنا چاہے سو لینا۔ میں تجھے بالکل پریشان نہیں کروں گا، میری جان۔'

—میری جان؟ عورت تلخی سے ہنسی۔ سالا سؤر کہیں کا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

سجاد دبے پاؤں نیچے اُتر آیا۔ اس کا دل چاہا وہ اس شہر، اس ملک کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے لیکن کہاں جائے؟ اور اسے کیوں بھاگ جانا چاہیے؟ کون تھی یہ عورت؟ کیوں اس پر اتنا ظلم کیا جا رہا تھا؟ وہ دلال کی بات ماننے پر کیوں مجبور تھی؟ جب اس نے کمرے میں جھانکا تھا تو اس نے دیکھا تھا اس تنگ کمرے میں بہت تیز روشنی تھی۔ کم از کم سو واٹ کا بلب ہوگا۔ حتیٰ کہ اندھیرے میں آ جانے پر بھی اسے محسوس ہوا جیسے روشنی کی شدت اس کی آنکھوں کو چھید رہی ہے۔ سجاد کو تعجب ہوا کہ اتنی تیز روشنی میں کوئی کیسے سو سکتا ہے؟

کچھ دیر بعد اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دو سائے نمودار ہوئے اور اس کے پاس آ کر ٹھہر گئے۔ 'دیکھ لیجیے، صاحب۔' دلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

—دیکھ لیا۔

—ٹھیک ہے نا؟

—ٹھیک ہے۔

—چالیس روپے۔

جیب سے کچھ نوٹ نکال کر سجاد نے دلال کے ہاتھ پر رکھ دیے— گن لو۔

—پچاس ہیں، حضور۔

—پچاس ہی رکھ لو۔

—سلام صاحب۔

سجاد نے دل میں سوچا کاش میرے ہاتھ میں بڑا سا پتھر ہوتا تو میں اس دلال کا سر پھوڑ دیتا۔

دلال بڑبڑایا، 'لے جائیے، صاحب، لیکن زیادہ تکلیف مت دیجیے گا۔'

کوئی جواب دیے بغیر سجاد عورت کو لے کر سڑک پر نکل آیا۔ سامنے ہی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ وہ عورت کے ساتھ تانگے پر سوار ہو گیا۔ اسے دلال کی آواز پھر سنائی دی، 'سلام صاحب۔' سجاد سوچنے لگا اُسے کوئی بڑا سا پتھر کیوں نہیں مل رہا۔ سجاد اس عورت کو ایک ہوٹل کے کمرے میں لے آیا۔ پہلی بار اس نے عورت کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ اسے ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ وہ کسی ایسی شکستہ عمارت کی طرح لگ رہی تھی جو کسی بھی وقت ڈھے سکتی ہو۔

—ادھر، میری طرف دیکھو۔ سجاد نے کہا۔

— کیا چاہتے ہیں، آپ؟

— کچھ نہیں۔ بس مجھ سے باتیں کرو۔

اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں، اس نے خاموش سے نگاہوں سے سجاد کی طرف دیکھا۔

— تمھارا نام کیا ہے؟

— کوئی نام نہیں۔

— کہاں کی رہنے والی ہو؟

—آپ کہاں کی چاہتے ہیں؟

— تم اس طرح کیوں بات کر رہی ہو؟

یوں لگا جیسے وہ عورت اچانک جاگ اٹھی ہو— آپ کو جو کرنا ہے جلدی کریں، مجھے جلدی واپس جانا ہے۔

— کہاں؟

—جہاں سے آپ مجھے لے کر آئے ہیں۔

—تم چاہو تو ابھی جا سکتی ہو۔

—جو کرنا ہے کریں، اتنی باتیں کیوں کر رہے ہیں، صاحب۔

—میں تمھیں سمجھنا چاہتا ہوں۔

عورت یک دم بھڑک اٹھی— مجھے سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، صاحب۔ جو کرنا ہے کریں
تاکہ میں واپس جاسکوں۔

سجاد آ کر عورت کے برابر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا ہاتھ عورت کے سر پر رکھ دیا۔ عورت نے
تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

—مجھے تنگ مت کریں، صاحب۔ میں بہت دیر سے سوئی نہیں ہوں۔ جس دن سے
یہاں آئی ہوں، میں سو نہیں پائی۔

—یہیں سو جاؤ۔

اس کی آنکھیں مزید لال ہوگئیں: میں یہاں سونے کے لیے نہیں آئی۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔

—اور وہ گھر، کیا وہ تمھارا گھر ہے؟

—یہ بکواس چھوڑیں، صاحب۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ آپ اپنا کام کریں ورنہ مجھے
واپس لے چلیں اور اس چوہے سے اپنے پیسے واپس لے لیں۔

اس کے بعد اور کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ سجاد اس عورت کو اسی مکان پر واپس لے آیا۔

نہیں، میرے بھائیو، کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ کیا کہانی اتنی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے؟ کہانی
کے بھی کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں، ہیں نا؟ وہ کوئی یتیم تو نہیں جسے آپ جہاں چاہیں چھوڑ دیں۔

اگلے دن شام کو، اسی قیصر باغ کے پاس ایک ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے سجاد اپنے
دوست کو گزشتہ روز کا واقعہ سنا رہا تھا۔ اس کا دوست جو یہ سن کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا، اس سے
پوچھنے لگا: کیا وہ نوجوان تھی؟

—پتا نہیں۔ میں نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں۔ مجھے تو بس یہی خیال آ رہا ہے کہ
میں نے سڑک سے کوئی بھاری پتھر اٹھا کر اُس دلاّل کا سر کیوں نہیں پھوڑ دیا۔

اُس روز سجاد کو اپنے دوست کی رفاقت میں بھی لطف نہ آیا۔ وہ ابھی تک گزشتہ روز کے
واقعے کو نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔ اپنے دوست کے رخصت ہونے کے بعد وہ باہر فٹ پاتھ پر آ کر
کھڑا ہو گیا، اور اِدھر اُدھر نظریں گھماتا، دلاّل کو تلاش کرنے لگا۔ وہ خستہ حال عمارت سڑک کے
بالکل سامنے تھی۔ سجاد اس میں داخل ہو گیا اور دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخر وہ روشنی سے

بھرے ہوئے اس کمرے کے باہر پہنچ گیا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ سجاد نے دروازے کے شگاف
سے کمرے کے اندر جھانکا۔ چندھیا دینے والی روشنی میں اس نے دیکھا، ایک عورت فرش پر لیٹی تھی
اور اس کا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کیا وہ مرگئی؟ سجاد کمرے میں داخل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ
وہ سو رہی تھی۔ اور پھر اس کی نظر اس آدمی پر پڑی جو فرش پر جمے ہوئے خون کے درمیان پڑا ہوا
تھا۔ پاس ہی خون سے سنی ہوئی ایک اینٹ پڑی تھی۔ اس کے سر سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔

سجاد پھر کبھی قیصر باغ کے آس پاس دکھائی نہیں دیا۔ بعد میں اسے پاگل خانے میں داخل
کروانا پڑا۔ مجھے کچھ علم نہیں پھر اس کے ساتھ کیا ہوا۔

کوٹھوں والی عورتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ یہ سب سہنے کے باوجود، جینا ان کے لیے نشے
جیسا ہوتا ہے۔ سوگندھی کی زندگی کیا تھی؟ مادھو اس کے ساتھ آئے دن بے وفائی کرتا رہا؛ جب
سوگندھی کو یہ سمجھ آیا، اس نے اسے لات مار کر نکال دیا، لیکن اس نے اپنی جان دینے کی کوشش نہیں
کی۔ کیوں دیتی وہ جان؟ کسی نے اُسے ذرا سا بھی تو نہیں چاہا تھا۔ اپنی زندگی کو اس نے خود ہی چاہا۔

کیا ہوا، برادران؟ ارے ہاں، آپ خوشیا کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اس کی
کہانی میں نے ابھی نہیں سنائی۔ آپ کو سوگندھی کی کہانی سنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
چلیے، ٹھیک ہے، سوگندھی کے بجائے خوشیا ہی کی کہانی سناتا ہوں۔ اس میں تو مجھے بھی بہت دلچسپی
تھی۔ آخر اس نے کانتا کو کیوں غلط سمجھا؟ یہی جاننے کے لیے میں ایک روز اکیلا ہی کانتا کے
کوٹھے پر پہنچ گیا۔

—ارے، منٹو صاحب آئے ہیں۔ لیکن آج آپ کے یار دوست کہاں رہ گئے؟

— تمھی نے تو مجھے اکیلے آنے کو کہا تھا۔

کانتا ہنس پڑی— میں نے اکیلے آنے کے لیے کہا تھا؟ لیکن میرے پاس بچا ہی کیا ہے
جو میں آپ کو دے سکوں۔

— تمھارے پاس بہت کچھ ہے، کانتا۔ کتنی لڑکیاں ایسی ہوں گی جو تمھاری طرح کمر لچکا
سکتی ہیں۔

کانتا زور زور سے ہنسنے لگی— تو آپ یہاں میری کمر کے بل دیکھنے آئے ہیں؟

میں نے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،'اس گوشت کا مزہ ہی اور ہے۔'

— بکومت۔ صرف باتیں کرنی آتی ہیں۔

— کیا کروں، کانتا۔ اس لمحے بھر کی ملاقات سے میری سیری نہیں ہوتی۔ مجھے لمبی کہانیاں درکار ہیں، جو طویل مدت تک چلتی رہیں، جو میری نیند اور میرا چین مجھ سے چھین لیں۔

— تو پھر آپ یہاں کیوں آتے ہیں، منٹو صاحب؟

— کہانیوں کی تلاش میں۔ آج تم مجھے خوشیا کی کہانی سناؤ گی۔

— خوشیا؟

— اسی واسطے تو تم نے مجھے اکیلے آنے کو کہا تھا۔ تمھیں یاد نہیں؟ چلو، شراب منگواؤ۔ پیتے ہوئے خوشیا کی کہانی سنی جائے گی۔

ہم چھت پر چلے آئے۔

— خوشیا بہت اچھا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا عجیب برتاؤ کرے گا۔

— کیا کیا تھا اس نے؟

— وہ میرے لیے گاہک لایا کرتا تھا۔ میں جو کہتی تھی وہ خوشی خوشی کرتا تھا۔ میں تب نئی نئی اس دھندے میں آئی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا کہ مجھے گمان ہوتا جیسے وہ میری وجہ سے دکھ اٹھا رہا ہے۔ مجھے بھی اس بات سے دکھ پہنچتا۔ کتنا پیارا لڑکا تھا وہ۔ ستائیس اٹھائیس برس سے زیادہ عمر نہ ہوگی اس کی۔ چکلوں پر دلالی کرنے پر مجبور تھا۔ کیسی اچھی کہانیاں سناتا تھا خوشیا۔

— کیسی کہانیاں سناتا تھا؟

— اسی نے پہلی بار مجھے یوسف اور زلیخا کا قصہ سنایا تھا۔

— اچھا، پھر؟

— پھر کیا؟

— آگے بتاؤ، کانتا۔

ایک سہ پہر میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اس وقت نہا رہی تھی۔'کون ہے؟' میں نے چلا کر پوچھا۔'میں ہوں، خوشیا۔'ارے خوشیا۔ اس وقت کیسے آئے؟ یہ گاہکوں کا وقت نہیں

ہے۔ گیلے بدن پر ہی میں نے ایک چھوٹا سا تولیہ لپیٹا اور دروازہ کھول دیا۔ مجھے ایسی حالت میں دیکھ کر خوشیا کی آنکھیں متغیر ہو گئیں۔'کیا ہوا، خوشیا؟' میں نے پوچھا۔'میں نہا رہی تھی۔ ارے نہیں، جاؤ مت، اندر چلے آؤ۔ آہی رہے تھے تو ایک پیالی چائے لیتے آتے، راموآج صبح بھاگ گیا۔' خوشیا میری طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا، لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پھر کہاں دیکھے۔ اتنا سیدھا تھا وہ، منٹو صاحب۔ کتنی ہی دیر وہ سر کو جھکائے فرش کو گھورتا رہا پھر بولا،'جاؤ، جا کر نہا لو۔ دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں بعد میں آجاتا۔'

— تمھیں بھی شرم آئی ہوگی۔ ہے نا، کانتا؟

— بالکل نہیں۔ شرم کیوں آتی؟ وہ تو ہمارا خوشیا تھا۔ اس سے کیسی شرم؟

— کیا خوشیا نے تمھیں پہلے کبھی ایسی حالت میں دیکھا تھا؟

— نہیں، لیکن وہ گھر ہی کا آدمی تھا۔ وہ کوئی گاہک تو نہیں تھا۔

— اس کے بعد کیا ہوا؟

— آپ سمجھ سکتے ہیں خوشیا پاگل ہو گیا تھا، منٹو صاحب؟

— کیوں؟

— وہ چلا گیا۔ شام سے رات ہوگئی۔ لیکن خوشیا نہیں آیا۔ میرے پاس اس دن کوئی گاہک نہیں تھا۔ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو کوئی اجنبی کھڑا تھا۔'چلو گی؟' اس نے پوچھا۔'صاحب باہر گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں؟'

— انھیں یہاں لے آؤ۔

— وہ کوٹھوں پر نہیں جاتے۔

— کیوں؟

— کہا نا، وہ کوٹھوں پر نہیں جاتے۔ چلنا ہے تو چلو۔ کتنے لوگی؟ پیشگی دوں؟

— تم گئیں؟ میں نے کانتا سے پوچھا۔

— اور میں کیا کرتی؟ خوشیا نہیں، گاہک نہیں۔ مجھے کمائی تو کرنی تھی۔ یا نہیں؟ جو کوٹھوں پر نہیں آتے، زیادہ پیسے دیتے ہیں۔ میرے پاس اور چارہ کیا تھا؟ ٹیکسی بڑی سڑک پر کھڑی

تھی۔ دلّال نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا اور فوراً اپنا کمیشن لے لیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

گاڑی کے اندر اندھیرا تھا اس لیے پہلے تو میں اسے پہچان نہ سکی لیکن جب میری آنکھیں روشنی سے ہم آہنگ ہوئیں میں نے دیکھا وہ خوشیا تھا—— خوشیا تم؟

—— تمھیں تمھارے پیسے مل گئے ہیں نا؟

—— خوشیا......

—— چپ کرو۔ تمھیں تمھارے پیسے مل گئے ہیں، اب تم وہی کروگی جو میں کہوں گا۔

—— خوشیا نے کیا کیا؟

—— کچھ نہیں۔ جب ہم کافی دُور نکل آئے تو اُس نے مجھے ٹیکسی سے باہر نکال دیا۔

—— پھر؟

—— مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں وہاں اکیلی کھڑی رہی۔ پھر سڑک پر ہی سوگئی۔ جب صبح ہوئی تو میں کوٹھے پر واپس آئی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، منٹو صاحب، خوشیا نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟

میں اُس شام کانتا کو کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے بعد میں نے خوشیا کے بارے میں اکثر سوچا۔ انتقام انسان کی بنیادی جبلّت ہے۔ خوشیا انتقام چاہتا تھا۔ وہ چکلے کا دلّال ضرور تھا لیکن وہ تھا تو مرد۔ کانتا اسے اپنا دلّال سمجھ لینے کے بعد اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی تھی، اسی لیے وہ اس کی موجودگی میں برہنہ حالت میں کھڑی ہو کر کہہ گئی، ؟ 'ارے تم تو ہمارے خوشیا ہو۔ تم سے کیسی شرم؟'

بھائیو! مردوں کی انا بڑی خوفناک چیز ہوتی ہے! جب یہ اپنا سر اٹھاتی ہے تو پوری دنیا کو تہس نہس کر دینا چاہتی ہے۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ یہ ایک کانچ کا کھلونا ہے۔ اسے فرش پر پھینکو تو یہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے انا معمولی سے دھمکی سے غضب ناک ہو اٹھتی ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ انا صرف مردوں ہی میں ہوتی ہے، عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ معلوم ہے مردوں کی انا کیسی ہوتی ہے! بس میں حرفِ آخر ہوں، اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

—— خدا کو مانو! کس نے تمھیں حق دیا حرفِ آخر کہلانے کا؟ تم ایک ایسی دنیا میں خود کو حرفِ آخر سمجھتے ہو جس کی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا کی؟ اسی سبب میں ترقی پسند ادیبوں کو برداشت

نہیں کر پاتا تھا۔ انھوں نے زندگی میں دیکھا کچھ بھی نہیں تھا اور کہانیاں گھڑ لیتے تھے، اور پھر دعوٰی کرتے تھے کہ وہ حرفِ آخر ہیں۔ تم کوئی پیغمبر ہو کہ زندگی کے بارے میں تمھاری بات حرفِ آخر ہے، جسے مجھے ماننا ہی ہوگا؟

۲۱

تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں

نوجوان روہت کو دیوتاؤں کے راجا اندر نے جو کہا تھا، وہ میں آپ کو بتلانے جارہا ہوں، غور سے سنیے۔ یہ سب کچھ تج دینے اور اپنی زندگی کو سڑک پر لے آنے کی بات ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو ایسا کر پاتے ہیں؟ اگر ہم ایک بار بھی ایسا کر پائیں، منٹو بھائی، تو ہماری آنکھوں کے آگے سے دُھند چھٹ جائے، اور تب ہم جان پائیں کہ ہم کس لیلا، کس خدائی تماشے کا حصہ ہیں۔ ہاں، تو میں دیوتاؤں کے راجا اندر کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اس نے روہت سے کہا تھا، 'یاد رکھو! جو اپنا گھر بار نہ چھوڑ سکے اور سڑک پر نہ آسکے وہ کبھی راحت نہیں پا سکتا۔ انسانی سماج میں طویل المیعاد قیام نیک لوگوں کو بھی بد بنا دیتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں، سڑک کو ہی اپنا گھر بنالو اور زندگی کو سفر کے ذریعے سے دریافت کرو۔ مسافر کے پاؤں پھولوں کی طرح ہیں۔ اس کی روح ہر روز کھلتی ہے اور طرح طرح کے پھلوں کو جنم دیتی ہے۔ راستے کی تھکان اس کے سارے گناہوں کا جڑ سے خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس لیے سفر کرو، روہت، ٹھہرو مت۔'

میری زندگی بھی ان تین سالوں میں پھلوں اور پھولوں سے سیراب ہوگئی جو میں نے شاہ جہان آباد سے دور سفر میں گزارے۔ اس دوران میں نے کچھ کم تکلیفیں نہیں اٹھائیں، اچھی خاصی تذلیل بھی برداشت کی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ پنشن کے معاملے کو طے بھی نہ کروا پایا۔ پھر بھی میرے یہ تین برس جیسے کسی حیرت انگیز تصویر خانے میں بسر ہوئے۔ اور جب دلّی واپس لوٹا تو میں ایک

بدلا ہوا شخص تھا، جانتے ہیں کیوں؟ اس سے پیشتر میں اپنی بدنصیبیوں کے لیے دوسرے لوگوں کو، حتیٰ کہ خدا کو بھی مورد الزام ٹھہرایا کرتا تھا، لیکن دیس دیس کی سیر کرکے جو غالب دلّی لوٹا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ زندگی جس بھی صورت میں تمھارے پاس آئے، اسے بہر صورت قبول کرو۔ اگر ایک کیڑے کی طرح مرنا پڑے، تو ویسے ہی مرو۔ شکایت کرنے سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

نہیں، نہیں، زیادہ عجلت مت کریں، برادران، میں اب اپنے سفر کی روداد سنانے جارہا ہوں۔ کبھی سوچا تھا کہ اس سفر کا احوال بہ زبانِ فارسی تحریر کروں گا لیکن مجھے اس کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ خاص طور پر، دلّی لوٹنے کے بعد میں پے در پے الجھنوں میں پھنستا چلا گیا کہ میری انگلیوں نے قلم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اگر کہیں میں ان دنوں کا احوال لکھ پاتا تو نثرِ فارسی کا ایک نیا اُفق روشن کر دیتا۔ آئیے، آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی مرزا کے احوالِ سفر کا ذائقہ چکھتا ہوں۔

۱۸۲۷ء کا موسمِ بہار۔ اپنی قسمت کی تلاش میں مرزا غالب شاہ جہان آباد سے نکلے۔ ان کے آبا و اجداد گھڑ سواروں کی ہمراہی میں، غبار اڑاتے ہوئے، تلواریں لہراتے سفر کیا کرتے تھے—یہ جری سپاہیوں کا سفر ہوتا تھا۔ اور مرزا غالب اپنی پنشن کی عرضی دینے، محض دو تین خادموں کو ساتھ لے کر کلکتہ جارہے تھے۔ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تو کبھی بیل گاڑی میں، بھد بھد کرتے وہ بڑھتے گئے۔ رات کسی سرائے میں کاٹنا ہوتی تھی اور اگر سرائے نہ مل سکے تو وہیں راستے میں خیمہ گاڑ کر رات بسر کرنے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ سامنے دکھائی دیتے نا مختتم راستے کے ساتھ دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا تھا، لیکن رات گھپ اندھیرے میں گھری ہوتی تھی، جس میں رستے کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب آپ نوکروں کے ساتھ بھی کتنی دیر بات کریں گے؟ اس لیے آپ کو اپنے آپ سے باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ خود کلامی کا مطلب کیا ہوتا ہے، برادران۔ اپنے ہر فقرے کے ساتھ آپ خود ہی کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں، خوابوں کے مینار کھڑے کر رہے ہوتے ہیں، جو اگلے ہی لمحے چور چور ہو جائیں گے۔

کان پور پہنچ کر مرزا سخت بیمار پڑ گئے۔ وہاں کوئی طبیب بھی نہ ملا۔ اس لیے لکھنؤ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس سفر کے دوران مرزا لکھنؤ جانے کے آرزومند نہ تھے، لیکن عمائدین لکھنؤ نے جب یہ سنا کہ مرزا کلکتہ کے لیے عازمِ سفر ہیں تو انھوں نے مرزا سے شہر میں آنے کی

درخواست کی۔ مرزا کو بھی لکھنؤ میں کم کشش نہ محسوس ہوتی تھی۔ دلّی نے اپنی چمک دمک کب کی کھودی تھی۔ بچی کھچی مغلیہ تہذیب کا مرکز لکھنؤ ہی تھا۔ سوداؔ اور میرؔ جیسے شعراء نے مدت پہلے اودھ کے اس دارالخلافے کی خاطر دلّی کو چھوڑ دیا تھا۔ یہی سب سوچ کر، مرزا نے شہر کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ نواب کی طرف سے انعام واکرام ملنا طے تھے، ہوسکتا ہے دو ایک مشاعرے بھی مل جائیں اور کچھ آمدن ہوجائے، اس سب سے سفر کے اخراجات میں مدد مل جائے گی۔ ایک پالکی منگوائی گئی، اس میں بیٹھ کر مرزا نے دریائے گنگا کو پار کیا اور لکھنؤ جا پہنچے۔

کیا بتاؤں، بھائیو، جس لکھنؤ میں وہ پہنچے اس کا بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اور لکھنؤ کی راتوں کا تو کیا ہی کہنا۔ ان کی ایک ایک ساعت کو بازوؤں میں بھر لینے کو جی چاہتا تھا۔ ہر رات ایک نئی رات ہوتی تھی، جیسے کسی بوسے کے بعد اور بھی کئی نامکمل بوسے باقی رہ جاتے ہیں، ویسے ہی وہ راتیں آرزوئیں لیے بیدار رہنے کے لیے تھیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے اس زمانے میں لکھنؤ کے سب سے عمدہ شاعر کون تھے؟ ناسخ صاحب۔ انھوں نے غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ہوسکتا ہے آپ کو میری ابتدائی غزلوں میں ان کی آواز کی بازگشت سنائی دے جائے۔ انھوں نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ میں نے پوچھا: 'کیا میں نواب کے ہاں جانے کی امید نہ رکھوں، ناسخ صاحب؟'

—وہ دن لد گئے میاں۔

—یعنی؟ کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ نواب مجھ سے نہ ملیں گے۔

—اب ان تک رسائی کے لیے بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

—مثلاً؟

—معتمد الدولہ آغا میر نواب کے وزیر اعظم ہیں۔ ان کے بعد وزیروں میں سبحان علی خان ہیں۔ تم انھیں خوش کرکے ہی میر صاحب تک پہنچ سکتے ہو، اور اگر میر صاحب چاہیں گے تبھی تم نواب کے حضور میں پیش ہوسکو گے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا عہد نہیں ہے، جنھوں نے سوداؔ کو اپنے دربار میں مدعو کیا تھا۔ بیگم شمس النساء بھی ایک شاعرہ ہوتی تھیں۔ نواب کی ایک غزل کے جواب میں انھوں نے کیا لکھا تھا، جانتے ہو؟

—بتائیے، جناب۔

—

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں
نہ آنکھوں کو ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
تو آئے نہ آئے، یہیں، ہم تو ہر شب
تری راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

—کیا بات ہے، جناب، سبحان اللہ۔ میں نے گویا لختِ دل کھودیا۔

—میاں اب ہمارے نواب غازی الدین حیدر کے اس عہد میں کوئی لختِ دل نہیں کھوتا۔

—یاالٰہی! خیر پھر بھی ایک بار کوشش تو کرکے دیکھیے۔ شاید اس نادار کے لیے رقم کے حصول کی کوئی صورت پیدا ہوجائے۔

—جانتا ہوں، میاں، تم کو بہت دور جانا ہے، خیر میں کوشش کرتا ہوں۔ پہلے تو تمھیں سبحان علی کے پاس جانا ہوگا۔

سبحان علی سے ملاقات کرنے میں تو میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ میں ان کے لیے قصیدہ کہہ کر لے جاسکوں، اس لیے نثر میں ان کی مدح لکھ کر لے گیا۔ یوں قصیدے لکھنا مجھے پسند نہیں تھا لیکن پھر بھی لکھنا پڑتے تھے۔ سچ کہوں تو، منٹو بھائی، میری آدھی زندگی تو نوابوں بادشاہوں اور وزیروں کی مدح کرنے میں ضائع ہوگئی۔ کیا شاعر اسی لیے ہوتے ہیں کہ ان گدھوں کی مدح سرائی کرتے رہیں؟ لیکن کیا کرتا؟ پیٹ کی خاطر مجھے اپنی شاعری کو اس غلاظت کی سطح پر اُتارنا پڑا۔ لیکن یہ شاعر کا نظریہ نہیں ہوسکتا۔ میں شاعری کے قابلِ تعظیم رستے سے ہٹ گیا تھا، اور یہ میں جانتا تھا۔ ویسے ایک بات غور کرنے کے قابل تھی۔ قصیدے کی ابتدائی سطروں میں تو گویا میں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، اس کے برعکس مدح والے حصّے میں میں نے بے دلی سے محض چند سطریں ہی لکھی تھیں۔ میری نثر پڑھ چکنے کے بعد سبحان علی سنجیدہ شکل بنائے بیٹھے

رہے، دوسرے لوگوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن میری طرف مطلق نہ دیکھا۔

— جناب۔

— کیا کوئی عرض داشت ہے، میاں؟

— میں نواب بہادر کی خدمت میں سلام عرض کرنا چاہتا ہوں۔

— یہیں عرض کر دیجیے، یہ نواب بہادر ہی کی سلطنت ہے۔

— حضور، براہِ کرم دربار میں حاضری کا بندوبست فرما دیجیے۔

— دیکھتے ہیں، کیا ہو سکتا ہے۔

— لیکن میں ایک دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، جناب۔

— اب کیا ہے؟

— میں شاہجہاں آباد کا ایک شاعر ہوں۔ مجھے امید واثق ہے کہ میں دربار میں حسبِ مرتبہ عزت پاؤں گا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں بڑے لوگ شاعروں کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں۔

— خیر، دیکھتے ہیں —

— اور یہ کہ —

— کچھ اور بھی ہے کیا؟

— میں نواب بہادر کو کچھ نذر پیش نہ کر سکوں گا۔ اس کے لیے مجھے معاف رکھیے گا۔

سبحان علی نے آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا۔ پھر قصداً اپنے منہ میں پان چباتے ہوئے کہا: گھر لوٹ جائیے، میاں، نذر کے بغیر تم نواب بہادر سے ملاقات کی توقع کیونکر کر سکتے ہو۔ کیا تم دربار میں حاضری کے آداب سے واقف نہیں۔

نواب غازی الدین حیدر کے ساتھ مرزا کی ملاقات نہ ہو سکی۔ انھیں قوی امید تھی کہ اگر نواب کی خدمت میں حاضری ہو گئی تو انعام و اکرام پائیں گے۔ سبحان علی نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے باوجود مرزا نے لکھنؤ میں مزید قیام کیا، اور مشاعروں سے آراستہ لکھنؤ کی راتوں نے مرزا کو مایوس نہیں کیا۔ ان کی غزلوں کو خوب داد و تحسین سے نوازا گیا۔ وہاں ہونے والی گفت و شنید اور لوگوں کی رائے سے مرزا کو یہ سمجھنے میں مدد ملی کہ چاہے مرتی ہوئی دلّی ان کی قدر و قیمت

نہ جان پائی ہو، لیکن زندہ دلانِ لکھنؤ نے تو ان کی شاعری کو سراہا۔

اور پھر میں دوبارہ سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ باندا اور الہ آباد ہوتے ہوئے میں کاشی پہنچا۔ باندا کے نواب ذوالفقار علی نے سفر خرچ میں کچھ معاونت کی۔ الہ آباد کو میں بالکل برداشت نہ کر پایا، منو بھائی، ایک خود سر شہر، جس کا کوئی تمدن نہیں۔ میں تو بس کاشی پہنچ کر اطمینان کا سانس لے پایا۔ یہ ایک حیرت انگیز جگمگاتا ہوا شہر تھا۔ یوں محسوس ہوا میں سارے وقت ایسے ہی کسی شہر میں پہنچنا چاہتا تھا۔ ہر کوئی کہتا ہے، بنارس، بنارس، مجھے چڑ تھی اس نام سے۔ چونکہ انگریز کہتے ہیں تو کیا ہمیں بھی کہنا چاہیے؟ اسے وارانسی کہو یا پھر کاشی۔ شہر کی حقیقی شناخت تو کاشی کے نام سے ہی تھی۔ نورنگ آباد میں ایک مکان کرائے پر لے کر، میں نے مہینہ بھر کاشی میں گزارا۔ وشنو امیدہ اور مئیکرنکا گھاٹ پر بیٹھے میں اپنے آپ سے کہتا تھا کہ دیوادو مہیشور کے اس شہر میں اگر میں اپنی ساری زندگی گزار سکتا تو مجھے نوابوں اور بادشاہوں کی توجہ کا طالب نہ ہونا پڑتا۔ غزلیں نہ کہتا۔ کاشی کی گلیوں میں گھومتے، طوائفوں کا گانا سنتے، صبح اور شام آرتی پوجا دیکھتے، اور گھاٹ پر بیٹھ کر گنگا کے بہاؤ کا پُرشوق نظارا کرتے ایک سیلانی کی سی زندگی گزار دیتا۔

جھنجھلائیے مت، برادران، مجھے کاشی کی بابت قدرے وضاحت سے بیان کرنا ہوگا۔ جس شخص نے زندگی میں ایک بار بھی کاشی نہیں دیکھا، میں سمجھتا ہوں اس نے جنم ہی نہیں لیا۔ آپ کبھی کاشی گئے ہیں، منو بھائی؟ کبھی نہیں؟ تب تو آپ کو دوبارہ جنم لینا ہوگا، تبھی آپ جان پائیں گے کہ اس دنیا میں آپ کا جنم تو اب ہوا ہے۔ آپ کی گزشتہ زندگی؟ نہیں، نہیں، وہ تو ایک خواب تھی۔ یقین کیجیے، آپ کا جنم تو اب ہوا ہے۔ زندگی اور موت کا مطلب کیا ہوتا ہے، یہ آپ تبھی جان پائیں گے جب آپ کاشی دیکھیں گے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کاشی ساری دنیا ہے۔ ہندوستان کے سارے تیرتھ ستھان اور سبھی پوتر جل کاشی آ کر رل جاتے ہیں — یہ ہے روشنیوں کا شہر، برادران۔ دیوادو یوشیو یہاں رہتے تھے۔ کاشی ایک ایسی درخشاں جگہ تھی جو ہر شے کو اُجاگر کر دیتی تھی۔ نہیں، اس روشنی میں کسی دیدنی نظارے کی امید مت رکھیے — آپ صرف وہ کچھ واضح طور پر دیکھ پائیں گے، جو اس دنیا میں ہے۔ اس کے علاوہ، صرف کاشی ہی وہ مقام ہے جہاں اگر ہم موت سے ہمکنار ہو جائیں تو اس

دوسرے جنم کے چکر سے نجات پالیتے ہیں۔ میں نے کاشی کی عظمت کے متعدد پہلوؤں کو جانا تھا۔ لیکن میں دوزخ کا کیڑا، وہ سب کب کا بھول چکا۔ لیکن ہاں، جس شام میں کوٹھے پر نہیں جاتا تھا — یا اگر جاتا بھی تھا تو وہاں سے آکر میں منیکر نیکا گھاٹ پر جاکر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ منیکر نیکا وہ مقام ہے جہاں تعمیر اور تخریب باہم مل جاتے ہیں۔ جانتے ہیں کیسے؟ ابتدائے آفرینش میں بھگوان وشنو نے یہاں ایک پاک تالاب تیار کیا تھا اور یہیں پر ایک عظیم الشان شمشان بھی ہے، جہاں وقت کے خاتمے پر ہر ایک چیز جل کر راکھ ہوجائے گی۔ میرے بھائیو، کیا تم سننا چاہتے ہو کہ منیکر نیکا کا جنم کیونکر ہوا؟ ایسا صرف ہمارے ہی ملک میں کہا جاتا ہے کہ خیر کی بات سننے سے بھی گناہ کم ہوجاتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب — نہیں، میں غلط کہہ گیا تھا، تب تو وقت کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف تاریکی تھی اور پانی کا تلاطم۔ نہ سورج تھا نہ چاند۔ ستارے یا سیارے کہاں سے آئے؟ دن اور رات جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ آواز، نہ مہک، نہ لمس، نہ ذائقہ — کچھ نہیں تھا۔ بس وہ تھا۔ غیر فانی برہما، جسے کسی بھی طرح نہ چھوا جاسکتا تھا نہ اس تک پہنچا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ اس بے کراں خاموشی، اس ناقابلِ دخول تاریکی میں کب تک اکیلا رہتا؟ اس لیے اس نے ایک ایشور کی تخلیق کی۔ جو شِو تھے۔ شِو کے ہی جزوبدن سے شکتی نے جنم لیا، وہ فطرت بھی تھی اور فریب نظر بھی۔ دونوں نے مل کر دس میل لمبا زمین کا قطعہ، کاشی، تخلیق کیا۔ ایک دن، شِو اور شکتی نے ایک اور ہستی کی تخلیق کے بارے میں سوچا، جو دھرتی کو بنائے اور پھر اس کی دیکھ بھال بھی کرے۔ یوں وشنو کا جنم ہوا۔ شِو اور شکتی نے وشنو کو زمین اور اس کی ہر چیز کو تخلیق کرنے کا حکم دیا۔

وشنو نے بہت کڑی تپسیا شروع کی۔ اپنے سُدرشن چکر[1] کے ذریعے انھوں نے کنول کے پھولوں کا ایک تالاب تخلیق کیا۔ ان کے اپنے ہی پسینے سے وہ تالاب بھر گیا۔ اس چکردار تالاب کے کنارے پتھر کی طرح جم کر بیٹھے وہ مراقبے میں ڈوب گئے۔ پانچ لاکھ برس پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ منھ کیوں کھل گیا، برادران؟ ہزاروں اور لاکھوں برس تو ان کے لیے لمحوں کی بات تھی۔ یہ قاعدہ غیر معمولی تھا۔

[1] سدرشن چکر: وشنو بھگوان کا پہیہ یا آلۂ حرب۔

ایک دن شِو اور شکتی نے اس راہ سے گزرتے ہوئے وشنو کو دیکھا۔ اپنی شدید تپسیا کے زیرِ اثر وہ کسی شعلے کی طرح دہک رہے تھے۔ شِو نے ان سے کچھ وردان[1] مانگنے کو کہا، جس پر وشنو بولے، مجھے آپ کی قربت کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ — بھگوان۔ وشنو کی بھگتی دیکھ کر شِو نے مسرت سے یوں سر کو ہلایا کہ ان کے کان کا آویزہ — منیکر نیکا — ڈھیلا ہوکر پانی کے تالاب میں جاگرا۔ وہ تھا استوٹ[1]۔ شِو نے وشنو سے کہا اور یہ بھی اضافہ کیا کہ اب سے اس چکردار تالاب کا نام ان کے کان کے آویزے کے نام پر منیکر نیکا ہوگا۔ تالاب کے ساتھ والے گھاٹ کا بھی یہی نام پڑ گیا۔ اسی گھاٹ کے شمشان میں انسان اپنے مادّی جسموں کو موت کے ہاتھوں میں سونپتے ہیں اور پھر کوئی دوسرا جسم پاکر جنت کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ میں آدھی آدھی رات تک منیکر نیکا گھاٹ پر بیٹھا، لپکتے ہوئے شعلوں کو ایک کے بعد ایک چِتا کو چاٹتے ہوئے دیکھا کرتا اور یہ سوچتا کہ اگر مجھے دوبارہ جنم لینا پڑے، تو میرے جسم کو بھی ایسے ہی چِتا میں جلایا جائے، تاکہ میں بھی شاید خلا میں تحلیل ہوجاؤں۔ کتنی ہی کہانیاں تھیں جو میں نے لوگوں سے سنیں۔ ایک نے کہا تھا، کاشی کی گلیوں میں گدھا ہوکر گھومنا یا ایک پرندے کی مانند اس کے آسمان میں اُڑنا، کسی جگہ کا شہنشاہ ہونے سے زیادہ افضل ہے۔

نہیں، میرے بھائیو، میں آپ کو محض موت کی کہانیاں سنانے یہاں نہیں آیا۔ کاشی کا دفتر تب تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک آپ کو یہ نہ بتایا جائے کہ موت کے اُس طرف ہے کیا، وہ ہے خواہش۔ خواہش صرف عورت کے جسم کی نہیں، موسیقی کی اور رقص کی اور لمس کی اور ہوا کی مہک کی۔ ہر چیز میں خواہش ہے۔ ہماری ہوائے نفس اور ناآسودہ خواہشات کی کتنی کہانیاں ہیں۔ بات چاہے حُسن کی ہو یا اظہارِ محبت کی، کاشی کی طوائفوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا، منٹو بھائی۔ میں نے گوتم بدھ کے زمانے کی ایک طوائف کے بارے میں سنا، وہ ایک رات کا اتنا پیسہ لیتی تھی جو کاشی کے راجا کو ادا کیے جانے والے ایک دن کے لگان کے برابر ہوتا تھا۔ موت کے ساتھ ساتھ، یہ ایک اور طرح کا کاشی تھا۔ جس کے بدن پر خواہشاتِ نفسانی کے کتنے ہی صندلیں لیپ چڑھے ہوئے تھے۔ یہ کاشی تو ایک عورت تھا، ورنہ اسے چھوڑنے پر رِشی[1] اگستیہ کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ کاشی چھوڑ کر انھیں جنوبی ہندوستان جانا پڑا۔ حتیٰ کہ گوداوری کے ساحلوں پر مارے مارے پھرتے

ہوئے بھی وہ کاشی سے جدائی کے غم کو سہہ نہیں پاتے تھے۔ شمال کی جانب سے آتی ہواؤں کو اپنے
آغوش میں بھر لیتے اور پوچھتے، بتاؤ، میری کاشی کیسی ہے؟ میں نے کسی کے لیے یہ شعر کاشی ہی
میں کہا تھا۔

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

معذرت چاہتا ہوں، منو بھائی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں، لیکن جب تک میں دفن نہ ہو گیا وہ
چھری میرے سینے میں دھنسی رہی۔ اس نے مجھے کتنے ہی قصے سنائے۔ سچ کہوں تو میں اس کے
ہاں اس کے ساتھ سونے کے لیے نہیں، بلکہ اس کی خوشبو اور اس کی کہانیوں کے لیے جاتا تھا۔ اسی
نے مجھے رزمیہ نظم 'کٹّانی متھ' کے بارے میں بتایا۔ کیا آپ نے دامودر گپتا کے بارے میں سنا ہے؟
وہ کشمیر کے راجا جیہ پیڑھ کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے اپنی ضعیفی کے زمانے میں 'کٹّانی متھ' لکھی
تھی۔ واتسائین کے 'کام سوتر' کے بعد کام شاستروں[2] میں سب سے قدیم، اس نظم کی کہانی کاشی ہی
میں واقع ہوئی ہے۔ کیسا شہر تھا یہ؟ معاف کیجیے گا، برادران، اس شہر کو ہماری گھسی پٹی بھاشا میں بیان
کرنا ممکن ہی نہیں۔ ذرا تصور کیجیے دامودر گپتا آج ہمارے درمیان ہوں، اور وارانسی کی خوبصورتی
اور اس کی زنانِ شب کا بیان کر رہے ہوں۔ اب آپ ان ہی کی زبانی سنیے:

— مدن دیو کی جے ہو کہ جو خواہشِ نفسانی کا خدا ہے، جو جوشِ جذبات سے تمتماتی ہوئی
ناری کی نیم باز آنکھوں میں ہوتا ہے، خواہشِ نفسانی کہ جو مدن کو اپنی چتی رتی کے کنول مکھ کو بار بار
چوم لینے کے لیے بھنورے کی طرح بے تاب کر رہی ہے۔

حُسن اور ودیعت کی کثرت سے مالا مال، ساری دُنیا کے ماتھے کا جھومر، وارانسی اُن
رشیوں کے اجتماع سے تابندہ ہے جنھیں علم ربانی حاصل ہے۔ اس شہر کی عظمت ایسی درخشاں
روایت کی حامل ہے کہ یہاں کے باشندے اگرچہ خوشحالی کے عادی ہیں لیکن ان کے لیے یہ
ناممکن نہیں کہ وہ مہادیو کی رفاقت میں جئیں جن کی جلالی جٹاؤں کے پس منظر میں چاند ہوتا ہے۔
وارانسی شہر کی زنانِ شب طلائی زیورات سے پٹی ہوتی ہیں۔ وہ متمول ہیں اور اپنے طلبگاروں

---
۱ رشی: خدا پرست ۲ کام شاستر: جنسی رسائل

کے جھرمٹ میں گھری رہتی ہیں۔ ان کے بدن پشوپتی کی مانند نرم و نازک اور حسین ہیں، جو گُل
ذی روح کا دیوتا ہے۔ نقش و نگار سے مزین جھنڈے مندروں کے آسمان کو چھوتے کلسوں کی
چوٹیوں پر لہراتے ہیں اور اس جنت نظیر کو گلستان کی طرح خوبصورت بنا رہے ہیں — یہاں وہاں
گھومتی زنانِ شب نے اپنے پیروں کے قرمزی تلووں سے زمین کو گلنار کر دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا
ہے زمین سوسن کے پھولوں سے ڈھک گئی ہے۔ ہوا سے ان کے گہنے گھنٹیوں کی طرح بج اٹھتے ہیں
اور ان کی کھنک طالب علموں کی توجہ ان کے سبق سے ہٹا دیتی ہے۔ وہ اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پا رہے
اور پڑھائی میں ایسی چوک کر رہے ہیں جس کی تصحیح کرنے سے اُن کے استاد بھی قاصر ہیں۔

دیوی دیوتاؤں سے آباد سورگ کی نگری امراوتی جس طرح نندن ون کے طمطراق سے
آراستہ، بے شمار دیوسیناؤں[1] کی پوجا سے عبارت ہے ٹھیک اسی طرح وارانسی شہر بھی بہت سے خوش
سلیقہ لوگوں کی آماج گاہ ہے اور کائنات کے خالق کی بنائی ہوئی اس دنیا کے مرکز میں ایک اور
امراوتی ہی کی طرح براجمان ہے۔

اب دامودر گپتا مالتی کی بات بتاتے ہیں۔ ذرا غور سے سنیے گا، بھائیو، کہ اس رزمیے کو ہم
مدت ہوئی کھو چکے ہیں۔

— اسی شہر وارانسی میں ایک ناچنے والی رہتی تھی، جس کا نام مالتی تھا۔ کام دیو کی قابلِ
رشک جسمانی طاقت ہی کی طرح، طوائفوں کے بہناپے کی قابلِ رشک زیبائش کا نام تھی
مالتی۔ گروڑ کو دیکھ کر جس طرح بلوں میں بیٹھی ناگنیں غمگین ہو جاتی ہیں، ویسے ہی اُسے دیکھ کر
وارانسی کی کسبیاں بھی حسد سے جل اٹھتی تھیں۔ ہمالیہ کی بیٹی پاروتی نے جس طرح دیوتاؤں کے
دیوتا مہادیو کے دل کو اپنی کشش میں مبتلا کر دیا تھا، اسی طرح سے مالتی بھی دولت مندوں کے دل
کو متوجہ کر لیتی تھی۔ جس طرح سمندر منتھن[2] کے وقت مندراپربت شیش ناگ کی کنڈلی میں بندھ
گیا تھا، لوگوں کی آنکھیں بھی اسی طرح مالتی کو دیکھ کر اس سے بندھ جاتی تھیں۔ شِو کے ترشول کی
چوٹی پر براجمان اندھکاسُر کے بدن کی طرح ہی مالتی بھی تمام زنانِ شب میں سب سے اونچے
مقام پر تھی۔ وہ نرم گفتار، چنچل، معشوق صفت، کسی قدر بذلہ سنج اور گفتگو میں آزمودہ کار تھی۔ ایک

---
۱ دیوسینا: دیوتا کے سپاہی ۲ سمندر منتھن: ایک ہندو دیو مالائی قصہ جس میں امرت جل کے آغاز کا بتایا گیا ہے

دن چھت پر ٹہلتے ہوئے مالتی کو ایک گیت سنائی دیا:

دور پھینک دو، کامنی[1] تم

اپنا حسن اور جنوں خیز جوانی

اور سیکھو توجہ سے، بجائے اس کے

شہوت انگیز دلوں کو چرانے کا ہنر

گیت سن کر مالتی کو لگا، 'گانے والا، ایک دوست کی طرح مجھے نصیحت کر رہا ہے کہ عشق باز مرد دن رات جس کے گھر پڑے رہتے ہیں، مجھے اب لازماً سنسار کی اُس وکرالہ سے ہی مشورہ لینا ہوگا جو اس دنیا کے تمام پہلوؤں سے آشنا ہے۔'

آپ جانتے ہیں وکرالہ کون تھی، منٹو بھائی؟ وہ ایک بوڑھی ویشیا تھی۔ منھ کے دانت گر چکے تھے، جسم کی کھال لٹک گئی تھی، پستان سوکھ چکے تھے اور سر پر بس دو چار سفید بال رہ گئے تھے۔ پھر بھی ساری کسبیاں اُسے گھیرے رہتی تھیں۔ بھلا کیوں؟ یہ ہنر سیکھنے کے لیے کہ کسی دولت مند کا انتخاب کیسے کیا جائے، اور اس کا دل کیسے چرایا جائے۔ یہ سن کر مجھے لگا جیسے ساری زندہ ہوسناکیاں اور خواہشیں موت کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی ہوں۔ جیسے محض موت ہی انھیں سکھا سکتی ہے کہ زندگی سے لطف کیونکر حاصل کیا جائے۔ اسی لیے مالتی جیسی طوائف کو بھی وکرالہ کے پاس جانا پڑا۔

ایک جانب شہوانی خواہشات کی تسکین کے لیے کوٹھے، دوسری جانب موت کا منیکرنیکا گھاٹ، دونوں کو ایک ساتھ صرف کاشی ہی اوڑھ سکتی تھی۔ رشی نارد کا ایک غیر معمولی قصہ سنا میں نے۔ یہ صوفیانہ جاں کنی کی کہانی ہے، ایسی کہانی جس میں کتنی ہی زندگیاں جیسے خواب میں گزر گئی ہوں۔ جہاں ہوس اور خواہش اور موت سب باہم مل گئی ہوں۔ میرے بھائیو، جب تک میں آپ کو نارد کی کہانی نہ سناؤں، آپ صوفیانہ جاں کنی کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ ایک دن برہما نے نارد کو گنگا میں غوطہ لگانے کو کہا۔ نارد غوطہ لگا کر پانی سے اُبھرے تو جانتے ہیں انھوں نے کیا دیکھا؟ ایک حسین و جمیل دوشیزہ سے ان کا بیاہ ہو چکا تھا، بچے تھے، پوتا پوتی بھی تھے۔ پھر ایک دن، اس عورت کے باپ اور اس کے شوہر کے درمیان خونی جنگ چھڑ گئی، لڑائی میں دونوں کی موت ہوگئی، اس عورت کے متعدد بچے بھی اس جنگ میں مارے گئے۔ وہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ جل مرنے کے لیے اس کی چتا پر بیٹھ گئی۔ آگ بھڑک

[1] کامنی: محبت کے دام میں پھنسانے والی، حسین عورت

اٹھی، لیکن حیرت انگیز طور پر وہ آگ اندر سے ٹھنڈی تھی، جیسے وہ کسی ندی کے اندر کھڑی ہو۔ نارد نے دیکھا کہ ان کے غوطہ لگا کر ابھرنے کے بیچ ہی اتنا کچھ گزر گیا۔ یہ کاشی کا معجزہ ہے، منٹو بھائی۔ کیا آپ جانتے ہیں دیوتاؤں کے دیوتا، مہادیو نے اپنی رانی پاروتی سے کیا کہا تھا؟ پاروتی، جو مسرت مجھے کاشی میں رہ کر حاصل ہوئی ہے، وہ میں کسی یوگی کے دل میں بھی نہیں پاتا، یہاں تک کہ کیلاش یا مندار پربت پر بھی نہیں۔ پاروتی! اس دنیا میں بس دو ہی دائمی روپ ہیں جنھیں میں چاہتا ہوں، ایک تم، میری پاروتی، میری گوری، کہ جو تمام فنون کا علم جانتی ہو اور ایک یہ کاشی۔ کاشی کے علاوہ میرے لیے اور کوئی مقام نہیں۔ کاشی میں ہی سرخوشی ہے، کاشی میں ہی جلاوطنی۔ ہم ابد تک کاشی میں ہی رہیں گے۔

روشنیوں کے اس شہر سے جانے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں تو اپنی پنشن کی عرضی لے کر نکلا تھا، کلکتہ تو مجھے جانا ہی تھا، ورنہ گزارا کیسے ہوتا؟ شاہ جہان آباد کی حویلی میں کتنے ہی چہرے اپنی بقا کے لیے میری طرف دیکھ رہے تھے، اور پھر قرض خواہ بھی تو تھے۔ میں بہ آسانی کاشی میں قیام کر سکتا تھا لیکن پھر قرض خواہ میرے خاندان کو گلی میں لا بٹھاتے۔ ہو سکتا ہے میں نے امراؤ بیگم کو نہ چاہا ہو، لیکن میں ان کی آبرو کو خاک میں نہیں ملا سکتا تھا۔ ادھر کاشی کے کوٹھے کی حسینہ بھی مجھے جانے نہ دیتی تھی، بار بار یہی کہتی تھی، یہیں رہ جائیے، میاں، میں اپنی ساری زندگی بخوشی آپ کے ساتھ کاٹ لوں گی لیکن کاشی میں مجھے پیسے کون دیتا، منٹو بھائی؟ اور میں جانتا تھا کہ جب پیسے ختم ہو جاتے ہیں تو محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ عورت بھی جو میری محبت کا دم بھر رہی تھی، اگر میں قلاش ہو جاتا تو مجھے لات رسید کرنے سے دریغ نہ کرتی۔ اس لیے بس ایک انسان کی یادوں کو ساتھ لیے، میں نے کاشی کو الوداع کہا۔ آج تو سخت نیند آ رہی ہے، میرے بھائیو، اُس شخص کے بارے میں کسی اور وقت بتاؤں گا آپ کو۔ اور پھر سنت کبیر کی بات بھلا چند لفظوں میں کیسے کہی جا سکتی ہے؟ کاشی ہی کی طرح ان کی حیات بھی ابدی ہے ورنہ میں تو ان سے کبھی ملا نہیں۔

۲۲

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مرزا صاحب، آپ کلکتہ چل دیے اور مجھے بمبئی نے بلا لیا۔ بالکل بیکار بیٹھا ہوا تھا امرتسر میں۔ ابّا جان کی وفات کے بعد امّی کی دیکھ بھال کی ذمّے داری مجھ پر آ گئی تھی۔ لیکن آمدن کچھ نہیں تھی۔ بی بی جان کے جوڑے ہوئے پیسوں سے خرچہ چل رہا تھا۔ لیکن وہ بھی کتنے دن؟ اگر میں کام دھندا شروع نہ کرتا تو ہم ماں بیٹے کو فاقوں سے مرنا پڑتا۔ یکا یک قسمت ہم پر مہربان ہوئی۔ بمبئی سے مجھے نذیر لدھیانوی کا بلاوا آ گیا۔ فوراً بمبئی پہنچو اور مجھے ملو۔ میں نے جب بی بی جان کو بتایا تو وہ دھاروں دھار رونے لگیں۔ 'بیٹا، تم اکیلے بمبئی کیسے جاؤ گے؟ تم نے بمبئی دیکھا ہے؟ میں نے سُنا ہے بہت بڑا شہر ہے وہ۔ وہاں تمھاری دیکھ بھال کون کرے گا؟

ہاں، میری بڑی بہن اقبال بمبئی میں ماہم کے پاس رہتی ضرور تھی لیکن اس کا میاں مجھے بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا تھا۔

—میں امرتسر میں رہ کر کیا کروں گا، بی بی جان؟ یہاں مجھے کوئی کام نہ ملے گا۔ بمبئی میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اور جب نذیر صاحب نے خود بلایا ہے تو......

—بیٹا، تمھاری بہن سے سُنا ہے، اس شہر میں لوگوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ہوتا......

—تو اس میں بُرا کیا ہے؟ ایک بار کوشش کر کے دیکھ لینے دیجیے، بی بی جان۔

میں اس وقت چوبیس برس کا تھا۔ بی بی جان کو خدا کے سہارے پر چھوڑ کر میں نے بمبئی کی صدا پر لبیک کہا۔ اگر میں نے بمبئی نہ دیکھا ہوتا تو میں ان گوناگوں طریقوں کے بارے میں کبھی نہ جان پاتا جو جینے کے لیے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ اونچے اور نچلے طبقے کا جیسا فرق بمبئی میں ہے، اور کسی شہر میں نہیں۔ اونچے طبقے میں ہر وقت دولت اُڑائی جاتی ہے، وہاں روشنیاں ہیں، گلیمر ہے۔ نچلے طبقے میں بھوک ہے، تاریکی ہے، خون خرابہ ہے لیکن ان دونوں طبقوں کے درمیان کچھ خفیہ راستے بھی ہیں۔ سب کی سب نہایت غیر معمولی کہانیاں۔

نذیر لدھیانوی نے مجھے کام پر لگا دیا۔ میں ان کے ہفتہ وار رسالے 'مصوّر' کا مدیر بن گیا۔ تنخواہ تھی چالیس روپے ماہانہ۔ میں تو خوشی سے پاگل ہو گیا۔ یہ تو سالے چاند کو ہاتھوں میں تھام لینے جیسا تھا۔ میں نے دفتر ہی کے ایک کمرے میں اپنے رہنے کا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن اس میں سہولت نہیں تھی۔ چونکہ میں دفتر ہی میں رہتا تھا اس لیے نذیر صاحب نے سارا وقت مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ میں اس آدمی کو کیونکر سمجھاتا کہ میں اخبار کی غلامی کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ مجھے کچھ اپنا بھی پڑھنا لکھنا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں چاہتا تھا مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ رہنے کے لیے کوئی کرائے کی جگہ لینی چاہیے۔

میری ماہانہ آمدن چالیس روپے تھی۔ اتنے پیسوں میں آپ بمبئی میں معقول رہائش نہیں حاصل کر سکتے۔ میں نو روپے کرائے پر ایک کھولی میں اُٹھ آیا۔ اور وہ کھولی، اگر آپ اسے دیکھتے، تبھی جان سکتے، وہ انسانوں کے رہنے کی جگہ تھی یا چوہوں کے۔ ایک خستہ حال عمارت میں چالیس چھوٹے چھوٹے دڑبے جن میں سورج کی روشنی کا کہیں گزر نہیں تھا۔ ایک مستقل سیلن، آپ کو دن میں بھی بتّی جلانا پڑتی تھی۔ مچھر، چوہے، کھٹمل——جس کا نام لیجے، وہاں موجود تھا۔ بمبئی کی اس کھولی ہی میں میں نے پہلی بار دوزخ دیکھا، مرزا صاحب۔ حتیٰ کہ اگر آپ اس کھولی میں مر رہے ہیں تو بھی آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ نہ جانے کتنے مرد، عورتیں اور بچے ان چالیس کھولیوں میں محبوس تھے۔ اور سب کے ہگنے موتنے اور نہانے کے لیے ٹوٹے دروازوں والے صرف دو غسل خانے۔ کسی کے بیدار ہونے سے پہلے ہی میں اٹھ بیٹھتا اور نہا دھو کر نکل جاتا۔ دن بھر دفتر میں رہتا اور رات گئے لوٹتا۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور کھولی کی گرمی میں نُھنکتا سو جاتا۔

اب جبکہ میں آپ کو اس جھونپڑپٹی میں گزرے اپنے دنوں کے بارے میں بتا رہا ہوں تو پھر مجھے آپ کو ممد بھائی کی کہانی بھی ضرور سنانی چاہیے۔ میں بمبئی میں جتنے بھی عجیب وغریب لوگوں سے ملا، ممد بھائی ان سب میں منفرد تھا۔ میری کھولی عرب گلی میں تھی۔ مجھے وضاحت سے بتانا ہوگا۔ فارس روڈ اپنی رنڈیوں کے سبب مشہور تھا۔ فارس روڈ سے تھوڑا آگے مڑ کر سفید گلی آتی تھی۔ وہاں بہت سے ہوٹل اور ریستوران تھے۔ ہر طرف چکلے تھے، جہاں ہندوستان بھر سے ہر ذات اور ہر دھرم کی بیسوائیں دستیاب تھیں۔ سفید گلی سے آگے نکل کر ایک سینما ہال 'پلے ہاؤس' تھا، جہاں دن بھر فلموں کے شو چلتے رہتے تھے۔ باہر کھڑا ہوا آدمی مستقل چلا چلا کر لوگوں کو مدعو کیا کرتا تھا، 'آؤ، آؤ...... دو آنے میں...... فسٹ کلاس کھیل......' بعض اوقات وہ زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیا کرتا۔ وہاں ایک اور مزیدار چیز تھی — مالش والا۔ لوگ سڑک پر رُک کر دن یا رات کے کسی بھی پہر سر کی چمپی کرا سکتے تھے۔ بعضے تو مالش کا مزہ لیتے ہوئے آنکھیں موند کر گانے لگتے تھے۔ مجھے یہ سب دیکھ کر بہت لطف آتا تھا۔ عورتیں جنگلا لگے کمروں میں بیٹھ کر دھندا کرتی تھیں۔ اور ان کے دام؟ آٹھ آنے سے آٹھ روپے تک، یا آٹھ روپے سے آٹھ سو روپے تک۔ اس منڈی میں آ کر آپ دیکھ سُن کر، اپنی پسند کا تازہ گوشت خرید سکتے تھے۔

عرب گلی میں بیس پچیس عرب رہتے تھے، جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔ ممد بھائی اسی عرب گلی میں رہتا تھا۔ کوئی کسی کی خبر رکھے یا نہ رکھے، سنا تھا ممد بھائی ہر شخص کی خبر رکھتا تھا۔ چونکہ رام پور کا رہنے والا تھا اس لیے اوّل درجے کا بھکیت تھا اور چھری مار تھا۔ درجن، دو دو درجن لوگوں کو ایک ساتھ قابو کر لینا اس کے لیے روزمرہ کی بات تھی۔ میں نے اس کی بہادرانہ چھری بازی کے بہت قصّے سنے تھے۔ ایسی چھری مارتا تھا کہ جسے لگتی اسے پتا بھی نہ چلتا۔ لیکن ایک بات سب قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ ممد بھائی نے کسی بھی عورت پر کبھی بُری نظر نہ ڈالی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ وہ غریب اور نادار لڑکیوں کی مدد کیا کرتا ہے۔ اس کے شاگرد انھیں یومیہ کچھ رقم دے آیا کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی آمدنی کے ذرائع کیا تھے۔ لیکن میں نے سنا تھا کہ وہ اچھا کھاتا پیتا اور عمدہ پہنتا اوڑھتا ہے۔ وہ اپنے حواریوں کے ہمراہ ایک چھچھاتے ہوئے تانگے پر محلّے میں گھوما کرتا۔ لیکن اس کا زیادہ تر وقت

ایرانی کیفے میں گزرتا تھا۔ مجھے اس ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا لیکن چونکہ میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات گئے لوٹتا تھا، اس لیے اس کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ایک عجیب کہانی عاشق حسین سے سنی جو میری ساتھ والی کھولی میں رہتا تھا اور فلموں میں رقاص تھا۔

ایک دن باتوں باتوں میں عاشق حسین نے کہا، 'ممد بھائی کا جواب نہیں ہے، منٹو بھائی۔'

— وہ کیسے، اس نے کچھ کیا ہے، تمھارے لیے؟

— جب مجھے ہیضہ ہوا اور ممد بھائی کو پتا چلا تو وہ آ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا معلوم ہے؟ فارس روڈ کا ایک ایک ڈاکٹر میری کھولی میں حاضر تھا۔ ممد بھائی نے صرف اتنا کہا، 'دیکھو، اگر عاشق حسین کو کچھ ہوگیا تو میں تم سب کا صفایا کر دوں گا۔' سارے ڈاکٹر تھر تھر کانپنے لگے۔

— اچھا، پھر؟

— میں چند دنوں میں صحت یاب ہوگیا۔ وہ فرشتہ ہے، منٹو بھائی، فرشتے کے سوا اور کچھ نہیں۔

ممد بھائی کے بارے میں اور بھی بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ ممد بھائی اپنے نیفے میں ایک آب دار خنجر اُڑس کے رکھتا ہے، اور وہ اکثر ہنستے ہنستے، اس خنجر سے اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا کرتا ہے۔ ان سب باتوں نے اس آدمی کا ایک خاص تصوّر قائم کر دیا تھا، اونچا لمبا، قوی ہیکل انسان جس کی ایک نظر پڑے تو آپ کا خون سرد پڑ جائے۔ لیکن میں نے اسے ابھی تک دیکھا نہیں تھا۔ میں نے سوچا کسی دن کام پر نہ جاؤں اور ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں۔ لیکن رسالے کی نوکری کا بہت دباؤ تھا؛ جہاں مجھے مدیر سے لے کر چپراسی تک، سبھی کا کام کرنا پڑتا تھا۔

ایک دن مجھے تیز بخار نے آ لیا — بستر سے اٹھنے کی ہمت بھی نہ رہی۔ عاشق حسین اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ دو دن تک میں اکیلا کھولی میں پڑا رہا۔ بیچ بیچ میں ایرانی ہوٹل کا چھوکرا آ کر کھانا دے جایا کرتا تھا۔ بمبئی میں مجھے کون پوچھتا؟ حتیٰ کہ نذیر صاحب بھی نہیں جانتے تھے کہ میں کہاں رہ رہا ہوں۔ اگر میں مر جاتا تو کسی کو پتا تک نہ چلتا۔

تیسرے دن، میں نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرا ہوگا — آ جاؤ۔

دروازہ کھلا، باہر کوئی آدمی تھا۔ سب سے پہلی چیز جس پر میری نظر گئی وہ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، جسے وہ دونوں ہاتھوں سے تاؤ دے رہا تھا۔ مجھے لگا وہ بڑا معمولی سا آدمی ہے، اگر اس کی ایسی مونچھیں نہ ہوں تو شاید کوئی اس کی طرف دوسری نگاہ بھی نہ ڈالے۔ وہ چار پانچ لوگوں کے جلو میں کمرے داخل ہوا، پھر اس نے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا، 'دمّو صاحب......'

—دمّو نہیں، منٹو۔

—سالا ایک ہی بات ہے۔ دمّو صاحب یہ تو ٹھیک بات نہیں۔ تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی کہ تمھیں بخار ہو گیا ہے؟

—آپ کون ہیں؟

اس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، پھر بولا، 'ممد بھائی۔'

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ 'ممد بھائی، ممد بھائی...... مشہور دادا؟'

—ہاں، دمّو صاحب، میں ممد دادا ہوں۔ ہوٹل کے چھوکرے نے مجھے بتایا کہ تم بہت بیمار ہو۔ یہ تو سالا ٹھیک بات نہیں۔ تم نے مجھے اطلاع نہیں دی۔ ممد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔ اب اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ 'ارے سور— کیا نام ہے تیرا؟ اُس سالے ڈاکٹر کے پاس جا۔ اس سے کہہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے، ایک دم۔ اور دیکھ سالے سے کہنا، سب دوائیں لیتا آئے۔'

میں ممد بھائی کو دیکھ رہا تھا اور وہ تمام کہانیاں میرے دماغ میں دوڑ رہی تھیں جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سُن چکا تھا لیکن یہ وہ ممد بھائی نہیں تھا جس کا تصوّر میرے ذہن میں تھا۔ اس کی صرف مونچھیں دکھائی دیتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملائم اور نرم و نازک خدوخال والا شخص محض اپنی خوفناک مونچھوں کی وجہ سے محلّے کا دادا بن گیا ہے۔ میرے کمرے میں کوئی کرسی نہیں تھی، میں نے اسے کہا کہ وہ میرے بستر پر بیٹھ جائے۔

ممد بھائی نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اُڑا رہا ہو اور بولا، 'یہ سب سوچنے کی ضرورت نہیں، دمّو صاحب۔'

ممد بھائی میری حبس زدہ کھولی میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا، پھر کسی لمحے میں نے اس کا

مشہور زمانہ خنجر اس کے ہاتھ میں چمکتے دیکھا۔ وہ خنجر اپنی کلائی پر پھیرنے لگا اور اس کے بال جھڑ کر گرنے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھے لگا جیسے میرا بخار کئی درجے نیچے اُتر گیا ہے۔

'چھری بہت تیز ہے، ممد بھائی، کہیں آپ کو لگ نہ جائے۔'

— یہ چھری میرے دشمنوں کے لیے ہے، دمّو بھائی، مجھے نقصان کیوں پہنچائے گی؟ پھر گویا اُسے پچکارتے ہوئے کہا، کیا بیٹا کبھی باپ کو مار سکتا ہے؟

ڈاکٹر آ پہنچا، اور مزے کی بات ہوئی، مرزا صاحب کہ اس کا نام پنٹو تھا اور میں دمّو۔

'کیا ہوا ہے؟' ڈاکٹر پنٹو نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

—وہ سالا بھی میں بتاؤں گا؟ اگر تم نے دمّو صاحب کو ٹھیک نہیں کیا تو سالا قیمت تمھیں چکانی پڑے گی۔

میرا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد، ڈاکٹر پنٹو نے ممد بھائی کو بتایا، 'فکر کی کوئی بات نہیں، ممد بھائی، ملیریا ہے، میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔'

—میں کچھ نہیں جانتا، ڈاکٹر، اگر تم اسے انجکشن دینا چاہتے ہو تو دے دو سالا انجکشن، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو......

—یہ ٹھیک ہو جائے گا، ممد بھائی۔ میں اُسے انجکشن دیتا ہوں۔ ڈاکٹر نے اپنے بیگ سے ایک ٹیکا اور سرنج نکالی۔

—رُکو، ڈاکٹر! ممد بھائی نے چلّا کر کہا۔ ڈاکٹر نے دہشت زدہ ہو کر سرنج واپس بیگ میں رکھ دی۔

—میں سالا کسی کے سوئی لگتا نہیں دیکھ سکتا۔ ممد بھائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنٹو نے بڑی احتیاط کے ساتھ مجھے کونین کا انجکشن دیا۔ 'کتنے پیسے؟' میں نے اس سے پوچھا۔

—دس روپے۔

ابھی میں پیسے بٹوے نکال کر اُسے دے ہی رہا تھا کہ ممد بھائی دوبارہ اندر آ گیا۔ 'سالا یہ

سب کیا ہو رہا ہے؟'

ڈاکٹر پنٹو نے کپکپاتی آواز میں کہا: 'خدا قسم ممد بھائی، میں نے کچھ نہیں مانگا۔'

—سالا، روپیہ چاہیے تو مجھ سے مانگو، وسٹو صاحب کا روپیہ فوراً واپس کرو۔ پھر وہ میری طرف مڑا، میرے علاقے کا ڈاکٹر تم سے پیسے کیسے لے سکتا ہے، وسٹو صاحب؟ سالا، یہ کبھی ہو سکتا ہے؟ میں اپنی سالی مونچھیں منڈوا دیتا۔ یاد رکھو وسٹو صاحب، میرے علاقے میں سب تمھارے غلام ہیں۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا: 'تم مجھے جانتے ہو، ممد بھائی؟'

—اور کیا نہیں جانتا؟ یہاں ایسا کون ہے جسے سالا ممد بھائی نہیں جانتا؟ ممد بھائی یہاں کا بادشاہ ہے، پیارے، اس کے پاس سب کا حساب کتاب ہے۔ کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت میں ہے، کون بُری حالت میں ہے...... تمھارے متعلق ہم سب جانتے ہیں۔

— کیا جانتے ہیں آپ؟

— سالا، ہم کیا نہیں جانتے؟ تم امرتسر کا رہنے والا ہے...... کشمیری ہے...... ہے نا؟ یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے...... تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اس لیے تم ادھر سے نہیں گزرتے۔ ہے نا؟ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمھاری جان کو روتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔

میں نے منہ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا میں زمین میں دھنستا جا رہا ہوں۔ کیا اس آدمی کی ہر طرف نظر تھی؟

—وسٹو بھائی، کچھ فکر نہ کرو۔ تمھارے سب قرض چکا دیے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ شرمندہ کیوں ہو رہے ہو، وسٹو صاحب؟ اس لمبی زندگی میں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار اگر وسٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا، اور ممد بھائی سالا تم کو زبان دیتا ہے کہ کوئی تم کو تنگ نہیں کرے گا۔

معلوم نہیں ممد بھائی سُن پایا کہ نہیں، لیکن میں نے بدبدا کر کہا: 'خدا تمھیں خوش رکھے۔' ممد بھائی نے اپنی مونچھوں کو مروڑا اور ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا۔

پندرہ روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ ممد بھائی کے ساتھ میری اچھی دوستی جم گئی۔ اکثر وہ میری بات چپ چاپ سُن لیتا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی پانچ برس بڑا ہوگا۔ بس اس کی مونچھیں تھیں جو میری عمر سے بھی لمبی تھیں۔ بعد میں سنا کہ ممد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو مکھن لگاتا ہے۔ میں سوچا کرتا کہ اصلی ممد بھائی کون ہے؟ —اس کی مونچھیں یا اس کا آبدار خنجر۔

ایک بار عرب گلی میں چینی ریستوران کے آگے ہماری ملاقات ہو گئی۔ باتوں کے دوران میں نے اس سے پوچھا: 'ممد بھائی، آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے، تم یہ خنجر کیوں لیے پھرتے ہو؟'

ممد بھائی نے اپنی مونچھوں پر انگلی پھیری اور بولا: 'سالا بندوق جیسی بکواس چیز کوئی نہیں ہے، وسٹو صاحب۔ اسے تو کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔ گھوڑا دبایا اور ٹھاہ۔ لیکن یہ خنجر...... خدا کی قسم۔ خنجر چلانا دوسری بات ہے۔ اس دن تم نے کیا کہا تھا؟ ہاں، آرٹ...... سنو، وسٹو بھائی، خنجر چلانے میں آرٹ ہوتا ہے۔ اور پستول کیا ہے؟ سالا کھلونا ہے۔' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ 'دیکھو اس کو، ذرا دیکھو اس کو، اس کی تیز دھار دیکھو۔ جب اس کو چلاؤ گے تو کوئی آواز نہیں آئے گی۔ کسی کے پیٹ میں گھسا کر ایک بار گھما دو، سب ختم۔ بندوق پستول سب بکواس ہے۔'

میں جتنا ممد بھائی سے ملتا تھا اُتنا ہی حیران ہوتا تھا کہ آخر کیوں ہر کوئی اس سے اتنا ڈرتا ہے۔ سوائے بڑی بڑی مونچھوں کے اس آدمی میں ڈرانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ ڈر ہمارے باہر سے نہیں آتا، مرزا صاحب، یہ دراصل ہمارے دلوں کی تاریکی میں گھات لگا کر بیٹھا ہوتا ہے۔

ایک دن دفتر جاتے ہوئے، میں نے چینی ریستوران کے باہر کسی سے سُنا کہ ممد بھائی کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ پولیس کے ساتھ تو بھائی کی اچھی بنی ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ...... عرب گلی میں شیریں بائی نامی ایک ویشیا رہتی تھی۔ اس کی ایک جوان بیٹی تھی۔ بھائی کی گرفتاری سے ایک روز پہلے شیریں بائی ممد بھائی کے پیروں میں آ کر گر گئی۔ کسی نے اس کی بیٹی کی عصمت دری کر دی تھی۔

— تم اس علاقے کے دادا ہو، بھائی، اور میری بیٹی سے فلاں آدمی نے بُرا کیا ہے! کیا تم بدلہ نہ لو گے؟

بھائی نے پہلے تو شیریں بائی کو بہت گالیاں دیں، پھر سنگ دلی سے بولا: 'کیا چاہتی ہے،

مادر چود کا پیٹ پھاڑ دوں؟ جا اپنے کوٹھے پر جا، کنیا، میں دیکھ لوں گا۔'

آدھے گھنٹے کے اندر اندر کام ہوگیا۔ اس آدمی کا خون ہوگیا۔ لیکن پولیس نے مند بھائی کو کیسے پکڑ لیا؟ بھائی ایسے کاموں کا کوئی ثبوت پیچھے نہیں چھوڑتا تھا۔ اور اگر کسی نے دیکھا بھی ہوتا، تو وہ اس کے خلاف کچھ نہ بولتا۔ دو دن جیل میں رہنے کے بعد، مند بھائی کو ضمانت پر رہائی مل گئی، لیکن جیل سے آنے کے بعد وہ جیسے کوئی دوسرا ہی آدمی تھا۔ میں جب اسے چینی ریستوران میں ملا، وہ مجھے جیسے ہارا ہوا معلوم ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، اس نے کہا، 'منٹو صاحب، سالے نے مرنے میں اتنا وقت لیا، ساری میری غلطی تھی، ٹھیک سے چھرا گھونپ نہیں پایا۔' ذرا سوچیے، برادران، کتنی حیران کی بات تھی یہ۔ ایک انسان کا خون کرنے کا اسے ذرا بھی دکھ نہیں تھا، صرف اس بات کا افسوس تھا کہ وہ چھرا ٹھیک نہیں چلا پایا۔

عدالت میں پیشی کا دن جتنا پاس آتا جا رہا تھا مند بھائی اتنا ہی گھبراتا جا رہا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ اسے کچھ علم نہیں ہے کہ عدالت کیا ہوتی ہے، اور اسی لیے وہ اتنا ڈر رہا تھا۔ عدالت میں پیشی تو دور کی بات ہے، بھائی تو کبھی حراست میں بھی نہ رہا تھا۔ ایک دن اس نے میرا بازو کس کے پکڑا اور کہنے لگا، 'منٹو صاحب، کورٹ جانے سے اچھا ہے، میں سالا مر ہی جاؤں۔ میں نے یہ کورٹ ووُرٹ کبھی نہیں دیکھی۔'

عرب گلی والے اس کے ساتھیوں نے اس کو ڈھارس دی کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی شہادت موجود نہیں۔ کوئی اس کے خلاف گواہی دینے والا بھی نہیں لیکن ہاں، اس کی بڑی بڑی مونچھیں ضرور مجسٹریٹ پر بُرا تاثر قائم کرسکتی ہیں۔ اس طرح کی مونچھوں والا آدمی ضرور مجرم معلوم ہوگا۔

ایک دن جب ہم ایرانی کیفے میں بیٹھے تھے، مند بھائی نے اپنا خنجر نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ 'یہ کیا کیا، مند بھائی؟' میں نے حیرت سے کہا۔

—منٹو صاحب، سب میرے ساتھ دغا کر رہے ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں کہ مجسٹریٹ سالا میری مونچھیں دیکھتے ہی مجھے جیل میں بند کردے گا۔ میں کیا کروں۔ بتاؤ؟

طویل بات چیت کے بعد میں نے کہا، 'تمھارے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، لیکن جب مجسٹریٹ تمھاری مونچھیں دیکھے گا تو وہ سوچ سکتا ہے کہ......

—تو کیا اُڑا دوں؟' مند بھائی نے اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے، بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔

—اگر تم ٹھیک سمجھو۔

—میرے سمجھے سے کچھ نہیں ہوتا، سالا مجسٹریٹ کیا سمجھتا ہے یہ اہم ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟

اگلے دن میں نے مند بھائی کو دیکھا۔ منڈی ہوئی مونچھوں کے ساتھ وہ اور بھی بے یار و مددگار معلوم ہو رہا تھا۔

کورٹ نے مند بھائی کو خطرناک غنڈہ قرار دے دیا۔ اور اسے بمبئی بدری کا حکم دے دیا۔ بس ایک دن ملا تھا۔ ہم سب عدالت میں موجود تھے۔ مند بھائی خاموشی کے ساتھ فیصلہ سُن کر عدالت سے باہر آ گیا۔ اس کا ہاتھ بار بار بے اختیار ناک کے نیچے پہنچ جاتا تھا۔

شام کے وقت مند بھائی اپنے بیس پچیس ساتھیوں سمیت ایرانی ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں کہیں دور، اس کیفے اور اس علاقے سے پار کہیں معلق تھیں۔ 'کیا بات ہے مند بھائی؟'

مند بھائی پھٹ پڑا— جس سالے مند بھائی کو تم جانتے تھے، وہ مر چکا ہے۔

—اتنا کیوں اُلجھ رہے ہو۔ تم زندہ تو رہو گے آخر۔ بمبئی میں نہ سہی کسی اور جگہ سہی۔

—سنو، منٹو صاحب، اپن کو یہ غم نہیں کہ زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔ اپن بھی سالا کتنا بے وقوف تھا، تم لوگوں کی بات مان کر اپنی مونچھ کٹوا ڈالا۔ سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا۔ اس سے تو اچھا تھا وہ مجھے پھانسی دے دیتے۔

میں نے مند بھائی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے اکثر سوچا اسے اپنی مونچھوں سے اتنا لگاؤ کیوں تھا؟ کیا وہ مونچھیں ہی اصلی مند بھائی تھیں؟ میں اب تک نہیں جان پایا۔ کچھ دنوں بعد امرتسر سے مجھے بی بی جان کا خط موصول ہوا۔ وہ بمبئی آنا چاہتی تھیں۔ وہ مجھے بہت یاد کر رہی تھیں۔ میں نے جواباً لکھا، 'بمبئی آ جایئے، بی بی جان۔ میں بھی یہاں بہت اکیلا ہوں، اتنا اکیلا رہنا میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔

۲۳

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے،گردلِ بے مدعا ہوتے

کبھی کبھی میں آدھی رات کے وقت منیکرنیکا گھاٹ پر چلا جاتا اور اس کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا۔ کاشی چھوڑ کر جانے کی میری بالکل خواہش نہ تھی۔ گنگا کی ٹھنڈی ہوائیں میرے اندر کی ساری بے اطمینانی اور جنون کو پُرسکون کردیتی تھیں۔ مجھے لگا کلکتہ جاکر کیا ہوگا۔ کیوں میں تھوڑی سی رقم کی خاطر،اس طویل سفر میں خود کو مارے ڈال رہا ہوں۔ منیکرنیکا کی چتاؤں کی آگ نے میری ساری نفسانی خواہشوں اور آرزوؤں کو خاکستر کرڈالا تھا،اور اِس راکھ پر جانے کون لوگ اُوپر سے مخفی طور پر گنگا کا پوتر جل چھڑک رہے تھے۔ حتیٰ کہ میں سوچتا تھا کہ اسلام کا خول اُتار پھینکوں اور ماتھے پر تلک لگاکر، ہاتھ میں جپ مالا لے کر گنگا کے کنارے بیٹھا زندگی گزاردوں،جس سے میرا وجود بالکل مٹ جائے،جس سے میں ایک بوند کی مانند گنگا دیوی کی بہتی دھاروں میں کھو جاؤں۔ کیا آپ ہنس رہے ہیں،منٹو بھائی؟ آپ کو ہنسنا ہی چاہیے کہ ہوس رانی اور خواہشِ نفسانی میں ڈوبا رہنے والا مرزا غالب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یقین مانیے منیکرنیکا کے گھاٹ پر بیٹھے ہوئے ذہن کسی کورے کاغذ کی طرح ہوجاتا تھا،جیسے میرا کوئی ماضی نہ ہو،جیسے ایک حیاتِ نو آغاز ہوا چاہتی ہو۔ لیکن مردود شاہ جہان آباد مجھے کیونکر جانے دیتا؟ میں نے اس کا نمک کھایا تھا؛ مجھے اس کا حساب تو دینا ہی تھا۔ کاشی جیسا روشنیوں کا شہر مجھ ایسے ریاکار کے لیے تھوڑا ہی تھا۔ جس روز میں نے کاشی چھوڑا اس شام میں منیکرنیکا گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ اس

رات میں کوٹھے پر بھی نہیں گیا؛ میں جانتا تھا کہ اگر میں وہاں گیا تو معشوقوں میں پھنس جاؤں گا،پھر وہاں رُکنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا،لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں،برادران، میرے لیے اور تاخیر ممکن نہیں تھی،جتنی جلدی ممکن ہو مجھے کلکتہ پہنچنا تھا۔ میں جانتا تھا وہ میرا انتظار کررہی ہوگی، ساری رات میرے لیے جاگتی رہی ہوگی؛ میرے کاشی سے چلے جانے کے بعد شاید اس کی تقدیر بھی منیرہ بائی کی تقدیر کی طرح اس کا انتظار کرتی رہی۔ کون جانے کہ اس کا کیا بنا۔ شاید وہ مجھے بھول گئی ہو۔ اور یہی میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھول جائے۔ میں نے گنگا دیوی سے دعا کی،کاش تمھاری موجیں میری یادوں کو بھی بہالے جائیں۔ لیکن مزے کی بات تو یہ تھی کہ خود میں اسے بھول نہیں پارہا تھا؛ اس کے بدن کی یاد نے مجھے گرفت میں لے رکھا تھا،کاشی کی گلی گلی سے اس کی آواز بہتی ہوئی مجھ تک آتی تھی اور مجھے رابعہ بلخی کا خیال آیا۔ میں منیکرنیکا گھاٹ کی سیڑھیوں پر تازہ خون کا بہتا ہوا دریا دیکھ سکتا تھا۔

آپ رابعہ کے بارے میں جانتے ہیں،منٹو بھائی؟ غالباً نہیں جانتے۔ ملاؤں نے رابعہ کی زندگی مٹا ڈالی۔ وہ اسلامی دنیا کی پہلی خاتون شاعرہ تھی جس نے خودکشی کی۔ رابعہ کی زندگی کی زمین پر شاعری،محبت اور موت کا پیچیدہ نقشہ کھنچا ہوا تھا۔ وہ بلخ کی شہزادی تھی۔ لیکن اس دنیا میں کسی بددعا کے ساتھ پیدا ہوئی تھی، جہاں میں اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ رابعہ کو بچپن سے شاعری سے رغبت تھی۔ شاعرہ کے طور پر اسے کچھ شہرت بھی ملی۔ لیکن قسمت کچھ الگ ہی لکھ کر اس کی منتظر تھی اور ایک دن اس کی ملاقات بکتاش کے ساتھ ہوئی۔ وہ ایک عام سا نوجوان تھا اور رابعہ کے بھائی حارث کا غلام تھا۔ شعلۂ عشق پہلی ہی نظر میں بھڑک اٹھا۔ وہ چھپ چھپ کر ملنے لگی۔ نظمیں لکھی جانے لگیں۔ بکتاش......بکتاش......رابعہ کی شاعری میں صرف بکتاش کے جلوؤں ہی کی باتیں ہوتی تھیں، جیسے میرا کے گیتوں میں ان کے نیلامبر شیام، ان کے محبوب گرگووردھن کی لیلا ہوتی ہے۔

ایک دن حارث کو رابعہ کی خفیہ ملاقاتوں کا علم ہوگیا۔ بکتاش کو دارالخلافے سے نکال دیا گیا، اور کچھ دن بعد سنا گیا کہ اس کا قتل ہوگیا۔ خبر رابعہ تک بھی پہنچ گئی۔ شام ڈھل رہی تھی،منٹو بھائی، رابعہ نے کھڑکی میں کھڑے دیکھا کہ کالے آسمان کا سینہ چیرتے ہوئے سارسوں کا ایک

گھمنڈ اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ پھر وہ غسل خانے میں گئی اور اپنے بالوں کے کانٹے سے اس نے اپنی نس کاٹ لی۔ وہ بے سدھ بیٹھی بہتے ہوئے خون کو دیکھتی رہی۔ پھر اسی خون سے اس نے دیوار پر اپنی آخری نظم لکھی—زہر کا گھونٹ بھرو، رابعہ، اگر بھر سکو، لیکن اس کا ذائقہ تمھاری زبان پر شیریں رہے۔ میں اس رات بہت بے قرار تھا، منٹو بھائی، اگر کہیں رابعہ ہی کی طرح میری محبوبہ بھی......لیکن کیوں......میری دنیا میں تو کوئی کسی سے پیار نہیں کرتا؛ تو پھر ایک ویشیا جس کے ساتھ میری دو دن کی ملاقات ہے، کیونکر مجھے چاہے گی؟ محبت کی خاطر اپنے ہی لہو کا ذائقہ کتنے لوگ چکھ پاتے ہیں، منٹو بھائی؟ میں منیکرنیکا گھاٹ پر بیٹھا یہی سب سوچ رہا تھا کہ میں نے سنا، کوئی گا رہا تھا:

کون مُرلی شبد سُن آنند بھیو
جوت برھے بن باتی
بنا مول کے کمل پرگٹ بھیو
پھلوا پھلت بھانت بھانتی
جیسے چکور چندرما چتوئے
جیسے چاترک سواتی
جیسے سنت سُرت کے ہوکے
ہوگئے جنم سنگھاتی

یہ کیسی مُرلی بج رہی ہے جسے سُن کر سرشار ہو گیا ہوں۔ بتی نہیں ہے لیکن چراغ جل رہا ہے، جڑ نہیں ہے لیکن کنول کھل رہا ہے، رنگ برنگے پھول ہنس رہے ہیں۔ جیسے چکور لگاتار چاند کو تکتا رہتا ہے اور چاتک (پپیہا) سواتی کی ایک بوند کی امید لگائے رہتا ہے اسی طرح اس کے پریم (سُرت) میں میرا سنتوں سے عمر بھر کا ساتھ ہے۔[1]

کچھ دور ایک سایہ سا بیٹھا نظر آیا۔ میں سمجھ گیا وہی گا رہا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے اس نے پھر شروع کیا:

چرکھا چلے سُرت برہن کا

[1] ترجمہ: سردار جعفری

کایا نگری بنی اَتی سُندر
محل بنا چیتن کا
سُرت باوری ہوت مگن میں
پیڑھا گیان رتن کا
مہین سوت برہن کاتے
مانجھا پریم بھگت کا
کہے کبیر سنو بھئی سادھو
مالا گونتھو دن رین کا
پیا مورا ایہیں پگ رکھے ہیں
آنسو بھینٹ دیہوں نین کا

پریم کی ماری برہن (جو اپنے پریتم سے جدا ہو گئی ہے) چرخہ چلا رہی ہے۔ جسم کا شہر اپنے سارے جلال و جمال کے ساتھ اُبھر رہا ہے اور اس کے اندر دل کا محل تعمیر ہو رہا ہے۔ آسمان پر پیار کے پھیرے پڑ رہے ہیں اور عرفان کے جواہرات کا بنا ہوا تخت بچھا ہے۔ برہن سوت کو مہین کات رہی ہے اور اس سے پریم اور بھگتی کا عروسی جوڑا تیار ہو رہا ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ میں دن اور رات کی مالا گوندھ رہا ہوں۔ جب میرے پریتم آئیں گے اور (میرے گھر میں) اپنے قدم رکھیں گے تو میں اپنی آنکھوں کے آنسو نذر کروں گا۔[1]

گیت سنتے سنتے میں اس کے پاس چلا آیا اور اس کے پیروں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک دُبلا پتلا آدمی تھا جس کے بدن پر سوائے لنگوٹ اور گلے میں تلسی مالا کے اور کچھ نہیں تھا۔ یقین مانیے، منٹو بھائی، وہ گیت نہیں تھا بلکہ جیسے برسوں کی دبی ہوئی سسکیاں تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ جیسے جیسے وہ گاتا تھا، ویسے ویسے ہی وہ روتا جاتا تھا اور ویسے ویسے ہی اس کا چہرہ چمکتا جاتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے اور اس کا گیت سنتے ہوئے، میں اندرونی طور پر گویا پُرسکون ہو گیا۔ پھر میں بھی اس کے ساتھ گانے لگا، 'چرخہ چلے صورت برہن کا۔' اس نے

[1] ترجمہ: سردار جعفری

آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور ہنس کر کہا: کیا مزے کی بات ہے، مرزا صاحب، پریم برہن کا چرخہ چلا ہے تو چلتا ہی جا رہا ہے۔'

— گرو جی......

— گرو کہاں، میاں، میں تو محض کبیر داس ہوں۔ آپ جس گرو کے داس ہیں میں بھی اسی گرو کا داس ہوں۔

— کون ہے وہ گرو؟

— میاں، مادّی خواہشات کے ساتھ دل کا پنچھی اِدھر اُدھر اُڑتا رہتا ہے۔ گرو خود کو تب تک ظاہر نہیں کرتا، جب تک کہ عقاب اس پنچھی پر جھپٹ نہیں پڑتا اور اسے اٹھا نہیں لے جاتا۔ تو میاں، کل آپ کاشی چھوڑ کر روانہ ہو جائیں گے، ہے نا؟

— آپ جانتے ہیں؟

— کبیر جی مسکرائے — میں آپ کو روز دیکھتا ہوں، گلیوں میں پھرتے۔ میں روز آپ کو کچھ مزید دیکھتا ہوں، اور تھوڑا تھوڑا آپ کے اندر اترتا جاتا ہوں۔ کسی کو اسی طرح تو جانا جاتا ہے، ہے نا؟

— میرے اندر اترتے جاتے ہیں؟ وہ کس طرح؟

— غلط کہہ گیا، مرزا صاحب، آپ کے اندر اترنے کی طاقت مجھ میں کہاں۔ یہ جو روشنی کے نشان دیکھ رہے ہیں نا آپ — کبیر داس نے انگلی سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا — نور کے انھی دونوں نشانوں سے چیزیں میرے اندر اُترتی جاتی ہیں۔ اسی کے تعلق سے ایک بار بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا، مرزا صاحب۔ یہیں کاشی میں شیخ تقی نام کے ایک پیر ہُوا کرتے تھے۔ انھوں نے سکندر لودھی کے پاس جا کر میری شکایت کی کہ میں لوگوں کو کہتا ہوں کہ میں نے خدا دیکھا ہے۔ کیا یہ مسخرا پن نہیں ہے۔ بتایئے؟ مجھ جیسے معمولی داس کو خدا اپنا درشن کیوں دے گا؟ کوئی بات نہیں۔ بادشاہ نے مجھے قید کرنے کے لیے پروانہ بھیج دیا، دربار میں لے جانے کے لیے میرے گھر لوگ آئے۔ میں نے ان سے پوچھا، بادشاہ کے اتنے بڑے دربار میں مجھ ایسے معمولی آدمی کو کیوں بلایا گیا ہے؟

— تمھارے مقدمے کی سماعت کی جائے گی۔

— جہاں پناہ کا کام فیصلہ صادر کرنا ہے۔ جو انھیں مناسب لگتا ہے وہ فیصلہ کریں۔ میں ہر سزا کو سر جھکا کر ماننے کو تیار ہوں، مگر میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟

— کیا تمھیں یاد نہیں کہ تم جہاں پناہ کی سلطنت میں رہتے ہو؟

— میں تو رام رحیم کی رعایا ہوں۔ میں تو انھی کے راج میں رہتا ہوں۔ تمھارے جہاں پناہ کی لا انتہا سلطنت میں رہنے کی طاقت مجھ میں کہاں؟

— تو پھر تمھیں باندھ کر لے جانا ہوگا۔

— یہی کرنا بہتر ہوگا۔ تمھیں اپنا پورا زور دکھانا چاہیے۔ لیکن پہلے میں ذرا نہا لوں۔

— کیوں؟

— اس گندی حالت میں بھلا میں جہاں پناہ کے دربار میں کیونکر حاضر ہو سکتا ہوں؟ میں نے گنگا میّا کے سینے میں پناہ لے لی جبکہ سپاہیوں کی ٹولی گھاٹ پر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ پانی میں ڈوبے، تیرتے صبح سے شام ہوگئی۔ ادھر سپاہی چلاتے رہے، مجھے گالیاں دیتے رہے لیکن یار لوگ پانی میں نہیں اُترے۔ جہاں پناہ کی دی ہوئی وردی جو بھیگ جاتی۔

تب لگ بھگ شام ڈھل چکی تھی جب مجھے رسّیوں سے باندھ کر شاہی دربار میں لایا گیا۔ میں چپ چاپ جہاں پناہ کے سامنے کھڑا رہا۔ سپاہیوں سے سارا ماجرا سُن کر جہاں پناہ نے کہا: 'تمھیں صبح لینے بھیجا تھا، اور تم شام کو حاضر ہوئے ہو۔ نہانے میں تمھیں اتنا وقت لگتا ہے؟'

— نہیں، جہاں پناہ۔ میں تو کئی کئی دن نہیں نہاتا۔

— تو پھر؟

— آج نہاتے ہوئے جو منظر میں نے دیکھا، اسے دیکھنے کے بعد میں پانی سے باہر آ ہی نہیں پا رہا تھا۔

— کیا دیکھا تم نے کہ ہزاروں مگرمچھ تمھاری طرف دوڑتے چلے آ رہے ہیں؟

دربار قہقہوں سے گونج اٹھا۔

— بڑا ہی دلچسپ نظارہ تھا، جہاں پناہ۔ آپ نے سوئی کا ناکہ دیکھا ہے نا؟

—سوئی؟ وہ کیا ہوتی ہے؟

— گستاخی معاف کیجیے گا۔ بھلا ایک شہنشاہ نے سوئی کیوں دیکھی ہوگی۔ اب میں کیسے سمجھاؤں۔

—'سوئی حاضر کی جائے۔' سکندر لودھی دھاڑا۔ ایسی کیا چیز ہے یہ کہ جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ 'ہنس کیوں رہا ہے، کافر؟' شہنشاہ اور زور سے دھاڑا۔ 'ہنسنے کی کیا بات ہے؟'

سمجھے مرزا، جو لوگ ہنسی سے بھی مشتعل ہو جائیں ان کے مصائب کی کوئی حد نہیں۔

میں جہاں پناہ کی طرف دیکھتے ہوئے گویا اپنے آپ کو یہ نظم سنانے لگا:

اس گھر کا ہوگا پہری کون
پھیلا ہے اتنا مانس
جس کی کرتا شکن پہریداری
چوہے کی ناؤ، بلی کھیوے
مینڈک سوئے، سانپ پہرے پہ
بیل بیائیں، بانجھ ہوئی گائیں
ہر سانجھ تبھی بچھڑوں کو دودھ پیائیں
سیار ہرون سنگھ سے جوجھے
کبیری ورل بانی کسو نہ سوجھے

دربار میں سوئی لے آئی گئی۔ بادشاہ نے بغور اس کا معائنہ کیا، اس کے ناکے سے جھانکا۔ پھر وہ میری طرف پلٹا: 'کیا کہہ رہے تھے تم سوئی کے بارے میں؟'

— کیا آپ نے سوئی کے ناکے میں سے کچھ دیکھا، جہاں پناہ؟

— نہیں۔ سوئی کے ناکے میں سے کچھ دیکھنا ناممکن ہے۔

— تو پھر میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے کیا دیکھا — اونٹوں کی ایک قطار سوئی کے ناکے میں سے بھی تنگ ایک گلی سے چلی جا رہی تھی۔

— بند کرو یہ بکواس، جھوٹے کہیں کے۔

— میں جھوٹ نہیں بول رہا حضور۔ آپ تو جانتے ہیں جنت اس دنیا سے کتنی دور ہے جہاں پناہ۔ سورج اور چاند کے درمیان جو فاصلہ ہے اس میں سے کروڑوں ہاتھی اور اونٹ گزر سکتے ہیں۔ ہم آنکھ کی پتلی کے نقطے سے انھیں دیکھ سکتے ہیں، اور جہاں پناہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ آنکھ کی پتلی کا وہ نقطہ سوئی کے ناکے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔

جہاں پناہ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر مجھے آزاد کر دیا۔ آپ بہت کچھ چھپا سکتے ہیں، مرزا صاحب، لیکن جو آنکھیں کہتی ہیں اسے نہیں چھپا سکتے۔ خوشی اور غم میں ہمارے دل ہمیشہ آنکھوں کے ذریعے بات کرتے ہیں۔ وہ ایک حیرت انگیز تالاب بنا لیتی ہیں۔ میں ان کی گہرائی میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں آپ کو روز دیکھتا ہوں، مرزا صاحب، اور سوچتا ہوں، رام رحیم کے پاؤں چھونے کے باوجود آپ کو کس قدر غلامی کرنی پڑ رہی ہے۔ آپ زندگی میں کہیں بھی جم کر نہیں بیٹھ پا رہے۔

مجھے اس پر ہنسی آ گئی۔ کبیر جی سے میں نے کہا: 'دنیا میں اگر کوئی سب سے بڑا کافر ہے تو وہ میں ہوں۔ میں رام رحیم کے پاؤں چھونے کے لائق نہیں ہوں۔'

— آپ لفظوں کی عبادت کرتے ہیں، مرزا صاحب، اور وہ لفظوں سے بجتے ہیں۔ کیا وہ آپ کو مکمل طور پر خود سے دور رکھ سکتے ہیں؟

— لیکن آپ کی جیسی حصولِ مقصد کی لگن تو میری زندگی میں نہیں ہے۔

— حصولِ مقصد کی لگن کیا اتنی سہل ہے، میاں؟ مجھ میں اس کی قابلیت نہیں۔ یہ جس پوشاک کو مالکِ حقیقی نے دس مہینوں میں بُنا ہے، میں تو محض اس کی دیکھ ریکھ کرتا ہوں کہ کہیں یہ میلی نہ ہو جائے۔ یہ پوشاک ایک دن اس کے حقیقی مالک کو لوٹانی ہوگی۔ کیا کوئی میلی پوشاک لوٹاتا ہے؟

— میں اسے میلی پوشاک کے سوا اور کچھ نہیں لوٹا سکتا، کبیر جی۔

— یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ ایسا نہیں کر سکتے، مرزا صاحب۔ جب وقت آئے گا وہ آپ سے خود ہی اس پوشاک کو صاف کروا لے گا۔ چلیے میں آپ کو کبیر داس کا گیت سناتا ہوں:

صاحب ہے رنگریز چنر میری رنگ ڈاری
سیاہی رنگ چھڑائیکے رنگ دیو مجیٹھا رنگ

دھوئے سے چھوٹے نہیں رے دن دن ہوت سو رنگ
بھاؤ کے کنڈ نیہہ کے جل میں پریم رنگ دئی بور
دکھ دئی میل چھٹائے دے رے خوب رنگی جھک جھور
صاحب نے چنری رنگی رے پیتم چتر سجان
سب کچھ ان پر واروں رے تن من دھن اور پران
کہیں کبیر رنگریز پیارے مجھ پر ہوئے دیال
شیتل چنری اوڑھ کے رے بھئی ہوں مگن نہال

میاں، دنیا کے اس تالاب میں محبت کے پانی سے پیار کے رنگ میں وہی آپ کی پوشاک رنگ دے گا۔ اسی نے یہ دی ہے اور وہی اسے واپس لے لے گا، لیکن تب تک نہیں جب تک وہ اسے جذبات اور احساسات اور خوبصورتیوں سے رنگ نہیں دیتا۔ تمھاری کیا مجال کہ تم اس کے ہاتھوں میں میلی پوشاک تھماؤ۔ اب گھر لوٹ جایئے، میاں۔ سویرا ہونے والا ہے، اور آپ کو تو آگے سفر بھی جاری رکھنا ہے۔

— کیا آپ گھر نہ جائیں گے؟

— جب تک گنگامیا کو بھیروی نہ سنالوں، تب تک نہیں۔

— میں کہیں نہیں جانا چاہتا، کبیر جی، میں یہیں کاشی میں رہوں گا۔ مجھے یہ بھاگ دوڑ پسند نہیں ہے۔

کبیر جی، سر ہلانے لگے۔ ’نہیں، نہیں میاں۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ جیون نے جو راہ آپ کے آگے کھولی ہے، اس پر تو آپ کو چلنا ہی ہوگا۔ پھر چاہے اس راہ میں کتنی ہی مشکلیں آئیں، ذلت اٹھانی پڑے لیکن آپ اس راہ سے مکر نہیں سکتے، جو اس مالک نے آپ کے لیے قائم کردی ہے۔ اگر آپ ہی اپنی راہ پر نہیں چلیں گے تو کون چلے گا؟‘

— کیا میں کلکتہ جا کر وہ پاسکوں گا جو پانا چاہتا ہوں؟

— ہوسکتا ہے وہ نہ پاسکیں جو پانا چاہتے ہیں، لیکن اور ایسا بہت کچھ پالیں گے جو

شاہجہاں آباد آپ کو نہیں دے سکتا، جو کاشی آپ کو نہیں دے سکتا۔ سنیے میاں، مرنے سے پہلے میں کاشی چھوڑ کر مگہر چلا گیا تھا۔ جب لوگوں نے میرے مگہر جانے کا سنا تو بولے کاشی جیسا پاک مقام چھوڑ کر آپ مگہر کیوں جانا چاہتے ہیں؟ اگر آپ وہاں مرے تو اگلے جنم میں آپ کو گدھا بن کر پیدا ہونا ہوگا۔ تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ اگر مالک چاہتا ہے کہ میں دوبارہ ایک گدھے کی صورت میں جنم لوں تو ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اُسی نے طے کیا ہے کہ مجھے مگہر میں ہی مرنا ہے۔ مگہر پہنچنے سے پہلے میں کچھ دن امی ندی کے کنارے واقع کسروال گاؤں میں رہا۔ اس زمانے میں مگہر پر بجلی خاں راج کرتا تھا۔ اس نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا۔ مگہر میں پچھلے سالوں سے قحط پڑا ہوا تھا۔ ایک بوند پانی بھی کہیں نہیں تھا۔ گورکھ ناتھ نام کے ایک سادھو ہمارے ساتھ قیام کرنے آئے۔ سب نے انھیں پکڑ لیا۔ انھوں نے مٹی پر اپنا پاؤں مارا اور پانی کا سوتا بہادیا۔ لیکن اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا۔ تب سارے میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے لاکھ انھیں سمجھایا کہ میں گورکھ ناتھ جیسا سادھو نہیں ہوں، میرے اندر کوئی طاقت نہیں ہے لیکن وہ لوگ کچھ سننے کو تیار نہ ہوئے۔ سچ کہتا ہوں میاں، پانی کے سوتے جاری کردینے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ میں نے ان سے کہا، سب مل کر رام نام کرو، جو کچھ کرنا ہے پربھو ہی کرے گا۔ سب رام نام گانے لگے۔ یقین مانیے میاں، رام نام کے گن سے بارش ہوگئی۔ امی ندی پانی سے لبالب بھر گئی۔ رام نام سے کیا کچھ پایا جاسکتا ہے اس کا مظاہرہ میں نے مگہر کے راستے ہی میں دیکھ لیا۔ اسی لیے تو وہ نیک نہاد مجھے کاشی سے مگہر لے آیا تھا۔ اس کے بعد اگر میں گدھے کے روپ میں بھی پیدا ہو جاؤں تو فرق کیا پڑے گا؟

کبیر جی اُٹھ کھڑے ہوئے اور میرا ہاتھ پکڑ لیا چلیے میاں، میں آپ کو گھر پہنچا آتا ہوں۔

— وہ مسکرائے۔ آپ نے اب تک اکیلے چلنا نہیں سیکھا، میاں۔ کچھ اور ذلت سہیے، تبھی سیکھ سکیں گے۔

— اور کتنی تذلیل سہنی ہوگی مجھے؟

— آپ کی زندگی میں ذلت ابھی آئی ہی نہیں، میاں۔ پر اب آئے گی۔ میں رام رحیم سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ آپ اسے جھیل سکیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کا کوئی گھر نہیں ہے، کبیر داس کی دعا قبول ہو اور آپ لفظوں میں اپنا گھر ڈھونڈ پائیں، لفظ ہی آپ کی جڑیں ہیں، میاں۔

یہ کہتے کہتے انھوں نے میری پیشانی پر ایک بوسہ ثبت کیا۔ پھر اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر بولے، 'جانے سے پہلے ایک قصہ سنتے جایئے، میاں۔ آپ خوش دلی کے ساتھ ساتھ جائیں گے۔ چلیے، میں چلتے چلتے سناتا ہوں۔'

کاشی کی گلیوں سے گزرتے ہوئے کبیرداس نے قصہ سنانا شروع کیا: 'برسوں صحرا کی خاک چھاننے کے بعد، ایک درویش کسی بستی میں پہنچا، لیکن وہ جگہ بھی اُجاڑ بیابان تھی، سبزے کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ وہاں کے رہائشی گلہ بانی کے ذریعے اپنی گزراوقات کرتے تھے۔ راستے میں درویش نے ایک آدمی سے دریافت کیا، آیا یہاں شب بسری کے لیے کوئی جگہ ہوگی۔

آدمی نے سر کھجاتے ہوئے کہا: ہمارے گاؤں میں رہنے کے لیے ابھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ لیکن آپ شاکر صاحب کے ہاں جاسکتے ہیں۔ انھیں لوگوں کو ٹھہرا کر خوشی ہوتی ہے۔'

— تو بہت اچھے آدمی ہیں وہ؟

— جی ہاں۔ اس پورے علاقے میں ان جیسا دوسرا کوئی نہیں۔ بہت دولت مند بھی ہیں۔ حدّاد بھی حیثیت میں ان کے برابر نہیں۔

— کون حدّاد؟

— وہ برابر والے گاؤں میں رہتا ہے، چلیے میں آپ کو شاکر صاحب کے گھر کا راستہ دکھادوں۔

شاکر، اس کی بیوی اور اس کی بیٹیوں نے درویش کا گرم جوشی سے استقبال کیا، اور وہ ایک رات ٹھہرنے کے بجائے وہاں کئی راتوں تک ٹھہرا رہا۔ جب رُخصت ہونے لگا تو شاکر نے زادِراہ کے طور پر ڈھیر سارا کھانا اور پانی اس کے ہمراہ کیا۔ درویش نے اسے دعا دی: 'اللہ کرے تم مزید پھلو پھولو۔'

شاکر مسکرادیا: 'درویش بابا، جو کچھ آپ نے دیکھا ہے اس کے بھلاوے میں مت رہیے گا، یہ سب بھی ایک دن مٹ جائے گا۔'

شاکر کی بات سے درویش کو حیرت ہوئی۔ کیا مطلب تھا شاکر کی بات کا؟ پھر اس نے خود

سے کہا، میرا طریق سوال کرنا نہیں، سب کچھ خاموشی سے سننے کا ہے۔ اس بات کے معنی ایک دن خود ہی آشکار ہوجائیں گے۔ تصوف کی ریاضت نے اسے یہی سکھایا تھا۔

مختلف سرزمینوں پر گھومتے ہوئے، مزید پانچ برس بیت گئے۔ درویش پھر اسی بستی میں واپس آیا اور شاکر کی بابت دریافت کیا۔ اسے معلوم ہُوا کہ شاکر اب برابر والے گاؤں میں رہتا ہے، جہاں وہ حدّاد کے گھر کام کیا کرتا ہے۔ درویش اسے ملنے کے لیے پہنچا۔ شاکر پہلے سے کہیں بوڑھا دکھائی دے رہا تھا، اور اس کا لباس بھی پھٹا پرانا تھا۔ اس نے اسی گرم جوشی کے ساتھ درویش کا استقبال کیا۔

— تمھاری یہ حالت کیسے ہوگئی؟ درویش نے پوچھا۔

— تین سال پہلے ایک خوفناک سیلاب آیا۔ میرے سب مال مویشی بہہ گئے۔ اس لیے مجھے حدّاد بھائی سے مدد مانگنا پڑی۔

درویش نے کافی دن حدّاد کے گھر قیام کیا، جب رُخصت ہونے لگا تو پچھلی بار کی طرح شاکر اس کے لیے کھانا اور پانی لے آیا۔ درویش نے کہا: 'تمھاری یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا بے سبب کچھ نہیں کرتا۔'

شاکر نے مسکرا کر کہا: 'یہ وقت بھی گزر جائے گا۔'

اس کا کیا مطلب ہوا؟ کیا شاکر اپنی اس حالت کو بدلنے کے قابل ہوسکے گا؟ لیکن کیسے؟ درویش کے ذہن میں سوالات اُبھرے لیکن اس نے انھیں جھٹک دیا۔ مطلب تو ایک دن ظاہر ہوہی جانا تھا۔

مزید کچھ سال سفر کرنے کے بعد، درویش ایک بار پھر اسی بستی میں آیا اور دیکھا کہ شاکر پھر سے دولت مند ہوچکا ہے۔ حدّاد کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ مرتے وقت اس نے اپنی ساری جائیداد شاکر کے نام کردی۔ اس بار بھی درویش نے شاکر کے ہاں کئی دن قیام کیا اور اس کے رُخصت ہونے پر شاکر نے دُہرایا: ''یہ بھی گزر جائے گا۔''

اس بار درویش مکّہ سے ہوکر آیا اور شاکر سے ملنے پہنچا۔ شاکر مرچکا تھا۔ درویش اس کی قبر پر گیا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس کی قبر کے کتبے پر نقش تھا: ''یہ وقت بھی گزر جائے

گا"۔ درویش نے سوچا غریب آدمی دولت مند بن سکتا ہے، امیر آدمی غریب ہوسکتا ہے، لیکن قبر کیونکر بدل سکتی ہے؟ اس کے بعد سے درویش ہر برس شاکر کی قبر پر جاتا اور وہاں فاتحہ پڑھا کرتا۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ سب کچھ سیلاب میں بہہ گیا ہے۔ شاکر کی قبر کا نشان بھی مٹ چکا تھا۔ قبرستان کے آثار پر بیٹھے، درویش نے آسمان کی طرف دیکھا اور زیرِ لب کہا، "یہ بھی گزر جائے گا۔"

بعد میں جب درویش چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا تو اس نے ایک جگہ ڈیرا جما لیا۔ بہت سے لوگ اس کے پاس ہدایت لینے آنے لگے۔ یہ بات مشہور ہوگئی کہ اس جیسا صاحبِ علم اور کوئی نہیں۔ یہ بات نواب کے وزیرِ اعظم کانوں تک بھی پہنچی۔

یہ ایک دلچسپ معاملہ تھا، میاں۔ نواب کو ایک ایسی انگوٹھی کی خواہش تھی جس پر کچھ ایسا نقش ہو جو اسے حالتِ غم میں خوش کردے اور اگر وہ خوش ہو تو اسے ملول اور افسردہ کردے۔ کتنے ہی زرگر آئے، کتنے دانا و بینا اس کے دربار میں حاضر ہوئے، لیکن نواب کسی کی تجویز سے خوش نہ ہوا۔ پھر نواب کے وزیرِ اعظم نے تمام ماجرا ایک خط میں درویش کو لکھ بھیجا اور کہا کہ یہ مشکل آپ کی مدد کے بغیر حل نہ ہوسکے گی۔ آپ کو دربار میں آنا ہوگا۔ لیکن درویش بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے جوابی خط میں تجویز لکھ بھیجی۔

کچھ عرصے بعد، نئی انگوٹھی نواب کے حضور پیش کی گئی۔ نواب کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ انگوٹھی پہن کر اس نے مایوسی کی نگاہ انگوٹھی پر کی، جیسے ہی اس کی نظر انگوٹھی پر نقش الفاظ پڑی، اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل گئی۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جانتے ہیں انگوٹھی پر کیا نقش تھا، مرزا صاحب؟ جی ہاں، 'ایک دن یہ بھی گزر جائے گا۔'

اگلے ہی لمحے میں نے خود کو کاشی کی گلی میں تنہا کھڑے ہوئے پایا۔ کبیر جی کہیں نہیں تھے۔

۲۴

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

میں جانتا ہوں، برادران، آپ بہت دیر سے بے چین ہو رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے ہمیں ایک آسمانی قصہ سنایا ہے، لیکن ہم تو گلی کے کتے ہیں، ہم سب ہی——ایسی اچھی غذا ہمیں کہاں ہضم ہوگی۔ دیکھیے مرزا صاحب، کیسے ہمارے روئیں جھڑ رہے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں، میرے بھائیو، آخر منٹو کس لیے ہے؟ میں نے پہلے ہی سے کچھ ہڈیاں کوڑے دان سے بین کر رکھ لی ہیں، جنھیں آپ اطمینان سے چبا سکتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے، مرزا صاحب، میں کیسے اس جال میں پھنس گیا؟ لعنت ہے! جب میں بمبئی آیا تو مجموعی طور پر مزے میں بسر ہو رہی تھی؛ کھولی میں قیام کے باوجود، اکیلے رہنے کا لطف بے مثال تھا۔ کوئی احسان مندی نہیں، کسی کو جواب دہی نہیں، جیسے چاہو رہو۔ وہ جو حافظ نے کہا ہے نا۔

عشق بازی و جوانی و شرابِ لعلِ فام
مجلسِ انس و حریفِ ہمدم و شربِ مدام

عشق بازی اور جوانی اور لعل جیسی شراب۔ محبت کی مجلس اور ہمدم دوست اور دائمی شراب نوشی

سمجھ میں آیا، برادران؟ مجھے جوانی دو، محبت دو، شرابِ سرخ دو، بزم آراستہ کرو، دوست احباب جمع ہوں، اور کھانا پینا مہیا رہے، اے خدا۔ اکیلے رہنے والے شخص کو اس سے بڑھ کر اور

چاہیے بھی کیا؟ کیا کسی اور کو اس طرح جینے کی آزادی حاصل ہوتی ہے؟ لیکن یہ سالا منٹو بھی جال میں پھنس گیا۔ میں یہی قصہ اس وقت آپ کو سنانے جا رہا ہوں، برادران۔

بی بی جان امرتسر سے بمبئی آئیں۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام میری بہن اقبال بیگم کے ہاں تھا۔ اپنی کھولی میں تو میں ہی بہ مشکل سما پاتا تھا؛ وہاں ماں کو تو ٹھہرا نہیں سکتا تھا۔ میں سڑکوں پر بی بی جان سے ملا کرتا تھا۔ کسی چائے کی دکان پر بیٹھ کر ہم چائے پی لیتے اور باتیں کرتے۔ مجھ جیسے کافر کو بہن کے گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں تھی۔ اقبال بیگم کا بادشاہ مجھے برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ بی بی جان مجھ سے روز التجا کرتیں، بیٹا، تم کہاں رہتے ہو؟ مجھے وہاں لے چلو۔ میں یہاں تمھارے لیے ہی تو آئی ہوں لیکن میں بی بی جان کو وہاں نہیں لے جا سکتا تھا۔ سچ کہوں تو میں انھیں نہیں دکھانا چاہتا تھا کہ کوئی انسان اتنے گھناؤنے ڈھنگ سے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا ان کے شفاف دل کو آلودہ کرنا ٹھیک ہوتا؟ لیکن آخر یہ ہوا کہ میں انھیں روک نہیں پایا۔ ایک دن وہ بہ اصرار میری کھولی میں آ گئیں۔ انھوں نے اندھیری، تاریک کوٹھری میں نظر دوڑاتے ہوئے میری جانب دیکھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے بی بی جان کو کبھی یوں روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میری بھی آنکھیں بھر آئیں لیکن میں نے مسکرا کر کہا، 'آدمی کو بڑے کمرے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'

— منٹو۔

میرا بازو تھام کر بی بی جان میرے میلے کچیلے بستر پر بیٹھ گئیں۔ میں ان کے پاس بیٹھا ان کے کاندھے اور پیٹھ کو سہلا کر انھیں پُرسکون کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن ان کے آنسو نہ رُکے، وہ ہچکیاں لیتی جاتی تھیں اور کہتی تھیں، 'یا الٰہی! یہ تو نے مجھے کیا دکھایا ہے؟' جب ان کے آنسو تھمے تو وہ کمرے میں بکھرے ہوئے میرے میلے کچیلے کپڑے سمیٹنے لگیں۔

— یہ آپ کیا کر رہی ہیں، بی بی جان؟

— تمھیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

— لیکن کہاں؟

— اقبال کے ہاں۔

— آپ تو جانتی ہیں، بی بی جان، اس گھر میں میرے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں ہے۔

— اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس جہنم میں......

— میں ٹھیک ہوں، بی بی جان، خدا کی قسم میں بالکل ٹھیک ہوں۔ نفرت کی ضیافت کھانے سے اس طرح اکیلے رہنا کہیں بہتر ہے۔

بی بی جان خاموش بیٹھی رہیں۔ میں نے ان کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا، 'چلیے میں آپ کو واپس چھوڑ آتا ہوں۔ اسی لیے میں آپ کو یہاں لانا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو تکلیف پہنچے، بی بی جان۔' اب تک میں اپنے آپ کو سارے وقت روکے رہا تھا، مرزا صاحب، لیکن اب مجھ سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، اس لیے نہیں کہ میں ایک کھولی میں رہتا تھا بلکہ اس لیے کہ بی بی جان کو میری اس جہنم سے بدتر زندگی کو دیکھنا پڑا تھا۔

مدتوں کے بعد، بی بی جان نے مجھے بچے کی طرح خود سے چمٹا لیا اور بار بار مجھے چومتے ہوئے، منھ ہی منھ میں بدبداتے ہوئے قرآن کی کوئی آیت پڑھتی گئیں۔ میں نہیں سمجھ پایا کہ وہ کیا پڑھ رہی تھیں۔ میں نے قرآن پڑھا ہی نہیں تھا۔ اپنی موت سے ایک رات قبل، جب میں خون تھوک رہا تھا، مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ان کی وہی بدبداہٹ سنی تھی۔ پہلی بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں اس کے معنی سمجھ سکتا۔ لیکن سمجھ بھی لیتا تو کیا ہوتا؟ وہ تو میری بیداری کی آخری ساعتیں تھیں۔

واپس جاتے ہوئے، بی بی جان نے راستے میں مجھ سے کہا، 'کیا تم کچھ زیادہ نہیں کما سکتے؟'

— کیوں؟

— پھر تمھیں اس کوڑے دان میں نہیں رہنا پڑے گا۔

— میں ٹھیک ہوں، بی بی جان۔ زیادہ پیسے کما کر کیا کروں گا؟ جتنا کماتا ہوں اس میں آرام سے گزارا ہو جاتا ہے۔

— نہیں، گزارا نہیں ہوتا، میں جانتی ہوں تمھارا گزارا نہیں ہوتا۔ لیکن تعلیم تم نے مکمل نہیں کی، زیادہ کیسے کماؤ گے؟

میں نے بی بی جان کے ساتھ کبھی غصے سے بات نہیں کی تھی، لیکن اس وقت مجھے طیش آ گیا

تھا پھر بھی میں نے خود کو قابو میں رکھا اور کہا،'میں نے کہا تو ہے کہ میں جتنا بھی کما تا ہوں اس میں میرا گزارا ہو جاتا ہے، اور تعلیم کے بغیر بھی ڈھیروں روپیہ کمانا ممکن ہے۔'

—تو پھر کوشش کیوں نہیں کرتے؟

اب مجھے مذاق کی سوجھی، اور یہی مذاق میرے لیے وبالِ جان بن گیا۔'مجھے زیادہ کمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟' میں نے کہا،'ہاں، بیوی ہوتی تو بات اور تھی۔'

—ماشاللہ۔ شادی کرنا چاہتے ہو؟

—ہاں، کیوں نہیں؟

یہ محض حاضر جوابی تھی، مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں کتنی بڑی بے وقوفی کر بیٹھا ہوں۔ بی بی جان نے مجھے اگلے ہفتے ماہم آنے کے لیے کہا، جہاں اقبال اور اس کا شوہر نامدار رہتے تھے۔ میں نے خود ہی اپنے لیے دام بچھا لیا تھا، مرزا صاحب۔ اس وقت تو مجھے یہ بجھ میں نہ آیا لیکن جب اگلی اتوار کو میں ماہم پہنچا تو جان پایا۔

میں اقبال کے گھر کے سامنے سڑک پر کھڑا تھا۔ بی بی جان نے تیسری منزل کے فلیٹ کی بالکنی سے مجھے دیکھا تو نیچے آ گئیں۔

—آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا؟

—میرے ساتھ آؤ، بیٹا۔

—کہاں؟

—یہیں پاس ہی، چلو میرے ساتھ۔

—بات کیا ہے؟

—میں نے تمھارے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے۔

—کیا مطلب؟

'صفیہ۔' بی بی جان مسکرائیں۔'بڑی اچھی لڑکی ہے۔ تمھاری دیکھ بھال کرے گی۔'

—آپ سے کس نے کہا میں ابھی شادی کرنا چاہتا ہوں؟

—کیوں؟ تمھی نے تو اس دن کہا تھا۔ میں نے جب پہلی بار صفیہ کو دیکھا تھا، وہ مجھے پسند

آ گئی تھی۔ میں نے لوٹتے ہی اس کے چچا سے بات کی۔ ہم بھی کشمیری ہیں اور وہ لوگ بھی، وہ فوراً مان گئے۔

—بی بی جان......

—مسئلہ کیا ہے؟

—آپ تو میری کمائی جانتی ہی ہیں۔ میں بھلا شادی کیسے کر سکتا ہوں۔

—جب بیوی آ جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو آؤ۔ جب تم صفیہ کو دیکھو گے تو تمھیں بھی وہ پسند آئے گی۔

بی بی جان مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لے گئیں۔ میں بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن انھوں نے میرا بازو آہنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

دریائی گھوڑے جیسے جسم کے ایک آدمی کے پاس بٹھا کر، بی بی جان اندر مکان میں غائب ہو گئیں۔ اس آدمی کا نام ملک حسن تھا۔ وہ صفیہ کے چچا تھے، اور کسی سراغ رساں ادارے میں ملازم تھے۔ وہ سوال پر سوال کرتے چلے گئے۔ میں نے سب کا جواب دیا اور موقع پا کر یہ بھی بتا دیا کہ مجھے ہر شام پینے کی عادت ہے۔ میں اس جال کو توڑ کر باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ یہ شادی بھلا کیسے ہو سکتی تھی؟ یہ شریف لوگ تھے اور میں بمبئی کی سڑکوں کا کتا۔

جب انھیں سب سوالوں کے جواب مل گئے تو حسن صاحب ٹہلنے لگے اور لگاتار کہتے گئے،'بہت خوب، بہت خوب!' پھر کسی کو بلا کر کہا،'بہن جی سے کہو ذرا یہاں آ جائیں۔' کچھ دیر بعد بی بی جان آ گئیں۔ حسن صاحب نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا،'کیا بیٹا پیدا کیا ہے، بہن جی۔'

بی بی جان نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سوچا اب ہم دونوں کو گھر سے نکال باہر کیا جائے گا۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی؟

—بات ختم۔

—کیا مطلب؟ بی بی جان بڑبڑائیں۔

—رشتہ پکا سمجھیے۔ پہلی بات تو یہ کہ میں صفیہ کی شادی کسی کشمیری کے علاوہ کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ اور پھر آپ کا بیٹا، یہ تو بالکل صاف دل انسان ہے۔ حتیٰ کہ اس نے تو یہ بھی اعتراف

کرلیا کہ یہ ہر شام پیا کرتا ہے۔ مجھے کوئی ایمان دار شخص ہی چاہیے تھا۔

یہ کیسی بدنصیبی تھی، مرزا صاحب، کہ ملک حسن جیسے سراغ رساں نے مجھے ایمان دار آدمی سمجھ لیا تھا۔ غلطی ہوگئی کہ میں نے انھیں ہیرا منڈی کی راتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا میں خود بخود اس میں پھنستا چلا گیا۔ 'لڑکی کو اندر لے آیئے، بہن جی۔' حسن صاحب نے کہا۔

صفیہ آ گئی۔ اس کا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے کسی سائے کی طرح، غیر واضح طور پر دیکھا۔ میں اسے چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میں ایسا آدمی نہیں ہوں جو اکیلے رہنے سے خوشی محسوس کرتا ہو؛ مجھے اپنی تنہائی کے لیے کسی کی رفاقت کی ضرورت تھی۔ صفیہ بیگم کو عمر بھر میرے خبط کی قیمت چکانا پڑی۔ جب کبھی ہم ایک ساتھ دو چار دن خوشی سے گزارتے، میں اپنے آپ سے پوچھتا، یہ اس لکھنے لکھانے کا حاصل کیا ہے، منٹو؟ کم سے کم ایک انسان کو تو اس دنیا میں خوش رکھو۔ یہ کاغذ اور قلم جلا ڈالو۔ اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دو اور آنکھیں موند لو، وہ تمھارے بالوں میں غیرمرئی تصویریں بناتی رہے، یہاں تک کہ تمھیں دھیرے دھیرے نیند آ جائے۔

شادی کا دن مقرر ہوگیا۔ مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آسماں میرے سر پر آ گرا ہو۔ جبکہ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے تو میں شادی کیسے کرسکتا ہوں؟ میں نے بی بی جان کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ سننے کو تیار ہی نہ تھیں۔ بس یہی کہتیں، 'سب ٹھیک ہوگا بیٹا، تمھاری بیوی تمھارا نصیب بدل دے گی۔ اگر خدا کی رضا نہ ہوتی تو کیا حسن بھائی راضی ہوتے؟'

خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے سوا میرے لیے اور کیا رہ گیا تھا؟ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔

میں کچھ عرصے تک امپیریل فلم کمپنی میں جز وقتی منشی یعنی مکالمہ نگار کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ لیکن اب کمپنی روبہ تنزل تھی۔ ورنہ کچھ روپیہ بطور ایڈوانس ہی مل جاتا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ کمپنی کی طرف تو میرے پندرہ سو روپے نکلتے ہیں۔ لعنت ہو۔ میں نے سیٹھ اردشیر سے اپنے

بقایاجات کی ادائیگی کے لیے کہا۔ سیٹھ کے اپنے حالات بہت خراب تھے، اُس کے پاس مجھے دینے کے لیے رقم نہیں تھی، لیکن اس نے میری ہونے والی بیوی کے لیے کچھ زیورات اور ساڑھیوں کا بندوبست کردیا۔ ذرا تصور کیجیے، برادران، جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی لیکن دلہن کے لیے ساڑھیوں اور زیورات کا انتظام ہو چکا تھا۔ آپ اسے منٹو کا جادو کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح میں نے اکیلے ہی شادی کا سارا انتظام کرلیا۔ اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے صفیہ سے بھی پیار ہوگیا۔

یوں آخر کار منٹو حرامی کی بھی شادی ہو ہی گئی۔ صفیہ اپنے چچا کے گھر ہی رہی اور میں اپنی کھولی میں واپس چلا آیا، جی ہاں، بھائیو، اپنی سہاگ رات کو اپنے کھٹملوں سے بھرے بستر پر لیٹا میں سوچتا رہا کہ کیا واقعی میری شادی ہو چکی ہے؟ یا پھر میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ میری جیب میں اب تک چھوہارے اور الائچی دانے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ منٹو آج تمھاری شادی ہو گئی ہے۔
مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ منٹو کے ساتھ کوئی پاگل آدمی ہی اپنی بیٹی کو بیاہ سکتا ہے۔
سال بھر یا اس سے کچھ زیادہ بیت گیا، صفیہ اپنے چچا کے گھر ہی رہی اور میں اپنی کھولی میں۔ حسن صاحب بہت چاہتے تھے کہ ہم ایک ساتھ رہیں لیکن میں اپنی بیوی کو اس جھونپڑپٹی میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ آخر یہ ہوا کہ میں اور برداشت نہ کر پایا۔ کون برداشت کرسکتا ہے، میرے بھائیو، کہ تمھاری نوجوان بیوی کہیں اور رہے اور تم ہر رات اپنے میلے کچیلے بستر پر اس کے خواب دیکھتے ہوئے سو جاؤ۔ میں نے پینتیس روپے ماہوار پر ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یہ بھی منٹو کا جادو ہی تھا۔ تنخواہ چالیس روپے اور مکان کا کرایہ پینتیس روپے۔ گھر چلانے کے لیے پانچ روپے۔

لیکن فلم پروڈیوسر نانو بھائی ڈیسائی کی طرف میرے اٹھارہ سو روپے واجب الادا تھے۔ میں نے اس کی فلموں کے لیے کچھ کہانیاں لکھی تھیں۔ رخصتی کے دن مجھے اپنے گھر ایک ضیافت کا اہتمام کرنا تھا۔ میں اپنی رقم کے لیے نانو بھائی کے پاس گیا۔ وہ حرامزادہ پہلے ہنسا اور پھر رونے لگا، بولا، 'آپ خود دیکھ لیں، منٹو صاحب، میری جیب میں ایک ڈیڑھیا بھی نہیں ہے، آپ کو کیا دوں گا؟'
میں نے سیٹھ کو ساری تفصیل بتائی لیکن وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ آخر کار ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ نانو بھائی نے اپنے آدمی بلا کر مجھے دفتر سے باہر نکال دیا۔ میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ اگر

رقم نہ ملی تو میں دروازے سے نہیں ہلوں گا۔ اگر ضروری ہوا تو یہیں بیٹھ کر بھوک ہڑتال کروں گا۔ یہ لوگ ادیبوں کو کیا سمجھتے ہیں؟ ہماری کہانیاں لے کر کیا ہم پر احسان کیا ہے؟ کہانی کار کو بھوکوں مرنا چاہیے، ہے نا؟ سالو، اور ہر چیز کے لیے تم پیسہ دے سکتے ہو، لیکن جب کہانی کی بات آئے تو وہ تمھیں مفت چاہیے۔ کہانیاں کیا لاوارث ہیں؟ اخبارات کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ افسانہ نگاروں کو سب سے کم معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کیوں بھئی؟ کیا خوابوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی؟ آپ پیسے کے ساتھ دنیا کو ماپ سکتے ہیں، لیکن خواب کیا فالتو ہوتے ہیں؟

نانو بھائی کے ساتھ جھگڑے کی خبر بابوراؤ پٹیل تک پہنچی۔ کہتے ہیں اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ اس فہرست میں اونٹ کے فوراً بعد بابوراؤ کا نام آنا چاہیے تھا۔ وہ بات بات پر لفظ 'سالا' اور 'بہن چود' استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں، ناک اور ہونٹ موٹے تھے اور دانت گھسے ہوئے تھے، لیکن پیشانی کافی چوڑی تھی۔ بابوراؤ پٹیل، فلم انڈیا کا ایڈیٹر، ایک اردو رسالہ 'کارواں' بھی نکالتا تھا جس میں کچھ مہینے میں نے بھی کام کیا تھا۔ جوانی ہی میں اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کی اپنے باپ سے نہیں بنتی تھی۔ اس کے باپ کا ذکر جب بھی نکلتا وہ کہتا، 'وہ سالا پورا حرامی ہے۔' یہ مزے کی بات تھی۔ اگر بوڑھا پٹیل حرامی تھا تو بابوراؤ اس سے چار قدم آگے تھا۔ عورت کو دیکھ کر وہ اس کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ سچ میں مرزا صاحب، اس کی ایک سیکریٹری تھی، ریتا۔ وہ سب کے سامنے اس کے کولھوں پر چپت رسید کرتا اور کھی کھی کرکے ہنستا۔ تو بابوراؤ نے نانو بھائی کو فون کیا اور اسے سمجھایا، اور بالآخر خود نانو بھائی کے دفتر چلا آیا۔ کافی حیل و حجت کے بعد معاملہ آٹھ سو روپے میں طے پا گیا۔ میں خوش ہو گیا۔ پیسے ہاتھ میں آتے ہی میں خود کو بادشاہ محسوس کرنے لگا۔

صفیہ کے لیے کچھ مزید ساڑھیاں اور زیورات، اور اپنے لیے ایک بوتل جانی واکر خریدنے کے بعد میری جیب پہلے کی طرح خالی ہو گئی۔ جب میں اپنے نئے گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا، وہ میری جیب سے بھی زیادہ خالی تھا۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن میرے بھائیو، میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ بالآخر لوگ ہمیشہ دوسرے لوگوں کا ساتھ دینے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے پڑوس کے ایک صاحب نے قسطوں پر کچھ اسباب خریدنے کا بندوبست

کر دیا لیکن اب بھی دونوں کمرے ریگستان ہی معلوم ہو رہے تھے۔

نذیر لدھیانوی صاحب نے شادی کا دعوت نامہ چھاپ دیا۔ بھاری دعوت ہوئی۔ سب فلم والے آئے۔ کاردار صاحب، ڈائریکٹر گنجال، ای بلی موریا، بابوراؤ پٹیل، نور محمد چارلی، پدما دیوی اور بہت سے۔ پدما دیوی کا نام ابھی مشہور نہیں ہوا تھا۔ بابوراؤ نے اس کی کایا پلٹ دی۔ اس نے اسے کلر کوئن بنا ڈالا۔ 'فلم ورلڈ' کے ہر شمارے میں اس کی تصویریں چھپتیں، جن کے عنوانات بابوراؤ خود لکھتا تھا۔

آپ یہ کھیل سمجھ گئے نا، برادران؟ فلمی دنیا ایسی ہی تھی۔ اگر آپ صحیح آدمی کے ساتھ سو لیے تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔

دعوت جم کر ہوئی۔ کھانے پینے کے معاملے میں، مرزا صاحب، میں بالکل آپ جیسا تھا۔ بہترین سے کم یا کنجوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سارا کھانا کشمیری انداز کا پکایا گیا تھا۔ بابوراؤ جی نے ناچنا شروع کر دیا؛ ادھر رفیق غزنوی، ہندا اور آغا کشمیری ایک دوسرے کو مغلظات بکنے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا تھا جب یہ سب ختم ہوا تو بی بی جان، صفیہ اور میں بلیموریا صاحب کی گاڑی میں اپنے نئے گھر پہنچے۔ اب کیسے بتاؤں بھائیو، کہ اگلے دن میں نے دیکھا کہ میرا آدھا وجود صفیہ کا شوہر بن چکا تھا۔ لیکن مجھے بھی بہت اچھا محسوس ہوا۔ یہ ایک منفرد احساس تھا۔

اگلے دن شام کو گھر آنے کے بعد ابھی میں نے بوتل کھولی ہی تھی کہ صفیہ نے آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس میں نئی نویلی بیویوں والی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، 'مت پیجیے، منٹو صاحب۔'

— کیوں؟

— یہ آپ کو نقصان پہنچائے گی۔

— میں پیے بغیر لکھ نہیں سکتا۔

— کیا لکھنے کے لیے لوگ شراب پیتے ہیں؟

— ایسا نہیں ہے......

— تو پھر چھوڑ دیجیے۔

—ٹھیک ہے، آج تو پی لینے دو۔

—نہیں، ایک گلاس بھی نہیں۔

—آج کا دن بہت خاص ہے، صفیہ۔

—وہ کیسے؟

—تمھارے ساتھ آج پہلا دن ہے۔

—تو پھر شراب کی ضرورت کیوں ہے؟

—ضرورت ہے، ضرورت ہے۔ میں نے اُسے لپٹالیا—ورنہ تم بستر میں حقیقی منٹو کو کیسے پاؤ گی؟

وہ بھی ہنستے ہنستے مجھ سے لپٹ گئی۔ یہ صفیہ—سادہ، صاف گو اور دل کی بات برملا کہہ دینے والی۔ جس وثوق سے وہ اعتراض کرسکتی تھی اسی وثوق سے پیار بھی کرسکتی تھی۔ اس میں تصنع نہیں تھا۔ لیکن اس کی زندگی کو منٹو سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے تھا، برادران۔ منٹو تو اپنے ہی ساتھ چھپن چھپائی کھیلتا بڑا ہوا تھا۔ سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اسے بھول بھلیاں میں کھو جانا اچھا لگتا تھا۔ صفیہ نے بہت کوشش کی مگر میری شراب نہ چھڑا پائی۔ شراب کے پیچھے میں نے اس سے بہت جھوٹ بولے، بہت دھوکے دیے۔ ہاں، مرزا صاحب، بیچ بیچ میں، لمبے لمبے عرصے کے لیے میں پینا چھوڑ بھی دیتا تھا۔ اس وقت مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا، یوں لگتا جیسے میرا نیا جنم ہوا ہو۔ لیکن پھر وہیں پہنچ جاتا۔ نتیجتاً میں زندگی بھر اس راستے کو نہ چھوڑ پایا۔ برسوں بعد ایک دن صفیہ نے مجھے کہا تھا، 'اگر آپ افسانہ نگار نہ ہوتے، منٹو صاحب، تو ہماری زندگیاں اس طرح برباد نہ ہوتیں۔ شاید!'

۲۵

اب کس کس اپنی خواہشِ مردہ کو رویئے
تھیں ہم کو اس سے سینکڑوں امیدواریاں

وہ موسمِ بہار تھا جب میں مرشدآباد سے ہوتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ دِلّی میں بہار کا موسم ذرا دیر کا ہوتا ہے، لیکن کلکتہ—بنگال—تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ۔ اگر میں بنگال نہ جاتا تو کبھی نہ جان پاتا کہ فطرت اس ایک رنگ کے کتنے روپ دکھا سکتی ہے۔ بہار میں وہاں خوشگوار ہوا چلتی تھی۔ میرے دوست کہتے تھے اس ہوا میں عشق کے لیے رغبت گھلی ملی ہے۔ میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔ ململ کے سے لمس والی اس ہوا کے چھو جانے ہی سے آپ کے اندر حسرتیں جاگ اٹھتی تھیں؛ جیسے کوئی بے وفا محبوب کہیں آپ کا انتظار کررہا ہے۔ اور تب آپ کا دل چاہے گا بہار کی اس ہوا میں آپ کھو جائیں۔ آپ خود سے کہیں گے، 'کاش میں اس ہوا میں بہہ جاؤں۔' مجھے میر صاحب کا ایک شعر یاد آگیا۔

جیسے نسیم ہر سحر تیری کروں ہوں جستجو
خانہ بہ خانہ، دربدر، شہر بہ شہر، کو بہ کو

میرے دوست سوہن لال نے، شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں دس روپے ماہانہ کے کرائے پر میرے لیے ایک کمرے کا بندوبست کردیا۔ اپنے سفری گھوڑے کو بیچ کر میں نے آمد و رفت کے لیے ایک پالکی کرائے پر لے لی۔ میں نے طے کیا کہ کچھ بھی ہوجائے، پچاس

روپے مہینے سے زیادہ خرچ نہ کروں گا۔ آپ نے اس مرزا کو پہچانا، منٹو بھائی؟ شاہ جہاں آباد سے کلکتہ آتے آتے میں یہ بات سمجھ چکا تھا کہ سمجھوتے کیے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ اور سمجھوتا مجھے ہر حال میں کرنا تھا۔ آخر میں سر پر قرضوں کا پہاڑ اُٹھائے، اپنی پنشن کے معاملات درست کروانے کلکتہ آیا تھا۔ لیکن میں ناکام رہا۔ جیسا محتاج آیا تھا، ویسا ہی محتاج دلّی کو لوٹ گیا۔ میں انگریزوں سے انصاف کی امید لے کر کلکتہ آیا تھا، لیکن مجھے پتھر کی دیواروں سے سر پھوڑ کر لوٹ جانا پڑا۔ میں اس کی تفصیلات میں جا کر آپ کو بوجھوں نہیں مارنا چاہتا۔ حاصلِ کلام یہ تھا کہ مجھے بغیر کسی تبدیلی کے پانچ ہزار روپے سالانہ کی پنشن کو قبول کرنا ہوگا۔

لیکن کلکتہ نے جو کچھ مجھے دیا، وہ بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں، برادران۔ ایسا تر و تازہ شہر تو محض عطائے خداوندی ہی ہو سکتا ہے۔ سبز گھاس کی نشست تختِ شاہی سے کہیں زیادہ پُر لطف ہوتی ہے۔ ہائے، گنگا سے آتی وہ ہوائیں ایسی ہوائیں میں دوبارہ کہاں پاؤں گا؟ صبح شام گوری میمیں گھوڑوں پر سوار میدان میں گھوما کرتیں۔ عربی گھوڑے بھی ویسے ہی زور آور جیسی ان کی پیٹھ پر سوار حسینائیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سرسبز گھاس کے پس منظر میں ہر لمحہ ایک نئی تصویر بنائی جا رہی ہے۔ گھوڑوں کی رفتار کے ساتھ حسیناؤں کے بدن کے زاویے بھی بدل جاتے تھے، ہر زاویہ گویا کوئی تیر تھا جو دل کے آر پار ہو رہا تھا۔ لاٹ صاحب کا بنگلہ بھی کیسا زبردست تھا، اور چورنگی میں باغات کے درمیان گھرے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر میرے دل میں کیسا حرص پیدا ہوا تھا۔ وہ سب انگریزوں کے گھر تھے۔ یقین مانیے منٹو بھائی، اگر مجھ پر میرے خاندان کی ذمے داری نہ ہوتی تو میں یہیں رہ جاتا، جب تک کہ مجھے قبر میں نہ ڈال دیا جاتا۔ شاہ جہاں آباد میں ہوا اور پانی اس قدر صاف شفاف نہیں تھے۔ یہ تو بالکل جنت تھی:

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر

طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

کلکتہ جیسی عمدہ شراب میں نے کبھی نہیں پی۔ نہ ہی ایسے آم کھائے۔ کلکتہ آ کر ہی میں آموں کے عشق میں گرفتار ہوا۔ میں نے یہ پھل پہلے بھی کھایا تھا، لیکن بنگال کا آم ایسے تھا جیسے طویل انتظار کے بعد معشوق کا بوسہ۔ دیکھتے ہی میری رال ٹپک پڑتی۔ ایک ٹکڑا منھ میں رکھتے ہی مزے سے میری آنکھیں مند جاتیں۔ اگر جنت کے سارے میوے بھی آپ کے سامنے دھر دیے جائیں، منٹو بھائی، تو آپ کلکتہ کے آموں کو فراموش نہ کر سکیں گے۔ میں ایسا بسیار خور تھا کہ ایک مرتبہ میں نے ہُگلی کے امام باڑے کے متولّی کو کچھ آم بھجوانے کے لیے خط لکھ دیا۔ میں ایسا پھل چاہتا ہوں، متولّی صاحب، جو نہ صرف دسترخوان پر سج کر خوبصورت لگے بلکہ جان و دل کو بھی راحت بخشے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں فقط آموں ہی میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ اور ہُگلی کے آم بطور خاص بے مثال ہیں، جیسے باغ سے تازہ تازہ توڑے ہوئے پھول۔ آموں کا موسم ختم ہونے سے پہلے اگر دو ایک بار مجھے یاد کرنے کی عنایت کر لیں تو میں احسان مند رہوں گا۔ متولّی صاحب نے میری درخواست کا خاطر خواہ جواب دیا۔ میرے ملازم رات میں آموں کو پانی میں بھگو دیتے۔ میں روز سویرے ایک آم کھاتا اور پھر سہ پہر کو بھی۔ جانتے ہیں ٹھنڈے آموں کا مزہ کیسا ہوتا ہے، منٹو بھائی؟ گویا آپ اپنی محبوبہ کے بدن پر زبان پھیر رہے ہیں۔

چونکہ آموں کی بات چل نکلی ہے تو میں آپ لوگوں کو دو ایک قصے سناتا ہوں، برادران۔ یہ دراصل قصے نہیں ہیں ـــ لیکن اب میری زندگی تو محض ایک قصہ ہی ہے۔ شاہ جہاں آباد کے حکیم رضی الدین خان میرے بہت اچھے دوست تھے، وہ آم کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک روز ہم دونوں میری حویلی کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ایک آدمی گلی سے گدھا لیے گزر رہا تھا۔ گلی میں آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے آم کے چھلکوں کو سونگھا لیکن کھایا نہیں۔ حکیم صاحب زور سے ہنس دیے اور بولے، 'دیکھو، مرزا، گدھے بھی آم نہیں کھاتے۔'

میں نے محض اتنا کہا، 'درست ہے، حکیم صاحب، گدھے آم نہیں کھاتے۔'

حکیم صاحب پہلے تو ہنس دیے، پھر اچانک بگڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ 'کیا مطلب؟' انھوں نے پوچھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا، 'کوئی گدھا آم نہیں کھاتا۔'

'سمجھ گیا۔' انھوں نے کہا اور اُٹھ کر چل دیے۔

جہاں تک آموں کا تعلق ہے، منٹو بھائی، میں تو بس دو باتیں جانتا ہوں۔ آم میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں، تاکہ میں جتنے کھانا چاہوں کھا سکوں۔ کلکتہ نے دونوں ممکن کر دیے۔ آم میں صرف کھانا ہی نہیں تھا کبھی کبھی تو میں پانی میں بھیگے ہوئے آموں پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہتا تھا۔ کیسا لطف تھا وہ! آنکھوں کے لیے بھی کیسا خوش کن۔ ہمساگر کو دیکھیے — جس کے بدن پر اُگتے سورج کا ہلکا نارنجی رنگ پھیلا ہوا ہے۔ یا لنگڑے ہی کو لیجیے — مکمل سبز، کہیں کہیں ہلکے زرد رنگ کی لکیریں سی۔ گلاب خاص کچھ حصّوں سے سبز یا زرد۔ رنگوں کی ایسی بہار اور کسی پھل میں نہیں ہوتی، منٹو بھائی۔ خوبصورت آموں کے ذکر سے آپ کا دل کبھی نہیں بھرتا۔ میں ان کے لیے ایسا بدمست تھا کہ قریب و دُور کے دوست احباب میرے لیے قسم قسم کے آم بھیجا کرتے تھے۔ 'جب آموں سے اتنا پیار ہے۔' بیگم نے ایک بار مجھ سے کہا، 'تو آپ شراب کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟'

— آپ جانتی ہیں کہ گھر سے باہر بھی میری ایک زندگی ہے، بیگم، تو کیا میں نے آپ کو چھوڑ دیا؟ مجھے دونوں چاہئیں۔

— اور میرا چاہنا؟

— آپ چاہتی ہیں میں ایک مکمل شوہر بن جاؤں۔ اس زندگی میں تو یہ ممکن نہیں، بیگم۔ لیکن میں آپ کو چھوڑ بھی نہیں سکتا، ورنہ کب کا طلاق دے چکا ہوتا۔

— کیوں نہیں چھوڑ سکتے، مرزا صاحب؟

— زندگی کی گم کردہ راہ میں ایک آپ ہی تو میرا سہارا ہیں۔

— واقعی؟

— آپ کیا سمجھتی ہیں میں کیوں اس حویلی میں لوٹ کر آتا ہوں؟ چاہے ہم دن بھر کوئی بات نہ کریں، مجھے کیوں لگتا ہے کہ اب بھی میرا کوئی گھر ہے؟

میں نے بیگم سے کچھ بھی ایسا نہیں کہا، منٹو بھائی۔ سب میرا خواب تھا — یہ ساری باتیں میں نے خواب میں کہیں۔ میں امراؤ بیگم کے ساتھ صرف خواب میں باتیں کیا کرتا تھا۔ ضرور وہ بھی اسی طرح مجھ سے باتیں کیا کرتی ہوں گی، ورنہ اتنے برس ہم ایک ساتھ کیسے گزارا کر سکتے تھے؟ کہیں تو کوئی روح تھی جسے ہم دونوں ہی نہ پہچان سکے۔

روح! کتنا پُر فریب لفظ ہے۔ میں نے کلکتہ جا کر ہی یہ لفظ سیکھا۔ میرے کلکتہ کے دوست، نواب سراج الدین احمد نے ایک دن آ کر مجھ سے کہا، 'چلیے مرزا، آج آپ کو ایک ایسے آدمی کے پاس لے جاؤں گا کہ آپ کا دل خوش ہو جائے۔'

— کس کے پاس؟

— ندھو بابو کے پاس۔

— یہ کہاں کے بابو ہیں؟

— ارے نہیں۔ یہ کوئی بابو نہیں ہیں لیکن سب انھیں ندھو بابو کہتے ہیں۔ ان کا اصل نام رام ندھی گپتا ہے۔ وہ گیت لکھتے ہیں اور انھیں گاتے بھی ہیں، اگرچہ اب وہ گا نہیں پاتے۔

— تو ہم جا کر کیا کریں گے؟

— آپ کو ان سے باتیں کر کے خوشی ہوگی، مرزا۔

یہ اس دو منزلہ عمارت کا ایک چھوٹا سا کمرا تھا جو ایسی گلی میں واقع تھا جہاں دن کی روشنی میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہم وہاں دوپہر کے بعد پہنچے۔ وہ ابھی تک سو رہے تھے۔ ملازم کے جگانے پر وہ انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور سراج الدین سے کہا، 'اس ناوقت، نواب صاحب؟'

— میں اپنے ایک دوست کو لایا ہوں۔

— کوئی گانے بجانے والے ہیں؟

— شاعر ہیں۔ دلّی میں رہتے ہیں۔

انھوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا اور بولے، 'نواب صاحب آپ کو یہاں لے کر آئے ہیں۔ میری عمر اب لگ بھگ نوّے برس کی ہے۔ یہ خادم آپ کے تفننِ طبع کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اب گا نہیں پاتا۔'

—اگر جی چاہے تو ایک آدھ چیز سنا دیجیے گا۔ سراج الدین نے کہا۔

—جی تو چاہتا ہے لیکن آواز اب ساتھ نہیں دیتی، نواب صاحب۔ اگر گانے میں روح نہ ہو تو آپ کیسے گا سکتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔

—اگر آپ گائیں گے تو جنت زمین پر اُتر آئے گی۔

—یہ ناممکن ہے، نواب صاحب۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟ سُر ناف سے اُبھرتے ہیں—اور ترانہ سُروں سے پھوٹتا ہے—جب ناف ہی سوکھ جائے تو ترانہ کیسے پیدا ہوگا؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوے کی طرح کائیں کائیں کرکے لوگوں کو احمق بنانا میرا پیشہ نہیں۔ براہ کرم تشریف رکھیے حضرات، آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں؟ اس کمرے میں بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہم ندھو بابو کے بستر پر ہی بیٹھ گئے۔ 'کلکتہ کسی کام سے آنا ہوا؟' انھوں نے پوچھا۔

میں نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے، 'یہ حرام زادے یہاں ہمارے دیش کو چوسنے آئے ہیں، یہ میرے آپ کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ آپ نے سادھک رام کا گیت نہیں سنا؟ آپ کو یاد ہے، نواب صاحب؟

میرا آشا لے کر آنا، کیول آنا ہی رہا
جیسے چر میں کل کے دھوکے سے بھرنگ چھلا گیا
کھیلنے کے چھل سے اتارا اس بھوتل پر
اس بار جو کھیل کھلایا، ماں کو، پوری نہ ہوئی کوئی آشا

مرزا صاحب، ان گورے صاحبوں کی طرح اس شہر کا بھی دل نہیں ہے۔ آپ کو یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ دلّی لوٹ جایئے۔ اس شہر میں اب نئی قسم کے شرفاء ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ندھو بابو کے گیت فحش ہیں۔ سالے گو کھانے والے۔ اب یہ انگریز فیصلہ کریں گے کہ کیا فحش ہے اور کیا نہیں؟ تو پھر بھارت چندر کو کہاں رکھو گے تم؟ کیا ودّیا ساگر کو یکسر مٹا ڈالو گے؟ وہ ذلیل بدیشی—وہ حرامی ڈیروزیو—لوگوں کو سکھلا رہا ہے کہ ماس کھاؤ، مدرا پیو اور کہو کہ انگریزی تعلیم ہی بہترین تعلیم ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، ہم نے تم سے کم ماس کھایا ہے اور کم مدرا پی ہے۔ ارے ہم نے تو

رکھیل بھی رکھی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بے راہ رو ہو گئے۔ یہ گیت سنیے:

پران، کم سمجھے میری داسنا
اسی کھید میں مرتا ہوں میں تم وہ سمجھتے نہیں
ہر دیہ سروج میں رہ جائے، مجھے کوئی دکھ نہیں
پران چلے جائیں، سداوچار میں، کہو یہ بھی کیا گن ہوا؟

کہیے، کیا ندھو بابو کا یہ گیت فحش ہے؟'

وہ ہمیں ایک کے بعد ایک ٹپہ سنانے لگے۔ اور ہر گیت میں وہی ایک لفظ 'پران' یعنی روح۔ جب بھی وہ اسے ادا کرتے، یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کھلے ہوئے پھول ہاتھوں میں دے رہے ہیں۔ پھر گاتے گاتے تھک کر وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

'کیسی خوش نصیبی ہے میری۔' سراج الدین صاحب بولے۔ 'آج کتنی مدّت بعد آپ کو دوبارہ گاتے ہوئے سنا ہے۔'

ندھو بابو میری طرف پلٹے اور کہا، 'لوٹ جایئے، میاں، دلّی لوٹ جایئے۔ کلکتہ آپ کو کچھ نہ دے گا۔ تذلیل کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آج کل اندھوں ہی کی نظر سب سے تیز ہے۔ یہاں لوگ بدنامی کے سوا اور کچھ دینا نہیں جانتے۔ مرشد آباد کے مہاراج، مہانند رائے بہادر کبھی کبھی کلکتہ آ کر رہتے تھے۔ شریمتی نام کی ایک بیسوا ان کی ملازمت میں تھی۔ میں ہر شام مہاراج کی ضیافتِ طبع کے لیے گایا کرتا تھا۔ نجانے کیوں لیکن شریمتی مجھے چاہنے لگی۔ جتنی دیر میں وہاں رہتا وہ دھیان رکھتی کہ میری دیکھ بھال میں کمی نہ رہ جائے۔ لوگوں نے چہ مگوئیاں شروع کر دیں کہ شریمتی کے ساتھ میرا تعلق ہے۔ اگرچہ اس کو تصور میں رکھ کر میں نے کتنے ہی گیت تخلیق کیے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ میری رکھیل ہو گئی۔ کلکتہ میں چیزوں میں توضیح اس طرح کی جاتی ہے۔ کچھ دن اور یہاں رہیں گے تو آپ خود ہی سمجھ جائیں گے۔ یہاں جوہر کی کوئی قدر نہیں، بس بک بک کرنا آنا چاہیے۔ یہ سب بدیشی تعلیم کا نتیجہ ہے، مرزا، یہ لوگ اپنے سوا کسی کو انسان نہیں سمجھتے۔'

جب ہم رخصت ہونے لگے تو ندھو بابو نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا اور بولے، 'مایوس نہ ہوں، میاں صاحب، آپ کے سامنے لمبا راستہ ہے۔ میں تو اپنا وقت پورا کر چکا اسی لیے اناپ شناپ بک رہا تھا۔'

جب ندھو بابو کا ذکر ہوا ہے تو مجھے ایک اور شاعر کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہیے۔ کوی رام پرساد سین، جن کا ندھو بابو سے بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بھگت کوی تھے منٹو بھائی، ایک زاہد و عابد شاعر۔ کہتے ہیں ایک بار جب وہ اپنے مکان کے گرد باڑ لگا رہے تھے تو کالی دیوی ان کی بیٹی کے بھیس میں ظاہر ہوئیں اور کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے بارے میں اور بھی بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ کاشی کی دیوی انپورنا ان کا گانا سننے آئی تھیں۔ وہ جس دفتر میں کام کرتے تھے، وہیں کے بہی کھاتوں پر گیت لکھ لیا کرتے تھے۔ پیلو بہار کے سروں میں ترتیب دیا ہوا ان کا ایک گیت بہت دنوں تک، بھونرے کی طرح میرے دماغ میں گونجتا رہا، اور ایک دن وہ بھی کھو گیا۔ دھیرے دھیرے، سارے رنگوں، سارے سُروں نے مجھ سے رخصت لے لی۔

ندھو بابو نے جو کچھ کہا تھا، اس کے بعد میں نے ان کی آنکھوں سے کلکتہ کی ایک اور ہی تصویر دیکھی۔ اور جلد ہی اس کلکتہ نے — کہ جو اپنے مشاہیر کی تکریم کرنا نہ جانتا تھا — مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ مجھے اس مشاعرے میں کلام پڑھنا پڑا۔ اتنا بڑا مشاعرہ دلّی میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ تقریباً پانچ ہزار افراد کا مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔ میری فارسی غزل سن کر وہاں موجود لوگوں کے ایک گروہ نے مجھے قتیل کا حوالہ دیتے ہوئے میری غزل کی زبان اور اسلوب پر اعتراضات کیے۔ کوئی کچھ بھی کہتا، میں نے قتیل کو کبھی بڑا فارسی شاعر نہیں مانا۔ کیسے مان لیتا؟ وہ درحقیقت فرید آباد کا ایک کھتری دل والی سنگھ تھا جس نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ ہاں، اگر آپ امیر خسرو کی بات کریں تو میں مان سکتا ہوں۔ جب میں نے یہ بات مشاعرے میں کہی تو وہاں شور و غوغا شروع ہو گیا۔ مجھے ندھو بابو کی بات یاد آ گئی۔ میں بحث کو بڑھائے بغیر وہاں سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ لیکن میری خاموشی سے بھی کچھ نہ ہوا۔ قتیل کے حواری مجھے کب چھوڑنے والے تھے۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئے۔ میں نے اس بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ میں یہاں اپنی پنشن کے معاملات ٹھیک کرنے آیا ہوں، لوگوں کو ناراض کرنے سے کچھ حاصل

نہ ہوگا، کہہ نہیں سکتے کون کس کام آ جائے۔ میں نے ایک مثنوی 'بادِ مخالف' کے نام سے لکھ کر معافی مانگ لی، لیکن اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹا، منٹو بھائی۔ لوگ حیران رہ گئے۔

'یہ آپ نے کیا کیا، مرزا صاحب؟' راجا سوہن لال نے دریافت کیا۔

— کیا مطلب؟

— خود کو یوں نیچا کیوں دکھایا؟

— کیا آپ نہیں جانتے کہ ہاتھی اگر گڈھے میں گر جائے تو چیونٹیاں بھی لات رسید کر دیتی ہیں۔ مدد کے لیے ہاتھی کو چیونٹیوں کی بھی منتیں کرنی پڑتی ہیں۔

— مگر پھر بھی آپ......

— میں کوئی نہیں۔ آپ کہہ لیجیے میں ایک دائمی نیند ہوں۔

— مطلب؟

مطلب میں خاک سمجھتا تھا۔ میرے تو جو دماغ میں آتا تھا میں کہہ دیتا تھا۔ اگر میں کہنے سے پہلے چیزوں پر اچھی طرح غور و خوض کر لیا کرتا تو میری زندگی مخمل کا بستر نہ ہوتی، منٹو بھائی لیکن ایسا تو میں چاہتا بھی نہیں تھا۔ میں کلکتہ سے ناامید ہو کر دلّی لوٹا، لیکن کلکتہ کو بھول نہیں پایا۔ پتا ہے، کتنے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آتے رہے۔ اپنے مقدمے کے سلسلے میں متعدد انگریز افسروں سے ملا، جنھیں اب میں بھول چکا ہوں۔ لیکن وہاں ایک مچھلی والی تھی جسے میں نہیں بھول پایا۔ میں روزانہ سبزیاں، پھل اور مچھلی وغیرہ خریدنے کے لیے ایک ملازم کو ساتھ لے کر شملہ بازار جایا کرتا تھا۔ تو بازار میں ایک مچھلی والی سے میری جان پہچان ہو گئی۔ وہ میرے لیے باقاعدگی سے توپسے مچھلی لایا کرتی — جسے انگریز لوگ 'مینگو فش' کہتے تھے۔ نارنجی رنگ کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں۔ تلی ہوئی ہوں تو ان کی نفاست کا جواب نہیں، خصوصاً شراب کے ساتھ۔ بڑی بشاشت کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے، وہ مچھلی والی مجھے روز کوئی نہ کوئی قصہ سناتی۔ اس دوران اگر کوئی مچھلی خریدنے آ جاتا تو وہ درشتی سے کہتی 'جاؤ یہاں سے، دیکھ نہیں رہے ہم میاں سے دل کی بات کر رہے ہیں۔'

'دل کی بات؟' خریدار پوچھتا، 'تو کیا اب مچھلی نہیں بیچو گی؟'

—نا،نہیں بیچوں گی۔ میری مچھلیاں ہیں۔ بیچوں یا نہ بیچوں تمھیں اس سے کیا؟' پھر میری طرف پلٹتی،'تو سنیے میاں، اُس براہمن بھٹا چاریہ کی بات سن کر آپ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔'قصہ سننے کے لالچ میں میں بھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔

—یہ سارے براہمن بھٹاچاریہ لوگ اپنی پوتھیوں کو تاکتے رہتے ہیں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے خیالوں میں مست رہتے ہیں۔ دنیا میں کچھ بھی ہو رہا ہو، انھیں نظر نہیں آتا۔ ایک بُراہمن بھٹا چاریہ کی پتنی رسوئی میں دال پکارہی تھی۔ اچانک اُسے یاد آیا گھر میں پانی نہیں ہے۔ اس نے اپنے پتی کو رسوئی میں بٹھایا کہ وہ دال دیکھتا رہے اور خود پانی لینے چلی گئی۔ اِدھر وہ گئی، اُدھر دال کا پانی اُبل کر گرنے لگا۔ یہ تو بڑی مشکل ہوگئی۔ آپ جانتے ہیں اس براہمن نے آخر کیا کیا؟ اس نے اپنے ہاتھ پر اپنا جنیو[1] لپیٹ کر ہاتھ دال کے برتن کے اوپر پھیلا دیا اور چنڈی پاٹھ کرنے لگا۔ کیا ایسی بات آپ نے کبھی سنی ہے، میاں ؟ ذرا سوچیے، بہتی ہوئی دال کو روکنے کے لیے چنڈی پاٹھ!'

—پھر کیا ہوا؟

—جب اس کی پتنی گھر لوٹی اور اس نے یہ ماجرا دیکھا تو بولی، 'یہ کیا! تم اس میں تھوڑا سا تیل نہیں ڈال سکتے تھے؟' تیل ڈالتے ہی دال کا بہنا بند ہوگیا۔ جانتے ہیں، میاں، اس کے بعد براہمن بھٹا چاریہ نے کیا کیا؟

— کیا کیا؟

مچھلی والی ہنستے ہنستے مجھ پر ڈھلک آئی۔ اسے کوئی شرم و حیا نہ تھی۔ میری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی، 'براہمن نے اپنا سر اپنی پتنی کے پیروں پر رکھ دیا اور بولا، تم کون ہو؟ دیوی ماں؟ جہاں میں نے ہار مان لی تھی وہاں تم محض تیل کی ایک بوند چھڑک کر جیت گئیں۔

—اور پھر؟

—پھر کیا ہونا تھا؟ پتنی نے چلا کر کہا، 'ہے بھگوان!' اور وہاں سے چلی گئی۔ مچھلی والی نے ہنستے ہنستے مجھ سے پوچھا، 'کیا مرد کبھی عورت سے جیت سکتا ہے، میاں؟'

[1] جنیو: سوت کا وہ دھاگا جسے تین برن کے لوگ گلے میں پہنتے ہیں۔ مزنار

اگر آپ مردوں کی بات کریں، منٹو بھائی، تو مجھے ایک ہی شخص یاد آتا ہے، وہ تھے رام موہن رائے۔ میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ لیکن کلکتہ میں ہر جگہ ان کا بہت نام سنا۔ ان کے گھر ہونے والی ضیافتوں میں طوائفوں کا مجرا ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ میں بہت سی مشہور طوائفیں تھیں— بیگم جان، ہُنگل، ننھی جان، سوہن جان، زینت، سید بخش۔ نہیں، میرے بھائیو، میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ سب کلکتہ کے امیرزادوں کی ملازمت میں تھیں۔ میرا ان امیرزادے بابوؤں میں اٹھنا بیٹھنا نہیں تھا۔ سنا تھا، بابو رام موہن رائے 'مراۃ الاخبار' کے نام سے کوئی فارسی کا اخبار نکالا کرتے تھے۔ لیکن اخبار میرے کلکتہ جانے سے بہت پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ تاہم ایک دوسرا فارسی اخبار 'جامِ جہاں نما' کے نام سے نکل رہا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی اور بنگالی تو کتنے ہی اخبار نکل رہے تھے۔ کلکتہ نے مجھ پر اخبار پڑھنے کا نشہ طاری کر دیا۔ اب تک دلّی سے کوئی اخبار جاری نہ ہوا تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ اخبار کے لیے چھاپہ خانہ چاہیے ہوتا ہے، اور کلکتہ میں ایسے متعدد چھاپہ خانے تھے۔ سراج الدین صاحب نے مجھے ایک کتاب دکھائی۔ بھارت چندر کی اند امنگل، جسے کسی گنگا کشور بھٹا چاریہ نے شائع کیا تھا۔ میں نے کسی پنچانن کرمکار کا نام بھی سنا، یہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے چھاپہ خانے کے لیے بنگلہ حُروف تیار کیے۔

میں رام موہن رائے کا ذکر کر رہا تھا نا، منٹو بھائی؟ میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا، لیکن ان کے بارے میں بہت اُلٹی سیدھی باتیں سنی تھیں۔ لیکن جب مجھے ستی کی رسم کے خلاف ان کی جدوجہد کا علم ہوا، تو دوسری کسی بات کی اہمیت نہ رہی۔ نیمتلا گھاٹ کے شمشان پر میں نے ستی کی رسم دیکھی تھی۔ اور میں نے لوگوں کو موت کی راہ پر جاتے دیکھا تھا۔ مرنے والے لوگوں کو گنگا کے کنارے پر لے جایا جاتا تھا، اور ایک کوٹھڑی میں رکھا جاتا۔ روز جوار کے وقت اس کے رشتے دار اس کے جسم کو جزوی طور پر گنگا کے پانی میں ڈبوئے رکھتے تھے۔ اس عمل کو انتر جلی یاترا کہا جاتا تھا، منٹو بھائی۔ گنگا کے مقدس پانیوں میں موت۔ وہ دنوں ہفتوں بعد دھوپ میں جل جل کر، بارش میں اور ٹھنڈ میں تکلیفیں اٹھا اٹھا کر مر جاتے تھے۔ معمولی سی تجہیز و تکفین کے بعد ان کے جسموں کو پانی میں بہا دیا جاتا۔ ستی کی رسم کے دوران چندن کی لکڑیوں پر گھی ڈال کر چتا جلائی جاتی تھی؛ بیوی کو اس کے شوہر کے مردہ جسم کے ساتھ جلا کر مار دیا جاتا تھا۔ منتر پڑھے جاتے

تھے، ڈھول منجیرے بجائے جاتے تھے — گویا کوئی جشن ہو۔ زندہ جلتی ہوئی عورت کی تکلیف دہ پکار کوئی نہیں سُن پاتا تھا۔ جس دن میں نے یہ منظر پہلی بار دیکھا، مدھو بابو کا وہی گیت میرے اندر گونجنے لگا— اوپران۔ بعد میں سنا کہ رام موہن کی کوششوں سے اس رسم کا خاتمہ ہوگیا۔

سب امیدوں کو ترک کر کے میں نے کلکتہ چھوڑ دیا۔ بس ایسی ہی کچھ یادیں ہیں جو بچی رہ گئی ہیں۔ جی ہاں منٹو بھائی، وہاں حیرت انگیز بادِ بہاری ضرور چلتی ہے، لیکن مجھے اسی شہر کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو کر لوٹنا پڑ رہا تھا۔ اور جب میں دلّی لوٹا تو میرے سر پر کچھ چالیس ایک ہزار روپے کا قرض چڑھ چکا تھا۔

۲۶

بہت دنوں تک منٹو کے ناول کے ترجمے کا کام بند رہا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ تبسّم ایک ننھی پری کی ماں بن گئی تھی، اس لیے میں نے اسے کچھ ماہ تک پریشان نہیں کیا۔ اُس نے اپنی بیٹی کا نام فلک آراء رکھا تھا۔ اس دوران میں بھی اپنی زندگی کے ایک غیر مانوس دور سے گزر رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر میری شراب نوشی اس حد تک بڑھ گئی کہ علاج کے لیے مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ان پندرہ دنوں میں، جو میں نے عادی نشے بازوں اور پاگلوں کے درمیان گزارے، میں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کا بھی اپنا ایک موقف ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے نارمل روزمرہ جیسے نہیں ہیں۔ اس کے بجائے یہ اپنے خوابوں اور اُوٹ پٹانگ باتوں میں، کہیں زیادہ گہرائی کے ساتھ، رنگے ہوئے ہیں۔ اس نفسیاتی ہسپتال کی کھڑکی میں بیٹھے ہوئے میں نے آسماں سے آتی اُس تُرش مہک کو محسوس کیا جس کے بارے میں سکو مارارے نے اپنے احمقانہ شعر میں بیان کیا تھا۔

جنوں ایک لاچار روح کا نام ہے۔

سچ کہوں تو میں منٹو کے ناول کے ترجمے میں دلچسپی کھوتا جا رہا تھا، کیونکہ اس نفسیاتی ہسپتال کے مریض مجھے اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ بار بار مجھ میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ میں ان کے بیچ لوٹ جاؤں۔ کیوں، کب، کہاں اور کیسے، یہ سوالات وہاں نہیں تھے۔ اگر کچھ تھا تو صرف کسی کا بے قابو جذبہ یا پھر دور تک پھیلا خاموشی کا سایہ۔

ایک دن فلک آراء کا پوچھنے کے لیے میں نے تبسّم کو فون کیا۔

— بچی اس قدر ہنستی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی دن خود آ کر دیکھیے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ صرف فون پر خبر لے رہے ہیں؟

— آؤں گا کسی دن۔

— اور ہمارے کام کا کیا ہوگا؟

— تمھارا مطلب ہے منٹو کا ناول —

— لگتا ہے آپ تو بالکل بھول چکے ہیں۔

— نہیں، بھولا تو نہیں ہوں۔

— تو پھر آیئے، دوبارہ کام شروع کرتے ہیں۔

میں چپ رہا۔

— کیا ہوا؟ کچھ کہتے کیوں نہیں، جناب؟

— میں سوچ رہا تھا......

— کیا؟

— یہ منٹو کا بھوت آخر میری ہی گردن پر کیوں چڑھ بیٹھا!

مجھے تبسم کی ہنسی سنائی دی — آپ نے خود ہی اپنی گردن آگے بڑھائی تھی۔ کیا اب آپ اسے گردن سے اُتار پھینکنا چاہتے ہیں؟

— اگر ایسا کردوں تو کیسا رہے گا؟

— نہیں، جناب ایسا مت کیجیے گا۔ فلک آراہ کی دیکھ بھال کے دوران میں نے پورا ناول پڑھ ڈالا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے منٹو صاحب سے پیار ہوگیا ہے۔ کیسے ادیب تھے وہ بھی — کوئی تصنع نہیں، کوئی اکڑ نہیں — انھوں نے مرزا غالب کے حوالے سے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ایسے ایماندار ادیب کے ساتھ بے انصافی مت کیجیے۔ چلیے آیئے، ہمیں اس ترجمے کو ضرور پورا کرنا چاہیے۔

— تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ منٹو ایک ایماندار ادیب تھے؟ میں نے ہنس کر پوچھا۔

— میں کہہ سکتی ہوں۔ میں ادیب نہیں ہوں اس لیے سمجھا نہیں سکتی۔ لیکن یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی بچی محبت کے بارے میں بتا سکتا ہے۔

— تم کیسے بتاتی ہو؟

— پتا نہیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا، اپنی اس بے خبری کو بچائے رکھنا، تبسم، جب تک تم ایسا کروگی، میں تمھارے ہاں آتا رہوں گا۔

— آپ چپ کیوں ہیں؟

— کیا میں کل تمھارے ہاں آسکتا ہوں؟

— ضرور۔ آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور آپ فلک آراہ سے بھی مل لیجیے گا۔

— ہوں ں ں۔ اس ناول سے جو تم نے ابھی ابھی شروع کیا ہے؟

— کیسا ناول؟

— فلک آراہ۔ وہ بھی تو ایک ناول ہی ہے۔

— آپ کے دماغ میں بس ناول بھرے ہوئے ہیں، ہے نا؟

— میرے دماغ میں تو صرف گوبر، غلاظت اور کوڑا کرکٹ بھرا ہوا ہے۔

— اگلے دن میں تبسم کے گھر گیا۔ اس کی بیٹی فلک آراہ سچ مچ ستاروں کی مالا جیسی تھی، یوں لگتا تھا جیسے اسے مصور بہزاد نے اپنے موقلم سے بنایا ہو۔ بچی کے چہرے سے میری نظر ہی نہیں ہٹتی تھی۔

— ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ تبسم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

— میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

— کون سا شعر؟

—

عالمِ حسن ہے عجب عالم
چاہیے عشق اس بھی عالم سے

— آپ کا بھی جواب نہیں۔ اتنی چھوٹی سی بچی کے لیے میر کا شعر؟

حسن کا خنجر کب اور کس رُخ سے وار کرے، آپ کبھی نہیں جان پاتے۔

— کیا آپ نے حال ہی میں ایسے کسی خنجر کا وار کھایا ہے؟

— سارے خنجر زنگ آلود ہوگئے ہیں، تبسم۔ اب وہ خون نہیں بہاتے، بس اندر ایک سڑن

پیدا کر دیتے ہیں۔

— مجھے لگتا ہے آپ کو شاہانہ مکالموں کی خاصی مہارت حاصل ہے۔

میں ہنس پڑا — اس لیے میں تم کو اتنا پسند کرتا ہوں، تبسم۔

— کس لیے؟

— اسی وجہ سے۔

— کیا مطلب ہے آپ کا؟

— پتا نہیں۔

— ٹھہریے، میں بچی کو کسی کے پاس چھوڑ آؤں۔

جوں ہی تبسم کمرے سے گئی، دیوار پر لٹکے ویونیکل آئینے نے مجھے نگل لیا۔ دور آگرہ کا چہار باغ آئینے میں اُبھر آیا۔ وہاں...... وہاں وہ تھے...... اسد اللہ...... بیگم فلک آراء کے آگے سر نیہوڑائے کھڑے۔ اور یہاں، کلکتہ کی ایک گلی میں، تبسم کے گھر میں ایک اور فلک آراء نے جنم لیا تھا۔ لوگ واپس نہیں آتے لیکن نام لوٹ آتے ہیں، بار بار۔ ذرا دیر بعد اسی آئینے میں میں نے تبسم کو دیکھا۔

— اس آئینے میں کیا دیکھ رہے ہیں؟

— تمھارے اس آئینے میں کتنی راہیں چھپی ہوئی ہیں۔

— راہیں؟

— خیر چھوڑو۔ منٹو کی بات کرو۔

— ہوں۔ چلیے پھر سے کام شروع کرتے ہیں۔ الماری کھول کر اس نے منٹو کا مُسوّدہ نکال لیا۔ بستر پر بیٹھ کر وہ اس کے صفحے اُلٹتے ہوئے بولی، 'کیا آپ لکھیں گے آج؟'

— میں اپنی نوٹ بک نہیں لایا۔

— کام نہ کرنے کے ہزار بہانے ہیں آپ کے پاس۔

— میں کل لکھوں گا۔ آج صرف تمھاری زبانی سنوں گا۔

— لیکن آپ کو یہ ترجمہ پورا کرنا ہی ہوگا۔

— کروں گا۔ ضرور کروں گا۔ اب پڑھو۔

تبسم نے پڑھنا شروع کیا۔

میں نے مرزا غالب کے بارے میں اپنا قصہ ایسے وقت لکھنا شروع کیا تھا جب میرے پاس گنے چنے ہی دن رہ گئے تھے۔ پاکستان آکر میں بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میرا دل گویا ایک جھلسی ہوئی سرزمین تھا جہاں صرف چند خستہ حال کنٹیلی جھاڑیاں ہی بچی رہ گئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ کبھی جی چاہتا لکھنا بند کردوں، کبھی جی چاہتا کہ مجھے ضرور لکھنا چاہیے، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں ایسے حال کو پہنچ چکا تھا جہاں میری تمنا تھی کہ کاغذ قلم چھوڑ کر بس ایک کونے میں پڑا رہوں اور جو خیال دماغ میں آئے اس کا سر قلم کردوں، اگر اتنا ذرا سا سکون بھی میری دسترس سے باہر ہوا تو میں کالے بازار سے پیسہ کماؤں گا، زہریلی شراب تیار کر کے منافع حاصل کروں گا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے، بہت سخت ضرورت ہے۔ دن رات کہانیاں اور اخبار میں کالم لکھ کر اتنے پیسے ہاتھ نہیں آتے کہ گھر چلا سکوں۔ میں سوچتا ہوں، میں اگر اچانک مرگیا تو میری بیوی اور تین بیٹیوں کا کیا ہوگا؟ آپ مجھے جو جی چاہے کہہ لیں — فحش افسانہ نگار، ری ایکشنری — لیکن میں ایک شوہر اور تین بیٹیوں کا باپ بھی تھا۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار پڑ جائے تو مجھے کشکول اٹھا کر دردر جانا ہوگا اور گھر کے خرچ کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی شراب کے لیے بھی تو پیسے چاہیے تھے۔ اگر چار جذ نہ ہوں تو میں ایک جملہ بھی نہیں لکھ پاتا۔ چچا سام، آپ ہی بتایئے، کیا یہی ہے ایک افسانہ نگار کی تقدیر؟

میں کل پھر سے ہسپتال سے واپس آیا ہوں۔ صفیہ نے میری شراب چھڑانے کے لیے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ یہ لوگ سمجھ نہیں رہے، شراب اب مجھے نگل رہی ہے۔ شراب پینے کے لیے میں کتنی کتنی دیر اپنے دوستوں کے گھر پڑا رہتا ہوں۔ انھیں میری تحریروں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ جانتے بھی نہیں کہ منٹو کون ہے۔ میں نے بھی انھیں کبھی بتانا نہیں چاہا۔ دن بہ دن میں نے اپنے جسم کو مرجھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ سچ میں، کبھی کبھی خود دیکھ کر گھن آتی ہے۔ میں ہمیشہ ہر چیز صاف ستھری رکھنا چاہتا تھا۔ صفیہ سے اکیلے سارا کام نہ ہو پائے گا، یہ سوچ کر میں گھر کی صفائی بھی کر دیا کرتا تھا اور جب تک دھول مٹی کا ہر دھبہ دور نہ ہو جاتا، مجھے چین نہ آتا تھا۔ صفیہ

مجھے وہی کہا کرتی تھی۔ لیکن اگر ہمارے اردگرد کا ماحول خوبصورت نہ ہو تو ہم اندر سے بھی خوبصورت نہیں ہو سکتے۔ شراب میرے لیے صرف ایک لت نہیں تھی، میں شراب نوشی کے آداب باقاعدہ ملحوظِ خاطر رکھتا تھا۔ جب ہم بمبئی میں رہتے تھے، میں نے کئی قسم کے گلاس خریدے تھے، اور اب مجھے شراب کی بوتل غسل خانے میں کموڈ کے پیچھے چھپانی پڑتی تھی۔ کبھی کبھی صفیہ پوچھ بیٹھتی کہ میں بار بار غسل خانے کیوں جاتا ہوں؟ میں جھوٹ بول دیتا کہ پیشاب آتا ہے یا منہ دھونا چاہتا ہوں۔ اب مجھے کسی طرح کا جھوٹ بولنے میں باک نہیں ہوتا، لیکن اس سے پہلے میں نے صفیہ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میری نشے کی لت مجھے اخلاقی پستی کی طرف لے جا رہی تھی۔

لیکن کیا کروں؟ پیے بنا میرا قلم چلتا ہی نہیں، اور اگر نہ لکھوں تو کمائی بند۔ جیسے میں کسی بھول بھلیاں میں چکراتا پھر رہا تھا، اور میں جانتا تھا کہ موت کے سوا اس صورتِ حال سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ لیکن جانے سے پہلے مجھے مرزا سے متعلق اس قصے کو ضرور پورا کرنا ہوگا۔ میں صبح کے وقت کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہسپتال سے لوٹنے کے بعد دو چار دن تک شراب کو چھونے کی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا سارے بدن پر تر و تازہ گھاس اُگ آئی ہو۔ میں اس کی مہک محسوس کر سکتا تھا — کیسی صاف مہک تھی۔ ہر بار میں خود سے عہد کرتا، نہیں! کبھی نہیں۔ میں اب شراب کو نہیں چھوؤں گا۔ مجھے صفیہ اور اپنی بیٹیوں کے ساتھ باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد میں پھر سے شراب خانے پر قطار میں جا کھڑا ہوتا۔

میں لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت دیر تک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا، لیکن ایک لفظ بھی نہیں لکھ پایا۔ دماغ بالکل خالی تھا۔ کیسے شروع کروں، یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا ذرا سی پیٹ میں پڑتے ہی قلم دوڑنے لگے گا۔ یکا یک گلی میں کوئی چلایا، 'خالد میاں...... خالد میاں......'

میرے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ مجھے کسی بھیانک حادثے کا اندیشہ ہوا۔ ہو سکتا ہے یہ گھر ڈھینے والا ہو۔ 'بجیا جی...... بجیا جی......' میں نے زور سے پکارا۔

اپنی چھوٹی بیٹی نصرت کو میں پیار سے، اسی نام سے بلایا کرتا تھا۔ وہ کہیں کھیل رہی تھی، دوڑتی ہوئی میرے پاس چلی آئی۔ میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اوپر اٹھا لیا اور

اسے پیار کرنے لگا۔ اسی لمحے صفیہ آ گئی۔ ہنستے ہوئے بولی، 'آج باپ بیٹی میں بڑا لاڈ ہو رہا ہے۔'

— بیٹھو، صفیہ۔

میں نے نصرت کو گود سے اُتار دیا اور پوچھا، 'تم کھیل رہی تھیں؟'

— جی، ابا۔

— تو جاؤ کھیلو۔

ٹِڈے جیسی دُبلی پتلی نصرت ہنستے ہوئے بھاگ گئی۔

میں نے صفیہ کی طرف دیکھا۔ منٹو کی زندگی میں آ کر یہ کتنی جلدی بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ صفیہ میرے پاس آئی اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، 'آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں، منٹو صاحب؟'

— کیا تمھیں کبھی خالد میاں کی یاد آتی ہے؟

صفیہ کے ناخن میرے کاندھے میں دھنسنے لگے۔ وہ ایک پل کے لیے پتھر کا بُت بن گئی۔

— آج بہت دنوں بعد مجھے اُس کی یاد آئی۔

صفیہ فرش پر یوں ڈھے گئی جیسے طوفان سے اُکھڑ کر درخت ڈھے جاتے ہیں۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت دیر سر جھکائے بیٹھی رہی؛ پھر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا، وہ چہرہ، جو معلوم ہوتا تھا کسی نے پتھر سے تراشا ہے۔

— میں نے خالد میاں کے بارے میں ایک کہانی لکھی تھی، صفیہ، تمھیں کبھی پڑھنے کو نہیں دی۔

— کیوں؟

— اس سے تمھیں تکلیف ہوتی۔

— خالد نے میرے ہاتھ میں دم توڑا تھا، منٹو صاحب، کیا میں نے یہ برداشت نہیں کیا؟

— موت کو برداشت کیا جا سکتا ہے، صفیہ، یادوں کو نہیں۔ ہم زندگی میں بڑی بڑی چوٹیں سہہ جاتے ہیں، صفیہ، ہو سکتا ہے بعد میں وہ ہمیں یاد بھی نہ آئیں۔ لیکن لکھے ہوئے لفظ ہمیں بار بار رُلا سکتے ہیں۔ آخر کہانی میں یادوں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔

— آپ آج وہ کہانی سنائیں گے مجھے؟

—تم سننا چاہتی ہو؟

—خالد کے لیے۔

— کہانی میں میرا نام ممتاز تھا۔ ممتاز ہر روز صبح سویرے اٹھ جاتا اور گھر کے تینوں کمروں کی جھاڑو لگاتا تاکہ ذرا سی بھی دھول مٹی باقی نہ رہے۔ اس کے بیٹے خالد نے ابھی ابھی گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا تھا۔ اس عمر میں بچے، جو فرش پر پڑا مل جائے اٹھا کر منھ میں ڈال لیتے ہیں۔ ممتاز یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ چاہے وہ گھر کو کتنا ہی صاف رکھے، لڑکا منھ میں ڈالنے کے لیے کچھ نہ کچھ ڈھونڈ ہی لیتا تھا۔ چاہے وہ دیوار سے جھڑتا ہوا پلستر ہو یا کمرے کے کسی کونے میں پڑی ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں، اور ممتاز دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتا۔

جیسے جیسے خالد کی پہلی سالگرہ نزدیک آتی جا رہی تھی، ویسے ویسے ایک انجانا خوف ممتاز کے دل پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ہر وقت یہ خوف ستاتا رہتا تھا کہ خالد ایک برس کا ہونے سے پہلے ہی مر جائے گا۔ ایک دن اس نے اپنے اس خوف کے بارے میں اپنی بیوی کو بتایا تو وہ سُن کر حیران رہ گئی۔ ممتاز تو اس طرح کے توہمات پر یقین نہیں کرتا تھا۔ 'تعجب ہے،' اس کی بیوی نے کہا۔ 'آپ ایسی بات کیسے سوچ سکتے ہیں؟ سنیے ممتاز صاحب، ہمارا بیٹا سو سال تک جیے گا۔ میں نے اس کی سالگرہ کے لیے جو انتظامات کیے ہیں، آپ وہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔' لیکن اب بھی وہ خوف کی گرفت میں تھا۔

خالد خاصا صحت مند تھا۔ اس کے گال دیکھ کر لگتا جیسے غازہ لگا رکھا ہو۔ دفتر جانے سے پہلے، ممتاز اپنے بیٹے کو پانی کے ٹب میں بٹھا کر نہلایا کرتا۔ لیکن اس روز خالد کو نہلاتے ہوئے، اس کے ذہن پر کالے بادل منڈلانے لگے۔ 'میری بیوی ٹھیک کہتی ہے،' اس نے خود سے کہا۔ 'خالد کی موت کا یہ خوف میرے دل میں آیا کیسے؟ وہ بھلا کیوں مر جائے گا؟ وہ دوسرے بچوں سے کہیں صحت مند ہے۔ کیا یہ خوف اس وجہ سے ہے کہ میں خالد کو بہت چاہتا ہوں۔'

روز صبح جھاڑو لگا کر، فرش پر دری بچھا کر لیٹے رہنا ممتاز کو بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک دن کے بعد خالد کی سالگرہ تھی۔ اچانک اسے سینے کے اُوپر بوجھ سا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خالد اس کے سینے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ خالد شاید رات ٹھیک

سے سویا نہیں تھا۔ وہ کسی ڈر سے مسلسل کانپ رہا تھا۔ اپنے بیٹے کے جسم کو سہلاتے ہوئے ممتاز نے کہا۔ 'یا الٰہی، میرے بیٹے کی حفاظت کرنا......'

—اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں، ممتاز صاحب، ہلکا سا بخار ہے۔ اللہ کے کرم سے جلدی چلا جائے گا۔ اس کی بیوی چلی گئی۔ ممتاز اپنے بیٹے سے لپٹتا رہا اور اسے چومتا رہا۔

خالد کی پہلی سالگرہ کے لیے ممتاز کی بیوی نے لمبا چوڑا انتظام کر رکھا تھا۔ سارے رشتے دار اور دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ اس نے خالد کے لیے نئے کپڑے سلوائے تھے۔ ممتاز اس تام جھام کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا پہلی سالگرہ خاموشی سے گزر جائے، اس کے بعد کوئی ڈر نہیں رہے گا۔

خالد گھٹنوں کے بل چلتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ممتاز اسی طرح لیٹا رہا۔ اچانک اسے بیوی کے چیخنے کی آواز سنائی دی، 'ممتاز صاحب، جلدی آیئے، ممتاز صاحب۔'

ممتاز دوڑ کر کمرے میں پہنچا۔ اس نے دیکھا اس کی بیوی خالد کو بازوؤں میں اُٹھائے غسل خانے کے سامنے کھڑی ہے۔ خالد ہاتھ پاؤں پٹک رہا تھا، اس نے خالد کو اپنی گود میں لے لیا۔ پانی میں کھیلتے ہوئے اچانک خالد کو غش آ گیا تھا۔ اس کا جسم اس کے ہاتھوں میں بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ ممتاز نے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر ہاتھ پیر پٹکنے کے بعد خالد بے ہوش ہو گیا۔ وہ بالکل بے جان تھا۔ 'خالد مر گیا۔' ممتاز ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

'یا اللہ، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!' اس کی بیوی پلٹ کر چلائی۔ 'ذرا غش آ گیا ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔'

تھوڑی دیر بعد خالد نے آنکھیں کھول دیں۔ ممتاز اس پر جھک گیا اور بولا، 'خالد، میرے بیٹے، کیا ہوا ہے، کہاں درد ہو رہا ہے؟'

خالد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ جوں ہی ممتاز اٹھا کر اسے دوسرے کمرے میں لایا، اسے پھر سے غشی کا دورہ پڑ گیا۔ ممتاز اسے سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ ذرا دیر بعد خالد پھر سے پُرسکون ہو گیا۔ ممتاز ڈاکٹر کو بلانے دوڑا۔ ڈاکٹر نے خالد کا معائنہ کرنے کے بعد کہا، 'بچوں کو کبھی کبھی ایسے دورے پڑ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے پیٹ کے کیڑوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ میں دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔

لیکن خالد کی حالت بگڑتی چلی گئی، اس کا بخار بڑھ گیا۔ ڈاکٹر اگلے دن دوبارہ آیا۔ 'گھبرایئے مت، صاحب۔' اس نے کہا: 'برانکائیٹس معلوم ہوتا ہے۔ تین چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔'

خالد کا بخار بڑھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں کے علاوہ، گھر کے ملازم جمشید کے کہنے پر اسے پڑھا ہوا پانی بھی پلا گیا۔ شام کو ایک دوسرا ڈاکٹر آیا۔ ملیریا کے شک میں اس نے بچے کو کونین کا ٹیکہ لگایا۔ خالد کا بخار ۱۰۴ ڈگری تک جا پہنچا۔ ممتاز نے فیصلہ کیا کہ خالد کو ہسپتال لے جانا چاہیے۔ اس نے تانگہ منگوایا اور بچے اور بیوی کے ساتھ نکل پڑا۔

ممتاز کو ہر وقت پیاس لگی رہتی تھی۔ کتنا پانی پیتا تھا وہ۔ ہسپتال جاتے ہوئے اس نے سوچا، تانگہ رُکوا کر پانی پی لے۔ تبھی یوں لگا جیسے کسی نے اسے کہا ہو: 'یاد رکھو ممتاز، اگر تم نے پانی پیا تو تمھارا خالد مر جائے گا۔' اس کا حلق سوکھ کر لکڑی ہو گیا۔

ہسپتال پہنچ کر اس نے ایک سگریٹ جلایا، لیکن دو تین کش لینے کے بعد اس نے سگریٹ پھینک دیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو: 'سگریٹ مت پیو ممتاز، ورنہ تمھارا بیٹا مر جائے گا۔' کون تھا جو اس کے کانوں میں یہ سب کہہ رہا تھا۔ سب بکواس ہے۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگانے کی کوشش کی، لیکن نہ سلگا سکا۔

خالد کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے انھیں بتایا کہ اسے برانکیل نمونیا ہوا ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔

خالد بے ہوش تھا۔ اس کی ماں اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ ممتاز کو پھر سے پیاس لگنے لگی۔ وہ پانی پینے کے لیے وارڈ کے نل کے پاس گیا ہی تھا کہ اس نے پھر وہی آواز سنی: 'یہ کیا کر رہے ہو ممتاز؟ پانی مت پیو ورنہ تمھارا خالد مر جائے گا۔' لیکن ممتاز نہ رُکا۔ اسے یوں لگا جیسے سمندر بھی اس کی پیاس نہ بجھا سکے گا۔ وہ پانی پی کر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ خالد کا رنگ اور بھی زرد ہو چکا تھا۔ ممتاز کو لگا اگر وہ پانی نہ پیتا تو شاید خالد اتنی جلدی نہ مرجھا جاتا، لیکن اس کے اندر وہی آواز اسے بار بار کہہ رہی تھی کہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے پہلے خالد مر جائے گا۔

شام اُتر رہی تھی۔ متعدد ڈاکٹروں نے خالد کا معائنہ کیا۔ اسے بہت سی دوائیں اور ٹیکے دیے گئے، لیکن خالد کو ہوش نہ آیا۔ دفعتاً اسی آواز نے کہا: 'ممتاز، فوراً ہسپتال سے نکل جاؤ، ورنہ

خالد مر جائے گا۔'

ممتاز ہسپتال سے نکل گیا۔ اس کے سر میں گونجتی وہ آواز اسے مختلف ہدایات دیتی رہی۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ ایک ریستوران میں گیا اور شراب منگوائی۔ جب شراب آ گئی تو اس آواز نے حکم دیا: 'اسے پھینک دو۔' جب اس نے شراب پھینک دی تو آواز نے دوبارہ حکم دیا: 'اور شراب منگواؤ۔' اور شراب آ گئی۔ آواز نے کہا: 'پھینک دو اسے۔'

شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے پیسے چکانے کے بعد ممتاز ریستوران سے باہر نکل آیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس آواز کے علاوہ اور ساری آوازیں اس دنیا سے غائب ہو گئی ہیں۔ وہ ہسپتال لوٹ آیا۔ جب وہ خالد کے وارڈ کی جانب جا رہا تھا، آواز نے اس سے کہا: 'وہاں مت جاؤ ممتاز۔ اگر تم گئے تو خالد مر جائے گا۔'

وہ ہسپتال میں ہی ایک بنچ پر لیٹ گیا۔ رات کے لگ بھگ دس بجے تھے۔ اندھیرے میں صرف ہسپتال کے باہر لگا گھڑیال دکھائی دے رہا تھا۔ 'خالد بچ تو جائے گا نا؟' وہ بڑبڑایا۔ 'بچے کیوں مرنے کے لیے اس دنیا میں آ جاتے ہیں؟ پیدا ہونے کے بعد موت کیوں انھیں اتنی جلدی ختم کر دیتی ہے۔ خالد ضرور......'

اسی آواز نے اس کو کہا: 'ایسے ہی لیٹے رہو، ممتاز۔ جب تک خالد اچھا نہ ہو جائے، ایک انچ بھی مت ہلنا۔'

آخر ممتاز اندر ہی اندر چیخ پڑا: 'اے غفور الرحیم، مجھے بچا۔ اگر تو خالد کی جان لینا چاہتا ہے تو لے لے، پر مجھے کیوں اتنی تکلیف دے رہا ہے؟'

اس کے قریب بیٹھے دو لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

— کتنا پیارا بچہ ہے۔

— اس کی ماں کی طرف دیکھا نہیں جا رہا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹروں کی منتیں کر رہی تھی، روتے ہوئے ان کے پاؤں پڑ رہی تھی۔

— بچہ بچ نہیں سکے گا۔

اچانک ان کی نظر ممتاز پر پڑی — تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ممتاز اٹھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

— کون ہو تم؟ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

ممتاز کا حلق سوکھ چکا تھا۔ 'میں مریض ہوں، ڈاکٹر صاحب۔' وہ بدبدایا۔

— مریض ہو تو یہاں باہر کیا کر رہے ہو؟ اندر جاؤ۔

— سر، میرا بیٹا...... اوپر کے وارڈ میں......

— تمھارا بیٹا؟

— آپ لوگ شاید اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا بیٹا، خالد......

— تم اس کے باپ ہو؟

ممتاز صرف سر ہلا سکا۔

— اور تم یہاں بنچ پر لیٹے ہو؟ فوراً اوپر جاؤ۔

ممتاز دوڑا۔ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا جب وارڈ کے سامنے پہنچا تو اس کی نظر جمشید پر پڑی۔ اس کا بازو پکڑ کر جمشید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ 'خالد میاں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے صاحب۔'

ممتاز وارڈ میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا اس کی بیوی اسی بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں اسے گھیرے ہوئے کھڑی تھیں۔ ممتاز بستر کے پاس آیا۔ خالد آنکھیں موندے پڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سکون پھیلا ہوا تھا۔ ممتاز نے اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیر اور بولا، 'خالد، نانی کھاؤ گے؟'

خالد کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا، 'خالد میاں، میرے ڈر کو تم اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤ گے؟'

ممتاز کو یوں لگا جیسے خالد نے سر ہلا کر کہا ہو، 'جی ابا۔'

کہانی سنتے سنتے، جانے کب صفیہ نے میرا ہاتھ کس کر تھام لیا تھا۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا، اس کی آنکھیں ریگستان کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پکاری، 'ججیا جی...... ججیا جی......'

صفیہ نے اس سے پہلے کبھی نصرت کو اس نام سے نہیں پکارا تھا۔

۲۷

کچھ خوب نہیں اتنا ستانا بھی کسو کا
ہے میرؔ فقیر، اس کو نہ آزار دیا کر

تقدیر کا لکھا دیکھیے، میں یہ سوچ کر کلکتہ گیا تھا کہ رُپیوں سے بھرا جھولا لے کر لوٹوں گا لیکن لوٹا ناداروں کی سی پیوندلگی جھولی لے کر۔ مجھے ایک صوفیانہ قصہ یاد آ گیا، منٹو بھائی۔ ایسے ہی قصوں نے تو مجھے زندہ رکھا ہوا تھا ورنہ میں کب کا مر گیا ہوتا۔ ایک صوفی نے اپنے شاگردوں سے کہا چاہے تم آدمی کی کتنی ہی مدد کرنے کی کوشش کرو، تم پاؤ گے کہ اس کے اندر کچھ ایسا ہے جس کی بدولت وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی اس بات سے ان کے بہت سے شاگردوں نے اتفاق نہیں کیا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنے ایک شاگرد سے کہا، سونے کے سکوں سے بھری ہوئی ایک بوری لے جاؤ اور اسے دریا پر بنے پُل کے اوپر رکھ آؤ۔ پھر دوسرے شاگرد سے کہا، شہر میں کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو، اسے پُل پر لے جاؤ اور پُل پار کرنے کو کہو۔ اس کے بعد دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ شاگردوں نے ان کی ہدایات پر عمل کیا۔ جب وہ شخص، جسے پُل پار کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، دوسرے کنارے پر پہنچا، صوفی نے اس سے پوچھا، 'پُل کے بیچ تمھیں کیا نظر آیا؟'

— کچھ بھی نہیں۔ کیوں؟

— تمھیں کچھ دکھائی نہیں دیا؟

— نہیں۔

—یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک شاگرد نے کہا۔

—میں جب پُل پار کررہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ اگر میں آنکھیں بند کرکے یہ پُل پار کروں تو کیسا رہے گا۔ کیا میں اسے پار کرپاؤں گا؟ اور میں نے پار کرلیا۔

صوفی اپنے مریدین کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

کلکتہ سے واپسی پر مجھے یہ قصّہ بار بار یاد آتا رہا۔ تمھاری راہ میں بھی لاتعداد طلائی مہریں بکھری ہوئی تھیں، غالب میاں، لیکن تم تو اپنی جھونک میں آنکھیں بند کیے چلتے رہے۔ اس لیے تم نے کچھ نہیں پایا۔ بہت بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں سوچا، تو احساس ہوا کہ اس کے علاوہ اور میری زندگی میں ہو بھی کیا سکتا تھا۔ کتنی غلطیاں کی تھیں میں نے۔ دنیاداری کے اصول میں کبھی نہیں اپنا سکا۔ میں سوچتا کچھ تھا اور ہو کچھ اور جاتا تھا۔ ایسا کیوں تھا، بتایئے منٹو بھائی؟ ایسا نہیں تھا کہ میں حقیقت سے غافل تھا، آخر میں نے اپنی پنشن کی رقم کے لیے کلکتہ دوڑ لگائی ہی تھی نا، جس کسی کو خوش کرنے کی ضرورت تھی، اُسے خوش کیا، جسے ستا کر مزہ آیا اسے ستایا بھی۔ لیکن پھر بھی میرا انجام اسی شخص کا سا ہوا، میں نے بھی اسی کی طرح اپنی جھونک میں آنکھیں بند کرکے پُل پار کیا۔

درحقیقت، یہی وجہ رہی کہ مجھے دلّی کے دربارِ شاہی میں جگہ بنانے میں اتنا وقت لگا۔ ویسے اسے جگہ بنانا تو نہیں کہا جاسکتا۔ میں بہ مشکل ہی وہاں تک پایا تھا۔ میں محلّاتی ریشہ دوانیوں کو بھجھ نہیں پایا، اور پھر گوروں کا دور شروع ہونے جارہا تھا۔ مجموعی طور پر، منٹو بھائی، سب کچھ بگڑا ہوا تھا۔ سیاست کو سمجھنا مجھ جیسے احمق کے بس سے باہر تھا۔ شاید کوشش کرنے پر میں کچھ نہ کچھ سمجھ ہی جاتا، لیکن میں نے کوشش کرنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھائی۔ اس ضمن میں استاد ذوقؔ درجۂ اوّل پر فائز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں پناہ بہادر شاہ انھیں اپنی نظروں سے اوجھل ہی نہیں ہونے دیتے تھے۔ لیکن آج آپ کو ذوقؔ کے کتنے اشعار یاد ہیں؟ ایک آدمی دو دو کام نہیں کرسکتا، منٹو بھائی۔ سیاست اور شاعری۔ یہ دو الگ الگ دنیائیں ہیں۔ اگر آپ کسی ایک کو فتح کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو دوسری کو ہارنا ہوگا۔ میں سیاست کی دنیا کو فتح نہیں کرسکا۔ ذوقؔ جب بھی مجھے دیکھتے تو اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ میں دل ہی دل میں کہتا، بہت خوب، میاں، ہنس لو لیکن تم

جانتے تک نہیں کہ دربار کی خدمت گزاری میں شاعری تم سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔ ایک روز ذوقؔ نے ازراہِ مذاق مجھ سے پوچھا، 'مرزا، لوگوں کو تمھارے اشعار سمجھ کیوں نہیں آتے؟ تم اتنا مشکل کیوں کہتے ہو؟'

میں نے مسکرا کر جواب دیا، 'آپ کا دل تو سخت نہیں ہوا تا؟'

— کیا مطلب؟

جواب میں میں نے مومنؔ خان مومنؔ کا یہ شعر پڑھ دیا۔

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

میں جتنا دلّی دربار میں اُلجھتا گیا اتنا ہی مجھے اس بات کا احساس ہوتا چلا گیا کہ سیاست اور شاعری کی کبھی دوستی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے بہادر شاہ ظفرؔ نے ہزاروں شعر کہے، سب کے سب ردّی اور بے کار[1]۔ اور چوں کہ میں اُن کا ملازم تھا اس لیے مجھے ان اشعار کی اصلاح کرنا پڑتی تھی۔ کچھ عرصے تک مجھے انگریزوں پر بھروسا رہا کہ شاید وہ کچھ تبدیلی لائیں گے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد، مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ سب طاقت کا کھیل ہے۔ اور ایک شاعر کو طاقت کے اس کھیل سے دور ہی رہنا چاہیے، ورنہ میری بات لکھ لیجیے منٹو بھائی، شاعری اس سے رخصت ہوجاتی ہے۔ ایسا شاعر دربار میں شعلہ بیانی کرسکتا ہے، مختلف معاملات پر رائے زنی کرسکتا ہے، لیکن یہ — یہ سب بے معنی ہے۔ شاعر سے تو ہمیں شاعری چاہیے تھی، لیکن بدلے میں اس نے ہمیں کیا دیا؟ شہنشاہ بہادر شاہ کی شان میں لکھے ہوئے قصیدے۔ ذوقؔ جیسے شاعر، جو کسی نہ کسی سیاسی قوت کے ہاتھوں بکے ہوئے ہوں، اس کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے تھے؟ ان کی قیمت تو پہلے ہی طے ہوتی ہے۔ سچ کہتا ہوں، منٹو بھائی، اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ذوقؔ کے چوتڑوں پر ایک لات رسید کرتا۔ شاعری کے ساتھ اتنی بے ایمانی! جب آپ سیاست میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کب بے ایمانی آپ کے خون میں شامل ہوگئی ہے۔ سیاست دراصل نقاب بدلتے رہنے کا کھیل ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں کوئی چمک دمک نہیں بچی تھی۔ سب کچھ بِک چکا

---

[1] یہ بات محلِ نظر ہے اور مصنف کو مغالطہ ہوا ہے۔ غالب نے تو بہادر شاہ ظفر کے مصرعوں کی تضمین بھی کی ہے (مترجم)

تھا۔ اس کے باوجود میں نے کتنی ہی سازشیں اور شب خون دیکھے۔

بادشاہ اکبر شاہ، جنھیں اکبر شاہ ثانی کہا جاتا ہے، تخت نشین تھے۔ یہ ضرور ۱۸۴۳ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ مجھے پہلی بار دربار شاہی میں حاضری کا موقع ملا۔ ظفر یا بہادر شاہ کہیے، اگلے شہنشاہ بننے والے تھے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اکبر شاہ اپنے ایک دوسرے بیٹے، سلیم کو جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے، اس بارے میں وہ انگریزوں سے بھی بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے سوچا مجھے بھی سلیم کی حمایت کرنی چاہیے کیونکہ تب تک ظفر ابراہیم ذوقؔ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کر چکے تھے۔ میں نے اکبر شاہ کے لیے ایک قصیدہ لکھا، جس میں سلیم کی خوب تعریف و توصیف کی، بادشاہوں اور شہنشاہوں کی قربت حاصل کرنے کا یہی تو طریقہ تھا۔ لیکن معاملہ اُلٹ ہو گیا۔ انگریزوں نے سلیم کو قبول نہیں کیا، تین برس بعد اکبر شاہ نے انتقال کیا اور بہادر شاہ ظفرؔ تخت نشین ہو گئے۔ آپ میری صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بہادر شاہ نے سختی سے مجھے مسترد کر دیا۔ میں نے ان کی شان میں کئی قصائد لکھے، لیکن نہ انھیں قبولیت بخشی گئی اور نہ ہی مجھے دربار شاہی میں حاضری کا اذن ملا۔ بعد ازاں کالے صاحب اور احسان اللہ خاں کی سفارش پر مجھے دربار میں جگہ تو دے دی گئی لیکن جہاں تک بادشاہ کا تعلق ہے تو میں ان کے گلے کا کانٹا ہی بنا رہا۔

خواہش بڑی بھیانک چیز ہوتی ہے، جو کوئی بھی خواہشوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے، اس کی زندگی شطرنج کے چوخانوں سے باہر جا پڑتی ہے۔ اس پر میرا وہ اندھا اعتماد کہ میری رگوں میں تو مغلوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ امیر خسرو کے بعد مجھ جیسا کوئی فارسی گو پیدا نہیں ہوا۔ میں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اگر دولت نہ ہو تو خون کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اگر آپ مفلس ہیں تو لوگ آپ کی شاعری قدموں تلے روندتے ہوئے گزر جائیں گے۔ مجھے دلّی کالج میں پڑھانے کی نوکری مل سکتی تھی۔ وہاں کسی فارسی پڑھانے والے کی ضرورت تھی۔ ہندوستانی حکومت کے سیکریٹری جیمز تھامسن نوکری کے امیدواروں کے مصاحبے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس ملازمت کے لیے حکیم مومن خان مومنؔ، امام بخش صہبائی اور میرا نام تجویز کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے تھامسن صاحب نے مجھے ہی بلوایا۔ میں نے ایک پالکی منگوائی اور اس پر سوار ہو کر ان کے گھر پہنچا۔ اندر خبر بھجوا کر میں باہر کھڑا رہا۔ جب تک وہ بذاتِ خود آ کر مجھے اندر نہ لے جاتے میں

اندر کیوں جاتا؟ اگر کوئی مرزا آپ کے دروازے پر آئے تو ادب کا تقاضا ہے کہ آپ بذاتِ خود اس کا استقبال کرنے آئیں۔ انگریز صاحب بہادر کافی دیر کے بعد آئے۔ 'آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟' انھوں نے پوچھا۔

میں نے انھیں مرزاؤں کے استقبال کے مجلسی آداب سے مطلع کیا۔ وہ ہنس پڑے، 'جب آپ گورنر کے دربار میں حاضر ہوں گے تب یقیناً آپ کا استقبال حفظِ مراتب کے لحاظ سے کیا جائے گا، لیکن فی الحال تو آپ یہاں ملازمت کے لیے آئے ہیں، مرزا۔'

'عزت میں اضافے کے لیے ہی تو سرکاری نوکری کا عزم کیا تھا۔' میں نے کہا۔ 'لیکن اس کے بجائے میں دیکھتا ہوں کہ جو تھوڑی بہت میری عزت ہے، اب وہ بھی نہ رہے گی۔'

— میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا، مرزا۔

— تو پھر آپ بھی مجھے معاف رکھیے۔ مجھے یہ نوکری منظور نہیں۔ میں نے ان پر دوسری نگاہ بھی نہ ڈالی اور پالکی میں سوار ہو گیا۔ اس ملازمت سے میری صورتِ حال میں کچھ بہتری آ سکتی تھی۔ امراؤ بیگم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ جاتی۔ لیکن خدا نے میری زندگی کے لیے کسی اور ہی کھیل کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔

کلکتہ سے لوٹنے کے بعد شاہجہاں آباد میرے لیے عقوبت خانہ بن گیا۔ مجھ پر چالیس ہزار روپے کا قرض چڑھ چکا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ادائیگی کیسے ہوگی۔ گھر میں اکیلا بیٹھا، مایوسی میں سر کے بال نوچا کرتا۔ جب بھی گھر سے باہر نکلتا، قرض خواہ ٹوٹ پڑتے۔ 'کلکتہ جانے سے پہلے جو وعدے کیے تھے ان کا کیا ہوا میاں؟'

'مجھے کچھ اور مہلت درکار ہے۔' مجھے منمناتے ہوئے کہنا پڑتا۔ 'کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ میرا مقدمہ اب اونچی عدالت میں لگا ہوا ہے۔'

لیکن میں خوب جانتا تھا کہ کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ عدالت عالیہ میں بھیجا جانے والا بیان ایسا ہی تھا جیسے کسی حبشی کے گھنگھریالے بالوں کی جھاڑن، جیسے کسی عاشقِ نامراد کے دل سے رستا خون، جیسے پھانسی گھاٹ پر کیا جانے والا سزائے موت کا اعلان۔

ایک طرف تو قرض خواہ تھے اور دوسری طرف شمس الدین کے چاپلوس مصاحبین، جو

آنکھیں نچا نچا کر اور حماقت آمیز مسکراہٹ چہروں پر سجا کر مجھ سے پوچھتے: 'کلکتہ میں کیا ہوا، ذرا ہمیں بھی بتایئے، میاں؟' وہ سب جانتے تھے کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ لیکن لوگوں کو دوسروں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا شوق ہوتا ہے۔ میں ان کے تمسخر کا نشانہ بن چکا تھا۔ میں گھر سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے دیوان خانے میں اکیلے بیٹھے، میں تافتہ صاحب، میر اعظم علی اور باقر کو خط پر خط لکھا کرتا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے میں ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ باتیں کرنے کو اور تو کوئی تھا نہیں، نہ تو گھر میں اور نہ ہی شاہجہان آباد میں۔ میری ساری گفتگو دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں سمجھ گیا کہ اس دنیا میں میرا اپنا کوئی ملک نہیں ہے اور یہ کہ میں یہاں جلاوطنی پر آیا تھا۔

ایک سہ پہر امراؤ بیگم اچانک دیوان خانے میں چلی آئیں۔ میں تب ایک نئی غزل کہہ رہا تھا اور کپڑے میں گرہیں لگاتا جا رہا تھا۔ آپ کپڑے میں گرہ لگانے کی میری عادت کو نہیں جانتے نا؟ یہ میری ایک پرانی عادت تھی۔ کون جانے کب اور کیسے کوئی غزل ذہن میں وارد ہو جائے۔ مجھے کاغذ قلم لے کر بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ میں شعر کہتا جاتا اور کپڑے میں گرہیں باندھتا جاتا۔ ہر گرہ کا مطلب تھا ایک نیا شعر۔ بعد میں کسی سے لکھوا لیتا۔ ہر گرہ کھولنے پر ایک شعر نمودار ہو جاتا۔ میری ضروریات زیادہ نہیں تھیں، منٹو بھائی۔ مجھے اپنا گھر بنانے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ کچھ پس انداز نہ کر پانے کا بھی کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ میرا کنبہ آسودہ رہے، اچھا کھائے پیے، اور یہ کہ ہر شام مجھے میری پسند کا پینے کا سامان میسر ہو۔ میں نے زندگی بھر کوئی کتاب نہیں خریدی — میں نے سب کتابیں مستعار لی تھیں۔ میرے گھر میں کوئی کتاب نہیں تھی، منٹو بھائی۔ ضرورت ہی کیا تھی؟ خدا نے یہ کتابِ دل کس لیے دے رکھی ہے؟

میں پھر بہک رہا ہوں۔ ہاں تو ایک سہ پہر امراؤ بیگم میرے پاس آئیں۔ اس وقت ایک خاص شعر میرے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

حقیقتاً میں کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت میں تھا۔ ہر وقت یہی لگتا تھا کہ بس موت ہی مجھے اس

ذلت اور بے عزتی سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ خیر، میرے چاہنے سے تو موت آ نہیں سکتی تھی — وہ تو تبھی آتی جب اس کا وقت آتا۔ لیکن آخر ساری رات نیند کیوں نہیں آتی؟ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی ہی گور کے سرہانے بیٹھا ہوں۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود کو گھر میں نظر بند کر لوں۔ باہر قدم نکالتے ہی قرض خواہ گھیر لیتے تھے۔ کبھی کبھار میرے گھر پر بھی چڑھائی کر دیتے تھے۔ دو ساہوکاروں نے کچہری میں شکایت درج کروا دی۔ حکم آ گیا — یا تو پانچ ہزار روپے ادا کرو ورنہ جیل خانے جاؤ۔ میں پانچ ہزار روپے کہاں سے لاتا؟ اس لیے میں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ شاہجہاں آباد کے شرفاء کے لیے ایک غیر تحریری قانون موجود تھا۔ چاہے گرفتاری کا پروانہ بھی موجود ہو، کسی شخص کو بھی اس کے گھر سے گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مجھے اپنے گھر میں نظر بند ہونا پڑا۔ دوست احباب بھی ملنے نہیں آتے تھے۔ شاید اسی کو کافرانہ زندگی گزارنا کہتے ہیں، منٹو بھائی۔ لیکن میری اذیت اُس اذیت سے دُگنی تھی جو کسی کافر کو سو سال جہنم میں رہ کر ہوتی ہو گی۔ عرفی کا شعر ہر وقت ذہن میں آتا تھا:

نصیب نے میرے پیالے میں جو زہر انڈیلا ہے اس کی کڑواہٹ نے میرے دل کو جلا کر خاک کر ڈالا ہے۔
میرا دل اُمید اور نا اُمیدی کے جھولے میں جھولتا رہتا ہے۔

'میں نے سنا ہے آپ گھر سے بالکل نہیں نکلتے، مرزا صاحب۔' بیگم نے کہا۔
'کیا تم میرے روز و شب کی خبر رکھتی ہو، بیگم؟' میں نے مسکرا کر پوچھا۔
— کیا آپ کبھی طنز کیے بغیر بات نہیں کر سکتے؟
— میں طنز کیوں کروں گا؟ تم تو مسجد میں رہتی ہو، ایک کافر کی خبر وہاں کیسے پہنچتی ہو گی؟
— شاید میں آپ کی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہوں۔ ہے نا؟
— ایسا کیوں کہتی ہو؟ مذاق بھی نہیں سمجھتیں؟ بیٹھ جاؤ، بیگم۔ میں نے انھیں ساری صورتِ حال بتائی۔
— لیکن آپ اس طرح بسر کیسے کریں گے، مرزا صاحب؟
— بسر تو کر ہی رہا ہوں، بیگم۔

— نہیں، یوں بند رہنے سے تو لوگ پاگل ہوجاتے ہیں۔ آپ کے دوست کیوں نہیں آتے آپ سے ملنے؟

— کون ہیں یہ دوست؟ میرے لیے تو بس ایک ہی دوست ہے۔ اجل۔ معلوم نہیں وہ کب آئے گی۔

— یا اللہ! آپ موت کی بات کیوں کرتے ہیں؟

— زندگی سے اور کیا چاہوں؟ میں ایک بے مقصد زندگی گزار رہا ہوں۔ کوئی ترتیب نظر نہیں آتی۔ کسی ترتیب کا سوچا تو گیا تھا۔ کئی دنوں سے مولانا رومؔی کے مرشد شمس الدین تبریزی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس وقت شمس الدین نوجوان تھے۔ وہ کئی دنوں سے سو نہیں پا رہے تھے، ان کی بھوک بھی اُڑ گئی تھی۔ گھر والے بار بار پوچھتے تھے، کیا ہوا ہے محمد — جی ہاں، ان کا اصل نام محمد ملک داؤد تھا — تم سو کیوں نہیں پا رہے، کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ شمس الدین نے جواب دیا۔ 'اللہ نے مجھے خاک سے بنایا ہے۔ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟ پھر میں کیوں کھاؤں اور سوؤں؟ میں جاننا چاہتا ہوں اس نے مجھے کیوں بنایا، میں یہاں کب آیا، اس کے بعد کہاں جانا ہے مجھے؟ اگر وہ مجھے جواب دے دے، صرف تبھی میں کھا پاؤں گا اور سوؤں گا۔' کاش میں بھی اپنی زندگی کی ترتیب دیکھ پاتا، بیگم۔

— تو پھر میرا مذاق کیوں بناتے ہیں، مرزا صاحب؟

— میں تمھارا مذاق نہیں بناتا، بیگم۔ لیکن ہماری راہیں الگ الگ ہیں۔ تمھارا خدا مسجد میں رہتا ہے، جس کے لیے تم پانچ وقت نماز ادا کرتی ہو۔ مولوی اور ملاّ تمھیں راہ دکھاتے ہیں اور میرا خدا درگاہ میں رہتا ہے، جہاں مولانا رومی رقص کناں رہتے ہیں اور سماع کرتے ہیں۔ میرا راستہ تمھارے لیے نہیں ہے، بیگم۔ میں مسرت اور جشن میں خدا کو پاتا ہوں۔

— میں بھی، مرزا صاحب۔ لیکن آپ تو مجھ سے بات تک نہیں کرتے۔ یہ کہتے ہوئے امراؤ بیگم آبدیدہ ہوگئیں۔ پہلی بار، منٹو بھائی، مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی لمبے عرصے سے یہ قید کاٹ رہی ہیں۔ کبھی ایک بار اگر ان کی جانب میں ہاتھ بڑھا پاتا۔ لیکن میں نہیں بڑھا پایا۔ اگر ایک بار آپ گمراہ ہوجائیں، منٹو بھائی، تو دوبارہ راہِ راست پر آنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

امراؤ بیگم محل سرا لوٹ گئیں اور اسی کے ساتھ میں نے کپڑے میں گرہ لگائی۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے، سروِ چراغاں کا

بنو بیگم، یہ میں تمھیں کہہ رہا ہوں۔ اگر وقت ملا تو میں دکھادوں گا کہ میرے دل کا ہر زخم دراصل پھوٹ نکلنے والا ایک بیج ہے۔

قید کے ان دنوں میں ایک دوست کا ساتھ مجھے میسر رہا — میری شاعری کا۔ میں نے اس سرِ نہاں، اس غنائیت سے پوچھا، بتاؤ میرے نصیب میں یہ عمر قید کیوں لکھی ہوئی ہے؟ معلوم ہے اس نے جواب میں کیا کہا؟ کیا تم خود کو اس کوے جیسا سمجھتے ہو جسے پکڑا ہی اس لیے جاتا ہے کہ بعد میں چھوڑ دیا جائے؟ تمھیں اس قفس میں اس لیے بند کیا گیا ہے کہ تم عندلیب ہو، تم آنے والی کئی نسلوں کو نغمے سناؤ گے۔ ہم اپنے لیے کتنے فریب تیار کرکے رکھتے ہیں! غالب کی ناکامی لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی، منٹو بھائی۔ میرا گھر تاریکی میں ڈوب چکا۔ میں گل شدہ شمع کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنے تاریک چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ میں وقت کا حساب نہیں رکھ پاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنم سے اسی حجرے میں قید ہوں۔ جو بھی بات چیت ہوتی، بس کلّو سے ہوتی۔ شام کو جب وہ میری شراب لاتا تو کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاتا۔ اس کا تو بس ایک ہی نشہ تھا — قصے۔ وہ کچھ کہتا نہیں تھا، بس بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہتا اور میرے بولنے کا انتظار کرتا۔ اگر میں کچھ بولتا تو وہ قصہ سننے کی ضد کرنے لگتا۔ میں نے اتنا عجیب آدمی کبھی نہیں دیکھا، بھائیو۔ قصہ ختم ہونے کے بعد وہ ایک لفظ بھی نہیں کہتا تھا۔ روز روز قصہ کون سنائے؟ لیکن میں کبھی کبھی اسے قصہ سنا دیا کرتا، ورنہ قصوں کے بغیر کلّو کیسے رہتا؟ ایک دن میں نے اسے ایک دلچسپ عشقیہ قصہ سنایا۔ میں آپ کو بھی سناتا ہوں۔ آپ لوگوں کو پسند آئے گا، میرے بھائیو۔ غالب کی کفن پوش زندگی کی کہانیاں کب تک سنیں گے؟

یہ ایک حسینہ کی کہانی ہے۔ اس کا نام جہاں آرا تھا۔ کیسا تھا اس کا حُسن؟ ایسا ہی جیسا میر صاحب نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

اُس کے فروغِ حُسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

تین نوجوان، جہاں آراء سے شادی کرنے کی غرض سے نواب کے دربار میں آئے۔ تینوں میں سے کوئی بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ نواب صاحب فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اپنی بیٹی کا بیاہ کس نوجوان سے کریں۔ آخر انھوں نے اپنی بیٹی ہی سے انتخاب کرنے کو کہا۔ خدا کی شاید یہی منشا تھی۔ مہینے گزر گئے، لیکن جہاں آراء کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اس کی شادی ہی نہ ہو سکی اور ایک ناگہانی بیماری نے اس کی جان لے لی۔ اُن تینوں نوجوانوں نے مل کر اسے قبر میں اُتارا۔ پہلا نوجوان وہیں قبرستان میں رہ گیا۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ تقدیر کا یہ کیسا کھیل ہے جس نے اس کی محبوبہ کو اتنی جلدی اس دنیا سے اٹھا لیا۔

دوسرے نوجوان نے فقیری اختیار کر لی اور راستوں پر نکل کھڑا ہوا۔ وہ اس نازنین کی موت کا سبب جاننا چاہتا تھا جسے وہ چاہتا تھا۔ اور تیسرا نوجوان نواب صاحب کو تسلی اور دلاسہ دینے کے لیے وہیں ان کے پاس ٹھہر گیا۔

وہ نوجوان جو فقیر ہو چکا تھا، ایک دن ایک انجان بستی میں پہنچا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہاں ایک ایسا شخص رہتا ہے جو معجزے کر سکتا ہے۔ نوجوان فقیر اس کے در پر حاضر ہوا۔ جب وہ رات کے کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے، تو اس دانا شخص کا نواسا رونے چلّانے لگا۔ وہ دانا آدمی فوراً اٹھا اور اس نے لڑکے کو اٹھا کر آگ میں پھینک دیا۔

'یہ آپ نے کیا کیا؟' نوجوان فقیر چیخ اٹھا۔ 'میں نے دنیا میں بڑے بڑے گناہ اور ظلم ہوتے دیکھے ہیں، لیکن کیا کوئی ایسا بہیمانہ عمل کر سکتا ہے؟'

دانا شخص مسکرایا اور بولا، 'اتنا پریشان مت ہو۔ بعض اوقات معمولی واقعات بھی درست آگہی نہ ہونے کی وجہ سے، غیر معمولی معلوم ہوتے ہیں۔' اس نے ایک منتر پڑھا اور اسی وقت بچہ آگ میں سے باہر نکل آیا۔

نوجوان فقیر نے وہ منتر یاد کر لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے ملک واپس لوٹ آیا۔ اپنی محبوبہ کی قبر پر آ کر جیسے ہی اس نے وہ منتر پڑھا، جہاں آراء اس کے سامنے ظاہر ہو گئی۔ بیٹی کے لوٹ آنے پر نواب نے سارے ملک میں جشن کا اہتمام کیا۔ تینوں نوجوان جہاں آراء سے شادی کرنے کے لیے ایک بار پھر جمع ہو گئے۔ کیا آپ کو معلوم ہے جہاں آراء نے کسے منتخب کیا؟ اس نے اپنے چاہنے والے کو منتخب کیا۔ جانتے ہیں اس کا چاہنے والا کون تھا، منتو بھائی؟ مجھے یوں حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ اگر آپ اس کا جواب نہ دے پائے تو میں آپ کو ادیب نہیں مانوں گا۔

جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے! معلوم تھا آپ بتا دیں گے۔ جس نوجوان فقیر نے جہاں آراء کو زندگی دی۔ وہ اس کا جذبۂ انسانیت تھا۔ تیسرے نوجوان نے نواب کو ایک بیٹے کی طرح سے سکھ اور آرام دیا۔ لیکن پہلا والا — جی ہاں، وہی حقیقی عاشق تھا، جو اس سارے عرصے کے دوران اس کی قبر پر بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ موت بھی اسے دور نہ کر پائی۔

دن اسی طرح بیت رہے تھے کہ ایک دن میں نے سنا، دلّی کے ریزیڈنٹ فریزر صاحب کا کسی نے قتل کر دیا۔ یا اللہ!

۲۸

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

بمبئی شہر مجھ سے باتیں کیا کرتا تھا، مرزا صاحب۔ اور کیوں نہ کرتا؟ ہماری زندگیوں میں، میری اور بمبئی شہر کی، اتنی مماثلتیں جو تھیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ شہر میری آمد کا منتظر تھا۔ یہاں تک کہ تقسیم کے بعد جب میں لاہور چلا گیا، میرے بھائیو، تب بھی مجھے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے میں اب تک بمبئی ہی میں ہوں۔ بمبئی کے ساتھ میرا یہ معاشقہ بارہ برسوں پر محیط تھا، جب میں نے شہر چھوڑا مجھے یوں لگا جیسے کسی پرندے کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔ یہ بمبئی ہی تھا جس نے مجھ ایسے آوارہ گرد کو پناہ دی تھی۔ چاہے تم یہاں دن میں دس پیسے کماؤ یا دس ہزار روپے، منٹو — بمبئی نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی — تم یہاں خوب مزے کر سکتے ہو، اگر تم کرنا چاہو۔ یا پھر تم یہاں دنیا کے سب سے ناخوش آدمی کی طرح زندگی گزار سکتے ہو۔ تم جو جی چاہے یہاں کر سکتے ہو۔ کوئی تمھیں نہیں ٹوکے گا۔ کوئی تمھیں نیکوکار بننے کے لیے مجبور نہیں کرے گا۔ ساری مشکلات تمھیں خود ہی اٹھانا ہوں گی۔ ہاں، سارے اہم فیصلے تمھیں خود ہی کرنا ہوں گے۔ تم چاہے فرش پر رہو یا کسی محل میں، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر تم مجھے چھوڑ بھی جاؤ تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں وہیں رہوں گا جہاں میں ہوں۔ بمبئی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لے گیا اور اپنے گلی کوچوں سے جان پہچان کروائی، اپنے شائستہ قرب و جوار سے، سمندر سے، اپنے دنوں اور راتوں سے، اپنے جوش اور سرخوشی سے، اپنے گناہوں اور زوال سے مجھے متعارف کروایا۔ کبھی کبھی

مجھے لگتا ہے اگر میں نے کبھی کسی کو چاہا تھا تو وہ یہ شہر تھا، اور کوئی نہیں۔

مرزا صاحب کی زندگی کی مقابلے میں میری زندگی نہایت غیر اہم تھی، میرے بھائیو۔ اس لیے اگر میں اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہوں تو مجھے کتنے ہی اور لوگوں کے بارے میں بتانا ہوگا۔ بمبئی ہی نے مجھے ان سب لوگوں سے مجھے متعارف کروایا تھا۔ میں اپنے افسانوں کے سب کرداروں کو جانتا ہوں، محض جانتا ہی نہیں ہوں — درحقیقت میں نے ان کے ساتھ زندگی گزاری ہے، وہ میری روح کے ساتھی تھے۔ میں نے جو بھی لکھا وہ سب — وہ سب ہی ذاتی تھا۔ میرا اپنا دیکھا اور سنا ہوا اور تجربہ کیا ہوا۔ میں کسی خاص طرح کی سیاست سے متاثر نہیں تھا۔ اسی لیے مجھے کبھی ترقی پسند کہا گیا تو کبھی رجعت پسند۔ ٹنوں کاغذ خرچ کر کے ترقی پسند ادب کے نام پر سوویت یونین میں جو کچھ شائع ہوا اس سے زیادہ وحشت ناک اور ریاکارانہ چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اسے ادب نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے دنیا کو کبھی سیاسی یا فلسفیانہ عینک سے نہیں دیکھا، میرے بھائیو۔ میں نے اسے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اگر میں نے کسی ایسے شخص کی کہانی سنی جسے میں جانتا نہیں تھا تو بھی میں نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ زندگی ہمارے لیے کیا لے کر آئی ہے۔ چلیے، تو میں آپ کو پیرن کی کہانی سناتا ہوں۔ میں نے پیرن کو کبھی نہیں دیکھا، صرف اس کے بارے میں برج موہن سے سنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ پیرن گویا بمبئی کی روح تھی۔

میں ایک کھولی میں رہا کرتا تھا، جیسا کہ میں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔ برج موہن میرے سامنے والے کمرے میں رہا کرتا تھا۔ ہر اتوار کو وہ اپنی گرل فرینڈ پیرن سے ملنے باندرہ جاتا تھا۔ پیرن ایک پارسی لڑکی تھی۔ برج موہن کا اس سے کیا رشتہ تھا، میں کبھی ٹھیک سے نہ سمجھ سکا۔ وہ ہر اتوار کو باندرہ کیوں جاتا تھا؟ پیرن اس کی زندگی میں کسی بچی لت کی طرح تھی۔ مجھے ہر بار اس کو کرائے کے لیے آٹھ آنے اُدھار دینا پڑتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ کئی گھنٹے گزارتا اور پھر لوٹ آتا۔ 'تم اس کے ساتھ کیا کرتے ہو؟' میں اس سے پوچھتا، 'کیا تم لوگ باہر جاتے ہو، یا پھر گھر میں ہی رہتے ہو اور پیار و یار کرتے ہو؟'

— ارے نہیں! برج موہن ہنسا۔ 'میں پیرن کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔'

— کراس ورڈ پزل؟

—وہ جو السٹریٹڈ ویکلی' میں چھپتے ہیں۔ وہ یہ حل بھیجتی ہے۔ اس کو چھوٹے چھوٹے کئی انعام مل چکے ہیں۔

برج موہن کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ بس سر نیوڑھائے پیرن کے لیے کراس ورڈ پزل حل کیا کرتا۔ ایک دن میں نے پوچھا: پیرن کو انعام ملتے ہیں، تمھیں کیا حاصل ہوتا ہے؟'

— کچھ بھی نہیں۔

— کیا وہ انعام کی رقم میں سے تمھیں کچھ نہیں دیتی؟

— نہیں۔

— کیوں؟ آخر تمھی تو اس کے لیے یہ حل کیا کرتے ہو؟

—تو کیا ہوا؟ پیرن یہ حل اپنے نام سے بھیجتی ہے۔ وہ انعام جیتتی ہے۔ وہ کیوں مجھے رقم دے۔

—تم انتہائی احمق ہو۔

برج موہن اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا ہنس پڑا۔

وہ تصویریں کھینچا کرتا تھا۔ اس نے مجھے پیرن کی بے شمار تصویریں دکھائی تھیں۔ الگ الگ پوز اور کپڑوں میں۔ شلوار قمیض میں، ساری میں، فراک اور ڈھیلے پاجامے میں، یہاں تک کہ تیراکی کے لباس میں۔ پیرن تصویروں میں قطعاً خوبصورت نہیں لگتی تھی۔ لیکن میں نے یہ بات کبھی برج موہن سے نہیں کہی، مرزا صاحب۔ خوبصورتی تو دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں نا یہ میرے ہی حواس ہیں جنھوں نے زمرد کو سبز بنادیا ہے۔ میں نے برج موہن سے پیرن کے بارے میں کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اس نے بھی مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ میں بس اتنا جانتا تھا کہ ہر اتوار کو برج موہن ناشتے کے بعد مجھ سے آٹھ آنے مانگے گا اور وہ مجھے دینا ہی ہوں گے۔ وہ ہمیشہ دوپہر کے کھانے تک لوٹ آتا تھا۔ ایک اتوار کو وہ لوٹا تو اس نے خلاف معمول مجھ سے کہا: آج معاملہ ختم ہوگیا۔'

— کیا مطلب؟

—میں نے تم کو کبھی بتایا نہیں، منٹو بھائی، پیرن میری زندگی میں نحوست کی طرح ہے۔

میں جب بھی اس سے ملتا ہوں، میری نوکری ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے آج یہ کہہ دیا۔

—اس پر اُس نے کیا کہا؟

—اس نے کہا تم مجھ سے ملنا چھوڑ دو۔ اور جا کر کام تلاش کرو۔ تم سمجھتے ہو کہ تمھیں میری وجہ سے کام نہیں ملتا، مگر تم اوّل درجے کے نکھٹو اور کام چور ہو۔

—تم نے کیا جواب دیا؟

— کوئی بات نہیں، منٹو بھائی، میرا خیال ہے کل مجھے یقیناً کام مل جائے گا۔ صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ نانو بھائی سے ملوں گا۔

سیٹھ نانو بھائی ایک فلم ڈائریکٹر تھا۔ یہ برج موہن کو ملازمت دینے سے متعدد مرتبہ انکار کر چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اگلے دن برج موہن کو کرائے کے لیے پیسے دیے۔ رات کو میں نے یہ سنا کہ نانو بھائی نے اُسے دو سو پچاس روپے پر ملازم رکھ لیا۔ برج موہن نے جیب سے سو روپے نکالے اور کہا: یہ رہا ایڈوانس۔ جی تو میرا چاہتا ہے کہ باندرہ جاؤں اور پیرن کو بتاؤں۔ لیکن ڈر ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں اگلے ہی دن ملازمت سے فارغ کر دیا جاؤں گا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے، منٹو بھائی۔ اِدھر ملازمت ملی، اُدھر پیرن سے ملاقات ہوئی۔ اور مجھے فارغ کر دیا گیا۔ خدا معلوم کس گھڑی میں اس لڑکی کا جنم ہوا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کوئی بہت ہی منحوس گھڑی ہوگی۔ سنو منٹو بھائی، اب میں کم از کم ایک برس تک اس کا منھ نہیں دیکھوں گا۔ مجھے ایسا کرنا ہی ہوگا۔ تم نے میرے کپڑوں کی حالت دیکھی ہے؟ اگر میں سال بھر اپنی ملازمت برقرار رکھ لوں تو کم از کم کچھ اچھے کپڑے بنوا لوں گا۔

اگلے چھ مہینے تک برج موہن پیرن سے ملنے نہیں گیا، مرزا صاحب۔ وہ دل لگا کر کام کرتا رہا، اور اس نے کئی نئے کپڑے بنوا لیے تھے۔ اسے رومال جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے بہت سے خوبصورت کشیدہ کاری والے رومال خریدے۔ اچانک ایک دن اس کے نام ایک خط آیا۔ اسے پڑھتے ہی برج موہن چیخا: سب ختم ہوا، منٹو بھائی۔'

— کیوں، کیا ہوا؟

—پیرن کا خط ہے۔

— کیا لکھتی ہے؟

— کہتی ہے اتوار کو مجھ سے ملو۔ لگتا ہے اسے مجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ آج سنیچر ہے نا؟

—ہاں۔ تو پھر؟

—اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیٹھ نانو بھائی پیر کو مجھے نکال باہر کرے گا۔

—تو پیرن کے پاس مت جاؤ۔

—یہ نہیں ہو سکتا، منٹو بھائی۔ وہ بلائے تو مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔

— کیوں؟

برج موہن کچھ دیر چپ رہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ 'ملازمت کرتے کرتے کچھ میں بھی اُکتا چکا ہوں، منٹو بھائی۔ آخر چھ مہینے سے اُوپر ہو گئے ہیں۔'

اگلے دن برج موہن باندرہ گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس نے مجھ سے پیرن کے بارے میں کوئی بات نہ کہی۔ 'دیکھتے ہیں کل کیا گل کھلتا ہے۔' حاجی کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے بس اتنا کہا۔

برج موہن پیر کے روز دفتر سے لوٹ کر آیا تو بہت زور سے ہنسا— میں جانتا تھا، منٹو بھائی، میں جانتا تھا۔ پیرن نے اپنا کام کر دکھایا۔

— کیا ہوا؟

—اسٹوڈیو بند ہو گیا، منٹو بھائی، صرف میری وجہ سے۔ اگر میں کل پیرن سے نہ ملا ہوتا—

برج موہن گردن میں کیمرا لٹکا کر باہر نکل گیا۔ اتنی رات کو وہ کیمرا لے کر کہاں گیا ہوگا؟

برج موہن اب پھر بیکار تھا۔ اس کی جمع پونجی بھی ختم ہو گئی تھی اور پرانا ڈھرا پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ ہر اتوار کو ناشتے کے بعد وہ مجھ سے باندرہ جانے کے لیے آٹھ آنے اُدھار لیتا۔ کچھ گھنٹے پیرن کے ساتھ گزارتا اور لوٹ آتا۔

ایک دن میں نے برج موہن سے پوچھا، 'کیا پیرن تم سے محبت کرتی ہے؟'

— نہیں۔

—تو تم ہر اتوار کو اس سے ملنے کیوں جاتے ہو؟

—میں جائے بغیر رہ نہیں پاتا، منٹو بھائی۔

— کیا پیرن—

'ہاں، وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔' برج موہن غصے سے چلّایا۔ 'تو اس میں غلط کیا ہے؟'

—غلط بات تو کوئی نہیں، لیکن پھر وہ تمھیں کیوں بلواتی ہے؟

—وہ بہت اکیلی ہے۔

— کیوں؟

—پتا نہیں۔ اس نے مجھے بتایا نہیں کبھی۔

بستر پر لیٹا اور چھت کو گھورتا ہوا، برج موہن کہتا رہا، 'ہو سکتا ہے میں اسے دلچسپ لگتا ہوں۔ آپ کو ایسے لوگ چاہیے ہوتے ہیں جن سے آپ دل بہلا سکیں، منٹو بھائی۔ شاید اس لیے کہ میں اس کی تصویریں کھینچتا ہوں۔ وہ تصویروں میں بہت بہتر نظر آتی ہے نا۔ یا پھر، کون جانے، شاید اس لیے کہ میں اس کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔ آپ ان لڑکیوں کو کبھی نہیں جان سکتے، منٹو بھائی۔'

— کیوں نہیں۔

— کیونکہ آپ کو پیار چاہیے۔

—اور تمھیں؟

—معلوم نہیں۔ لیکن میں پیرن جیسی لڑکیوں کو خوب پہچانتا ہوں۔

— کیسی ہوتی ہیں وہ؟

—وہ کسی سے پیار کرتی ہیں، لیکن جب اس میں وہ نہیں پاتیں جو وہ چاہتی ہیں، تو اسے کسی اور میں تلاش کر لیتی ہیں۔ وہ ذہنی طور پر اس شخص کے گرد سانپ کی طرح کنڈلی بنا لیتی ہیں اور اس آدمی کو اپنے بدن تک نہیں پہنچنے دیتیں۔

—تو پھر تم جاتے کیوں ہو؟

— کیونکہ مجھے مزہ آتا ہے۔

— کس بات کا؟ پیرن تو تمھیں کچھ دیتی نہیں۔

برج موہن مسکرایا — دیتی ہے۔ وہ اپنی نحوست مجھ پر استعمال کرتی ہے، منٹو بھائی۔ میں تو ایک کھیل کھیل رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں وہ میری زندگی میں اپنی نحوست کے کتنے سیاہ بادل بھیج سکتی ہے۔ پیرن کا جواب نہیں۔ ہر بار جب میں اس سے ملتا ہوں، میری نوکری چھوٹ جاتی ہے۔ اب تو میری ایک ہی خواہش ہے۔

— وہ کیا؟

— کہ میں اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔

— وہ کیسے؟

برج موہن کچھ دیر چپ رہا۔ کمرے میں کسی چوہے کے کٹ کٹ کرکے کسی چیز کو کاٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اپنے بستر سے اُٹھ کر برج موہن نے آگے پیچھے ٹہلنا شروع کر دیا۔'

کیا تم نے پیرن کو چکمہ دینے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے؟' میں نے دوبارہ پوچھا۔

— ہوں......

— کیا منصوبہ ہے؟

— ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے میں علاحدہ ہو جاؤں گا۔ یعنی خود اپنے مالک سے کہہ دوں گا، جناب مجھے معلوم تھا آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں، لیکن میں خود استعفیٰ دے رہا ہوں تاکہ آپ کو زحمت نہ ہو۔ میں اسے کچھ اور بھی بتاؤں گا، کہ یہ آپ نہیں تھے جو مجھے برطرف کر رہے تھے بلکہ یہ میری دوست پیرن تھی جو مجھے نکال رہی تھی۔ بس یہی خواہش ہے، منٹو بھائی۔

— عجیب وغریب خواہش ہے۔

— ہاں۔

برج موہن کمرے سے نکل گیا اور بہت دیر بعد لوٹا۔' کہاں گئے تھے؟' میں نے پوچھا۔

— آسمان کو دیکھنے۔ میں رات کو زیادہ دیر تک بستر پر نہیں لیٹ پاتا، منٹو بھائی۔ مجھے کھولی میں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے میں آسمان کی جھلک دیکھنے چلا جاتا ہوں۔

— کیا دیکھا کرتے ہو، برج موہن؟

— کچھ نہیں۔

— ستاروں کو دیکھتے ہو؟

— میں صرف ایک گہرا نیلا اندھیرا دیکھتا ہوں، منٹو بھائی، جس کے اندر میری عجیب وغریب خواہشات چمک اٹھتی ہیں۔ گذشتہ اتوار کو میں نے پیرن کی ایک تصویر اُتاری۔ اس کا دوست جس سے وہ محبت کرتی ہے اسے اپنے نام سے ایک کمپی ٹیشن میں بھیجے گا۔ مجھے یقین ہے اس تصویر کو انعام ملے گا، منٹو بھائی۔

— تم اس آدمی کو جانتے ہو؟

— نہیں۔ وہ پہلے بھی کئی بار میری کھینچی ہوئی پیرن کی تصویروں پر انعام حاصل کر چکا ہے۔

— پیرن نے تمھیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟

— نہیں۔

ایک اتوار کو برج موہن باندرہ سے واپس آیا تو اس نے کہا:' لیجیے منٹو بھائی، اس بار میں نے معاملہ واقعی ختم کر دیا۔ اب مجھے جلد ہی کوئی ملازمت مل جائے گی۔ سیٹھ نیاز علی ایک نئی فلم پروڈکشن کمپنی بنا رہا ہے۔ کیا تم اس کے دفتر کا پتا لگا کر دے سکتے ہو؟

— دیکھتا ہوں۔

میں نے ایک دوست کو فون کر کے سیٹھ نیاز علی کے دفتر کا پتا معلوم کیا۔ برج موہن اگلے دن اس سے ملنے گیا۔ جب وہ لوٹا تو ہنستے ہوئے بولا:' تنخواہ دو سو روپے ماہوار۔ لیکن سیٹھ نیاز علی نے کہا ہے کہ بڑھا دے گا۔ امید ہے تمھیں خوشی ہوئی ہوگی۔'

— تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔

— میں اب مطمئن ہوں۔ برج موہن نے خود کو بستر پر گرا دیا۔

' کیا اب تم پیرن سے ملنے نہیں جاؤ گے؟' اگلے دن میں نے اس سے پوچھا۔

برج موہن مسکرایا۔' میں جانا چاہتا ہوں، لیکن نہیں، منٹو بھائی، اس بار جلد بازی نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ نئے کپڑے خریدنے ہیں۔ یہ دیکھو، پچاس روپے ایڈوانس ملا ہے۔ پچیس تم رکھ لو۔'

— کس لیے؟

— اُدھار چکتا کر رہا ہوں۔

وقت ایسا مشکل نہیں تھا، مرزا صاحب۔ سو روپیہ ماہوار میں کما لیتا تھا۔ برج موہن ظاہر ہے، مجھ سے دُگنے پیسے کما رہا تھا۔ ہمیں پیسوں کی طرف سے تنگی نہیں تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کھولی کی زندگی کے لیے یہ کافی تھا۔

تقریباً پانچ مہینے بعد، برج موہن کے نام ایک خط آیا۔ لفافے پر نظر ڈالتے ہی اس نے کہا: 'ملک الموت۔' میں سمجھ گیا کہ پیرن کا خط ہے۔

برج موہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ 'وہ اتوار کو ملنا چاہتی ہے،' خط پڑھنے کے بعد اس نے مجھے بتایا۔ 'اشد ضروری ہے۔'

— جاؤ گے؟

برج موہن اُچھلا — ظاہر ہے میں جاؤں گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، منو بھائی، کہ پیرن بلائے اور میں نہ جاؤں؟

کسی نئے فلمی گانے کی دھن پر سیٹی بجاتا، برج موہن بستر پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں جھلانے لگا۔

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر میں نے کہا: 'پیرن کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں برج موہن۔ تم نہیں جانتے میں کتنی مشکل سے ہر اتوار کو تمھیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا کہ تم اس سے مل آؤ۔'

برج موہن قہقہہ لگا کر ہنس پڑا — مجھے سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ اب دن پھر آنے والے ہیں، منو بھائی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ تم کس طرح مجھے ہر اتوار کو آٹھ آنے دیا کرو گے۔

اگلی ہی صبح برج موہن پیرن سے ملنے چلا گیا۔ رات کو میں نے اس سے پوچھا: 'کیا کہا پیرن نے؟'

— کچھ بھی نہیں۔

— اُس نے لکھا تھا نا اشد ضروری کام ہے۔

— وہ تو اس کی عادت ہے۔ شاید وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی ہے۔

— کیوں؟

— کوئی نہیں جانتا۔ لیکن میں نے اس سے کہہ دیا، یہ بارہویں مرتبہ ہے کہ میں تمھاری وجہ سے برطرف ہو رہا ہوں۔ تم پر رحمت ہو زرتشت کی۔

— پیرن نے کیا کہا؟

— فقط یہ کہ — تم ایک کلی ایڈیٹ ہو۔

— ٹھیک کہا اس نے۔ میں مسکرا دیا۔

— سوفی صد درست۔ برج موہن ہنس پڑا۔ میں صبح جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دوں گا۔

— کیوں؟

— تاکہ وہ مجھے نکال نہ سکے۔ میں نے استعفیٰ وہیں پیرن کے ہاں لکھ لیا تھا۔

اس نے مجھے استعفے کا کاغذ دکھایا۔

دوسری صبح برج موہن جلدی نکل گیا۔ جب میں رات کو لوٹا تو میں نے اسے بستر پر لیٹا ہوا پایا، وہ چھت کو گھور رہا تھا۔ 'اب کس کے پاس نوکری کے لیے جاؤ گے۔' میں نے پوچھا۔

— کس لیے؟ برج موہن بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

— کیا پیرن کے فضل سے کچھ ہوا نہیں آج؟

برج موہن کچھ کہے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔

'میں نے سیٹھ نیاز علی کو اپنا استعفیٰ پیش کیا، منو بھائی،' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ 'تو سیٹھ نے تھوڑی دیر بعد مجھے ایک خط تھما دیا۔ میری تنخواہ دو سو بڑھا کر تین سو روپے کر دی گئی ہے۔'

اس دن کے بعد پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ بعد میں مجھے اس نے بتایا: 'اگر پیرن کی نحوست ختم ہوگئی ہے تو پھر وہ بھی ختم ہوگئی۔ میری زندگی کا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ختم ہوگیا۔ اب کس کے سبب میں استعفیٰ دوں گا، منو بھائی؟'

اس دن میں نے پہلی بار پیرن کو دیکھا۔ وہ بحیرۂ عرب کے ساحل پر پڑی سو رہی تھی۔ ایک تاریک جہاز دور سمندر کی لہروں پر تیر رہا تھا۔ بمبئی ایسے ہی تصوراتی لوگوں کا شہر ہے، مرزا صاحب۔

۲۹

رہ گزرِ سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصدِ تم تعمیر کا

کلکتہ سے لوٹنے کے بعد، میری اسیری کے سترہ برس کسی نہ کسی طرح کٹ ہی گئے، منٹو بھائی۔ مجھے ہر وقت میر صاحب کی یاد آیا کرتی۔ انھیں ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور میر صاحب بُڑبُڑاتے رہتے تھے۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

ہاں، منٹو بھائی، یہ گُل بڑے سنگ دل ہوتے ہیں، انھیں کسی اور کی پروا نہیں ہوتی۔ یہ تو بس اپنی ہی خوشبو میں مست جھومتے رہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہے، کیوں؟ کیا اس لیے کہ ان کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے؟ یا پھر اس لیے کہ یہ بہت جلد مرجھا کر زمین پر آ رہتے ہیں؟ زمین پر تو ہم بھی آ رہتے ہیں، بس یہ ہے کہ پھولوں سے کچھ زیادہ جی لیتے ہیں اس دنیا میں، پھر بھی ہم پھولوں کے پاس جاتے ہیں، انھیں پیار سے چھوتے ہیں، لیکن پھول ہمیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ کیا آپ یہ تمنا نہیں کرتے، منٹو بھائی، کہ آپ کسی پھول کی صورت پیدا ہوئے ہوتے؟ کھلتے اور رات بھر اپنی خوشبو بکھیرتے، اور پھر صبح دم زمین پر آ رہتے۔ کیسی انوکھی تخلیق ہے یہ خالقِ کائنات کی — یہ حیاتِ گُل — جیسے ایک سُر بیدار ہوتے ہی دوسرے سُر میں مدغم ہو جائے۔ معلوم ہے پھول کی حیات کیسی ہوتی ہے؟ جیسے میاں تان سین کے گلے سے ترنم کا بیج پھوٹ

پڑے — زندگی اور موت اس بیج کے اندر تیز حرارت سے یوں پگھل چکی ہو، جسے آپ ساری زندگی بھول نہ سکیں۔ جب میں بوڑھا ہو گیا اور میں نے اپنی زندگی کی جانب پلٹ کر دیکھا تو چہار باغ والی بیگم فلک آرا، مجھے سُر کا ایسا ہی کوئی بیج معلوم ہوئیں جو شاید کہیں کسی طوائف کے گلے سے پھوٹا اور بکھر کر رہ گیا، جس کی روشنی، کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کی مانند اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور میں پُرشوق نظروں سے اس حیاتِ گُل کو دیکھتا دیکھتا بوڑھا ہو گیا۔

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو

وہ فقط ایک بار آئی، منٹو بھائی۔ مت پوچھیے کہ اُس کے ایک بار آنے سے میرا کیا کچھ چلا گیا۔ صبر و سکوں، صحت اور طاقت، حوصلہ اور جوانی، اور جانے کیا کیا کچھ — میں نے سب کھو دیے۔ اور بدلے میں مجھے کیا دیا؟ محض درد۔ موت سے پہلے، رات کو چیر ڈالنے والی ایک پکار۔ وہ دیکھیے۔ وہ پکار مرزا غالب کے ایک یتیم شعر کو لیے جاتی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

جی ہاں، برادران، عشق، زیست کے کتنے ہی مزے لے کر آیا، میں نے اس میں ہر درد کی دوا پائی، لیکن جو درد اس نے مجھے دیا، یا خدا، وہ بے دوا تھا، جس کی دوا آپ کے پاس نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں ہوتی؟ کیونکہ خدا خود ایک درد ہے۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی، منٹو بھائی، ویسے ویسے مجھے محسوس ہوتا چلا گیا کہ اللہ ہی حقیقی درد ہے۔ درد کے سوا ہماری حیات کا گواہ اور کون ہو سکتا ہے؟

ارے نہیں، یوں بے قرار نہ ہوں برادران، میں جانتا ہوں کہ مجھے فریزر صاحب کے قتل کا قصہ آپ لوگوں کو سنانا ہے۔ بات یہ ہے، اب اپنی زندگی کی کہانیاں سنانے کو اور جی نہیں چاہتا۔ خود کو جتنا مٹا سکوں، اتنا ہی سکون ہے۔ میں نے کچھ مدت شعر گوئی ترک کر دی تھی — لیکن ناداری اور محرومی کے سبب نہیں، اور نہ ہی اس وجہ سے کہ کوئی اسے پڑھے گا نہیں۔ مجھے لگا تھا یہ وقت خود سے ہمکلام ہونے کا ہے۔ جی ہاں، یقین کیجیے، منٹو بھائی، میں نے درد کی قدم بوسی کے لیے اپنے فن کو مار ڈالا تھا۔ میں سمجھتا ہوں ایک فن کار کو زندگی میں اس ایک لمحے کی شناخت ضرور کر لینی

چاہیے کہ جب وہ لازماً اپنے فن کا خون کر ڈالے گا۔ آخر وہ اس دنیا میں کیوں آیا ہے۔ نہیں، کچھ تخلیق کرنے کے لیے نہیں۔ خدا کے بعد کوئی کچھ تخلیق نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس کی تخلیق کی نقل کر سکتے ہیں۔ ہم صرف زندگی کو چھو سکتے ہیں۔ خدا کا یہ تحفہ بے مثل و بے نظیر ہے، منٹو بھائی۔ کلکتہ سے لوٹتے ہوئے ایک دن بارش میں میں نے ایک سنسان ٹیلے کو دیکھا۔ وہ ایک سرسبز قطعۂ زمین کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا، اور اس کے قدموں میں لاتعداد کائی زدہ قبریں تھیں۔ میں رو پڑا۔ زندگی کتنی تنہا، کتنی حسین اور بارش کے دُلار سے شرابور تھی۔ ایک شب دیر گئے کسی صوفی کامل نے گریہ کرتے ہوئے کہا تھا: ہم اس دنیا کے بند تابوت میں اپنی کوتاہیوں اور نادانیوں سمیت زندہ ہیں۔ سن رہے ہو نا تم لوگ؟ جب اجل تابوت کا ڈھکن کھولنے کو آئے گی، ہم میں سے وہ جن کے پر ہیں، ازل کی جانب پرواز کر جائیں گے، اور جن کے پر نہیں ہیں یونہی قید رہیں گے۔ ڈھکن کھلنے سے پہلے کچھ کر لو، دوست، کچھ ایسا جو تمھیں کسی پرندے میں بدل دے اور تم اپنے پَر اُگا لو۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنے بازوؤں کو پروں میں تبدیل کر لو۔' میں یہ سب جانتا تھا، منٹو بھائی، لیکن میں اپنے پَر نہ اُگا سکا۔ اور ایک دن میں ریزہ ریزہ ہو کر میدان میں پڑا تھا، مردہ، اور میرا چہرہ شاہجہاں آباد کے خرابے میں گڑا ہوا تھا۔

یوں بے صبرے نہ ہوں، برادران۔ اس بوڑھے کو ذرا اپنے ہی ڈھنگ سے سرگزشت کرنے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کوئی بھی قصہ نہ چھوڑوں گا۔ تو ایک رات فریزر صاحب کا قتل ہو گیا۔ انھیں کشمیری دروازے کے پاس گولی ماردی گئی۔ خبر سُن کر میں ساکت رہ گیا۔ فریزر صاحب دلّی کے ریزیڈنٹ ضرور تھے، لیکن آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مراسم دوستی کے تھے۔ وہ دوسرے انگریزوں سے مختلف تھے۔ وہ اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمارے ملک کو جاننا چاہتے تھے، اور قاعدے قانون کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔ میں نے ان کے کتب خانے سے لاتعداد کتابیں مستعار لیں۔ ہم متنوع موضوعات پر گفتگو کیا کرتے۔ انھوں نے ہی پہلی بار مجھے صوفی کامل جامی کی حیرت انگیز کہانی سنائی تھی۔ کیا میں آپ کو وہ کہانی سناؤں، برادران؟ آدمی کیا ہے؟ جامی نے پوچھا۔ نور کا عکس۔ اور یہ دنیا؟ بحرِ بیکراں کی ایک موج۔ کیا نور کو اس کے عکس سے علاحدہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا بحر سے اس کی موج کو جدا کیا جا سکتا ہے؟

یاد رکھو، یہ عکس اور یہ موج، نور اور بحر ہی ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔ فریزر صاحب کے ساتھ میری دوستی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ جائیداد کے قانونی معاملات میں وہ شمس الدین کے سوتیلے بھائیوں امین الدین اور ضیاء الدین کی مدد کیا کرتے تھے۔ اور میں شمس الدین کو، ظاہر ہے، ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

فریزر صاحب کے قتل کے جرم میں کریم خان کو گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ شمس الدین کا ملازم تھا۔ دلّی کے مجسٹریٹ کے ساتھ میری دوستی تھی۔ سر پر قرض کا پہاڑ ہونے کے سبب میں دن کی روشنی میں گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے صرف رات کے وقت ہی میں الوؤں کی طرح مجسٹریٹ صاحب کے گھر کی طرف اُڑ کر جا سکتا تھا۔ ہم نے فریزر صاحب کے قتل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ میں نے شمس الدین کے بارے میں کبھی کوئی بات نہ کی۔ لیکن تفتیش سے پتا چلا کہ اسی نے فریزر صاحب کے قتل کے لیے کریم خان کو مقرر کیا تھا۔ دونوں کو سرِ عام شاہجہاں آباد کی سڑک پر پھانسی دے دی گئی۔ میں پھانسی دیکھنے نہیں گیا لیکن میں نے سنا کہ پھانسی کا منظر دیکھنے کے لیے خلقت اُمڈ پڑی تھی۔ لوگوں کی سفاکی کی کوئی حد نہیں، منٹو بھائی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انگریز بھی ایسے ہی وحشی لوگ تھے۔ کون جانے، شاید تہذیبوں کی تاریخ، کسی دوسرے نکتہ نظر سے، وحشیانہ پن کی تاریخ سے بڑھ کر کچھ بھی نہ ہو۔

اس واقعے کے فوراً بعد شاہجہان آباد میں میرے متعلق بے پَر کی اُڑنے لگی۔ گویا شمس الدین کی پھانسی کا بظاہر ڈ‍‌ت‌ے دار میں ہی تھا۔ جیسا بوؤ گے، ویسا کاٹو گے، لیکن کوئی اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ایک روز امراؤ بیگم نے بھی پوچھا؛ مرزا صاحب، کیا آپ نے مجسٹریٹ صاحب سے شمس الدین بھائی کے متعلق کچھ کہا تھا؟'

— تمھیں یقین ہے کہ میں نے کچھ کہا ہوگا؟

— سب یہی کہہ رہے ہیں۔

— اور اس لیے سچ ہے؟

— میں جانتی ہوں......

— کیا جانتی ہو تم؟

— کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔

— پھر بھی تم نے یہ پوچھا۔

— مجھے معاف کر دیجیے۔

— شمس الدین خواہ میرا کتنا بڑا دشمن رہا ہو، کیا میں اس کی موت کی آرزو کر سکتا تھا؟

— مجھ سے خطا ہو گئی، مرزا صاحب۔

— جسے لوگوں کا مجمع کہہ رہا ہو وہ سچ نہیں ہو سکتا، بیگم۔ سچ صرف تنہا فرد کا ہوتا ہے۔ مجموعی رائے لامحالہ جھوٹ ہو گی۔

میں امراؤ بیگم کا ہاتھ تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ یہ ایک نئی طرح کی محبت تھی۔ اس میں فنا ہو جاؤ، اسد۔ تمھاری راہ کہیں اور ہے۔ بن جاؤ آسان، کلہاڑے سے توڑ ڈالو قید خانے کی دیواریں۔ فرار ہو جاؤ، جنم لو رنگوں میں —— ابھی۔ مر جاؤ، اور خاموش رہو۔ خاموشی کا مطلب ہے تم مر چکے ہو۔ اپنی ساری زندگی تم خاموشی سے بھاگتے رہے۔ وہ دیکھو، خاموش چاند اب فلک پر طلوع ہو رہا ہے۔

مجھ پر شمس الدین کا قاتل ہونے کی مہر لگ گئی تھی، میرے عزیزو۔ کئی برسوں تک، اس کی قبر دلّی کے لوگوں کے لیے مرجع خلائق بنی رہی۔ اور فوجی بغاوت کے دوران، اگرچہ بہت سے انگیریزوں کی قبروں کو نہیں چھیڑا گیا، مگر فریزر صاحب کی قبر تاراج کر دی گئی۔ لوگ کسی انسان کے انفرادی وجود کو نہیں دیکھتے بلکہ اُسے اس کے عقیدے کی بنا پر پرکھتے ہیں۔

انگریزوں نے بھی، ہم مسلمانوں کو شبہ کی نظر سے، اور ہندوؤں کو مختلف نظر سے دیکھا۔ معلوم ہے کیوں؟ کیوں کہ یہ ہندو ہی تھے —— بنگالی ہندو، جنھوں نے احیاء کا پرچم اٹھا رکھا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر سود خور مہاجنوں اور تاجروں سے بڑھ کر کچھ نہیں تھے، منٹو بھائی۔ سراج الدین صاحب نے کلکتہ سے مجھے کئی خط لکھے، میں نے جواب بھی دیا۔ ان کے خط پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ کلکتہ دراصل ایک دو چہروں والا شہر تھا، چونکہ وہ دارالحکومت تھا، اس لیے وہاں تعلیم تہذیب و تمدن اور سب چیزوں کے لیے ایک بھرپور فضا قائم تھی، لیکن وہ روح، وہ پران جس کا ذکر ندھو بابو کے گیتوں میں تھا، وہاں مفقود تھی۔

شاہجہاں آباد میں بھی وہ روح موجود نہ تھی۔ دربار شاہی لنگڑی چال چل رہا تھا۔ انگریز سب کچھ ہڑپ کرتے جا رہے تھے۔ ان کی خوراک شارک مچھلیوں جیسی تھی، منٹو بھائی۔ ایک دن کلّو دیوان خانے میں ایک فقیر کو ساتھ لیے حاضر ہوا۔ وہ فقیر کتنی ہی دیر نظر جما کر میری طرف دیکھتے رہے۔

— کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

— بُرا وقت آ رہا ہے، میاں۔

— اور کتنا بُرا وقت آئے گا میری زندگی میں؟

— میں تمھاری بات نہیں کر رہا۔

— تو پھر؟

— شاہجہاں آباد کربلا بن جائے گا، میاں۔

'کیا آپ کو مجھ میں وہی کربلا دکھائی دی ہے۔' میں مسکرایا۔

— مختصراً۔ میں تم میں پورے شاہجہاں آباد کو دیکھ رہا ہوں، میاں۔ اس شہر کی ساری پرانی حویلیاں اور مسجدیں تباہ ہیں۔ لوگوں کو گلیوں میں پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ عورتیں چیتھڑے لٹکائے گھوم رہی ہیں۔ بکریوں کے پیٹ سے سانپ جنم لے رہے ہیں۔

میں زور سے ہنس پڑا —— یہ سب کب رونما ہو گا، قبلہ؟

— ہو گا، دنیا سے جانے سے پہلے تم یہ ہوتا ہوا دیکھو گے میاں۔

— اور میرے ساتھ کیا ہو گا؟

— تم تب انسانِ کامل بن جاؤ گے۔

— مذاق مت کیجیے قبلہ۔ مجھ میں انسانیت نہیں ہے۔

— کوئی انسان بن کر پیدا نہیں ہوتا، میاں۔ تم آگ میں جل جل کر ہی علمِ کامل حاصل کر سکتے ہو۔ لو، میں تم کو ایک قصہ سناتا ہوں۔

کلّو اُچھل پڑا —— ہاں، ہاں، قصہ ہو جائے، بابا۔ کلّو فقیر کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

— ایک دن اپنے مریدوں کو دین کی تلقین کرتے ہوئے صال عبداللہ کو حال آ گیا۔ ان

کی آنکھیں سرخ ہوگئیں، وہ اپنے سر کو ہلانے لگے اور ان کا جسم مسلسل جھٹکے کھانے لگا۔ بعد میں ابنِ سلیم نے اُن سے پوچھا، 'آپ کو کیا ہوگیا تھا، مرشد؟' عبداللہ مسکرائے اور بولے، 'تم جو سوچ رہے ہو، وہ بات نہیں ہے۔ مجھ پر کسی قوت نے قبضہ نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس، وہ میری کمزوری تھی۔' ایک اور مرید نے سوال کیا، 'اگر یہ کمزوری تھی تو پھر قوت کیا ہے؟' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد عبداللہ نے جواب دیا، 'جب تم کسی قوت کے قبضے میں ہوتے ہو تو تمھارا جسم اور تمھارا دل، دونوں پُرسکون ہوجاتے ہیں۔' کچھ سمجھے، میاں؟ ایسا آدمی ہی انسانِ کامل ہوتا ہے۔

—بابا— کلّو نے فقیر کے پاؤں پکڑ لیے۔

— کہو، بیٹا۔

—ایک قصہ اور، بابا۔

کلّو فقیر کے قصے میں محو ہوگیا، میں اپنی کوٹھری، اپنے شیطانی حجرے میں چلا آیا۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اپنی اس خودساختہ نظر بندی کے دوران ہی میں اپنے لیے کچھ کام کرسکا۔ میں نے اپنی اردو غزلیات کا دیوان مرتب کیا۔ میں نے بہت سا کلام نکال دیا۔ دوبارہ پڑھنے پر مجھے محسوس ہوا تھا کہ بہت سی غزلیں دیوان میں شامل کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ فضلِ حق نے ٹھیک ہی کہا تھا، بہت سی غزلوں پر فارسی کا اثر تھا، اگرچہ وہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اور تب تک میں جان چکا تھا کہ جو شعر پہلی ہی بار تیر کی طرح جگر کے پار نہ ہو، بطور فنی شہ پارہ اُس کی کوئی قیمت نہیں۔ اصل میں، منٹو بھائی، جب ہم نوجوان ہوتے ہیں تو زیبائش کی چیزیں اور پُرتکلف لباس ہمیں مائل کرتا ہے۔ ہم دکھاوا کرنے کے لیے نمائشی انداز میں لباس زیب تن کرتے ہیں۔ لیکن جب تک خوبصورتی باطن سے نہ اُبھرے اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے فارسی مضامین کی تدوین بھی مکمل کرلی۔ پانچ جلدوں کا ایک انتخاب تیار ہوگیا۔ پانچویں جلد میں میں نے دوستوں کے نام لکھے جانے والے اپنے خطوط شامل کیے تھے۔ میں نے اس مجموعے کو 'پنج آہنگ' کا نام دیا۔ وہ خطوط پڑھ کر آپ کافی لطف اندوز ہوتے۔ ایک بات اور بتاؤں؟ مجھے خود اپنی ہی فارسی نثر پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ خود کو میں شاباش دیتے ہوئے کہتا، ماشااللہ، کیا عمدہ تحریر لکھی ہے، میاں، بہت خوب۔ ہنس کیوں رہے ہیں منٹو بھائی؟ کیا آپ نے کبھی یوں اپنی پیٹھ

نہیں تھپتھپائی؟ کسی افسانے کو لکھ کر، کبھی آپ کو نہیں لگا، یا میرے مولا، کیا واقعی مجھ میں ایسا ہنر ہے؟ کیا میں اتنے دنوں تک اسے لے کر پھرتا رہا ہوں؟ اس میں بُری بات کیا ہے، منٹو بھائی؟ کیا کوئی فنکار خود اپنی اتنی سے توصیف بھی نہیں کرسکتا؟ آپ کو زندگی بھر خود میں یہ لطیف سی پسندیدگی قائم رکھنی چاہیے۔

چلیے برادران، میں آپ کو الف بیگ کے نام لکھے گئے اپنے خط کی بابت کچھ بتاتا ہوں۔ آپ کو لطف آئے گا۔ الف بیگ کے ہاں پیرانہ سالی میں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے نومولود کا نام تجویز کرنے کی خواہش کی۔ میں نے جواب میں انھیں لکھا، مجھے آپ کے پسر کا نام تجویز کرنے کے لیے شمہ برابر بھی سوچنا نہیں پڑا— اس میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ بغیر کسی زحمتِ فکر کے یہ قطعہ زبان پر آگیا:

چوں الف بیگ در کہن سالی
پسرے یافت سربسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد، بلی
الف منحنی بود، ہمزہ!

پیرانہ سالی میں الف بیگ کے ہاں پسر تولد ہوا ہے جو سربسر حسین وجمیل ہے۔ میں اس کا نام حمزہ تجویز کرتا ہوں کہ الف منحنی ہوکر ہمزہ ہوجاتا ہے

کیا یہ بات درست نہیں ہے، برادران؟ الف ایک سیدھی لکیر ہے اور ہمزہ خمیدہ۔ پیرانہ سالی میں سب کا جسم خمیدہ ہوجاتا ہے۔

میں اسی طرح اپنے شیطانی حجرے میں بیٹھا، خطوط لکھ کر روز لوگوں پر پھبتیاں کس کر دن بسر کررہا تھا کہ دفعتاً میرے ایک انگریز قرض خواہ میک فرسن نے دوسو پچاس روپے کی قرض کی رقم کے حصول کے لیے، میرے خلاف عدالت سے ایک حکم نامہ جاری کروالیا۔ شومئی قسمت میں اُسی دن گھر سے باہر نکلا اور ایک انگریز سپاہی نے مجھے فی الفور گرفتار کرلیا۔ مجھے جیل خانے بھیجا چاہتے تھے کہ لوہارو کے نواب، میرے دوست امین الدین نے آکر مجھے بچالیا۔ انھوں نے میری جانب

سے چار سو روپے ادا کیے اور معاملے کو نمٹایا۔ بھائیو، کیا اسے کہتے ہیں انسان کی زندگی؟ آپ کتنی دیر خود کو کسی کوٹھری میں بند رکھ سکتے ہیں؟ اور اگر آپ باہر نکلیں تو قید آپ کی منتظر ہو۔ پھر بھی میں نے مسکراتے ہوئے خود سے کہا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

شمس الدین کی پھانسی کے بعد، فیروز پور جھرکا کی نوابی ضبط کر لی گئی۔ انگریز راج میں مجھے پنشن ملا کرتی تھی۔ وہی ساٹھ روپے آٹھ آنے۔ ان آٹھ آنوں نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا منٹو بھائی۔ میرے نصیب میں ہر چیز آدھے روپے پر ہی مقرر رہی، مجھے پورے روپے کی قدر کبھی نہیں ملی۔ لیکن اس حالتِ زار کے باوجود کچھ خاص لوگوں کی محبت نے مجھے بچائے رکھا۔ جب فضلِ حق صاحب نے دِلّی چھوڑی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل میں کوئی عمارت ڈھے گئی ہو۔ ان جیسے نیک طینت کتنے تھے شاہ جہان آباد میں؟ ان کے علم و فضل کی گہرائی اور حدیں ان کی حساسیت سے ملتی تھیں۔ وہ جس عہدے پر تعینات تھے وہ ان کی قابلیت کے مطابق نہیں تھا۔ پھر بھی وہ یہ ملازمت کر رہے تھے۔ لیکن انگریز تذلیل کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے تھے۔ انھیں اس کے لیے موقعوں کی ضرورت نہیں تھی، وہ ہمیشہ ہم لوگوں کو کسی بلندی پر کھڑے ہو کر دیکھتے تھے جیسے کہ ہم کیڑے مکوڑے ہوں۔ اسی لیے تو اپنے پیروں تلے کچلنے سے پہلے وہ لحظہ بھر بھی نہیں سوچتے تھے۔ ٹھیک اسی انداز میں انھوں نے فضلِ حق صاحب کی تذلیل کی۔ ایک دیانت دار شخص ہونے کے باوصف انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن وہ بیکار بیٹھے رہنے والے شخص بھی نہیں تھے۔ نواب فیض محمد خاں انھیں پانچ سو روپے ماہانہ کے وظیفے پر اپنی ریاست لے گئے۔ میں دِلّی میں دل شکستہ پڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فضلِ حق صاحب نے بھی آنسوؤں سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ دِلّی کو الوداع کہا تھا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ بہادر شاہ نے اپنا دوشالہ اُتارا اور فضلِ حق صاحب کے شانوں پر اڑھاتے ہوئے، اور اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے ان سے کہا: جب آپ مجھے الوداع کہیں گے تو میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔ لیکن جب میں آپ کو خدا حافظ کہوں گا، تو خدا ہی جانتا ہے یہ لفظ کہنے میں مجھے کتنی اذیت ہوگی، میرا عزیز ترین دوست، میری غزلوں کا حقیقی

مبصر، تذلیل کا بوجھ اُٹھائے شاہجہاں آباد سے رخصت ہو گیا۔

لیکن پھر ایک اور شخص میری زندگی میں آیا۔ اب کیا خدا مجھ سے بالکل ہی دست بردار ہو جاتا؟ میں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے روپ میں ایک دوست کو پایا۔ وہ مجھ سے نو برس چھوٹے تھے اور شاہجہاں آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد افغانستان سے آئے تھے۔ شیفتہ عربی و فارسی کے ماہر تھے اور نہایت عمدہ غزل کہتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ شراب اور عورت ہی شیفتہ کی زندگی کی دو بہاریں تھیں۔ رمضو طوائف کے ساتھ ان کا آشنائی کا تعلق تھا۔ رمجو طوائف کوئی ایسی ویسی طوائف نہیں تھی۔ وہ جتنی مال دار تھی اُتنی ہی صاحب علم بھی تھی۔

شیفتہ نے کتنی بار میری مدد کی، اس کی تو تعداد بھی مجھے یاد نہیں، برادران۔ بس ایک وہی تھے جو زندگی کے تاریک ترین لمحوں میں بھی میرے ساتھ کھڑے رہے۔ خدا کی قسم، وہ مجھے شاعری کی روح معلوم ہوتے تھے، کسی افترا سے جس کی نیک نامی پر داغ نہ آیا ہو۔ اس دوران، آگرہ میں میری والدہ فوت ہو گئیں اور بھائی یوسف پوری طرح سے پاگل ہو گیا۔ میں برداشت نہ کر پایا، اور میں نے ایک بار پھر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ میں نے اپنے شیطانی حجرے میں جوئے کا اڈّا کھول لیا۔ جوا تو میں پہلے ہی کھیلا کرتا تھا، جس کی وجہ سے ایک بار پانچ سو روپے کا جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا تھا۔ مگر اس بار میں نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ اپنی جیت سے اپنی قسمت بدل ڈالوں گا۔ اس زمانے میں دِلّی میں جوئے پر سخت پابندی تھی لیکن چونکہ بڑے بڑے انگریز صاحبوں سے میری صاحب سلامت تھی، اس لیے میں نے سوچا مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہی گمان مجھے لے ڈوبا، منٹو بھائی۔ جوئے کی محفلیں دن بہ دن زیادہ سرگرم ہوتی چلی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ رقم بھی ہاتھ آنے لگی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۳۰

تماشائے گلشن، تقاضائے چیدن
بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

ہوسکتا ہے میری آمدنی کچھ ایسی زیادہ نہ رہی ہو، مرزا صاحب، لیکن میں نے صفیہ کے ہمراہ زندگی کا لطف لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ وہ مجھے سمجھنا چاہتی تھی۔ اس لیے، ابتداء میں میری شراب نوشی پر معترض ہونے کے باوجود آخر اس نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن وہ ہر وقت اس پر کڑی نگاہ رکھتی تھی کہ میں کہیں حد سے تجاوز نہ کروں۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے بھائیو کہ میں اپنے گھر کو کتنی توجہ دینے لگا تھا۔ میں فرش پر خود جھاڑو لگاتا، اور ساری جھاڑ پونچھ کرتا۔ کبھی کبھی میں کھانا پکانے میں بھی مدد کر دیا کرتا۔ مجھے کھانا پکانے میں مزہ آتا تھا، خاص طور پر کباب، سکتے ہوئے گوشت اور مسالوں کی خوشبو مدہوش کر دینے والی ہوتی تھی۔ بمبئی کی فلم نگری سے میرا تعلق گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا، اس فلمی دنیا میں خود کو ایسا امیر حمزہ تصور کرتا تھا، لاکھوں مہمات جس کی منتظر ہوں۔ جب میں پاکستان چلا گیا تو میں نے بمبئی کی فلمی دنیا کی ان رنگین ہستیوں کے بارے میں 'گنجے فرشتے' لکھی۔ میں ان کے حقیقی نقوش دیکھنا چاہتا تھا۔ بغیر نمائشی لباس اور بغیر سرخی اور غازے کے۔ کچھ لوگوں نے اس پر سخت اعتراض کیا۔ لیکن ایسا سماج جائے بھاڑ میں جو کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے کارناموں کو اس لیے پاک صاف کر کے پیش کرتا ہے تا کہ یہ دکھا سکے کہ وہ شخص کس قدر نیک اور قابلِ احترام تھا۔ مجھے یاد ہے عصمت کا مضمون 'دوزخی' ساقی میں چھپا تھا۔ اُس نے اس مضمون میں اپنے مرحوم

بھائی عظیم بیگ چغتائی کو برہنہ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ خاکہ پڑھنے کے بعد میری بہن اقبال نے کہا: 'یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے مرے بھائی کو بھی نہیں بخشا کم بخت نے۔ کسی مضمون میں ایسی باتیں لکھنا کیا اچھی بات ہے؟'

میں نے اُس سے کہا: 'اقبال، اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج مرنے کو تیار ہوں۔'

— میں تمھارے بارے میں؟ لکھوں گی کیا؟

— یہی کی تمھارا سعادت جہنم کے نچلے درجے کا کیڑا تھا۔

— تم پاگل ہو، سعادت۔ اپنے پیاروں کے بارے میں کیا کوئی اس طرح سوچ سکتا ہے؟

— اپنے کسی پیارے کو ہی اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے، اقبال۔ آپ اس کی برا چھائی برائی سے واقف ہوتے ہیں۔ آپ اس کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کر سکتے۔ کیا آدمی، کسی بھی عیب کے بنا، صرف اور صرف خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے؟

— تم ادیب ہو، تم اس طرح سوچ سکتے ہو۔

— نہیں، اقبال، تم بھی اس طرح سوچ سکتی ہو۔ تم صرف سچائی کو تسلیم کرنے سے ڈرتی ہو۔ کسی دن تمھیں ستارہ کی کہانی سناؤں گا۔ اس جیسی عورت سو سال میں جنم لیتی ہے۔ اور پھر بھی اس کی شہرت کتنی بُری تھی۔ لوگ سمجھتے ہیں سیکس کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ بھی نہیں تھا۔

نہیں، برادران، زیادہ اُتاولے نہ ہوں آپ۔ ستارہ کی کہانی میں نے تاش کے پتے کی طرح ہاتھ میں چھپا رکھی ہے، مناسب وقت آنے پر اس پتے کو کھیلوں گا۔ اس شیرنی کی کہانی کیا اتنی جلدی سنا دینی چاہیے؟ ہمیں ابھی اس دوزخ میں لمبے عرصے تک سڑتے رہنا ہے، اور بہت سے مواقع آئیں گے، ستارہ اپنے وقت پر ظہور کرے گی۔ نسیم بانو بھی، نرگس بھی، نور جہاں بھی اور باقی سب بھی۔ بس تھوڑا صبر کرنا ہوگا، بھائیو۔ یہ سب بہت پہلے کی باتیں ہیں۔ میں سال اور مہینے بھول چکا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ان لوگوں کو کسی طویل خواب میں دیکھا تھا۔ لیکن فی الحال اپنی خفگی کو ایک جانب رکھیے اور اس حرامی منٹو کی زندگی کے دو ایک قصے سنیے۔

جب میں 'مصوّر' میں کام کر رہا تھا، بابوراؤ پٹیل نے مجھے ایک فلم کا منظر نامہ اُردو میں ترجمہ

کرنے کے لیے دیا۔ فلم پربھات اسٹوڈیو کے تحت بنایا جانا تھا۔ یوں میں نے بمبئی کی فلمی صنعت میں قدم رکھا۔ ایک دن 'مصوّر' کے مالک نذیر لدھیانوی نے مجھے امپیریل فلم کمپنی والوں سے ملوایا۔ مجھے چالیس روپے ماہوار پر فلموں کے مکالے لکھتا تھے۔ میں نے سوچا آخرِ کار میری قسمت کھل گئی۔ لیکن نذیر لدھیانوی نے میری تنخواہ کم کر کے بیس روپے کردی۔ مطلب سمجھے آپ؟ اُس نے ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا۔ میری ماہانہ آمدنی اب ساٹھ روپے ہوچکی تھی لیکن امپیریل فلم کمپنی کی حالت کے پیشِ نظر ماہانہ ادائیگی غیر یقینی تھی۔ میں کبھی کبھار پیشگی لے لیا کرتا تھا، لیکن یہ کام زیادہ دن چلا نہیں۔ نذیر لدھیانوی کی کوششوں کا شکریہ، کہ مجھے فلم سٹی میں سو روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی۔ پیسوں کے لیے میں نے متعدد فلم کمپنیوں میں کام کیا لیکن 'مصوّر' کی ملازمت نہ چھوڑی۔ یہ 'مصوّر' ہی تو تھا جو مجھے بمبئی لے کر آیا تھا۔ اور آخرِ کار یہ نذیر لدھیانوی تھا جس نے مجھے لات مار کر باہر نکال دیا۔ مجھے کوئی وجہ بتائے بغیر ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی، میرے بھائیو۔ فلم کمپنیوں کا کام آج ہے، کل نہیں۔ میں اپنی برطرفی کا خط لہراتا ہوا، سیدھا جا کر بابوراؤ پٹیل سے ملا۔ وہ مجھے اپنے رسالے 'کارواں' کی ادارت سونپنے پر راضی ہوگیا۔ اُس نے اپنی سیکریٹری ریٹا کارلائیل کو بلوایا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ ریٹا اس کی سیکریٹری، اسٹینوگرافر اور معشوقہ، سبھی کچھ تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بابوراؤ نے کہا، 'ادھر آؤ۔'

جب وہ اس کے پاس گئی تو بابوراؤ نے اس کے کولھوں پر ایک چپت لگائی اور کہا، 'کاغذ اور پنسل لے کر آؤ۔'

جب ریٹا چلی گئی تو بابوراؤ نے ہنستے ہوئے کہا، 'میں نے اتنے گٹھے ہوئے کولھے کبھی نہیں دیکھے، منٹو۔'

— کیا آپ ان پر یونہی دھول جمایا کرتے ہیں؟

—ہاں، جماتا تو ہوں۔ اور ان پر ہاتھ پھیرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میری انگلیاں پولسن کے مکھن پر رینگ رہی ہوں۔

ریٹا شارٹ ہینڈل والی نوٹ بک اور پنسل لیے لوٹی۔ میرا تقرر نامہ لکھواتے

ہوئے، بابوراؤ میری طرف پلٹا، 'کیوں منٹو، کتنا چلے گا؟' اُس نے پوچھا۔ پھر کچھ توقف کر کے خود ہی جواب دیا، 'سو روپیہ ٹھیک ہے؟'

— نہیں۔

— میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا، منٹو۔

— میں صرف ساٹھ روپے لوں گا۔ نہ زیادہ نہ کم۔

—بابوراؤ کرسی سے اُچھل پڑا۔ 'تم نرے گدھے ہو۔'

—دُرست۔

— کیا مطلب؟

— میں ساٹھ روپے سے زیادہ ہرگز نہیں لوں گا۔ لیکن میں کسی ضابطے پر عمل نہیں کرسکتا۔ میری جب مرضی ہوگی آؤں گا، جب مرضی ہوگی جاؤں گا۔ آپ تو صرف یہی چاہتے ہیں نا کہ رسالہ وقت پر شائع ہو؟

نوکری تو مل گئی، لیکن سات مہینوں سے زیادہ نہ چلی۔ ادھر بمبئی میں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ ۱۹۴۱ء میں میں ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے لیے دلّی چلا آیا۔ تنخواہ ایک سو پچاس روپے ماہوار تھی۔ لیکن میں ڈیڑھ ایک سال سے زیادہ یہاں نہ ٹک سکا۔ سرکاری نوکری میرے لیے نہیں تھی، مرزا صاحب۔ میرے اِردگرد کے لوگ سب تنگ کرنے والے تھے۔ اور یوں بھی میں بمبئی کی فلم نگری کی محبت میں پڑ چکا تھا۔ وہاں کسی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ آپ امیر ہیں یا غریب، کوئی آپ کی صلاحیتوں یا کوتاہیوں پر سوال نہیں اٹھاتا تھا۔ بس جیو، اور اپنے بدن کے ایک ایک خلیے کے ساتھ زندگی کا مزہ لو۔ جیسا کہ میرا دوست شیام کہا کرتا تھا، 'یہ زندگی میری معشوقہ ہے، منٹو۔ بتاؤ منٹو، تم کس کو ترجیح دو گے؟ بس زندگی سلامت رہنی چاہیے، باقی سب جائے جہنم میں— کیا تم ایسا نہیں چاہتے، بتاؤ مجھے؟' میں آپ کو شیام کے بارے میں ضرور بتاؤں گا، برادران۔ میں جب پاکستان میں منشیات سے نجات کے لیے ذہنی امراض کے ہسپتال میں تھا، جب میں نے اس کی موت کی خبر سنی تھی۔ 'موت کا ذائقہ واقعی منفرد ہے، منٹو۔' اس نے جیسے میرے کان میں آ کر سرگوشی کی تھی۔ 'اس جیسا تو کبھی میرے تصوّر میں بھی نہیں تھا۔'

ایک روز میں نے دلّی والی ریڈیو کی نوکری چھوڑ دی، برادران۔ اڈوانی نام کا کوئی آدمی ریڈیو کا چیف تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنے ریڈیو ڈرامے میں کچھ الفاظ تبدیل کرنا ہوں گے۔ بخاری صاحب ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے، اڈوانی ان کا منظورِ نظر تھا۔ اس کے ساتھ سینگ پھنسانے کی کوئی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے بے باکی سے کہہ دیا کہ اڈوانی جی نہ تو اردو جانتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اردو پڑھ سکتے ہیں۔ میرے ڈرامے میں غلطیاں نکالنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں۔ یوں مجھے جانا پڑا۔ اور جہاں تک بخاری صاحب کی بات ہے وہ تو مجھے کبھی برداشت ہی نہیں کر پائے۔ تقسیم کے بعد وہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنے، لیکن انھوں نے مجھے ایک پروگرام کے لیے بھی کبھی نہیں بلایا۔ میرا کیا بگڑا، مرزا صاحب۔ میرے مرنے کے بعد ریڈیو پاکستان کو مجھ پر آدھے گھنٹے کا پروگرام کرنا پڑا۔ اس زمانے میں بخاری صاحب مختارِ کل تھے۔ ایسے لوگ یہ بھول جاتے ہیں، مرزا صاحب، کہ چاہے آپ جتنے بھی اہم عہدے پر فائز ہوں، لیکن ہیں تو آپ ایک سرکاری ملازم۔ جب یہ عہدہ نہیں رہے گا تو کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

دلّی میں ڈیڑھ سال گزار کر میں بمبئی لوٹ گیا، مرزا صاحب۔ 'مصوّر' سے پھر نوکری کا بلاوا آ گیا، اوپر سے بمبئی کی ترغیبات جو ناقابلِ مزاحمت تھیں۔ یہاں پیسہ ہوا میں اُڑتا تھا۔ بس پکڑنے کی دیر تھی۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشکؔ، عصمت اور میں خالصتاً پیسوں کے لیے بمبئی کی فلمی دنیا سے منسلک ہوئے، تاکہ ہم اچھی طرح سے گزر بسر کر سکیں۔ تاکہ میں روز جانی واکر کی بوتل خرید سکوں، تاکہ ہر وقت اپنی جیب میں کیو پرن سگریٹ کا ڈبا رکھ سکوں۔ فلمی کہانیوں کا ادب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کرشن سیدھا سادہ آدمی تھا، وہ شروع میں یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ اس کا خیال تھا کہ فلمی کہانیاں لکھ کر وہ عظیم ادب تخلیق کر رہا ہے۔ ایک بار ہم دونوں نے مل کر ایک فلم 'بنجارہ' کی کہانی لکھی تھی۔ ہم کہانی لے کر جگت ٹاکیز کے مالک سیٹھ جگت نارائن کے پاس گئے کہ شاید وہ یہ کہانی خرید لے۔ کہانی سن کر سیٹھ نے کہا، 'بہت خوب، میں کہانی خرید لوں گا۔ لیکن منٹو صاحب، آپ نے کارخانے کے منیجر کو بہت بُرا آدمی دکھایا ہے۔ کیا اُسے تھوڑا سا اچھا نہیں بنا سکتے؟ کارخانے کے مزدور اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میں

کیا کہہ رہا ہوں؟'

—بالکل۔ فیکٹری کے منیجر کو اچھا بنانے میں دیر نہیں لگے گی، سیٹھ جی۔

—کیا مطلب؟

—کاغذ اور قلم لے کر بیٹھنا ہوگا، بس۔

—صحیح بات۔ سیٹھ نے ہنسنا شروع کر دیا۔

کرشن منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن میں نے اُسے روک دیا۔

—ایک بات اور کہوں، منٹو صاحب۔

—جی ضرور۔

—آپ نے منیجر کی بیوی کیوں دکھائی ہے؟ اسے اس کی بہن بنا دیجیے۔

—وہ کیوں؟

—اس سے آسانی ہو جائے گی۔

—اس سے کیا آسانی ہوگی؟ کرشن نے تقریباً گرجتے ہوئے پوچھا۔

—تم چپ رہو، کرشن۔ سیٹھ جی کہانی خرید رہے ہیں۔ اگر وہ چاہتے ہیں—

—بالکل۔ میرے نقطۂ نظر سے سوچو۔ دیکھو، منٹو صاحب، بہن کی شادی نہ ہوئی ہو۔ اسے تھوڑا سا ویمپ ٹائپ بنا دیجیے۔ جو کہ ہیرو کے ساتھ فلرٹ کرتی ہے۔ ذرا دلچسپ رہے گا۔ ہے نا؟

—شاندار۔ اس سے اچھا اور کیا ہوگا، سیٹھ جی۔

کرشن کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کیا میں وہی منٹو تھا جسے وہ جانتا تھا، جس نے اپنے ریڈیائی کھیل کے چند الفاظ بدلنے سے انکار کر دیا تھا؟ بے یقینی اور نفرت اس کی آنکھوں سے صاف عیاں تھی۔

سیٹھ کے گھر سے نکلتے ہی کرشن نے مجھ پر چلّانا شروع کر دیا— تم اپنے آپ کو ادیب کہتے ہو، منٹو؟ تم خود کو کیسے اس طرح بیچ سکتے ہو؟ اور میں نے تم پر اعتبار کیا۔

— کیا میں نے تمھارے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ہے؟

— اگر تمھارے افسانوں کا ایک لفظ بھی تبدیل کیا جائے تو کیا تم ان کی اشاعت منظور کرو گے؟

— ہرگز نہیں۔

— لیکن تم نے سیٹھ کی تجویزیں منظور کرلیں۔

— ہاں، مان لیں، کرشن بھائی۔ ہم اس کے پاس ادب کے لیے نہیں گئے تھے۔ کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ اس کہانی کی کوئی ادبی حیثیت ہے؟ ہم نے یہ کہانی فلم کے لیے بنائی ہے۔ جہاں ماں بہن بن سکتی ہے، بہن ویمپ بن سکتی ہے اور ہیرو کے ساتھ جو چاہے کرسکتی ہے۔ اس سے میرا تمھارا کیا لینا دینا؟ ہم پیسے کمانے کے لیے فلموں کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ادب کا یہاں مت سوچو، کرشن۔ کچھ سمجھ میں آیا میں کیا کہہ رہا ہوں؟

— ہوں ں۔

— تو پھر کہانی تبدیل کی جاسکتی ہے۔ ہے نا؟

کرشن نے سر ہلادیا۔

مجھے پتا تھا کہ مجھے کس کے لیے اپنی جان دینی ہے، مرزا صاحب، اور کس کے ساتھ کھیل کھیلنا ہے۔ فلمی دنیا ایسے ہی کھیلوں کے لیے ہے۔ کتنے ہی لوگ اپنی کہانیاں لیے قطار میں کھڑے رہتے ہیں کہ ان پر فلم بن جائے۔ کیا آپ انھیں ادیب کہیں گے، مرزا صاحب؟ جب میں کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تھا، میں اپنے آپ سے کہتا تھا میں جو لکھنے جارہا ہوں، اس دنیا کا کوئی بھی شخص اس پر فلم نہیں بنا سکتا۔ ادب کی ساری سچائیاں، اس کے سارے لفظوں اور جملوں میں پیوست ہوتی ہیں، کوئی شبیہ اس کو ادا نہیں کرسکتی، جس طرح ہم کسی شبیہ کو لفظوں کے ذریعے نہیں سمجھا سکتے اور کیا بمبئی کی فلمی دنیا کرشن چندر یا عصمت یا منٹو کی کہانیوں کو کبھی چھو بھی سکتی ہیں؟ ایک دن بمبے ٹاکیز سے لوٹتے ہوئے، ٹرام میں میں نے عصمت سے کہا، 'ان دنوں میں نے کرشن کی تحریر میں بعض چیزیں بڑے تواتر سے محسوس کی ہیں۔'

— اور وہ کیا ہیں؟

— زنا بالجبر اور قوسِ قزح۔

— یہ تو ہے، منٹو بھائی۔

— میں کرشن کے بارے میں ایک مضمون لکھنے کا سوچ رہا ہوں۔ اسی عنوان سے۔ زنا بالجبر اور قوسِ قزح۔ لیکن میں سمجھ نہیں پارہا کہ اس کہانیوں میں آخر زنا بالجبر اور قوسِ قزح کے بیچ کیا تعلق ہے؟

عصمت کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اُس نے کہا، 'قوسِ قزح کے رنگ میں کتنی جاذبیت اور کشش ہوتی ہے۔ لیکن آپ تو کسی دوسرے زاویے سے سوچ رہے تھے، منٹو بھائی۔'

— ہاں، آگ اور خون دونوں کا رنگ سرخ ہے۔ صنمیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلادِ فلک سے منسوب کیا جاتا ہے، عصمت۔ اور یہی رنگ زنا بالجبر اور قوسِ قزح میں بھی نظر آتا ہے۔

— ہوسکتا ہے۔ تو پھر لکھ ڈالیے اپنا مضمون۔

— کچھ اور بھی ہے، عصمت۔ عیسائی فنِ مصوری میں سرخ رنگ عشقِ الٰہی کا مظہر ہے۔ اس کا تعلق عیسیٰ کو مصلوب کیے جانے سے ہے۔ کنواری مریم سرخ ملبوس زیب تن کرتی ہیں۔ عصمت کا رنگ۔ جب میں یہ کہہ رہا تھا، میں نے غور کیا کہ عصمت مکمل سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔

عصمت مسکرادی اور بولی، 'لکھ ڈالیے، منٹو بھائی۔ لیکن عنوان میں سے لفظ 'بالجبر' اڑا دیجیے۔'

— لیکن کرشن اعتراض کرے گا۔ کیونکہ جبر یہ فعل سمجھ کر ہی تو وہ زنا سے نفرت کرتا ہے۔

— یہ اعتراض قابلِ قبول نہ ہوگا، منٹو بھائی۔

— کیوں؟

— کرشن کو کیا معلوم کہ شاید یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئن کو اچھا لگا ہو۔

جی ہاں، عصمت ایسی ہی تھی۔ بے پروا۔ ورنہ وہ 'لحاف' جیسی کہانی کیسے لکھتی۔ وہ کہانی اردو ادب میں ایک دھماکے کی طرح وارد ہوئی تھی، مرزا صاحب۔ اور وہ بھی ایک عورت کے قلم سے۔ عصمت سے ملاقات کے پہلے ہی دن میں اس کہانی کا ذکر کیا تھا۔ شاید یہ اگست ۱۹۴۲ کی بات ہے۔ میں کلیر روڈ ایڈلفی چیمبرز میں واقع 'مصوّر' کے دفتر ہی میں کام کررہا تھا۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈر گرفتار کیے جاچکے تھے۔ سارے شہر میں احتجاج ہورہا تھا۔ ایک دن شاہد

لطیف اپنی بیوی عصمت کو لے آیا۔ میں شاہد کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے دنوں سے جانتا تھا۔ میں نے غور کیا کہ عصمت ایک شرمیلی لیکن ساتھ ہی ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی لڑکی تھی۔ کچھ دیر تحریکِ آزادی پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد ہمارا رُخ شعروادب کی جانب ہوگیا۔

'میں نے ادبِ لطیف میں آپ کا افسانہ 'لحاف' پڑھا۔' میں نے عصمت کو بتایا۔

— آپ تو اس وقت دلّی میں تھے نا؟

— ہاں۔ افسانہ بہت اچھا تھا۔ لیکن آخری جملہ...... احمد ندیم قاسمی کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اِسے یقیناً حذف کر دیتا۔

— کیوں؟

— آپ کو یاد ہے آپ نے کیا لکھا ہے؟

— ہوں!

— ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو کبھی نہیں بتاؤں گی۔ یہی تھا نا؟

— ہاں۔

— کیا یہ غیر ضروری نہیں؟

— کیا عیب ہے اس جملے میں؟

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن جب میں نے عصمت کے چہرے کی طرف دیکھا تو رُک گیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ جو میں کہنے والا ہوں اُسے سننا اس کے لیے گناہِ کبیرہ سے کم نہیں ہے۔ عصمت ایسی ہی تھی۔ اچانک کچھ ایسا کہہ سکتی تھی جس سے آپ مشتعل ہوجائیں، لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایک شرمیلی اور متین دوشیزہ بن جاتی۔

میں عصمت کے بارے میں اختصار سے بات نہیں کرسکتا، میرے بھائیو۔ کسی نے مجھے حیدرآباد سے خط لکھا: 'کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت، اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر یہ نہایت افسوس کی بات ہے، منٹو صاحب کہ عصمت نے آپ کے بجائے شاہد سے شادی کرلی۔'

انھی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفوں مصنف کی ایک کانفرنس ہوئی۔ وہاں سینکڑوں لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر پوچھا: 'آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟ مجھے معلوم نہیں یہ بات درست ہے کہ غلط لیکن جب عصمت بمبئی واپس آئی تو اس نے صفیہ سے کہا کہ حیدرآباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے یہ سوال کیا: 'کیا منٹو صاحب کنوارے ہیں؟' تو اس کے جواب 'جی نہیں' نے اس کے غبارے میں سے ساری ہوا نکال دی۔

میں نے اس کے بارے میں بعد میں سوچا، مرزا صاحب۔ اگر میں اور عصمت واقعی شادی کرلیتے تو کیا ہوتا؟ اس 'اگر' کا جواب دینے میں آپ کو کافی زحمت اٹھانی ہوگی۔ فرض کیجیے، آپ اس سوال کا کیا جواب دیتے، اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا اٹھارہواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادیِ نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا؟ عصمت اور منٹو کی شادی کا سوال بھی اتنا ہی بے ہودہ ہے۔ لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس شادی کا اثر اردو ادب پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری تحریر ثابت ہوتے۔ اور میں تصور کرسکتا ہوں شادی کی تقریب پر قاضی کی موجودگی میں عصمت اور میرے درمیان جو گفتگو ہوتی......

— عصمت، قاضی کی پیشانی تختی جیسی نہیں ہے جس پر ہم لکھا کرتے تھے؟

— کیا کہا؟

— تمھارے کانوں کو کیا ہوگیا ہے؟

— میرے کان بالکل ٹھیک ہیں۔ تمھارے حلق میں کیا مینڈک پھنسا ہوا ہے۔

— حد ہوگئی! میں کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی پیشانی بالکل اس تختی سے ملتی جلتی ہے جس پر ہم لوگ لکھا کرتے تھے۔

— لیکن تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔

— تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتی ہو؟

— اوہ اچھا، میں تو نہیں جانتی۔ تم ہی جانتے ہو۔

— تم کچھ نہیں جانتیں۔

—میں تو جانتی ہوں کہ قاضی صاحب کا ماتھا بڑا خوبصورت ہے۔ تم محض چڑا رہے ہو، منٹو۔

—چڑا تم رہی ہو مجھے۔

—نہیں، میں کہتی ہوں تم چڑا رہے ہو۔

—تم...... تم...... تم باتوں کے انار چھوڑ رہی ہو۔

—اجی واہ، تم تو ابھی سے شوہر بن بیٹھے۔

میں قاضی کی طرف مڑ کر چلاّتا، 'میں اس عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ اگر آپ کی بیٹی کا ماتھا بھی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے پڑھوا دیجیے۔'

—عصمت بھی چلاّتی، 'میں بھی اس مردوے سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر آپ کی چار بیویاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجیے۔ مجھے آپ کا ماتھا بہت پسند ہے، قاضی صاحب۔'

بمبئی کی زندگی ایسی ہی کہانیوں جیسی تھی، مرزا صاحب۔ جہاں حقیقت اور افسانے باہم مل جاتے ہیں۔ میرے پاکستان چلے جانے کے بعد عصمت نے میرے ایک بھی خط کا جواب نہیں دیا۔ کیا اس خاموشی میں کوئی سچائی پنہاں نہیں تھی، مرزا صاحب؟ ایک بار اس نے میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہا تھا، 'آپ نے اپنی پوری زندگی کوئی ایک بات بھی کھل کر نہیں کہی، منٹو صاحب۔' میں نے عصمت کو آپ کا شعر سنا دیا، مرزا صاحب۔

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

۳۱

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

اُس دن میرے حجرے میں قمار بازی کی بیٹھک عروج پر تھی۔ ہم چوسر کھیلا کرتے تھے۔ کئی رئیس زادے موجود تھے۔ قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی، منٹو بھائی...... میں کئی بازیاں جیت چکا تھا۔ ذہن میں میر صاحب کا ایک شعر بھونرے کی طرح گھوم رہا تھا۔

عشق معشوق، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

دفعتاً کلّو نے آ کر خبر دی کہ ایک پالکی آ کر رکی ہے جس میں کچھ خواتین بیٹھی ہیں۔ 'تو مجھے کیوں بتا رہا ہے؟' میں نے اُسے ڈانٹا۔ 'ضرور بیگم صاحبہ سے ملنے آئی ہوں گی۔ انھیں محل سرا لے جا۔'

کلّو کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کچھ برقع پوش عورتیں میری کوٹھری میں گھس آئیں۔ ہم سب حیران تھے کہ کون ہیں یہ؟ جب انھوں نے اپنے برقعے اُتارے تو معلوم ہوا کہ کوتوال فیض الحسن اور ان کے سپاہی تھے۔ 'ہتھکڑی لگا لو سب کو،' فیض الحسن نے گرج کر کہا۔

میں نے پُرسکون آواز میں کہا، 'تشریف رکھیے کوتوال صاحب، میں مرزا غالب ہوں۔ مجھے تو آپ جانتے ہیں۔ یہ میرے احباب ہیں، سبھی شاہجہاں آباد کے شرفاء ہیں۔'

—اسی لیے جوا کھیلتے ہیں؟

میں نے مسکرا کر کہا، 'آپ نے کب ہمیں جوا کھیلتے دیکھا؟ کیا چوسر کھیلنا بھی جرم ہے؟'

—میں خوب جانتا ہوں مرزا، چوسر کی آڑ میں جوا چل رہا ہے۔ ایک بار پہلے بھی آپ کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ آپ کو کوتوالی چلنا ہوگا۔

ملک رام نے فیض الحسن کا بازو تھام لیا اور کہا، 'کیا آپ کو یقین ہے کہ مرزا غالب جیسے شاعر جوا کھیلیں گے؟'

فیض الحسن زور سے ہنس دیا۔ 'آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی اس بات پر یقین کر سکتا ہے اگر اسے کہا جائے کہ مرزا جوا نہیں کھیلتے؟'

—میں جوا کھیلتا ہوں، کوتوال صاحب۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

—لیجیے۔ سُن لیا آپ لوگوں نے۔

—لیکن زندگی کے ساتھ۔

—یہ فلسفیانہ باتیں کر کے آپ بچ نہیں سکتے، مرزا صاحب۔ اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے فیض الحسن نے انھیں حکم دیا، 'سب کو ہتھکڑیاں لگا لو۔'

اب میں بھڑک اٹھا اور دانت پیستے ہوئے بولا، 'مت بھولیے کوتوال صاحب، صاحب لوگ میرے دوست ہیں۔'

—یہ سب عدالت میں کہیے گا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، منٹو بھائی، ہمیں سچ مچ ہتھکڑیاں پہنا کر، شاہجہاں آباد کی گلیوں سے گزارتے ہوئے کوتوالی لے جایا گیا۔ کیا یہ رسوائی بھی نصیب میں تھی؟ جن لوگوں کو میرے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا وہ اثر و رسوخ استعمال کر کے یا زرِ ضمانت دے کر رہا ہو گئے۔ مجھے رات حوالات میں گزارنا پڑی۔

اگلے دن جب شیفتہ صاحب نے سُنا تو ملاقات کے لیے آئے۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے تھام کر انھوں نے کہا، 'فکر مت کیجیے مرزا صاحب، میں ضرور آپ کو چھڑوا لوں گا۔'

— کیسے؟

—میں دیکھتا ہوں، کیا ہو سکتا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔

شیفتہ صاحب کی کوششیں کام نہ آئیں۔ مجھے عدالت لے جایا گیا۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ

کوتوال فیض الحسن یکا یک مجھ سے اتنا برہم کیوں ہو گیا تھا۔ نئے مجسٹریٹ صاحب نے ناواقفیت ظاہر کی۔ مجسٹریٹ کا عہدہ کوتوال سے اوپر ہوتا ہے، لیکن مقدمے کی سماعت کے دوران انھوں نے ایسا برتاؤ کیا گویا کوتوال کی بات ہی حرفِ آخر ہے۔ سیشن جج میرے دوست تھے، ان کا مجھ سے کھلے بندوں میل جول تھا— لیکن اب تو وہ بھی مجھے نہیں پہچان رہے تھے۔ فیصلہ سنایا گیا، دو سو روپے جرمانہ اور چھ ماہ قید بامشقت۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں قید کی میعاد بڑھا دی جائے گی۔ اگر میں پچاس روپے مزید ادا کروں تو مجھے قید کے دوران مشقت نہیں کرنی پڑے گی۔ دلّی کے اخبارات اس واقعے کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔ شیفتہ صاحب نے مقدمے کی ازسرِنو سماعت کے لیے اعلیٰ عدالت میں درخواست بھیجی، لیکن وہاں بھی اسی فیصلے کو بحال رکھا گیا۔ شیفتہ صاحب نے مجھے بتایا کہ شاہجہاں آباد میں اس فیصلے کے خلاف کافی ہنگامہ گرم ہے۔ اخبارات میں لکھا گیا مجھ ایسے عزت دار ذہین شخص کو ایک معمولی قانون شکنی پر اس طرح سزا نہیں دینی چاہیے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بادشاہ بہادر شاہ نے، جو مجھے کچھ ایسا پسند بھی نہیں کرتے تھے، انگریزوں کو میری رہائی کے لیے ایک تحریری درخواست بھیجی۔ اُن کی درخواست بھی مسترد کر دی گئی، منٹو بھائی۔

میں ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگا۔ سالہا سال سے میں اپنے کمرے میں بھی تو قید ہی تھا۔ اب زنداں میں کون سی نئی سزا کاٹنی تھی مجھے؟ لیکن میرا دل تو دوسری وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ میرے قید کیے جانے کا سُن کر میرا خاندان کیا خود کو مجھ سے دور کر سکتا ہے؟ لیکن پھر خیال آتا کہ کیوں نہیں؟ آخر میر صاحب کو بھی تو ان کے اپنے ہی خاندان والوں نے اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ مجھے حیرانی لوہارو کے نواب امین الدین کے رویّے سے ہوئی۔ کتنی دوستی تھی ان کے ساتھ۔ اور اب انھوں نے مجھ سے مکمل لاتعلقی ظاہر کر دی تھی۔ ان کے بھائی ضیاء الدین بھی دور گئے تھے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

صرف شیفتہ ہی تھے جو میرے ساتھ کھڑے رہے۔ کسی فرشتے کی طرح میری ڈھال بنے رہے۔ انھوں نے جرمانہ ادا کیا اور مقدمے کی سماعت کے تمام اخراجات بھی اٹھائے۔ وہ مجھ سے

تقریباً روز ہی قید خانے میں ملنے کے لیے آیا کرتے۔

ایک دن میں نے اُن سے پوچھا، 'آپ تو حج کر آئے ہیں، اب شراب بھی نہیں پیتے۔ پھر مجھ ایسے کافر سے ملنے کیوں چلے آتے ہیں؟'

—توبہ، توبہ! یہ کیا فرما رہے ہیں مرزا صاحب؟

—سب نے مجھے چھوڑ دیا۔ آپ اب تک کیوں آتے ہیں؟

—مرزا صاحب، میں نے کبھی نہیں سوچا کہ آپ کا راستہ کتنا درست ہے یا یہ کہ آپ شریعت پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ میرے نزدیک صرف آپ ہی وہ شاعر ہیں جنھیں میں امیر خسرو کے برابر بٹھا سکتا ہوں۔ میاں تان سین کے سُر اور آپ کا کلام میرے آگے ایک ہو جاتے ہیں۔

—یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! میاں تان سین تو نورِ الٰہی تھے۔ ان کے مقابل میں ہوں ہی کیا؟ وہ وقت یاد ہے جب انھوں نے قلعے میں ملہار گا کر بارش برسا دی تھی؟ میں اپنے شیطانی حجرے میں لیٹا ہر رات وہ منظر دیکھا کرتا تھا۔ یہ مدتوں پہلے کی بات ہے۔ کیا اس دنیا میں پھر کبھی وہ دن لوٹ کر آئیں گے؟

—آتے تو ہیں؟

—کہاں؟

—وہ جو آپ کا شعر ہے......

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا

—مجھے یوں شرمندہ مت کیجیے، شیفتہ صاحب۔

— کیا ہم نہیں جانتے کہ آپ شراب پیتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں، مرزا صاحب؟ لیکن کیا میں محض اس لیے آپ کو فراموش کر دوں کہ آپ زنداں میں ہیں؟ آپ ایک شاعر ہیں...... آپ اب بھی لفظوں کے ساتھ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ کسی بات کی اہمیت نہیں۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا، 'آپ حج کر آئے ہیں، شریعت کے ماننے والے اگر آپ کی بات سنیں گے تو سنگ زنی کر کے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔'

—میں اُن سے کہوں گا، حضرت محمدؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ جنت اور جہنم دونوں دیکھ کر آئے۔ بھائیو، ان کی پیروی کرو۔

—اُن کو اس راستے پر لے جانے کے لیے آپ ہی کو ان کی رہنمائی کرنا ہوگی، شیفتہ صاحب۔

—یوں ہی سہی۔ میں تو صرف اللہ کے متعین کردہ راستے ہی پر چل سکتا ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ روزمرہ زندگی کے زندان سے یہ زندان زیادہ بُرا نہیں تھا، منٹو بھائی۔ چور، ڈکیت، قاتل، پاگل——مجھے طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ سب کی انوکھی کہانیاں تھیں اور انوکھا ہی کہنے کا انداز۔ قید خانے کی زندگی پیانو اور وائلن کے اُن سُروں کے اُتار چڑھاؤ کی مانند تھی جو میں نے انگریزوں کے ہاں سُنے تھے۔ ہاں، مجھے وہ لفظ یاد آیا، ہارمنی۔ میں نے یہ لفظ پہلی بار فریزر صاحب سے سنا تھا۔ یہ وہی ہارمنی تھی جو میں نے زندان میں آ کر سنی۔ قید خانے میں اپنی اسیری کے دنوں میں میں نے ایک حبسیہ نظم لکھی۔ آپ اس نظم میں ہارمنی کو سن سکتے ہیں، منٹو بھائی۔

پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم
درِ زنداں بکشائید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے
خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہِ تماشا ترسم
راہم از دُور نمائید کہ من می آیم
رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نکند
سخت گیرندہ چرائید کہ من می آیم
خستِ تن در رہِ تعذیب ضرور است اینجا
نمک آریدو بسائید کہ من می آیم
عارضِ خاک بہ پاشیدنِ خوں تازہ کنید
رونقِ خانہ فزائید کہ من می آیم

چوں من آیم بشما شکوۂ گردوں نہ رواست
زیں سپس ژاژ نخائید کہ من می آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید
بخت خود را بستائید کہ من می آیم
تا بہ دروازہ زنداں پئے آوردنِ من
قدمے رنجہ نمائید کہ من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است
بہرہ از من بربائید کہ من می آیم
بخود از شوق ببالید کہ خود باز روید
بمن از مہرگرائید کہ من می آیم
بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامی من
غیرشگفت خورد گر غمِ ناکامی من

پاسبانو، استقبال کے لیے جمع ہو جاؤ کہ میں آرہا ہوں، اور زنداں کا دروازہ کھول دو کہ میں آرہا ہوں۔ جو بھی اپنے در پر دیکھتا ہے، میرے لیے سپاس پیش کرتا ہے اور خیر مقدمی (کے نغمے) گاتا ہے کہ میں آرہا ہوں۔ میں راستہ نہیں پہچانتا اور تمھارے انبوہ سے ڈرتا ہوں۔ مجھے دور سے راستہ دکھا دو کہ میں آرہا ہوں۔ جادۂ تسلیم کے مسافر سختی نہیں کرتے۔ اس بات کو کیوں مشکل جانتے ہو کہ میں آرہا ہوں۔ یہاں بدن کو سزا کے لیے زخمی کرنا ضروری ہے۔ نمک لے آؤ اور پیسو کہ میں آرہا ہوں۔ خاک کے رخسار کو خون چھڑک کر تازہ کرو۔ گھر کی رونق میں اضافہ کرو کہ میں آرہا ہوں۔ جب میں تمھارے پاس آرہا ہوں تو آسمان کا شکوہ درست نہیں۔ اس کے بعد سخت گھاس مت چباؤ کہ میں آرہا ہوں۔ وہ دوست جو اس کوٹھری میں رہ رہے ہیں۔ اپنی تقدیر کو سراہیں کہ میں آرہا ہوں۔ تاکہ زنداں کے دروازے سے میرے آنے کے لیے قدم رنجہ فرمائیں کہ میں آرہا ہوں۔ شعر و دانش مرا وتیرہ ہے۔ مجھ سے تم لوگ کچھ سیکھ لو کہ میں آرہا ہوں۔ خود بخود شوق سے اٹھے۔ میرے ساتھ محبت سے پیش آؤ کہ میں آرہا ہوں۔ بس کہ اپنے مجھ سے میری بدنامی کی وجہ سے بیگانہ بن گئے۔ غیر خوش نہیں ہوگا اگر میری ناکامی کا غم کھائے۔[1]

میں تین ماہ تک زندان میں رہا، برادران۔ سبھی مجرموں کے ساتھ میرا دوستانہ قائم ہو گیا۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جو مجھ سے شعر سننا چاہتے تھے۔ مجھے زنداں میں جا کر ہی معلوم ہوا کہ تقریباً سبھی لوگ شاعری پسند کرتے ہیں۔ لیکن ان کی روزمرہ زندگی کا ڈھرا انھیں اس کی مہلت نہیں دیتا۔ غروب آفتاب کے بعد سب لوگ مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے، گویا مشاعرہ ہو رہا ہو۔ ظاہر ہے شعر پڑھنے والا تو ایک میں ہی ہوتا تھا۔ ایک شام میں نے ان کے لیے ایک نیا شعر کہا

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

—میاں—ایک مہین سی آواز سنائی دی۔ ایک شخص جو سارا وقت دلائی اوڑھے لیٹا رہتا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔

—اُٹھ گئے آخر کار، اقبال بھائی؟ کسی نے کہا۔

—میں کبھی نہیں سوتا، بھائی—بس دلائی کے اندر اندھیرے میں لیٹا رہتا ہوں، پھر بھی نیند نہیں آتی۔ لیکن میاں—اُس نے سیدھا میری طرف دیکھا—کیا آپ کے دل کو بھی قید خانہ نہ بن جانا چاہیے کیونکہ آپ قید خانے میں ہیں؟

اقبال کی اسیری کا واقعہ بھی بہت عجیب تھا، میرے بھائیو۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی گو کہ اس کی شادی کو بہت سال بیت چکے تھے۔ پھر اس کی بیوی اچانک حاملہ ہو گئی۔ اقبال کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا۔ بچے کی ولادت کے دو سال بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ بچے کا باپ وہ نہیں بلکہ خاندان کا کوئی اور شخص ہے۔ اقبال نے لڑکے کو مار ڈالا اور دفنا دیا۔ اس واقعے کے بعد سے وہ سو نہیں سکا۔ ایک دن وہ خود کوتوالی میں حاضر ہو گیا، ہر چیز کا اعتراف کیا اور قید خانے بھیج دیا گیا۔

اس دن پہلی بار میں نے اقبال کا چہرہ دیکھا۔ وہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین پر گرا کوئی خزاں رسیدہ پھول ہو، جس کی محض چند سوکھی ہوئی پتیاں ہی باقی بچی ہوں۔ اچانک اس نے کہنا شروع کیا۔

---

1 فارسی سے ترجمہ: افضال احمد سید

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

آہا! کتنے دنوں کے بعد انشاء اللہ خان انشاء کا شعر سنا۔ اودھ میں انشاء جیسا دوسرا کوئی شاعر نہیں تھا۔ ذرا لفظوں پر غور کیجیے، منٹو بھائی، یا خدا وقت کی گردش کسی کو نہیں بخشتی، کچھ احباب بیٹھے کم از کم باتیں تو کر رہے ہیں۔ آپ اس سے بڑھ کر زندگی سے اور کیا چاہ سکتے ہیں۔

'ایسے ہی میں نے بھی کچھ دوستوں پر اعتبار کیا تھا، اقبال بھائی،' میں نے کہا۔ 'لیکن جوں ہی انھیں میری اسیری کا پتا چلا، وہ سب دور ہٹ گئے۔'

—آپ نے ان پر اعتبار ہی کیوں کیا؟ کیا خدا کے سوا کسی پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ تو پھر ایک قصہ سنیے، میاں۔

مجھے یکا یک کلو کی یاد آ گئی۔ سارے قیدی یک زبان ہو کر بولے، 'ہاں، اقبال، سناؤ قصہ— آج کی شب مشہور قصوں کی شب ہے۔' ہر طرف ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔

—سکندر کی زندگی میں ایک گہرا راز تھا۔ ایسا راز جو اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔

—سکندر؟ فضا میں ایک مشترکہ پکار بلند ہوئی۔ 'کیا کہنے، اقبال بھائی۔'

'قید خانے میں سکندر کا قصہ!' سامعین میں سے کسی نے کہا۔ 'تمھارا بھی جواب نہیں، اقبال بھائی۔'

'سکندر کے سوا قید خانے میں اور آ بھی کون سکتا ہے۔' میں ہنسا۔

—بہت خوب۔

—تو وہ راز کیا تھا، اقبال بھائی؟ میں نے پوچھا۔

—سکندر کے کان بڑے بڑے تھے، ہاتھی کے کانوں کی طرح۔ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس خوف سے کہ لوگ ہنسیں گے، وہ انھیں ٹوپی میں چھپائے رکھتا تھا۔ صرف اس کا ایک قدیمی حجام اس کے کانوں کے بارے میں جانتا تھا۔ ایک بار یہ حجام اتنا بیمار پڑ گیا کہ اس میں کام کرنے کی سکت باقی نہ رہی۔ اب اس کام کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو یہ راز کسی کے سامنے نہ کھولے۔ ایک نوجوان لڑکا بلال دربار میں کام کیا کرتا تھا۔ بوڑھا اسے جانتا تھا، اس نے

اپنی جگہ کام کرنے کے لیے بلال کو منتخب کرلیا۔ پہلے تو سکندر راضی نہ ہوا، لیکن آخرِ کار اس نے بوڑھے حجام کی تجویز قبول کرلی۔ بلال کو کام پر رکھ لیا گیا۔

—پھر کیا ہوا؟

—پہلی بار جب بال تراشنے لگا تو بلال بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ انسان کے کان اور اتنے بڑے؟ حیرت اور خوف کے مارے اُس کے ہاتھ سے قینچی پھسل گئی۔ سکندر سمجھ گیا۔ 'اگر کسی کو اس کا علم ہوا تو تمھاری زبان کھینچ لی جائے گی، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمھارا سر قلم ہوجائے گا۔' بلال یہ سُن کر خوف سے جم گیا۔ اُس نے چشم تصور سے اپنے بُریدہ سر کو خاک پر لوھکتے دیکھا۔ اگر کبھی شہنشاہ کے کانوں والی بات زبان سے پھسل گئی تو کیا ہوگا؟ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی سے کہے بغیر اُسے چین بھی نہیں آئے گا۔ اُسے نجات تبھی ملے گی جب یہ راز کی بات اُس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے یہ راز کسی واقف کار سے کہا تو سارے شہر کو اس کا علم ہوجائے گا، اور اس کا بُریدہ سر خاک پر لڑھک رہا ہوگا۔

—تو پھر بلال نے کیا کیا؟

—ایک دن وہ چھپ چھپا کر محل سے نکلا اور ذرا دور ایک جنگل میں چلا آیا۔ جنگل میں ایک جھیل تھی جہاں چرواہے اپنے ریوڑوں کو پانی پلانے کے لیے لایا کرتے تھے۔ جب بھیڑیں پانی پی رہی ہوتیں، وہ بھی جھیل کے کنارے کچھ دیر ستا لیتے۔ کسی کو آس پاس نہ پاکر بلال نے بلند آواز میں جھیل سے کہا، 'ارے باپ رے باپ، کتنے بڑے بڑے کان ہیں شہنشاہ سکندر کے۔' یہ کہہ لینے کے بعد اُس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا، جیسے مدتوں سے اس کے سینے پر رکھا بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔

—جھوٹ۔ سب جھوٹ۔ کسی نے چلاّ کر کہا۔

—بے وقوف! اقبال بولا۔— کہانیاں جھوٹ کے سوا اور ہوتی ہی کیا ہیں؟ خود ہماری زندگیاں جھوٹ سے بھری ہوئی ہیں، اور اپنی کہانیاں ہم لوگ خود بناتے ہیں۔

—اس حرام زادے کو چھوڑو اور ہمیں قصہ سناؤ، اقبال بھائی۔ کوئی دوسرا اونچی آواز میں بولا۔

— کئی مہینے بیت گئے۔ بلال کا خوف اب ختم ہوچکا تھا، سکندر بھی اپنے نئے حجام سے

خوش تھا۔ لیکن اسی دوران ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ جنگل کی اس جھیل میں کچھ نرسل اُگ آئے۔ ایک دن ایک چرواہے نے ایک نرسل کو توڑ کر اس میں چھید کیا اور اسے بانسری کی طرح بجانے لگا لیکن بانسری میں سے جو آواز نکلی اسے سن کر وہ سراسیمہ ہو گیا۔ کوئی آواز کہہ رہی تھی، 'ارے باپ رے! کتنے بڑے کان ہیں شہنشاہ سکندر کے۔'

—پھر؟

—ایک بار اس جنگل سے گزرتے ہوئے سکندر نے اُس بانسری کی آواز سُن لی۔ آواز کا پیچھا کرتے کرتے وہ چرواہوں کے ڈیرے میں پہنچ گیا، بانسری بجانے والے کو گرفتار کر کے اس کے دربار میں پیش کیا گیا۔ جب تفتیش ہوئی تو چرواہے نے ساری حقیقت حال کہہ سنائی۔ 'ناممکن!' شہنشاہ نے گرج کر کہا۔ اب بلال کو بلوایا گیا۔ بلال نے خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا، 'میں نے کسی سے نہیں کہا حضور۔ میں نے صرف جھیل سے کہا تھا۔'

—جھیل سے؟

—میں اس راز کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا حضور۔ چونکہ کسی سے کہنے کی اجازت نہیں ملی تھی، اس لیے میں نے جھیل سے کہہ دیا۔

—پھر کیا ہوا؟

—سکندر نے جھیل سے ایک اور نرسل توڑ کر لانے کا حکم دیا۔ چرواہے نے اس نرسل سے بانسری بنائی۔ اس بانسری سے بھی وہی آواز اُبھری۔ 'ارے باپ رے، کتنے بڑے بڑے کان ہیں شہنشاہ سکندر کے۔' سکندر کچھ دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا، 'چرواہے کو جانے دو۔' پھر مایوس کن لہجے میں بلال سے مخاطب ہوا، 'تم اگر چاہو تو اب بھی میرے حجام رہ سکتے ہو۔'

—پھر کیا ہوا؟

—سکندر نے شہر کے بہترین خطاط کو بلوایا اور اسے آبِ زر سے کچھ لکھنے کو کہا۔ سکندر نے وہ مخطوطہ اپنی خواب گاہ میں آویزاں کر لیا، تاکہ ہر صبح جب وہ بیدار ہو تو اسے پڑھ سکے۔

—اُس میں کیا تحریر تھا؟

—اپنے سوا کسی پر اعتبار مت کرو۔ یہاں تک کہ جھیلیں بھی دغا دے جاتی ہیں۔

سامعین کھل اٹھے۔

اقبال نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا، 'کیا سمجھے، میاں؟'

—جو تم کہنا چاہ رہے ہو وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ لیکن اس قصے میں اک خفی معنی بھی ہے۔

—وہ کیا ہے، میاں؟

—بادشاہوں کے راز بھی چھپے نہیں رہتے۔ ایک نہ ایک دن خدا سب عیاں کر دیتا ہے۔ سب طاقتیں آخر کار مذاق کا نشانہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ ہے نا اقبال بھائی؟

—جی ہاں۔ میں نے اس طرح نہیں سوچا تھا۔

—ہر کوئی اپنے میلان کے مطابق ہی سوچتا ہے۔ اسی سے یہ زندگی کا کھیل جاری رہتا ہے۔

—خدا کے فضل سے میں قید خانے کو کھیل کا میدان بنا لینے میں کامیاب رہا، منو بھائی۔ اور جب میں قید سے رہا ہوا، تقدیر پہلی بار مجھ پر مسکرائی۔ صرف چند برسوں کے لیے۔ لیکن یہ بھی تو زندگی ہی کا صلہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ صلہ کس چیز پر دلالت کرتا ہے، منو بھائی؟ خدا نے جتنا چاہا تھا اُتنا ہی مجھے دیا، اور میں نے پانسہ پھینک کر سمیٹ لیا، جتنا سمیٹ سکتا تھا۔ صرف یہ تھا کہ آئینے میں قریب الوقوع مرگ کی تصویر پہلے ہی اُبھر آئی تھی۔

۳۲

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

آج یہاں اس دوزخ میں، میں یہ اعتراف کرتا ہوں، مرزا صاحب، کہ میں عصمت کو چاہتا تھا۔ اسے یہ بتانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی کہ ہم دونوں ہی یہ بات جانتے تھے۔ میں نے عصمت کے ساتھ کبھی شادی شدہ زندگی کا تصور نہیں کیا، شادی مرد اور عورت کے مابین رشتے کو محض عادات میں تبدیل کر دیتی ہے اور پھر وہ رشتہ دھندلا ہوتے ہوتے بے رنگ ہو جاتا ہے۔ عصمت کو میں نے کسی تصویر خانے کی طرح دیکھا، جوں جوں میں اس تصویر محل میں گھومتا، ہمیشہ نئی تصویریں ظاہر ہوتیں، نئے منظر پیدا ہوتے۔ عصمت کچھ خاص خوبصورت نہیں تھی، لیکن اس کے نقوش بیک وقت نرم اور تیکھے تھے۔ چشمے کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں نئی حیرانیوں کے لیے مستقل بیتاب رہتیں۔ جب اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تو ان پر سے نظریں ہٹانا سچ مچ مشکل ہوتا تھا۔ اور اُسے آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھنا تو نہایت دلچسپ تھا، آئس کریم پاتے ہی وہ چھوٹی سی بچی بن جاتی تھی۔

میری آنکھیں دیکھ کر اُسے مور کے پَر یاد آ جاتے تھے۔ ’تمھیں ایسا کیوں لگتا ہے، عصمت؟‘ میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

—پتا نہیں۔ بس لگتا ہے۔

—افسانے لکھتے لکھتے تمھیں باتیں بنانے کی اچھی عادت پڑ گئی ہے۔

—میں جھوٹ نہیں بولتی، منٹو بھائی۔

—کیوں نہیں بولتیں؟ جھوٹ کے بغیر زندگی بے رنگ ہے۔

—آپ تو بولتے ہیں نا۔ میں اپنے رنگ وہیں سے چُرا لیتی ہوں۔

—ماشاءاللہ۔

—ایک چیز اور، منٹو بھائی۔ میں جب آپ کی آنکھوں میں دیکھتی ہوں، میرے دل کی دھڑکن تھم جاتی ہے۔

—الٰہی خیر۔ مجھے صفیہ کو بتانا چاہیے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا اس کے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہو۔

—اپنی تعریفیں سننا آپ کو اچھا لگتا ہے۔ ہے نا؟

—کسے اچھا نہیں لگتا؟

—آپ کو سب سے بڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ میں نے آپ جیسا نرگسیت کا مارا دوسرا نہیں دیکھا۔

ہمارا رشتہ کسی کھیل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بات بات پر جرح ہوتی۔ عصمت کسی کو آسانی سے بخشنے والی نہیں تھی۔ میرا کام اسے ستانا تھا۔ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا، مرزا صاحب، کہ غصیلی عصمت کی خوبصورتی کیسی حقیقی تھی۔ کبھی کبھی ہمارا جھگڑا ایسے نکتے پر پہنچ جاتا جہاں معلوم ہوتا ہم لوگ اب ایک دوسرے کی صورت کبھی نہیں دیکھیں گے۔ ایک دن ایسے ہی کسی جھگڑے کے دوران میں بکنے لگا، ’تم عورت ہو ورنہ ایسی بات کہتا کہ تم بولنے کے قابل نہ رہتیں۔‘

—جو جی چاہے، کہہ لیجیے۔ مجھ سے رعایت برتنے کی ضرورت نہیں۔ عصمت نے سنگ دلی سے کہا۔

—سچ کہتا ہوں، اگر تم مرد ہوتیں......

—اب کہہ بھی ڈالیے۔ مجھے گالی دیں گے نا، اور کیا کہیں گے؟

—تم جھینپ جاؤ گی، عصمت۔

—ہرگز نہیں۔

—تو پھر تم عورت نہیں۔ میں نے بے قراری سے کہا۔

—کیوں؟ کیا میرے لیے جھینپنا ضروری ہے، چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے؟ صرف

اس لیے کیونکہ میں عورت ہوں؟ آپ بھی مردوں اور عورتوں کو الگ الگ نظریے سے دیکھتے ہیں، منٹو بھائی۔ میں سمجھی تھی آپ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔

ایسے موقعوں پر عصمت کی زبان تیز دھار چھری بن جایا کرتی تھی۔

'قطعی نہیں،' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا، 'میں عورتوں اور مردوں میں تفریق نہیں سمجھتا۔'

—تو پھر کہیے وہ بات جو کہنا چاہتے تھے۔

میں چپ ہوگیا۔ اب عصمت نے میری ٹانگ لینا شروع کی۔ 'کہہ ڈالیے، ذرا میں بھی سنوں۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں جھینپ کر بھاگ جاؤں گی۔' وہ مجھے کسی چھوٹی سی لڑکی کی طرح اُکسانے لگی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ 'نہیں، اب غصہ اُتر گیا، عصمت۔'

یوں مجھے ہر بار عصمت سے لامحالہ ہار جانا پڑتا تھا۔ اُس نے اپنی دنیا خود تعمیر کی تھی—بغیر کسی کی مدد کے۔ اس کے والد قاسم بیگ چغتائی مجسٹریٹ تھے، چونکہ ان کے مستقل تبادلے ہوتے رہتے تھے اس لیے انھیں مختلف جگہوں پر رہنا پڑا۔ جب عصمت علی گڑھ میں نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی اس کے والد کا تبادلہ سانبھر، راجستھان میں ہوگیا۔ عصمت ہوسٹل میں رہ کر پڑھنا چاہتی تھی لیکن اس کے والدین اس پر راضی نہ ہوئے۔ سانبھر میں عصمت کا دم گھٹتا تھا۔ وہاں پڑھنے لکھنے کے بالکل مواقع نہیں تھے۔ ایک صبح، اس کے ابا ناشتے کے بعد بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور اس کی امّاں چوکی پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں، عصمت کمرے میں داخل ہوئی اور اپنی امّاں کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے بڑی پُرسکون آواز میں کہا کہ وہ تعلیم جاری رکھنے کے لیے علی گڑھ جانا چاہتی ہے۔ عصمت کی امّاں نے آنکھیں پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ قاسم بیگ چغتائی نے دیکھا کہ ان کی بیٹی سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی ہے۔ ان کی کسی اولاد نے کبھی ان سے آنکھ نہ ملائی تھی۔

عصمت نے دوبارہ صاف صاف کہا، 'میں پڑھنے کے لیے علی گڑھ جانا چاہتی ہوں۔'

—لیکن یہاں تم بڑے ابا سے پڑھتی تو ہو۔

—میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہوں۔

—کس لیے؟ بجّو کی دو سال کی پڑھائی اور باقی ہے۔ اس کے بعد تم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔

—مجھے امتحان دینا ہے۔

—کوئی ضرورت نہیں۔

—تو پھر میں بھاگ جاؤں گی۔

—بھاگ جاؤ گی؟ کہاں؟

—جہاں جی چاہے گا۔

عصمت کی امّاں برہم ہوئیں لیکن قسیم بیگ چغتائی بیٹی کے بے باکانہ اظہار سے کچھ نتیجہ نکال چکے تھے۔ انھوں نے عصمت کو علیگڑھ بھجوا دیا۔ زندگی میں یہ عصمت کی پہلی جیت تھی۔ اپنی بہنوں کی طرح بچپن میں وہ گڑیوں سے کبھی نہیں کھیلی، وہ سارا وقت لڑکوں سے ہاتھاپائی کیا کرتی تھی۔ عصمت بالکل نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بہنوں کی طرح اس کی بھی بیس برس میں شادی کر دی جائے۔

عصمت کے ساتھ چھ برسوں پر محیط میرا رشتہ گویا آبی رنگوں سے بنی ہوئی کوئی تصویر تھا۔ یہ تصویر کب بننا شروع ہوئی اور کب مکمل ہوئی، مجھے اب یاد نہیں۔ اس کے علاوہ پینے کی وجہ سے، آپ سمجھ ہی سکتے ہیں، بھائیو، کہ میرے دماغ کی حالت کیسی ہوگی، مجھے واقعات کی ترتیب بالکل یاد نہیں رہتی تھی۔ ایک رات کی دلچسپ بات یاد آئی، میرے بھائیو۔ شاہد اور عصمت ان دنوں ملاڑ میں رہا کرتے تھے۔ ہم نے آدھی رات کے قریب اُن کے گھر پر ہلّہ بول دیا۔ میں اور صفیہ مع نندا جی اور خورشید انور۔ دروازہ کھلتے ہی صفیہ نے عصمت کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگی، 'میں نے ان سے سو بار کہا کہ آپ لوگوں کو پریشان نہ کریں، لیکن تمھارے یہ منٹو بھائی آنے کے لیے بضد تھے۔'

—تم سمجھتی ہو تم مجھے روک سکتی ہو، صفیہ؟ میرا جب جی چاہے گا، اور جہاں جی چاہے گا میں جاؤں گا۔

شاہد بھی آ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا، 'آؤ منٹو، آج کی رات مزہ آنے والا ہے...... آ جاؤ......'

ہم لوگوں کو بہت بھوک لگی تھی لیکن سارے ہوٹل بند ہو چکے تھے۔ میں نے کہا، 'ہم خود پکا لیں گے، عصمت، بس آٹا، دال آلو مل جائیں۔'

صفیہ نے ہمیں باورچی خانے میں گھسنے سے صاف منع کر دیا۔ مرد بھلا کیسے کھانا پکا سکتے ہیں؟ لیکن ہم لوگ اپنے گلاس اور بوتل لے کر وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔ میں آٹا گوندھنے لگا، شاہد انگیٹھی تیار کرنے لگے، خورشید آلو چھیلنے لگا۔ آخر کہنے لگا، 'مجھ سے یہ کم بخت آلو نہیں چھیلے جاتے۔ کیا ہم انھیں کچا ہی نہیں کھا سکتے، منٹو بھائی؟' میں نے روٹیاں پکائیں اگرچہ وہ ادھ جلی تھیں، اور پودینے کی چٹنی بنائی۔ کھا پی کر ہم وہیں باورچی خانے میں پھیل کر سو گئے۔ عصمت اور شاہد نے ایسا نامعقول برتاؤ سینکڑوں بار سہا تھا۔ میں جتنا زیادہ پیتا، اُتنا ہی عصمت کو یقین دلانے کی کوشش کرتا، 'خدا کی قسم، عصمت، میں نشے میں نہیں ہوں۔ تم دیکھنا چاہتی ہو، شرط لگاؤ۔ میں کل ہی پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ میرے لیے بالکل آسان بات ہے۔'

— میں شرط نہیں لگاؤں گی، منٹو بھائی۔ آپ ہار جائیں گے۔ اور آپ نشے میں ہیں اس وقت۔

یہ بڑے مزے کی بات ہے، مرزا صاحب، کہ کیسے ہم دونوں پر شرابی ہونے کا ٹھپا لگا دیا گیا۔ آپ اگر ہر وقت نشے میں رہا کرتے تھے تو اتنی غزلیں کس وقت کہہ لیں آپ نے؟ آپ اتنے سارے خط کیسے لکھ پائے؟ میں نے بھی اتنے افسانے کیسے لکھ لیے؟ میری زندگی بے ہنگم تھی، ایک آوارہ گردی سی۔ دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے صبح سے شام تک سویرے کام کرنے پڑتے تھے۔ ایک دو گلاس پیے بغیر میں ارتکاز ہی نہیں کر پاتا تھا، یا یوں کہیے کہ لکھنے کے لیے جگہ ہی تلاش نہیں کر پاتا تھا۔ لیکن ایک گلاس کے بعد ہی الفاظ کمرے میں چلنے پھرنے لگتے، اُڑنے لگتے، گنگنانے لگتے۔ درد سے پہلو بدلنے لگتے۔ ان لفظوں میں ہی میں نے چھپے ہوئے آنسوؤں، دبی ہوئی ہنسی قہقہوں اور محنت کش طبقے کی تحقیر، ان کے ریزہ ریزہ خوابوں اور ٹوٹے ہوئے دل کی آہوں کو پایا تھا۔ ان لفظوں کی نیلی چمک میں خواہشوں کا سرخ شعلہ لپک رہا تھا۔ میں نے اپنے بارے میں کبھی نہیں لکھنا چاہا، مرزا صاحب۔ کیا کوئی لکھنے والا واقعی اپنے روزمرہ کے بارے میں لکھتا ہے، اپنی خوشیوں اور اپنے دکھوں کے بارے میں، اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں؟ وہ تو اپنے لفظوں میں مانوس اور نامانوس لوگوں کی وہ تصویریں تلاش کرتا ہے جنھیں چھپانے پر لفظ مجبور ہوتے ہیں۔ جن کی یادیں ان لفظوں کو فنا کی راہ پر لے جاتی ہیں۔ ایسی عورت جو دن بھر کی محنت مشقت کے بعد رات کو سکون سے سوتی ہو، کبھی میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں

ہو سکتی، برادران۔ مجھے صرف اُس عورت سے سروکار ہے جو دیے کی لو کے ساتھ ساری رات جاگتی ہے، اپنے گاہک کے انتظار میں، اور پھر دن کے وقت سو جاتی ہے اور کسی بھیانک خواب سے ڈر کر جاگ پڑتی ہے۔ کیا خواب دیکھا ہوگا اس نے؟ یہی کہ اس کا اپنا بوڑھا وجود، جھریوں بھری جلد کے ساتھ اس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

عصمت ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ یہ جو میں چکلوں اور رنڈیوں کے بارے میں لکھتا ہوں تو یہ سب میری بنائی ہوئی کہانیاں ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں کے متعلق بھی جو کچھ لکھا تھا اُسے اس پر بھی یقین نہیں تھا۔ رفیق غزنوی ہی کو لیجیے بڑا بدمعاش اور لفنگا تھا۔ ایک ہی گھر میں چار بہنوں سے شادی کر چکا تھا، ایک ایک کر کے، لاہور کے چکلوں میں کوئی عورت ایسی نہ ہوگی جس کے ساتھ وہ سویا نہ ہو۔ میں رفیق کو بہت پسند کرتا تھا۔ زندگی اس کے لیے ایک کھیل تھی۔ ایک دن میں نے عصمت سے کہا، 'آؤ میں تمھیں رفیق سے ملواؤں۔'

— کیا کروں گی مل کر۔ آپ تو کہتے ہیں وہ لفنگا ہے۔

— ارے جبھی تو ملا رہا ہوں۔ یہ تم سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش بُرا آدمی ہوتا ہے؟ رفیق جیسے شائستہ لوگ بہت کم ہیں۔

— میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیا کہہ رہے ہیں، منٹو بھائی۔ شاید میں اتنی ذہین نہیں ہوں۔

— ہونہہ۔ رفیق سے ملنے میں کیا بُرائی ہے؟ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اس سے مل کر کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔

— میں بھی تو عورت ہوں۔

— میں تم کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔

— مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے۔ مجھے آپ کی لغویات کی کوئی پروا نہیں ہے، منٹو بھائی۔ عصمت نے اپنے ناخن میرے کندھے گڑا دیے۔

— میں اس طرح کسی کو بہن نہیں کہتا، عصمت۔ اقبال کو بھی نہیں۔

— کیوں؟

اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، مرزا صاحب۔ عصمت ہی نے ایک دن کہا

تھا: ’آپ کی زندگی میں کوئی ایک چیز بھی ایسی ہے جسے آپ نے کھل کر کہا ہو؟‘ عصمت جانتی تھی کہ منٹو جیسے شیطان کو بھی نقاب کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں نے عصمت کو رفیق سے ملوایا۔ عصمت مان گئی کہ رفیق ایک ایماندار اور شائستہ آدمی ہے۔ ’یہ کیسے ممکن ہے، منٹو بھائی؟‘ اس نے پوچھا۔

— میں نہیں جانتا۔ میں نے رفیق کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اسے ویسا ہی قبول کیا ہے جیسا وہ ہے۔

— منٹو بھائی......

— حکم کیجیے۔

— آپ گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت سے یہ موتی کیسے چن لاتے ہیں؟

— خدا کے فضل و کرم سے۔

— اور وہ چکلوں کی کہانیاں؟ کیا وہ بھی سچ ہیں؟ مجھے یقین نہیں آتا، جھوٹ بولنے میں تو آپ کا کوئی ثانی نہیں۔

— میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ کوئی بھی چکلے میں جا سکتا ہے اگر اس کی جیب میں پیسہ ہے۔

— آپ کے ان فراڈ دوستوں میں اتنی ہمت نہیں، منٹو بھائی، کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ گانا سن کر چلے آتے ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ کی ہمت نہیں اُن میں۔

— ارے...... میں خود بھی جا چکا ہوں......

— گانا سننے؟ عصمت نے مجھے چڑایا۔

— کیوں؟ صرف گانا سننے ہی کیوں؟ ٹھیک اُس مقصد کے لیے جس کے لیے لوگ چکلوں میں جا کر دام خرچ کرتے ہیں۔

— بس چپ رہیے۔ اتنی ڈھٹائی! عصمت نے چلّا کر کہا، جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔

— کیوں، اس میں مسئلہ کیا ہے؟

— یہ ناممکن ہے۔ آپ نے جان بوجھ کر اپنا یہ تاثر بنا رکھا ہے۔

— بھئی میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، عصمت، میں چکلوں میں گیا ہوں۔

— خدا پر آپ کو یقین نہیں، بیکار اُسے نہ گھسیٹیے۔

— میں اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں۔

— منٹو بھائی۔ اس نے میرے بال اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ آپ کیسے انسان ہیں؟ اپنے مرحوم بچے کی قسم کیسے کھا سکتے ہیں؟

میں نے دیکھا عصمت کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں ہنس دیا۔

— تم یقین کیوں نہیں کرتیں، عصمت بہن، میں رنڈی بازی کا عادی ہوں۔

— یہ ہماری آخری ملاقات ہے، منٹو بھائی۔ میں آپ کو خبردار کر رہی ہوں۔ عصمت غصّے سے کھول رہی تھی۔ اس کے دونوں گالوں میں گڑھے نمایاں ہو گئے تھے۔ میں اس کے غصّے کو اور بھڑکانا چاہتا تھا: ’ٹھہرو، میں صفیہ کو بلاتا ہوں،‘ میں نے کہا۔ ’دیکھو وہ کیا کہتی ہے؟‘

صفیہ کے آتے ہی عصمت پھٹ پڑی۔ ’کیا تمھیں منٹو بھائی نے بتایا کہ وہ چکلوں میں رنڈیوں کے پاس جاتے ہیں؟‘

— ہاں، کئی بار بتایا ہے۔

— ناممکن۔ عصمت غصّے سے پھنکارتے ہوئے آگے پیچھے ٹہلنے لگی۔ خیر، ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور گئے بھی ہوں تو دعا سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا صفیہ؟

— اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام دعا کر کے آ گئے یا...... یہ منٹو صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔

میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ عصمت زور زور سے چلّانے لگی۔ ’ناممکن ہے، یہ قطعی ناممکن ہے۔ اگر منٹو بھائی قرآن پر بھی ہاتھ رکھ دیں تب بھی میں یقین نہیں کروں گی۔‘

کیسا بچوں جیسا اعتبار تھا یہ۔ یہ یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ یہی وہ عصمت ہے جس نے اپنے مرحوم بھائی عظیم بیگ چغتائی پر ’دوزخی‘ جیسا مضمون لکھا تھا۔ مضمون میں کہا گیا تھا کہ عظیم بیگ نے جو کچھ بھی لکھا، وہ سب جھوٹ تھا۔ جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی، ان کے والد نے کہا: ’پھر قصرِ صحرا تعمیر کرنے لگے۔‘ ’دنیا میں جھوٹ کے بغیر کوئی رنگینی نہیں، ابّا جان،‘ عظیم بیگ کہتے۔ ’جب تک سچ میں جھوٹ کی آمیزش نہ کی جائے سچ دلچسپ نہیں لگتا۔‘ یہی پاگل پن عصمت

میں بھی تھا۔ اُسے بھی عجیب عجیب خبط تھے۔ ایک دن کہنے لگی اب میں مرغ اور مرغیوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں گی، ایک بار کہا، سوچتی ہوں لکھنا لکھانا چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو جاؤں اور ہوائی جہاز اُڑانا سیکھ لوں۔ وہ ایسی لڑکی تھی، مرزا صاحب، جو شاید آپ کی محبت میں مری جا رہی ہو لیکن وہ آپ ہی پر بے رحمی سے حملہ آور ہو گی یا ہو سکتا ہے کہ وہ آپ سے بات ہی نہ کرے۔ ہو سکتا ہے آپ کو چومنے کو اس کا بہت دل چاہ رہا ہو لیکن اس کے بجائے وہ آپ کو سوئی چبھو دے گی اور مذاق اُڑائے گی۔ صفیہ بھی عصمت سے محبت کرنے لگی تھی۔ جب ایک دن اس نے یہ بات کہی تو عصمت بولی: 'بڑی آئی ہو میری محبت میں گرفتار ہونے والی— تمھاری عمر کی لڑکیوں کے باپ تک قید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں......' ایک بزرگوار اہلِ قلم بُری طرح عصمت کی محبت میں گرفتار تھے۔ اسے مسلسل خط لکھا کرتے تھے۔ عصمت بھی جواب دے کر شہ دیتی رہی۔ آخر میں اسے ایسا اڑنگا دیا کہ بیچارے کو سمجھ نہ آیا کہ کہاں منھ چھپائے۔ ایسی تھی عصمت، جیسے اُڑتا ہوا بادل۔ نہیں لکھتی تھی تو مہینوں گزر جاتے تھے، اسے کاغذ قلم لے کر بیٹھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جب لکھنے پر آتی تو صفحے کے صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے، کھانے پینے، سونے کا کوئی ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ بس اگر کچھ چاہیے ہوتا تو آئس کریم۔

کیسے، مرزا صاحب، میں نے آپ کو عصمت کے بارے میں اتنا کچھ بتایا، کیا آپ اسے پہچان پائے؟ ذرا مختلف رنگوں کے گلال کے بارے میں سوچیے— سبز، سرخ، زرد، گلابی— جو صحن میں رکھا ہوا اور ہوا چل پڑے۔ سارے رنگ آپس میں گھل مل جائیں یہاں تک کہ انھیں علیحدہ علیحدہ شناخت کرنا ناممکن ہو جائے۔ کیا ایسی ہی نہیں تھی وہ؟ مجھے 'دوزخی' کا ایک ٹکڑا یاد آ رہا ہے:

صبح سویرے شمیم نے عصمت سے آ کر کہا: 'منے بھائی، ختم ہو رہے ہیں۔ اٹھو۔' عصمت نے جواب دیا: 'وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔'

شمیم نے بگڑ کر کہا: 'کم بخت تجھے یاد کر رہے ہیں۔

—ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے۔ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔

عصمت نے لکھا تھا: منے بھائی شاید دوزخ میں ہوں یا جنت میں، لیکن میں انھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ اب بھی ہنس رہے ہوں گے۔ کیڑے ان کی کھال کو کھا رہے ہوں

گے، ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی، ملاؤں کے فتووں سے ان کی گردن دب رہی ہوگی۔ مگر وہ ہنس رہے ہوں گے۔ ان کی شرارت بھری آنکھیں ناچ رہی ہوں گی۔ زہریلے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہوں گے، لیکن کسی نے ان کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ دیکھا ہوگا۔ دراصل وہ ایک دوزخ سے دوسرے دوزخ میں منتقل ہو گئے۔

عظیم بیگ کے بعد، عصمت نے مجھ میں ایک دوزخی کو ڈھونڈ لیا۔ ہم پانچ منٹ کے ارادے سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے گزر جاتے اور ہمیں پتا بھی نہ چلتا۔ بحثیں، اور مزید بحثیں وہ مجھے ہرانے کے لیے پُرعزم رہتی۔ کیا وہ مجھے ہرا کر اپنے منے بھائی سے انتقام لینا چاہتی تھی، جنھیں وہ کھو چکی تھی؟ پیتے ہوئے مجھے اکثر کھانسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے مجھے کھانسی کا مرض لاحق تھا۔ عصمت کو میری کھانسی سے کوفت ہوتی تھی، ایک دن کہنے لگی: 'یہ آپ کو کھانسی ہے، اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟'

—علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ کچھ سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا تم مر جاؤ گے، تمھیں ٹی بی ہے۔ تم دیکھ ہی رہی ہو میں بھلا چنگا ہوں۔ ڈاکٹروں سے تو جادو کرنے والے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔

—یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔

— کون بزرگ؟

— میرے بھائی عظیم بیگ۔ اب نو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔

ہاں، مرزا صاحب، ایک طرف میں اس کا منٹو بھائی تھا، کبھی منٹو صاحب اور دوسری طرف اس کا منا بھائی— عظیم بیگ چغتائی۔ جو کھیل وہ اپنے بھائی کے ساتھ نہ کھیل پائی، اس نے مجھے اس کھیل کا ہدف بنا لیا۔ اور اس کا شوہر شاہد اس کھیل کا خوب لطف لیا کرتا تھا، وہ جانتا تھا منٹو کو تہس نہس کر کے ہی عصمت کو سکون ملے گا اور یہ کہ عصمت کی تمام دراز دستیاں صرف یہ منٹو نامی مسخرا ہی برداشت کر سکتا ہے۔

اس لفظ 'دراز دستی' پر ایک بار ہماری خوب بحث ہوئی۔ شاہد اور عصمت نے ہمیں طلاڑ میں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے شاہد نے کہا: 'منٹو، تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں

ہوجاتی ہیں۔

— بکواس۔

الزامات، پھر جوابی الزامات، دھواں دھار بحث ہوتی رہی۔ رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ شاہد تھک گیا۔ 'جانے دو، اب نیند آ رہی ہے۔'

عصمت نے اپنی غلطی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ مسلسل بحث کرتی رہی۔ دفعتاً کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ 'دست درازی' استعمال کیا۔ مجھے موقع مل گیا۔ 'تم کب سے بڑی بڑی باتیں بنا رہی ہو، لیکن 'دست درازی' کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ صحیح لفظ 'دراز دستی' ہے۔'

— قطعی نہیں۔

— لغت دیکھ لو۔

— لغت دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، میں جو کہہ رہی ہوں 'دست درازی' ہوتا ہے۔

— بیکار بحث مت کرو۔

— آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں، منٹو صاحب۔ آپ اردو ادب کے چیمپئن ہیں؟

آخر شاہد دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ وہاں لفظ 'دست درازی' موجود ہی نہیں تھا۔ البتہ 'دراز دستی' درج تھا۔ 'تم ہار گئیں عصمت۔' شاہد نے کہا، 'اب تمھیں ماننا پڑے گا۔'

لیکن عصمت نے صاف انکار کر دیا۔ اب میاں بیوی میں جنگ شروع ہو گئی۔ میں بیٹھا ہنستا رہا۔ صبح ہو گئی، مرغ اذانیں دینے لگے۔ عصمت نے لغت اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور اعلان کیا، 'جب میں لغت بناؤں گی تو اس میں صحیح لفظ دست درازی ہوگا۔ یہ کیا ہوا دراز دستی...... دراز دستی۔'

عصمت پاگل تھی— سچ مچ پاگل۔ فرض کیجیے اگر کبھی کوئی ہم سے پوچھتا، آپ دونوں اتنے قریب ہیں— عصمت کی وہ کون سی بات ہے جو آپ کو بہت پسند ہے، منٹو؟ اور منٹو کی کون سی بات آپ کو اچھی لگتی ہے، عصمت؟ تو میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے اندھیرے میں ڈوب جاتے۔ اس اندھیرے میں عصمت اور میں ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے ہوتے۔ محض ایک زندگی کسی کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی، مرزا صاحب۔

۳۳

موزوں کرو کچھ اور بھی شاید کہ میر جی
رہ جائے کوئی بات کسو کی زبان پر

برادران! ایک صوفیانہ حکایت یاد آ گئی۔ ایک بھوکا گداگر شہر میں در در پھر رہا تھا۔ لوگ اُسے کھڑکی میں سے ہی دیکھ کر، دروازہ کھولنے سے انکار کر دیتے۔ آخر ایک دروازہ کھل گیا۔ گھر کے مالک نے پوچھا، 'کیا بات ہے— تم مسلسل دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو؟'

— کچھ کھانے کو دیجیے، حضور، میں نے تین روز سے کچھ نہیں کھایا۔

— تو میں کیا کروں؟ جاؤ، گھر میں کوئی نہیں ہے۔

— کسی کی ضرورت نہیں ہے، حضور۔ بس تھوڑا سا کھانا چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔

اسی گداگر کی طرح میں بھی در در بھٹک رہا تھا۔ قید خانے سے رہائی کے بعد قادرِ مطلق نے کچھ دنوں کے لیے گزر بسر کا بندوبست کر دیا۔ میاں نصیرالدین نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ سب لوگ انھیں میاں کالے شاہ کہا کرتے تھے۔ جہاں پناہ بہادر شاہ انھیں اپنا مرشد مانتے تھے۔ یوں قید سے چھوٹ کر میں میاں کالے شاہ کی حویلی کے ایک حصے لال کنویں میں آ کر رہنے لگا۔ کرایہ دینے کی میری سکت نہ تھی، انھوں نے بھی اس بابت کچھ نہ کہا۔ میں ان کے ساتھ ان کے دیوان خانے میں بیٹھا تھا کہ کسی نے آ کر کہا، 'مبارک ہو، مرزا صاحب۔'

— کس بات کی مبارکباد؟

— قید خانے سے رہائی پانے کی۔

مجھے تو ہمیشہ شرارت سوجھتی تھی، منو بھائی۔ میں نے کالے صاحب کی طرف دیکھ کر، ہنستے ہوئے کہا: رہائی کیسی میاں، زیادہ سے زیادہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ گورے صاحب کی قید سے نکل کر کالے صاحب کی قید میں آ گیا ہوں۔'

کالے صاحب، جنھیں ظرافت کا ذوق تھا، کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پھر کہنے لگے: 'میں سمجھ نہیں پایا کہ شہنشاہ نے اب تک آپ کو دربار میں طلب کیوں نہیں فرمایا۔ اگر آپ کے ذوقِ ظرافت کے چند چھینٹے اُن پر بھی پڑ گئے تو اُن کی زندگی اتنی لعین ہوتی۔'

—جہاں پناہ مجھے کیوں طلب کریں گے، میاں صاحب؟ میں تو سگِ الٰہی ہوں۔

—ماشاء اللہ۔ یہ ہیں وہ مرزا غالب جنھیں ہم جانتے ہیں۔

— کیا میں نے کچھ غلط کہا؟

— کیا آپ نے موتی درویش کا قصہ نہیں سنا؟ جو کہ نقشبندی سلسلۂ صوفیاء کے رہنما تھے۔ وہ بھی اپنے آپ کو سگ ہی کہا کرتے تھے۔

—یہ قصہ سنایئے، لیکن میں پہلے ذرا کلّو کو بلا لوں۔

— کس لیے؟

—قصہ سنے بغیر وہ سو نہیں پاتا۔ جیسے مجھے شراب کا نشہ ہے، ویسے ہی اُسے قصوں کا نشہ ہے۔

—بہت عجیب نوکر ہے آپ کا، مرزا۔

میں نے کلّو کو بلوا بھیجا۔ نیا قصہ سننے کے امکان سے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، کالے صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر وہ اُن کے پاؤں دابنے لگا۔ مجھے کلّو کے بارے میں کوئی نظم لکھنی چاہیے تھی، منو بھائی، میں نے اس جیسا قصوں کا رسیا دوسرا نہیں دیکھا۔

کالے صاحب نے قصہ کہنا شروع کیا۔— موتی درویش درگاہ میں نئے مریدین کو مولانا روم کی حکایات سنا رہے تھے۔ مولانا رومی نے کیا کہا تھا، معلوم ہے نا؟ انسان زندگی میں تین ادوار سے گزرتا ہے۔ پہلے میں وہ کسی کی بھی عبادت کرتا ہے— مرد، عورت، مال و زر، اولاد، یہ دنیا، پتھر— کوئی بھی چیز۔ اگلے دور میں وہ اللہ کے لیے نمازیں پڑھتا ہے۔ اور آخری دور میں وہ نہ تو یہ کہتا ہے کہ 'اللہ میرے پاس ہے' اور نہ ہی یہ کہ 'اللہ جیسی کوئی چیز نہیں۔' یکا یک ایک مُلّا غصے

میں غراتے ہوئے درگاہ میں گھس آئے۔ 'کتّے کمیں کے!' اس نے موتی کو گالی دی۔ 'تم یہاں بیٹھ کر ان نئے مریدین کو بہکاتے ہو، جبکہ میں انھیں خدا کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن کوئی میری طرف دھیان نہیں دیتا۔'

—پھر؟ کلّو بیتاب ہو اٹھا— 'انھوں نے مُلّا کی خوب جم کر پٹائی کی ہوگی؟

—صبر کرو، کلّو۔ کالے صاحب ہنسے۔ کیا مار پیٹ سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں؟ ظاہر ہے، نئے مریدین اُچھل پڑے اور مُلّا کو مارنے پیٹنے پر آمادہ ہو گئے۔

—انھیں مارنا ہی چاہیے تھا۔ کلّو پھر بیتاب ہو اٹھا۔ اگر میں ہوتا تو مُلّا کی داڑھی نوچ لیتا اور......

—میاں کو قصہ سنانے دو کلّو۔ اگر تم وہاں ہوتے تو ہم یہ قصہ کبھی نہ سُن پاتے۔ اور تم مُلّا کی داڑھی پکڑے اُسے گلیوں میں گھسیٹے پھرتے۔ میں ہنسا۔

—موتی نے اپنے مریدوں کو باز رکھا۔ ہنستے ہوئے اُن سے کہا: 'یہ کیا کر رہے ہو؟ اس لفظ 'کتّے' میں کیا برائی ہے؟ مجھے تو یہ کافی پسند آیا۔ بے شک، میں ایک کتا ہی تو ہوں۔ میں اپنے مالک کے احکامات بجا لاتا ہوں۔ میں بھونکنے لگتا ہوں، جب یہ دیکھتا ہوں کہ میرا مالک خطرے میں ہے، اس کے خوش ہونے پر میں اپنی دُم ہلاتا ہوں۔ بھونکنا، دُم ہلانا اور اپنے مالک سے پیار کرنا— یہی تو کتّے کا فرض ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی توہین آمیز بات نظر نہیں آئی۔' اس لیے مرزا، اگر آپ سگِ الٰہی ہیں تو بھلا اس سے بڑھ کر اعزاز کی بات کیا ہوگی؟

ایسے تھے میاں کالے شاہ۔ جتنے زندگی کی جمالیاتی قدروں کے شائق، اتنے ہی شفیق اور مہربان۔ وہ جہاں پناہ سے مسلسل میرا ذکر کرتے رہتے۔ وہ تہہ دل سے چاہتے تھے کہ مجھے دربارِ شاہی میں مقام مل جائے۔ 'ہمیشہ یاد رکھنا مرزا، خدا اسی دنیا میں سارے حساب کتاب چکا دیتا ہے،' وہ مجھے کہتے۔ 'قیامت کے دن تو بس خدا آپ کے ساتھ ہوگا۔ وہاں کوئی حاصل حصول نہ ہوگا۔ آپ کو اس خوبصورتی کا انعام ضرور دیا جائے گا، مرزا، جو آپ نے اُس قادرِ مطلق کے لیے تخلیق کی ہوگی۔'

—خدا ہر خوبصورتی کا خالق ہے، میاں صاحب۔ بھلا ہم اُس کے لیے کیا تخلیق کر سکتے ہیں؟

—تو پھر وہ ہمیں اس دنیا میں کیوں لایا، مرزا؟ وہ ہمیں حقیقت دیتا ہے اور ہم اُسے سراب۔

کالے صاحب نے درست کہا تھا۔ غزل درحقیقت ایک سراب ہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے 'غزل' لفظ کے معنی کیا ہیں؟ معشوق سے باتیں کرنا۔ عشق و عاشقی کی باتیں۔ جیسے بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے، اسی طرح محبت بھی آتی ہے اور رُخصت ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے آپ کو کپکپی محسوس نہیں ہوتی، منٹو بھائی؟ فراق کا بیج خواہشِ وصل میں سے پھوٹتا ہے۔ جسم جھڑ جاتا ہے۔ دل بھی جھڑ جاتا ہے، خواہش اپنی موت کی جانب بڑھ جاتی ہے۔ صرف ہم کچھ دن سراب کے اس تصویر محل میں گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں، چھوڑیے یہ باتیں۔ سراب کی خوراک کھا کر تو آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تو کباب پراٹھے اور شراب کی ضرورت تھی۔

باون برس کی عمر میں مجھے دربارِ شاہی میں جگہ ملی۔ جب میں آگرہ سے شاہجہان آباد آیا تھا اُس وقت شہنشاہ کا دربار میرے خوابوں کی منزل تھی، وہ خواب کب کا مر کر فنا ہو چکا تھا، منٹو بھائی۔ مجھے بطور شاعر بھی اب کچھ درکار نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ گفتگو کا فن بھی مجھے چھوڑ چکا ہے۔ مجھے محض اپنی مادّی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دربار میں جگہ چاہیے تھی۔ دربار کسی فنکار کی زندگی میں تخلیقیت کی بہار نہیں لا سکتا۔ اگر مجھے اس وقت دربار میں جگہ مل گئی ہوتی، جب میں ابھی لکھنے کے قابل تھا تو مجھے گزر بسر کرنے کے لیے طرح طرح کے غلط کام نہ کرنے پڑتے، زبان کو اور زیادہ جذبے کے ساتھ چاہنے کی مہلت مل جاتی مجھے۔

کالے صاحب تو ظاہر ہے میرے ساتھ تھے ہی، بادشاہ کے حکیم احسان اللہ خان نے بھی میری طرف مدد کا ہاتھ بڑھا دیا۔ انھیں میرا فارسی کلام بے حد پسند تھا۔ بادشاہ سے میری فارسی کتاب 'پنج آہنگ' کا تذکرہ کر کے انھوں نے میرے لیے دربار میں نوکری کا انتظام کر دیا۔ نوکری نہیں تو پھر اور کیا تھی وہ؟ دیکھیے، آپ ہوں گے شاعر، یا ہوں گے فارسی کے کوئی ذہین مصنف، لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ دربارِ شاہی میں آپ ایک نوکر سے بڑھ کر کچھ نہیں ہیں۔ شہنشاہ کے لیے تو ہم سبھی خواجہ سراؤں جیسے تھے، منٹو بھائی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ ایک غزل گو سے مغل سلطنت کی تاریخ لکھنے کو کہتے؟ اس کام کے لیے مجھے چھ سو روپے سالانہ دیے جاتے تھے۔

ساری ذلت رہی ہوتی ہے۔ اسی لیے مجھے خلعتِ فاخرہ کے ساتھ خطاب سے نوازا گیا۔ نظام الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ۔ کیا یہ کسی شاعر کا خطاب ہو سکتا ہے؟ لیکن بادشاہ کی مرضی۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے، اب آپ شاعر نہیں رہے، آپ سلطنت کے ایک رتن ہیں، قوم کے واقعہ نویس اور جنگوں کے مردِ غازی۔ ارے، خدا کو مانو، کیا میں جنگ لڑ سکتا تھا؟ جو شخص اپنی بقا کی جنگ ہار چکا ہو، وہ کسی جنگ کا مردِ غازی کیسے بن سکتا ہے؟ گھر آ کر میں خوب ہنسا۔ میں اور تاریخ نویس؟ میں نے تو سکندر اور دارا کی کہانیاں بھی نہیں پڑھیں، میری آدھی زندگی تو محبت اور موت کے قصوں میں گزر گئی، لیکن چونکہ جہاں پناہ ایسا چاہتے ہیں تو مجھے تاریخ داں بننا ہی ہوگا۔ آخر چھ سو روپے سالانہ کی رقم سے وہ چاہیں تو مجھے اپنے حرم کا خواجہ سرا اور بان بھی بنا سکتے ہیں۔

اس شام امراؤ بیگم میرے پاس آئیں۔ شاید کلو نے بتایا ہوگا کہ میں کسی خر کی مانند متواتر ہنسے جا رہا ہوں۔ میں نے اس دن معمول سے زیادہ پی رکھی تھی۔ امراؤ بیگم کو دیکھ کر میں نے ہنستے ہوئے کہا، 'اپنی مسجد کو چھوڑ کر میرے دوزخ میں کہاں آ گئیں، بیگم؟'

— آج آپ کے لیے خوشی کا دن ہے، مرزا صاحب۔

— بے شک۔ میں نظام جنگ جو ہوں۔

میں پھر ہنسنے لگا۔

— کیا ہوا؟

— تم نہیں سمجھو گی، بیگم۔

— کیا میں آپ کو بالکل بھی نہیں سمجھتی۔

— ہاں، بیگم، تم مجھے بالکل نہیں سمجھتیں۔

لمبے عرصے بعد، بہت لمبے عرصے بعد میں نے امراؤ بیگم کو اپنے سینے سے لگایا — اب میرا اور کوئی خواب نہیں ہے، بیگم۔ شاعری مجھے چھوڑ چکی ہے۔ جو بھی مجھے نوکر بننے کا کہے گا، اپنے ذریعۂ معاش کے لیے میں اس کا نوکر ہو جاؤں گا۔ میں صرف اسد اللہ خاں ہی نہیں، میں غالب بھی ہوں — یہ دو مختلف فرد ہیں، بیگم۔ اسد اللہ خاں کو اپنی شراب اور کباب پراٹھا عزیز ہے، اور غالب لفظوں کے چٹخارے پسند کرتا ہے — قوسِ قزح پر آویزاں لفظ۔ شہنشاہ اسد اللہ خاں کو خرید سکتے ہیں، لیکن ان کے خزانے میں اتنی دولت نہیں ہے کہ وہ غالب کو خرید سکیں۔ خرید لو، میری مصلحتوں کو بخوشی خرید لو۔

— مرزا صاحب......

— کہو۔

— تو پھر یہ ملازمت چھوڑ دیجیے۔

— نہیں، بیگم۔

— کیوں؟

— اب کوئی پریشانی نہیں ہے، بیگم۔ جب شاعری کسی کو چھوڑ جائے، وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ وہ بادشاہ کے پاؤں داب سکتا ہے، سیاسی کھیل بھی کھیل سکتا ہے۔ کل قیمہ پلاؤ پکواؤ۔ میں اب آسودہ زندگی چاہتا ہوں، بیگم۔

میں جانتا تھا کہ شہنشاہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے مجھے محض کالے صاحب اور احسان اللہ خان کی وجہ سے قبول کیا تھا۔ مجھے بھی دربارشاہی کے طورطریقے نہ بھائے۔ عید ہے، بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے شعر لکھو۔ اور بھی سینکڑوں تہوار تھے۔ ہر ایک موقع پر مجھے شعر لکھنا ہوتے تھے۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا تھا۔ میں لکھنے کے بجائے زبانی ہی دو ایک شعر پڑھ دیا کرتا تھا۔ کیا ایسی چیزوں کو شاعری کہا جا سکتا ہے؟ جشن اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر جہاں پناہ کو نذرانہ پیش کیا جاتا تھا، میں اس خرچ کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھ کر پیش کر دیا کرتا تھا۔ وہ سب گندگی اور غلاظت تھی، منو بھائی، جو میں جہاں پناہ کے منھ پر دے مارتا تھا، کیا آپ کو لگتا ہے شہنشاہ اس کی اہلیت رکھتے تھے کہ ایک فنکار کی چالبازی کو سمجھ سکیں؟ انھیں تو بس خوشامد درکار تھی۔ درباری شاعر ابراہیم ذوق کی مسلسل خوشامد نے ان کا یقین پختہ کر دیا تھا کہ دنیا بھر کی ساری شاعری دراصل بادشاہ بہادر شاہ کی مدح ہے۔ سارے حکمران اسی طرح سوچتے ہیں۔ اگر آپ اس خیال کی مخالفت کریں گے، آپ زندگی بھر کے لیے بدسلوکی کے سزاوار ٹھہریں گے۔ تاریخ میں شہنشاہ اکبر کی جو مدح سرائی کی گئی ہے، ذرا اس کا تصور کیجیے۔ لیکن انھوں نے انارکلی کا قتل کیسے کیا، وہ ایسا کیونکر کر سکتے تھے؟ انارکلی کا اصل نام نادرہ بیگم تھا، کچھ لوگ اسے شرف النساء بیگم بھی کہتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے حرم کی ایک کنیز کی حسین اور دلکش بیٹی۔ ایک دن شیش محل میں بیٹھے، شہنشاہ اکبر نے دیکھا کہ انارکلی شہزادہ سلیم کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ وہ مسکراہٹ انارکلی

کی موت کا پیغام بن گئی۔ زندہ انارکلی کو محل کی گہرائیوں میں چُن دیا گیا۔ تمام— تمام سلطنتیں انسانوں کو اسی طرح ہڑپ کر جاتی ہیں۔

سلطنت اور تاریخ ہر چیز کو صرف کر لیتی ہے، منو بھائی۔ جہاں پناہ کے حکم پر میں نے تاریخ لکھنا شروع کی۔ میں نے مغل سلطنت کی تاریخ کو دو جلدوں میں لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ پہلی جلد میں تیمور لنگ سے ہمایوں تک کے عہد کا احاطہ کیا جائے گا، اور دوسری جلد میں اکبر اعظم سے بہادر شاہ تک کا۔ میں نے پہلی جلد کو 'مہر نیم روز' کا عنوان دیا اور دوسری جلد کو 'ماہ نیم ماہ' کا۔ دونوں جلدوں پر مشتمل کتاب کو 'پرتوستان' کا نام دیا گیا تھا۔

چونکہ یہ میری بقا کا سوال تھا، اس لیے شتابی سے لکھنا شروع کیا۔ یہ طے ہوا تھا کہ ہر چھ مہینے بعد محنتانہ دیا جائے گا۔ پہلے چھ ماہ میں میں نے شہنشاہ بابر کی زندگی کا احوال لکھ ڈالا۔ لیکن اتنے بیزار کن کام کے بدلے چھ ماہ میں صرف ایک بار عوضانہ میں کیسے قبول کرتا؟ میں نے کچھ اشعار موزوں کیے، جن میں ماہانہ تنخواہ کی گزارش کی گئی تھی، اور شہنشاہ کے حضور بھیج دیے:

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

میں وہ تاریخ مکمل نہ کر سکا، برادران۔ صرف پہلی جلد 'ماہ نیم روز' ہی شائع ہو سکی۔ میں 'ماہ نیم ماہ' پر کام نہ کر سکا۔ میں نے حکیم احسان اللہ خان کو بتا دیا تھا کہ مجھ ایسے انسان کے لیے تاریخ کے جنگل سے درست معلومات چھانٹ کر نکالنا ممکن نہیں، میں تو بس اپنے دل کی روشنی میں شاعری کر سکتا ہوں، حکیم صاحب۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ جن حقائق و واقعات کا اس تاریخ میں درج کیا جانا لازم ہے، وہ منتخب کر کے مجھے بھیج دیے جائیں۔ جانتے ہیں انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے باوا آدم سے لے کر چنگیز خان تک کے حقائق و واقعات لکھ کر مجھے بھجوا دیے۔ لیکن میں نے سلطنت کی تاریخ کا آغاز تیمور لنگ سے کیا تھا۔ میں کیا کرتا، جو کچھ بھی میں نے لکھا تھا اُسے سابقے کے طور پر اس نئے مواد کے ساتھ شامل کر دیا، لیکن اگلی جلد کے لیے کوئی تفصیلات موصول

نہ ہوئیں۔ میں نے تقریباً چونسٹھ صفحات تحریر کیے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ مزید تفصیلات و معلومات کے لیے کہلوایا۔ کبھی جواب آیا،'ابھی ماہِ رمضان چل رہا ہے۔' پھر مجھے کہا گیا،'سب لوگ عید کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔' لعنت ہو۔ بادشاہوں کی سلطنت کی تاریخ لکھنے کے لیے میں کیوں شکرگزار ہوتا؟ میں نے چونسٹھ صفحات لکھے تھے، وہ بھجوا دیے۔ کون جانے قلعے کی کس کال کوٹھڑی میں دیمک نے انھیں چاٹا ہوگا۔ تاریخ تو دیمک کے چاٹنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ ہے نا، منٹو بھائی؟

جس طرح تاریخ رقم کروانا حکمرانوں کی خواہش ہوتی ہے، اسی طرح تاریخ مٹا دینا بھی ان کا فخریہ استحقاق ہوتا ہے۔ ہم لوگ اس سے ہم آہنگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور جہاں تک شاعروں کا تعلق ہے، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تاریخ کے جسم پر تتلی کے ست رنگے پَر جڑ دیں — اور اسے اُڑنے دیں۔ جس طرف اس کا جی چاہے۔ جنت کی طرف، چاہے جہنّم کی طرف۔ میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا۔ شہنشاہ بہادر شاہ میری غزلوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ ابراہیم ذوقؔ کے اشعار سُن کر وہ خوب داد دیا کرتے،'ہائے، ہائے،' 'کیا کہنے،' 'سبحان اللہ، سبحان اللہ۔' لیکن جب میرے اشعار کی باری آتی تو ان کے منھ سے بس اتنا ہی نکلتا،'اچھا ہے۔' ایک بار انھوں نے مجھے کہا،'مرزا، آپ پڑھتے بہت اچھا ہیں۔' اس کے پوشیدہ معنی سمجھے آپ؟ گویا اشعار کے معنی و مطالب کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ اب شاعری کے آرزو مند تو وہ بھی تھے۔ ابتداء میں ابراہیم ذوقؔ جہاں پناہ کے کلام کی اصلاح کیا کرتے تھے، ان کے انتقال کے بعد میں یہ فریضہ انجام دینے لگا۔ ہمارے شہنشاہ نے لکھا کیا؟ ان کے لیے ممکن ہی کیا تھا لکھنا؟ ان جیسا بزدل — جس کی زندگی میں، اپنے آباؤاجداد کی دولت پر عیش کرنے کے سوا کوئی مقصد نہ تھا، جو بیگم زینت محل کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی کی طرح تھا، اور زندگی بھر کا طفیلی تھا — کیا شعر موزوں کر سکتا تھا؟ معشوق سے باتیں کرنے کے لیے سکت ہونی چاہیے، منٹو بھائی۔

شہنشاہ کے چھوٹے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر ایک واقعہ پیش آیا۔ بیگم زینت محل کا بیٹا ہونے کے باعث وہ تخت کے متوقع وارث تھے۔ شادی کی تقریب بہت دھوم دھام سے ہونا تھی۔ بیگم زینت محل کی ہدایت پر میں نے ایک سہرا کہا تھا۔ اس سہرے کے مقطع میں میں نے لکھا تھا۔

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

شہنشاہ نے اسے اپنی اور اپنے استاد ابراہیم ذوقؔ کی توہین پر محمول کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ، جن کو انھوں نے 'ملک الشعراء' کا خطاب عطا کر رکھا ہے، نہ تو شعر فہم ہیں اور نہ ہی ایسی شاعری کرنے پر قادر ہیں۔ جب میں نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو شہنشاہ نے کہا،'ذرا ٹھہریے، مرزا۔ استاد کو آ لینے دیجیے۔'

— جو حکم جہاں پناہ۔

دفعتاً شہنشاہ نے شعر پڑھنا شروع کیا۔

ہم سے بھی اس بساط پہ کم ہوں گے بدقمار

جو چال ہم چلے، سو نہایت بُری چلے

پھر میری طرف دیکھا اور پوچھا،'جانتے ہیں یہ کس کا شعر ہے؟'

— جی نہیں، حضور۔

— استاد ذوق کا۔ آپ کو دیکھ کر یہ شعر یاد آ گیا۔

اتنے میں ذوق دربار میں آ گئے۔ شہنشاہ انھیں دیکھ کر کھل اٹھے۔

— تشریف لایئے، استاد۔ ذرا سہرا ملاحظہ کیجیے جو مرزا صاحب کہہ کر لائے ہیں۔

سہرا پڑھ کر ذوقؔ نے میری جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے واضح نفرت موجود تھی۔ جیسے وہ کسی کیڑے کو دیکھ رہے ہوں۔

'آپ کو بھی ایک سہرا کہنا چاہیے، استاد۔' شہنشاہ نے کہا۔

— بہت بہتر۔ وہ سہرا کہنے بیٹھ گئے۔ ان کے سہرے کے آخری دو مصرعے یوں تھے۔

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

— بہت خوب! بہت خوب! شہنشاہ خوشی سے جھوم اٹھے۔ جانتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا؟ ذوقؔ کا لکھا ہوا سہرا اُسی شام دلّی کے گلی کوچوں میں گونجنے لگا۔

میری تذلیل کرنے کا، شہنشاہ کا یہی طریقہ تھا۔ وہ جب پتنگ بازی کے لیے جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے۔ جانتے ہیں کیوں؟ مجھے بے عزت کرنے کے لیے، تا کہ زیادہ سے زیادہ میری تذلیل کی جا سکے۔ چونکہ میں ہر ماہ تم کو تنخواہ دیتا ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم مرزا غالب ہو یا کوئی اور — تم میرے حرم کے خواجہ سرا سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو۔ مجھے مشاعروں میں مدعو کرتے تھے اور پھر انتظار کروایا کرتے، کبھی آخر میں تو کبھی درمیان میں پڑھنے کے لیے بلواتے۔

سچ کہتا ہوں، منٹو بھائی، سہرے کا مقطع میں نے کسی کو چوٹ پہنچانے کے لیے نہیں لکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے شہنشاہ کے حضور معافی نامے کے اشعار لکھ کر بھیجنا پڑے۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ معاشرے کی نظر میں تو شاعر بھکاری سے بھی بدتر تھا۔ آپ جانتے ہیں کس لیے زیادہ تر لوگ مجھے پسند نہیں کرتے تھے؟ مشاعروں میں چاہے اچھی شاعری پڑھی جا رہی ہو یا بُری، ہر کوئی غل مچا رہا ہوتا تھا، 'بہت خوب! کیا کہنے۔' میں کبھی ایسا نہیں کرتا تھا۔ میں جب تک کسی شعر کی روح کو نہ سمجھ لیتا، اسے کبھی نہیں سراہتا تھا۔ لوگ مجھ سے برہم رہتے تھے۔ لیکن جب تک کسی چیز میں سرسوتی دیوی کی سی پاکیزگی نہ نظر آئے، میں اسے کیسے سراہ سکتا تھا۔ اور جب مجھے کوئی شعر اچھا لگتا تو میں بلا دریغ تعریف کیا کرتا۔ ایک بار شطرنج کھیلتے ہوئے منشی غلام علی خان نے ایک شعر پڑھا۔ سبحان اللہ، کیا شعر تھا وہ! میرے دل میں کسی تیر کی مانند ترازو ہو گیا۔ 'کس کا شعر ہے، منشی صاحب؟' میں نے پوچھا۔

— ذوقؔ صاحب کا۔

— مکرر ارشاد۔

میں منشی صاحب کو بار بار وہ شعر پڑھنے کو کہتا رہا۔ ذوقؔ نے کہا تھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مجھے مشاعروں میں لطف نہیں آتا تھا۔ شاعری تنہائی میں جنم لیتی ہے — جیسے دنیا کے سب سے نادر موتی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

جیسے کہ میرؔ صاحب نے کہا ہے۔

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میرؔ کا عجب ڈھب کا

۳۴

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

یہاں قبروں میں ، آج ہمارے لیے خوشی کا دن ہے، برادران۔ میں جانتا ہوں مرزا صاحب کی باتیں سنتے سنتے آپ لوگوں کا دل بھاری ہوگیا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی ساری حیات کسی بھاری پتھر کو دھکیل کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچانے جیسا عمل تھی۔ مرزا صاحب اُسے جتنی بار دھکیل کر اوپر چڑھانے کی کوشش کرتے تھے، وہ پتھر لڑھک کر نیچے آجاتا تھا اور وہ اسے پھر سے اُوپر چڑھانے کی کوشش میں جُٹ جاتے تھے۔ کیا یوں چوٹی کی طرف پتھر دھکیلتے ہوئے زندگی گزاری جاسکتی ہے؟ چلیے، ذرا اس جہنم میں ہلچل برپا کرتے ہیں۔ آج 'گنجے فرشتے' کی کہانیاں سنتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بمبئی کی فلم نگری سے ہے۔ زندگی ویسی نہیں ہوتی جیسی پردۂ سیمیں پر دکھائی جاتی ہے۔ حقیقت تو فلموں کی طرح یوں نِک سِک سے دُرست نہیں ہوتی۔ زندگی کا دوسرا نام روٹی، عورت اور طاقت کے لیے جنگ ہے۔ دنیا کی ہر کہانی اسی جنگ کے بارے میں ہے۔ تمام تقاضوں میں، بھوک سب سے بنیادی تقاضا ہے۔ ہے نا برادران؟ بھوک کو کوئی فراموش نہیں کرسکتا۔ انسان جب سے اس دنیا میں آیا ہے تبھی سے اس کے اندر اقتدار کا لالچ اور عورت کی ہوس رہی ہے۔ یہ چیزیں کبھی نہیں بدلتیں، میرے بھائیو، جب آدمی کے اندر روٹی، عورت اور اقتدار کے لیے نفرت پیدا ہوجاتی ہے صرف تبھی وہ اللہ کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ ان تینوں سے کہیں زیادہ پُر اسرار اور مبہم ہے، اتنا کہ اُسے طاقت آزمائی سے بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

معاف کیجیے گا، میں کچھ زیادہ ہی بک گیا۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو ستارہ کی کہانی سناؤں گا، تو گنجے فرشتے کا دفتر اسی سے شروع کرتا ہوں۔ ستارہ ایک ایسی شیرنی کا نام تھا، بھائیو، جس کے اندر ایسا طوفان چھپا ہوا تھا جو باہر سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ستارہ ہر روز صبح ایک گھنٹے تک رقص کا ریاض کرتی تھی، لیکن میں نے اُسے کبھی تھکا ہوا نہیں پایا۔ اس کے لیے نچلا بیٹھنا محال تھا، وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی یا اس فکر میں رہتی کہ کیا کیا جائے۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ تارا اور الکنندہ۔ وہ تینوں باری باری نیپال کے کسی گاؤں سے، بمبئی میں اپنی قسمت آزمانے کے لیے آئی تھیں لیکن ان تینوں بہنوں میں سے، ستارہ بے مثال تھی۔ اس جیسی لڑکی آپ کو لاکھوں میں کوئی ایک نظر آئے گی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ ستارہ دراصل کئی لڑکیوں کا نام تھا — ورنہ اتنے بہت سے مردوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں وہ کیسے کھیل سکتی تھی؟ ستارہ بمبئی کی کسی پانچ منزلہ عمارت کی طرح تھی، جس میں کئی فلیٹ اور کمرے ہوں، کچھ روشن تو کچھ تاریک۔ وہ ہمیشہ ململ کی باریک اور مہین ساڑھیاں پہنتی تھی۔ اس کے بدن کا نظارہ تصوّر کے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑتا تھا۔

ستارہ کو کوئی فلم ڈائریکٹر بمبئی لایا تھا۔ مجھے اس کا نام بھول گیا۔ — ہم لوگ اسے ڈیسائی کہا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ شادی کر چکے تھے لیکن زیادہ عرصہ ساتھ نہیں رہے۔ 'میں اس عورت سے پورا نہیں نمٹ سکتا۔' ڈیسائی کہا کرتا تھا۔ ستارہ اس زمانے میں کسی اور کے ساتھ رہتی تھی، لیکن مستقل ڈیسائی کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ ڈیسائی اسے زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ ان کی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق ہوئی تھی، اس لیے لگاتار نئے عاشقوں سے منسلک ہونے کے باوجود، وہ مسز ڈیسائی ہی کہلاتی تھی۔

ان دنوں محبوب صاحب کا ستارہ عروج پر تھا۔ انھوں نے ستارہ کو اپنے ایک فلم میں لیا تو وہ بھی اس کا شکار بن گئے۔ فلمی دنیا میں ان کا اسکینڈل مشہور ہوگیا۔ محبوب صاحب کے فلم کا کام جیسے ہی ختم ہوا، ستارہ نے نیا عاشق پکڑ لیا۔ اس کا نام تھا پی، این اروڑا۔ وہ انگلستان سے فلمسازی کی ٹریننگ لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد ستارہ الناصر پر فدا ہوگئی، لیکن میں پہلے آپ کو پی، این اروڑا کی کہانی سنادوں، برادران۔ میں اس زمانے میں دلّی میں ملازمت کر رہا تھا۔ ایک دن

میں نے اروڑا کو سڑک پر جاتے دیکھا، ہاتھ میں موٹی چھڑی تھی اور کمر دہری ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ میں نے تانگے والے کو رُکنے کا کہا، اور اس کے پاس چلا آیا۔

—اوہ، منٹو یہ تم ہو۔ کیسے ہو؟

—میں تو ٹھیک ہوں لیکن تمھاری حالت ایسی کیوں ہے؟ کیا ہوا؟

اروڑا نے ایک آہ بھری اور مسکرایا—ستارہ..... منٹو، ستارہ۔ یہ حال ستارہ کی وجہ سے ہوا ہے۔

الناصر وہرہ دون سے ہیرو بننے کے لیے آیا تھا۔ وہ مردانہ وجاہت سے بھرپور ایک خوب رو نوجوان تھا۔ اسے ایک فلم میں ہیرو کا رول بھی مل گیا، جس میں ستارہ بھی کام کر رہی تھی۔ الناصر نے خود کو شیرنی کی کچھار میں گرا ہوا پایا۔ یہ مت سمجھیے گا، برادران، کہ ستارہ ایک عاشق کو چھوڑنے کے بعد دوسرے کو پکڑتی تھی۔ وہ تو سب کو ایک ساتھ پکڑے رہتی تھی— ڈیسائی، اروڑا، محبوب، الناصر اور جانے کون کون۔ بمبئی آنے پر میں نے دیکھا کہ الناصر کس حالت میں تھا۔ اس کی رنگت جو کبھی گلابی ہوا کرتی تھی، زرد ہو چکی تھی۔ اس کی وجاہت ماند پڑ چکی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ الناصر نے بھی وہی بات دُہرائی، 'ستارہ..... منٹو، ستارہ۔ یہ سب ستارہ کی وجہ سے ہے۔'

— کیوں؟ اس نے کیا کہا؟

—وہ ایک ویمپائر ہے، منٹو۔ اُس نے مجھے کھوکھلا کر دیا۔ اگر میں اس کے چُنگل سے نہ نکل پایا تو میں ختم ہو جاؤں گا۔

الناصر وہرہ دون بھاگ گیا۔ تین مہینے سینی ٹوریم میں رہ کر اس نے اپنی صحت بحال کی اور واپس بمبئی آ گیا۔

اس کے بعد ستارہ نے ایک اور گڑبڑ کی۔ میں نے کہا تھا نا، برادران، کہ ایسی لڑکی لاکھوں میں کوئی ایک ہوتی ہے۔ وہ کسی شعلے کی طرح تھی جس پر آ آ کر پروانے گر رہے ہوں۔ اس بار ستارہ نے نذیر کو پھانسا۔ وہ اسے اپنی سوسائٹی فلم کمپنی میں لے گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے جال میں پھنس گیا۔ نذیر ایک سیدھا اور مخلص آدمی تھا۔ وہ جس شخص کو چاہتا تھا اسے گالیاں دیتے ہوئے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا کرتا تھا۔ ستارہ کے ساتھ اس کا تعلق کئی برس رہا۔ نذیر کی سخت

گیر طبیعت کے باعث ستارہ اپنے دوسرے آشناؤں کے ساتھ راہ و ربط قائم رکھنے سے باز رہی۔ لیکن اس کے لیے یوں وفاداری نبھانا ممکن نہیں تھا، میرے بھائیو، اس نے دوبارہ اروڑا، الناصر، محبوب اور ڈیسائی کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ نذیر یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے مستقل مارنے پیٹنے لگا۔ یوں لگتا تھا ستارہ اس زدوکوب سے ایک خاص قسم کی جنسی لذت محسوس کرتی ہے۔

اب اس کہانی میں ایک نہایت دلچسپ موڑ آنے والا ہے، برادران۔ نذیر کا بھانجا کے آصف بھی اُسی فلیٹ میں رہتا تھا۔ وہ بڑا تنومند نوجوان تھا، ہٹا کٹا اور خوش شکل بھی۔ آصف کی زندگی میں ابھی تک کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ اسے اپنے ماموں سے فلم سازی کے متعلق سیکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اسے سب معلوم تھا کہ نذیر اور ستارہ کے بیچ کیا چل رہا ہے۔ بند کمرے سے آتی ستارہ کی چیخیں اور اونچی اونچی آوازیں ہر گزرتے دن کے ساتھ اُسے پاگل کر رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک دن اس نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا۔ بعد میں مجھے اس نے بتایا تھا، 'وہ جیسے کسی کتے اور کتیا کی لڑائی تھی، جو ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے ہوں، منٹو بھائی، میرے ماموں ستارہ کو کیونکر برداشت کر سکتے ہیں؟

—یہ ایک بھیانک کھیل ہے۔ ہے نا، آصف؟

—جانور۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان دراصل ایک جانور ہے۔ اور محبت کیا ہے، معلوم ہے، منٹو بھائی؟

— کیا ہے محبت؟

—موت کے ساتھ محاذ آرائی۔ میں بھی سالی ایسی محاذ آرائی کرنا چاہتا ہوں۔ کم از کم ایک بار۔

—ستارہ کے ساتھ؟

—بے شک۔ ایک بار تو اُس سے پنجہ ضرور لڑاؤں گا، منٹو بھائی۔ لیکن مجھے اس عورت سے ڈر لگتا ہے۔

— کیوں؟ ستارہ سے ڈرنے کی کیا وجہ ہے؟

— لگتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی جن ہے۔

— برف جیسی ٹھنڈی لڑکیوں سے ستارہ کہیں بہتر ہے، آصف۔ اس کا جنونی پن زندگی سے بھرپور ہے۔ اس کا سامنا کرو۔

آصف نے ستارہ کے ساتھ بات چیت سے اس کا آغاز کیا۔ لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کو ہاتھ لگا سکتا کیونکہ وہ اپنے ماموں کی سخت گیر طبیعت سے واقف تھا۔ ویسے یہ کون نہیں جانتا کہ آصف کی جانب سے پہلا اشارہ ملتے ہی ستارہ اُس پر ٹوٹ پڑتی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ آصف کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ایک جوان اور بھوکا آدمی کتنی دیر ضبط کر سکتا تھا؟ نذیر نے اس کھیل کو بھانپ لیا۔ ایک دن اُس نے ستارہ کو بے رحمی سے پیٹا اور فلیٹ سے نکل جانے کو کہا۔ لیکن ستارہ نہیں گئی۔ غصے میں بھرا ہوا نذیر، اس رات اپنے دفتر میں چلا گیا اور سو گیا۔ آصف نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ وہ ستارہ کے کمرے میں چلا آیا اور نرمی سے اس کے زخموں کو سہلانے لگا۔ قلعہ فتح ہو گیا! موت کے ساتھ آصف کی پہلی مڈبھیڑ ہو گئی۔ پھر اس نے ستارہ کا سامان سمیٹا اور اسے دادر میں واقع ستارہ کے فلیٹ پر لے گیا۔ یوں آصف کے ساتھ ستارہ کا نیا معاشقہ شروع ہو گیا۔ اس رات ہی آصف نے اُسے کہا: 'دیکھو ستارہ، ہمارا سمبندھ بہت مضبوط ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے کا خیال چھوڑ دو، بس میری ہو جاؤ۔'

— میری جان، میں تو تمھیں ہی تلاش کر رہی تھی۔ یقین رکھو، آج سے ستارہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔

— ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

— میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔

ستارہ نے آصف پر بوسوں کی بارش کر دی۔

اگلے روز دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے آصف چلا گیا۔ وہ گیا ہی تھا کہ ستارہ اٹھی اور سنگھار میز کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا میک اپ درست کیا، ساڑھی بدلی اور باہر نکل گئی۔ ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اسے اروڑہ کے گھر جانے کا کہا۔ مجھے بتائیے، مرزا صاحب، آپ کو کیا لگتا ہے، کیا وہ عورت زندگی بھر جنسی بھوک کے پیچھے بھاگتی رہی؟ مجھے اس میں ایک بے قرار بے کسی دکھائی دیتی

ہے۔ ویسی ہی بیکسی جیسی مجھے سوگندھی میں دکھائی دی تھی۔ مادھو اسے چوس کر ختم کر رہا تھا۔ پھر ایک دن سوگندھی نے مادھو کو نکال باہر کیا اور اپنے پالتو کتے کے گرد بازو حمائل کر کے سو گئی۔ ستارہ مجھے بالکل برداشت نہیں کرتی تھی، لیکن میں چاہتا تھا کہ ایک دن وہ بھی سوگندھی کی طرح سو سکے۔

وہ سب حیرت انگیز عورتیں تھیں، میرے بھائیو۔ کیا میں کبھی پری چہرہ نسیم بانو کو بھول سکتا ہوں؟ کیا آنکھیں تھیں اس کی۔ جیسے جھیل میں دو کنول کھلے ہوئے ہوں۔ جن دنوں میں فلم 'بیگم' کی کہانی لکھ رہا تھا، میں نے نسیم بانو کو قریب سے دیکھا۔ ایس مکھرجی اور میں نسیم کے گھر بیٹھ کر کہانی پر بحث کرتے اور اس میں رد و بدل کیا کرتے۔ ہمارا خیال تھا وہ ضرور کسی بہت بڑے سے گھر میں رہتی ہوگی، لیکن پور بندر پر واقع اس کا گھر پرانی وضع کا تھا، دیواروں سے پلستر جھڑ رہا تھا، کھڑکیوں کے پٹ ٹوٹے ہوئے تھے۔ کمروں میں معمولی فرنیچر تھا جو سارا کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا وہ اپنے برآمدے میں کھڑی دودھ والے سے تکرار کر رہی تھی۔ دودھ والے نے شاید آدھا لیٹر دودھ کی ہیر پھیر کی تھی۔ میں حیران رہ گیا، جس نسیم کے پرستار اس کے لیے دودھ کی نہریں بہانے کو تیار تھے وہ یہاں کھڑی دودھ والے سے تکرار کر رہی تھی۔ 'پکار' کی نور جہاں کیا اصل زندگی میں ایسی تھی؟ اور کیوں نہ ہوتی؟ ہم سبھی نکوں کے بنے ہوئے ڈھانچے کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں جو کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔

فلمی لوگ نکوں کے اس وجود کو ہمیشہ ڈھانپے رکھتے ہیں، برادران۔ نسیم زیادہ تر گلابی لباس پہنتی تھی۔ گلابی بڑا خطرناک رنگ ہے، یہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ یہی تاثر نسیم قائم کرنا چاہتی تھی، لیکن اُس وقت تو خود اُس میں بھی لوگوں کو خیرہ کر دینے والی تمام خوبیاں پوری طرح موجود تھیں۔ جیسے گلابی پھول کی پتیاں — مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ایسی رنگت کسی اور کی دیکھی ہو۔ زیورات اور عطریات کی گرویدگی کے ساتھ ساتھ میں نے اُس میں ایک اور لگاؤ کو محسوس کیا — وہ تھا اپنے مرحوم باپ سے لگاؤ۔ اس کا فوٹو اس کے وینٹی بیگ میں رہتا تھا۔ میں نے ایک بار چوری سے وہ فوٹو دیکھ لیا۔ میری ایک بُری عادت تھی، مرزا صاحب — عورتوں کے بیگ میں چوری چوری جھانکنے کی۔ میں ایک بار نسیم کے بیگ میں جھانک رہا تھا کہ وہ آ گئی۔

— کیا کر رہے ہیں، منٹو صاحب؟

—معاف کیجیے گا، یہ میری بہت بُری عادت ہے۔ میں جانتا ہوں پھر بھی خود کو روک نہیں پاتا۔
نسیم ہنس دی، 'غنیمت ہے کہ آپ کو لڑکیوں کے دلوں میں جھانکنے کی عادت نہیں۔'

—وہ میں ویسے ہی دیکھ لیتا ہوں۔

—لڑکیوں کے دل؟

—ہاں۔

—تو پھر بتایئے، میرے دل میں کیا ہے؟

—ایک پھڑ پھڑاتا ہوا گلابی دوپٹہ۔

—آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں، منٹو صاحب۔

—لیکن یہ فوٹو کس کا ہے؟

— کیوں۔ میرے ابّا جی کا ہے اور کس کا۔ یہ ایک لفظ 'ابّا جی' کہتے ہوئے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ اپنے شبنمی بچپن کے دنوں میں لوٹ گئی ہو۔ میں نے اس گہرے لگاؤ اور پیار کو شدت سے محسوس کیا جس کی کرنیں اُس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھیں۔

فلم "بیگم" لکھنے کے دوران ایس مکھرجی کے ساتھ ایک منظر کی بحث و تمحیص کرتے کرتے رات کے دو بج گئے۔ صفیہ اس شام میرے ساتھ تھی۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو نسیم نے کہا، 'یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا؟ آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔'

— کوئی بات نہیں۔ ساڑھے تین بجے ایک گاڑی آتی ہے۔ تب تک ہم پلیٹ فارم پر ٹہل لیں گے۔

لیکن نسیم اور اس کے شوہر احسان نے ہماری ایک نہ سنی۔ ہمیں ٹھہرنا ہی پڑا۔ نسیم صفیہ کے ساتھ سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ احسان اور میں برآمدے میں لیٹ گئے۔

اگلے دن مجھے صفیہ کے ذریعے نسیم کی ایک نئی تصویر دیکھنے کو ملی، برادران۔ پہلے تو نسیم نے بستر پر ایک نئی چادر بچھائی، پھر صفیہ کو ایک نیا سلیپنگ سوٹ دیا اور کہا، 'یہ پہن لو، بالکل نیا ہے۔ پھر سو جانا۔'

—اور تم؟

—مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔

نسیم نے کپڑے تبدیل کیے۔ میک اپ اُتارا اور بستر کی جانب آئی تو صفیہ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا، 'تم کتنی مختلف لگ رہی ہو نسیم۔ تم تو بالکل پیلی ہو۔ پھر کیسے—'

—یہ سب میک اپ کی کارستانی ہے، صفیہ۔ میں کسی عام لڑکی سے بہتر نہیں ہوں۔

نسیم نے اپنے چہرے پر مختلف روغنیات ملے۔ پھر وضو کر کے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔ 'نسیم، قسم سے تم تو ہم لوگوں سے کہیں اچھی ہو' صفیہ کے منھ سے نکلا۔ نسیم نے کوئی جواب نہ دیا، بتی بجھائی اور سو گئی۔

ایسی کتنے ہی لوگوں کی بکھری ہوئی یادیں ہیں میرے پاس، مرزا صاحب۔ کیا میں کبھی نور جہاں کی آواز کو بھول سکتا ہوں؟ لوگ اس کی خوبصورتی کی باتیں کرتے تھے لیکن مجھے اس کی خوبصورتی نے کبھی متاثر نہیں کیا۔ فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی۔ میرے لیے تو نور جہاں کا مطلب تھا آسمانوں سے آتی ہوئی صدا۔ اتنی صاف شفاف آواز، اتنی واضح مرکیاں، اتنا ہموار کھرج، اتنا نوکیلا پنچم میں نے پھر کبھی نہیں سنا، مرزا صاحب۔ جس طرح بازی گر کسی تنے ہوئے رسّے پر بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہ سکتے ہیں اسی طرح نور جہاں چاہتی تو گھنٹوں ایک ہی سُر پر کھڑی رہ سکتی تھی۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں، جن پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے وہی اپنے ہنر کی بے توقیری کرتے ہیں۔ شراب گلے کو برباد کر دیتی ہے، اور سہگل صاحب شراب پیے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاتے تھے۔ کھٹی اور تیل کی چیزیں گلے کے لیے تباہ کن ہیں، مگر نور جہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اچار کھا جاتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ سہگل اور نور جہاں خدا سے محاذ آرائی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ جب تک یہ دنیا سلامت رہے گی، مرزا صاحب، نور جہاں کی آواز بھی زندہ رہے گی۔

نور جہاں کے عشق میں گرفتار لوگ شمار سے باہر ہوں گے۔ رئیس زادے تو اپنی جگہ، میں ایسے کئی باورچیوں کو جانتا ہوں جو چولہے کے پاس نور جہاں کی تصویر لگا کر اپنے صاحبوں اور میم صاحبوں کا کھانا پکاتے تھے۔ روز اس کے گائے ہوئے گیت اپنی بے سُری آواز میں گاتے تھے۔ جب رفیق نے مجھے نور جہاں سے ملوایا تو کہا، 'یہ نور ہے۔ نور جہاں ہے۔ سرورِ جاں ہے۔ خدا کی قسم ایسی آواز پائی ہے کہ بہشت کی حوریں بھی سنیں تو زمین پر اُتر آئیں۔' میں رفیق کے متعارف

کروانے سے پہلے ہی نور جہاں سے دل و جان سے واقف تھا، محض اس کی گائیکی کی بدولت۔ اس کے پرستاروں میں ایک حجام بھی تھا، جسے میں جانتا تھا۔ ہر وقت اسی کی باتیں کرتا رہتا تھا اور اس کے گائے ہوئے گانے گاتا رہتا۔ ایک دن اس کے ایک دوست نے اُس سے پوچھا، 'کیا واقعی تمھیں نور جہاں سے محبت ہے؟'

— میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ نور جہاں تو میری جان ہے۔

— کیا تم اس کے لیے جان دے سکتے ہو؟

— یہ تو کوئی چیز ہی نہیں۔

— کیا تم مہینوال کی طرح اپنے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر دے سکتے ہو؟

حجام نے فوراً اپنا اُسترا نکال کر اپنے دوست کو دے دیا اور بولا، 'جہاں سے چاہو میرا گوشت کاٹ لو۔'

حجام کا دوست بھی عجیب قسم کا انسان تھا۔ اس نے واقعی اس کے بازو سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا، اور پھر اس کا خون سے لت پت بازو دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حجام بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اسے ہسپتال میں ہوش آیا تو اس کی زبان پر نور جہاں کا نام تھا۔ وہ عجیب و غریب دنیا تھی، میرے بھائیو۔ عشق، قتل، خون ریزی — اس کے سوا بھی زندگی کوئی زندگی ہے؟

میرا دوست شیام زندگی سے کسی معذرت خواہی کے بغیر لطف لینے کا عادی تھا۔ میں اس وقت پاکستان میں تھا۔ شیام نے ایک خط میں لکھا تھا، 'میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور ان سے نفرت کرتا ہوں، زندگی یوں ہی گزر رہی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک ایسی معشوقہ ہے جس کے ریشے ریشے سے مجھے محبت ہے۔' شیام عجیب و غریب شخص تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو 'مسخرہ' کہا کرتا جو میٹنگوں اور کانفرنسوں میں پاجامہ کرتا اور ٹوپی پہن کر آتے تھے اور نہایت عجیب شکل بنائے رکھتے تھے۔ جب کوئی شراب کے نشے میں دھت ہو کر زندگی کے بارے میں فلسفہ بگھارنے لگتا تو وہ اسے گالیوں کے سیلاب میں بہا دیتا۔ شیام نے دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ جب وہ قلاش تھا، سکے ہاتھ میں پکڑ کر ہنستا اور کہتا، 'اور کتنے کرب پہنچاؤ گی جان من، ایک دن ایسا آئے گا کہ تم میری ہوگی۔' اور شیام نے سب حاصل کر لیا — گھر، گاڑی، نام۔

وہ مجھے کبھی نہیں بھولا۔

اس وقت میں پاکستان میں نہایت تنگ دستی کی حالت میں تھا۔ فلمیں لگ بھگ بن ہی نہیں رہی تھیں، کہانیاں کس کے لیے لکھتا۔ اس دوران 'ٹھنڈا گوشت' کے خلاف مقدمے نے میری پیٹھ دیوار کے ساتھ لگا دی تھی۔ عدالت نے مجھے تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا سنائی تھی۔ میں تھک چکا تھا۔ سوچتا تھا جو کچھ بھی لکھا ہے اسے آگ لگا دوں۔ اس سے بہتر تھا کسی دفتر میں کلرکی کر لیتا۔ کم از کم میرے بیوی بچے گزر بسر تو کر پاتے۔ میں زیادہ سے زیادہ پینے لگا۔ ایک دن مجھے تحسین پکچرز کے مالک کا خط ملا۔ لکھا تھا فوراً ملوں۔ بمبئی سے انھیں کوئی خط موصول ہوا تھا۔ میں تو پاکستان میں تھا — مجھے بمبئی سے کون خط لکھے گا؟ پھر بھی میں چلا گیا۔ شیام کا خط تھا۔ اُس نے مجھے پانچ سو روپے بھیجے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مرزا صاحب۔ اُسے کیسے علم ہوا کہ مجھے رُپوں کی اشد ضرورت ہے؟ میں نے کئی بار کوشش کی کہ شیام کو خط کا جواب لکھوں، میں نے کئی خط لکھے اور پھاڑ ڈالے۔ شیام کے جذبے کا شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ضرور مجھے جواباً لکھتا — تو یہ ہے تمھارا جواب، منٹو؟

ایک بار شیام کسی تقریب کے لیے لاہور آیا۔ میں اس سے ملنے کے لیے دوڑا گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر، کار میں سے ہاتھ ہلایا اور ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ لیکن پرستاروں کے ہجوم کے باعث ڈرائیور گاڑی نہیں روک پایا۔ میں پچھلے دروازے سے ہال میں داخل ہوا اور اس سے ملا۔ میں آج رات تمھارے ہوٹل آؤں گا میں نے اسے کہا۔

میں اجنبیوں کی طرح ہوٹل میں بیٹھا رہا۔ اس کے پرستاروں کی بھیڑ ہٹا کر اس تک پہنچنے کو جی نہیں چاہا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آیا اور بولا، 'سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں، چلو آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو۔'

— نہیں۔

— کیوں؟

— میں نہیں جاتا۔ تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔

شیام چلا گیا۔ میں اپنے گھر چلا آیا۔ یہ واضح تھا کہ میں اور شیام دولخت ہو چکے ہیں۔ جیسے

ہندوستان اور پاکستان۔ ہم اب ایک دوسرے کے دوست نہیں تھے۔ جس طرح میرے پاکستان چلے آنے کے بعد عصمت نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ اور اگر وہ جواب دے بھی دیتی تو کیا ہوتا تھا؟

۳۵

کریں کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت ہے، آسماں دُور ہے

کچھ لوگ آپ کی زندگی میں چند دنوں کے لیے آتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو زندگی کو بالکل سونا کر جاتے ہیں۔ دل کربلا بن جاتا ہے۔ عارف مجھے اُجاڑ کر چلا گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دوسری جبلتوں کی طرح، اولاد کی محبت بھی انسان کے اندر کتنی گہرائی میں چھپی ہوتی ہے۔ جس نے اولاد کے سکھ کو تجربہ نہیں کیا، اس کی زندگی کا ایک نہایت اہم حصہ ہمیشہ اندھیرے ہی میں رہتا ہے۔ عارف اُس چراغ کی لو تھا، منٹو بھائی، جس سے میرا گھر روشن ہوا تھا۔

عارف امراؤ بیگم کی بہن کا بیٹا تھا، اس کا اصل نام زین العابدین خاں تھا۔ عارف اس کا تخلص تھا۔ وہ اپنے دوست غلام حسین محو کے ہمراہ روز میرے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ دونوں شاعری کے بارے میں مجھ سے سوال جواب کیا کرتے تھے۔ عارف کی قوت تخیل غیرمعمولی تھی۔ مجھے لگتا بس وہی میرا پسر ہوسکتا ہے۔ مجھے مشاعروں میں جانا پسند نہیں تھا لیکن وہ دونوں بچے میرے جانے کے لیے اصرار کیا کرتے۔ 'آپ کو مشاعروں میں جانا کیوں پسند نہیں، مرزا صاحب؟' عارف اکثر مجھ سے پوچھتا۔

—میں مجلسی آدمی نہیں ہوں، عارف میاں۔

—آپ اپنے بارے میں ایسا کیوں سوچتے ہیں؟

—میں نے تو حسن ہمیشہ سرِراہ ہی پایا ہے۔ مجلسوں میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں نے تو

بیٹھ رہگزر پہ ہی بیٹھے رہنا چاہا، لیکن مجھے وہاں سے بھی اُٹھا دیا گیا۔

— کیوں، مرزا صاحب؟

— بھلا کوئی ایسا بھی ہے جسے کسی دیوانے سے ڈر نہ لگتا ہو؟ شعر کہتے ہوئے ایک دن تمھیں احساس ہوگا کہ لفظوں کے دل کو چھونے کے لیے تمھیں کسی گداگر کی طرح سرِ راہ آنا ہوگا۔ تمھارے ہمراہ کوئی نہیں ہوگا۔ تمھارے عزیز و اقارب تمھیں دھتکار دیں گے۔ اور اُس دن تم 'گفتگو' کا مطلب سمجھ پاؤ گے۔ عاشق اور معشوق کے مابین گفتگو۔ اور یہ کہ اس ایک لفظ کے اندر کتنے ہی طلوعِ آفتاب اور کتنے ہی غروبِ آفتاب پنہاں ہیں۔

— کیا میں بھی شعر کہہ پاؤں گا، مرزا صاحب؟

— اگر خدا نے چاہا تو ضرور کہو گے۔

اگر عارف کو کسی روز نہ دیکھ پاتا تو میں بے چین ہو اٹھتا تھا، منٹو بھائی۔ اس لیے میں نے اُسے ایک دن کہا کہ تم یہیں میرے گھر کیوں نہیں رہ جاتے۔ وہ فوراً مان گیا۔ اس کا دل آسمان کی طرح کشادہ تھا۔ وہ اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں سمیت میرے گھر اُٹھ آیا۔ بیٹے، بہو اور پوتوں کو پاکر امراؤ بیگم نہال ہو گئیں۔ ہم لوگوں نے طویل عرصے تک اکیلے پن کی زندگی گزاری تھی، منٹو بھائی۔ ان لوگوں نے آکر ہمارے گھر کو خوش نما بنا دیا، بچوں کی چہچہاہٹ سُن کر لگتا جیسے گھر میں کوئی چمن کھلا ہوا ہے، جہاں پرندے نغمہ سنج ہیں۔ مجھے پھولوں کی مہک آنے لگی۔ زندگی اگر ایک جشن کی طرح نہ ہو تو پھر جینے کا کیا فائدہ؟ اتنے بڑے کنبے کی پرورش کے لیے میری آمدن کافی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود سخت حالات میں ایک ساتھ مل کر رہنے کی خوشی غیر معمولی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ امراؤ کس قدر خوش تھیں؛ میں اُن کی یہ خوشی چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ میں عارف کو بالکل اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس کا نام لکھتے ہوئے، قلم کو تھامے ہوئے میرے انگلیاں کاغذ پر جیسے رقص کرنے لگتیں۔

عارف کی طبیعت بالکل اچھی نہیں تھی۔ وہ اکثر و بیشتر کھانسی اور بخار کے سبب بیمار پڑ جاتا تھا۔ آخر یہ ہوا کہ اس میں بستر سے اٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ حکیم نے تپِ دق تشخیص کیا۔ اس کے منھ سے مستقل خون آنے لگا۔ ہمیں لگا اس کے دن گنے جا چکے ہیں۔ ادھر اس کی بیوی بھی اسی

مرض کا شکار ہو گئی، اور عارف سے پہلے ہی چل بسی۔ عارف چار ماہ مزید جی سکا۔ مجھ سے اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا، منٹو بھائی۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ امراؤ بیگم ہر وقت اس کے سرہانے بیٹھی خدا سے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ ایک دن میرا ہاتھ پکڑ کر کسی بچے کی طرح رونے لگیں۔ 'جو بھی مجھے عزیز ہوتا ہے، وہ مر کیوں جاتا ہے، مرزا صاحب؟ ایسے سوالات کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہم پرچھائیں جیسی پتلیوں کے ساتھ خدا کون سا کھیل کھیلنا چاہتا ہے، یہ تو وہی جانتا ہے۔ عارف مر گیا، دو ننھے ننھے بچوں کو چھوڑ کر۔ باقر پانچ برس کا تھا اور حسین کی عمر دو سال تھی۔

میرے گھر کی سب روشنیاں بجھ گئیں۔ میں بس اپنے چھوٹے سے کمرے میں محصور ہو گیا، کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دربار میں تو جانا ہی تھا۔ بادشاہ کا ملازم جو تھا میں۔ ایک دن عارف کی موت ایک غزل میں نوحہ بن کر اُبھر آئی۔ یہ اجل ہی تو ہے جسے ہم لکھتے ہیں، منٹو بھائی۔ ہو سکتا ہے موت کا یوں تخلیق کرنا ہمیں ہمیشگی کی راہ پر لے جائے۔ میں لافانیت کی بات نہیں کر رہا، منٹو بھائی، اپنے آپ کو مٹاتے ہوئے اور موت کو تخلیق کرتے ہوئے ہمیشگی کی جانب جانا، لافانیت حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ میرا نام ہمیشہ اس دنیا میں زندہ رہے گا اور لوگ ہزاروں سال بعد بھی میری غزلیں پڑھیں گے۔ میں نے صرف یہ آرزو کی کہ جس خاک سے اللہ نے ہمیں بنایا ہے، میں وہ خاک بن سکوں — یہی میری لافانیت کی راہ ہوگی۔

عارف، میرے بیٹے، میں نے اُسے پکارا اور کہا:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!

ہاں اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ہاں، منو بھائی، مجھے تو یہ سب دیکھ کر ہی جانا تھا؛ ان سب زخموں کے نشان اپنے جسم پر سجانے ہی تھے۔ خدا نے مجھے فقیری کی راہ پر چلنے کی اجازت نہیں دی—میری ساری دعائیں اکارت چلی گئیں۔ بس کبھی کبھار جب میں اپنی تخلیقات کی جانب دیکھتا تھا تو میرا دل چھلک اٹھتا تھا۔ خدا تک میری محدود رسائی بس اتنی ہی تھی۔ مجھے بہت بعد میں اس بات کا احساس ہوا کہ عارف کے لیے جو غزل میں نے لکھی تھی، اردو میں ایسی دوسری شاعری موجود نہیں تھی۔ معلوم ہے کیوں؟ میرے ہم عصر شاعروں مثلاً انیسؔ اور دبیرؔ نے متعدد طویل مرثیے لکھے لیکن ان سبھی مرثیوں کا موضوع کربلا تھا۔ امام حسینؓ اور ان کے خاندان کی شہادت۔ مرثیہ لکھتے ہوئے کربلا کے سوا کسی اور چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پہلی بار ہوا کہ عارف کے لیے کہی گئی غزل میں مرثیے کا اسلوب برتا گیا۔ میں نے ارادتاً ایسا نہیں کیا تھا، بس یہ ہو گیا۔ صرف کربلا ہی کی مرثیہ خوانی کیوں— کیا ہم اپنے پیاروں کا نوحہ نہیں لکھ سکتے؟

لیکن ہم لوگوں کے پاس عارف کا غم منانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ باقر اور حسین کو یتیم چھوڑ کر جا چکا تھا۔ جو دو زندگیاں رہ گئی تھیں اب انھیں سنبھالنا تھا۔ عارف کی والدہ باقر کو اپنے ساتھ لے گئیں، حسین کو ہم نے گود لے لیا؛ ننھا سا بچہ، ہر وقت ہمارے چہروں کی طرف دیکھتا رہتا۔ مرحوم والدین کا بیٹا، وہ اکثر بیمار پڑ جاتا۔ امراؤ ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی جاگتی رہتیں۔ میں جانتا تھا انھیں یہ خوف تھا کہ کہیں حسین بھی ہمیں نہ چھوڑ جائے۔ سال بھر میں عارف کی والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ ہم لوگ باقر کو بھی اپنے ہاں لے آئے۔ ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ دونوں بچوں کی ہنسی اور پیاری پیاری باتوں سے میرے گھر میں پھر رونق آ گئی۔

اس دوران میں کالے صاحب کی حویلی چھوڑ کر محلہ بلی ماراں میں اُٹھ آیا۔ ۱۸۵۴ء میں کچھ رقم میرے ہاتھ لگی۔ اب میری سالانہ آمدن دو ہزار دو سو پچاس روپے تھی۔ سات سو پچاس روپے پنشن کی مد میں وصول ہوئے، دو سو روپے بادشاہ سے، اور چار سو روپے بادشاہ کے جانشین مرزا فخرالدین سے جنھوں نے مجھے اپنا استاد مقرر کر لیا تھا۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کی خدمت میں میں نے ایک قصیدہ لکھا، اس کے عوض انھوں نے میرے لیے پانچ سو روپے سالانہ کا وظیفہ جاری کیا۔ اسی برس کے اختتام پر بادشاہ کے استاد ابراہیم ذوقؔ کا انتقال ہو گیا۔ مومن خاں مومن بھی حیات نہیں تھے۔ اُن کا ایک شعر سنیے، برادران ۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیا بات ہے! جب میں نے یہ شعر سنا تو مومنؔ سے کہا تھا، 'میاں میرا سارا دیوان لے لو اور یہ شعر مجھے دے دو۔'

بادشاہ کے پاس یہ کڑوا گھونٹ بھرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ انھوں نے 'شاعرالملک' کے خطاب کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں جانتا تھا وہ ذوقؔ کی طرح مجھے 'ملک الشعرا' کا خطاب کبھی نہیں دیں گے۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ تاہم بادشاہ نے میرے مشاہرے میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ لیکن اُن کا استاد ہونے کے ناطے مجھے ان کے کلام کی اصلاح کرنی ہوتی تھی۔ میں نے اس امر پر کبھی توجہ نہیں دی۔ شاعری کی اصلاح کیسے کی جا سکتی ہے؟ جو لکھا گیا ہے وہ یا تو شاعری ہے یا شاعری نہیں ہے۔ اصلاح کر کے گدھے کو گھوڑا نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن روزی روٹی کا سوال تھا۔ ایک دن میں دیوانِ عام میں بیٹھا نذیر حسین مرزا سے باتیں کر رہا تھا۔ نذیر حسین بادشاہ کے وزیر تھے۔ ایک محافظ حاضر ہوا اور کہا کہ جہاں پناہ اپنی غزلیں ملاحظہ کرنا چاہتے ہیں۔ 'جاؤ پالکی میں سے میرے کاغذات اٹھا لاؤ۔' میں نے کلّو کو حکم دیا۔ کاغذات آ گئے۔ میں نے ان میں سے آٹھ نو صفحات نکالے، ان سب پر بادشاہ کے ادھورے اشعار درج تھے۔ میں نے سب اشعار کو مکمل کیا اور محافظ کے ہاتھ بھجوا دیا۔

'اتنی جلدی کیسے؟' نذیر حسین شاہ نے پوچھا۔

—یہ تو بہت آسان ہے۔ جہاں پناہ خوش ہو جائیں گے۔

شعروں کی اصلاح کرنا اور کتابوں کی تقریظ لکھنا، یہ وہ کام تھے جن سے مجھے چڑ تھی، منو بھائی۔ یہ شاعروں کا کام ہے؟ یہ تو وہ کرے جو اور کچھ کرنے کے قابل نہ ہو۔ میرا ایک شاگرد تھا، ہرگوپال تفتہ۔ وہ میرا دوست بھی تھا۔ سکندرآباد میں رہتا تھا۔ میں نے اس کے بے شمار فارسی کلام کی اصلاح کی۔ اور اس کے دیوان کی تقریظ بھی لکھی۔ تفتہ نے جب وہ تقریظ پڑھی تو سخت برہم ہوا۔ اُسے لگا کہ تعریف کی آڑ میں میں نے اس کی شاعری کا تمسخر اُڑایا ہے۔ میں کیا کہہ سکتا تھا؟ تم نہ تو میرے دشمن ہو اور نہ ہی میرے مقابل ہو، میں نے اسے لکھا: 'تم میرے دوست ہو اور خود کو میرا شاگرد بھی کہتے ہو۔ میں تعریف کی آڑ میں تمھارا تمسخر کیوں اُڑاؤں گا۔ کیا تم مجھے ایسا ہی نیچ تصوّر کرتے ہو؟' کچھ عرصے بعد تفتہ نے اپنا دوسرا دیوان شائع کروانا چاہا اور مجھ سے دوبارہ تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ اس بار تو میں سچ مچ بگڑ گیا۔ میں نے اُسے کھری کھری بات لکھ دی، 'تم کو شاید دیوان لکھنا آسان ہو، لیکن مجھ کو دیباچہ اور تقریظ لکھنا ایسا آسان نہیں۔ اگر شعر سے محبت ہے تو بس کہے جاؤ، چھپوانے کی عجلت نہ کرو۔ تحمل سے کام لو۔ اب یہ دیوان چھپوا کر تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ میں کب تک دیباچے لکھا کروں گا۔ میں اس عمر میں اپنی وضع نہیں بدل سکتا۔ اگر تم ہر برس ایک دیوان کہہ لو تو کیا مجھے ہر برس ایک دیباچہ لکھنا ہوگا؟ میں مزید ایسی مہملات لکھنے کو تیار نہیں۔' اس کے بعد تفتہ نے بہت عرصے تک مجھے خط نہیں لکھا۔ آخر لوگ کیا سمجھتے ہیں، منو بھائی؟ شاعری کی طرح نثر لکھنا بھی مشکل کام ہے۔ عمر اس کے حصے میں کسی کے بھی ساتھ سمجھوتا میری سوچ سے باہر تھا۔ سیّد احمد نے مجھ سے ابوالفضل کی آئینِ اکبری کی تقریظ لکھنے کو کہا۔ وہ اس کی تدوین کر رہے تھے۔ ہم دونوں قریبی دوست تھے۔ وہ نامور فلسفی اور رہنما تھے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ اس نئے عہد میں آئینِ اکبری بالکل غیر متعلق ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ابوالفضل کی نثر بالکل پسند نہیں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے تقریظ کے بجائے ایک نظم لکھ کر بھجوا دی۔ سیّد صاحب نے اُسے پسند نہیں کیا۔ انھوں نے اسے شائع بھی نہیں کیا۔ اس میں بھلا میں کیا کرسکتا تھا؟ صرف دوستی نبھانے کی خاطر کسی کے کام کی تعریف کرنا میری فطرت میں نہیں تھا۔ میں رفتہ رفتہ اکیلا ہوتا جا رہا

تھا اور میں نے اسے قبول کرلیا تھا۔ زندگی سے مزید کس نئے پن کی توقع کرسکتا تھا میں؟

ایک دن کلو کہیں سے کسی داستان گو کو پکڑ لایا۔ وہ کسی شکاری کی طرح داستان گوؤں کی تلاش میں رہتا تھا۔ کلو اور میں قصہ سننے بیٹھ گئے۔ اس نے ہمیں مولانا رومی کی مثنوی سے ایک آسمانی داستان سنائی۔ ذرا غور سے سنیے برادران۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے کی بات ہے۔ تسلیم نامی ایک مطرب شہر مدینہ میں رہا کرتا تھا۔ وہ صرف گاتا ہی نہیں تھا بلکہ چنگ بجانے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کی گلوکاری کوئل کو بھی شرما دیتی ہے۔ جب وہ گاتا تو مُردے بھی اپنی قبروں سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے۔ معاشرے کے ہر طبقے کے ساتھ اس کا رویہ نہایت دوستانہ تھا۔ تسلیم جہاں بھی جاتا لوگوں کا ایک ہجوم اس کے ساتھ ہولیتا؛ یوں لگتا جیسے تسلیم کے سوا ان کی زندگیوں میں اور کوئی نہیں ہے۔

لیکن جوں جوں تسلیم بوڑھا ہوتا گیا، اس کی آواز بھی اپنا جادو کھوتی چلی گئی؛ انگلیاں بھی زخم بکھیرنے کی طاقت کھو گئیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے گانے پر مدینے کے لوگوں کو ایسا لگتا جیسے کوئی گدھا رینک رہا ہو۔ ستر سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس کے گانے اور چنگ کو سننے والا کوئی نہ رہا۔ تسلیم نے سمجھا تھا کہ اس کی شہرت اور مقبولیت ساری عمر قائم و دائم رہے گی، اس لیے اس نے اپنی ساری دولت عیش و عشرت میں لٹادی تھی۔ اب بڑھاپے میں آ کر وہ قرض کے بوجھ تلے دب گیا۔ اس کے مالکِ مکان نے اسے نکال باہر کیا۔ حتیٰ کہ وہ ایک وقت کا کھانا خریدنے کے بھی قابل نہ رہا۔ وہ اپنے چنگ کو ہاتھوں میں لیے، جس کے تار ٹوٹ چکے تھے، گلی گلی بھٹکنے پر مجبور ہوگیا۔ اب وہ بالکل اکیلا ہوگیا۔ آپ ہی آپ خود سے باتیں کیا کرتا۔ اے رحمٰن و رحیم میں اس اذیت کا شکار کیوں ہوں؟ ایک وقت تھا جب لوگ اسے سرمدی موسیقار کہا کرتے تھے۔ تو کیا اب خدا اسے بھول چکا ہے؟ کیا اس دنیا میں کوئی انصاف موجود نہیں؟

سڑک پر کوئی اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ دو ایک لوگ 'سلام علیکم' کہہ کر جلدی سے نکل جاتے۔ مدینہ کے لوگ نئے فنکاروں کو سننے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ تسلیم کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی پاشکستہ آدمی چلا جا رہا ہے۔ یوں ہی ایک دن وہ مدینہ سے باہر ایک قبرستان میں جا پہنچا۔ بھوک اور تھکن سے نڈھال وہ ایک لوحِ مزار کے پاس جا کر بیٹھ

گیا۔ کیا مطلب ہے ایسی زندگی کا؟ کیا جو بھی عزت و تکریم اسے ملی تھی وہ جھوٹی تھی؟ اس کی جوانی کے دنوں کی شہرت اور ناموری اب ایک تلخ یاد بن کر رہ گئی۔ اب نہ وہ گانے کے قابل تھا نہ چنگ بجانے کے۔ یہ کسی زندہ دوزخ جیسی بات تھی۔ تسلیم کو لگتا تھا کہ اپنے ہنر پر غرور کرنا ہی دراصل اس کا گناہ تھا۔ کیا شہرت کی لالچ کی وجہ سے ہی اسے یہ سزا ملی؟ اردگرد پھیلی ہوئی قبریں بھی اسے یہی بات کہہ رہی تھیں — صرف موت ہی حقیقت ہے۔ تسلیم نے مرنے سے پہلے خدا کی عبادت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کبھی خدا کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ پھر وہ ایک قبر کے اوپر لیٹ گیا، اسے محسوس ہوا اس کے جسم کے نیچے کسی مرد یا عورت کی ٹھنڈی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ اس کے خاموش الفاظ اس کے آنسوؤں کے ساتھ گھل مل گئے — 'اے اللہ، تو نے مجھ سے میری موسیقی چھین لی۔ نغمہ ہی تو میری سانس تھا اور میرا ذریعۂ معاش بھی۔ میں موسیقی کے بغیر کیونکر زندہ رہوں گا؟ تُو نے اس نااہل آدمی کو بہت کچھ دیا، اور پھر سب کچھ واپس لے لیا، وہ سب تیرا ہی تھا۔ بس مجھے اتنا حوصلہ دے دے کہ میں اس درد کو برداشت کرسکوں۔ میں آج تیرے در پر بے سر کھڑا ہوں۔ اے خدا، میری حاضری قبول کر۔ اگر میں کچھ اور جی پایا تو فقط تیرے ہی لیے نغمہ سرا ہوں گا۔ تیرے ہی لیے چنگ کے تار چھیڑوں گا۔ مجھے کم از کم اتنا تو دے دے کہ میں اس ٹوٹے ہوئے ساز کے لیے تار خرید سکوں۔ تُو تو انھیں بھی بخش دیتا ہے جو تجھے بھول بیٹھتے ہیں، مجھے بھی بخش دے، مولا۔'

یہ کہتے ہوئے تسلیم کی روح قفسِ عنصری سے اُس ابدی گلشن کی جانب پرواز کرگئی، جہاں ہمیشہ فصلِ بہار رہتی ہے۔ اس کی روح گویا آبِ حیات کے سمندر میں غرقاب ہوگئی۔ اسے دنیا میں لوٹ جانے کی کوئی خواہش نہ رہی۔ اس نئی دنیا میں، کوئی شہرت، کوئی نیک نامی اور کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کر آسودہ مقام اور کیا ہوگا، تسلیم کی روح نے سوچا۔ اسی لمحے اس نے وہ آواز سنی برادران، وہ ندائے حقیقی، دنیا کی تمام آوازیں جس آواز کی محض بازگشت ہیں۔ آواز نے کہا: 'یہیں مت ٹھہر جانا، یہ تو تمھارے لیے محض ایک نیا تجربہ ہے۔ بس اب نکل پڑو۔'

— لیکن کہاں؟ کیا مجھے دوبارہ اُسی دنیا میں لوٹ جانا ہوگا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔

ٹھیک اسی لمحے دنیا میں، خلیفہ عمرؓ کو تخت پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ آگئی۔ وہ سوگئے۔ خواب میں انھیں وہی حقیقی ندا سنائی دی۔ 'میرا ایک پیارا بندہ مدینہ شہر سے باہر قبرستان میں سویا ہوا ہے۔ اسے بیت المال سے سات سو دینار دے دو اور کہو کہ وہ اپنے چنگ کے لیے تار خرید لے۔'

آنکھ کھلتے ہی خلیفہ عمرؓ سات سو دینار لے کر قبرستان کی طرف دوڑے۔ قبروں کے درمیان تلاش کرتے، انھیں ایک ضعیف العمر شخص دکھائی دیا جو ایک سنگِ مزار پر لیٹا ہوا تھا۔ لیکن خلیفہ نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ یکایک انھیں خیال آیا، میں اُس بوڑھے کی ظاہری حالت دیکھ کر آگے بڑھ آیا، مبادا وہی خدا کا عزیز بندہ ہو۔ عمرؓ دوبارہ اس بوڑھے کے پاس گئے اور جب انھوں نے غور سے دیکھا تو تسلیم کو پہچان لیا۔

تسلیم کی روح ابھی تک دوسری دنیا میں چکراتی پھر رہی تھی۔ دفعتاً چھینکنے کی آواز سنائی دی۔ خلیفہ عمرؓ کو چھینک آگئی تھی۔ تسلیم کی روح کو اس سے ایک بامعنی پیغام ملا۔ خدا کی اِس دنیا میں ہر چیز ایک قاعدے سے بندھی ہے۔ تسلیم کی روح اس کے جسم میں لوٹ آئی اور وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خلیفہ کو دیکھ کر اُس نے اُن کے پاؤں پکڑ لیے — 'حضور، قرض نہ چکانے کی وجہ سے مجھے زندان میں نہ ڈالیے۔ بس اس بار میری جاں بخشی کردیجیے۔'

— ڈرو مت۔ یہ لو سات سو دینار۔ جیسے چاہے انھیں استعمال کرو، لیکن اپنے چنگ کے لیے تار ضرور خرید لینا۔

سکّوں کو ہاتھ میں تھامے، تسلیم کچھ دیر انھیں دیکھتا رہا۔ پھر انھیں خلیفہ کو واپس لوٹا کر اس نے اپنا چنگ اٹھایا اور قبر پر مار کر اسے پاش پاش کردیا، اور پھر اس نے اپنا گریبان چاک کرڈالا۔

— یہ تم کیا کررہے ہو؟ تم خدا کے عزیز بندے ہو۔ اُسی نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔

— میں اس کا اہل نہیں ہوں خلیفۂ وقت۔ اسی چنگ کی وجہ سے میں خدا سے دُور ہوگیا تھا۔ میں اپنی آواز کے حسن کی وجہ سے اُس کا جمال نہ دیکھ سکا۔ میری آرزوؤں نے مجھے اس کے قریب نہ جانے دیا۔ میں جب شہرت کی سیڑھیاں چڑھنے میں مگن تھا، اس کا کارواں دور نکل گیا۔ میرے غرور اور گناہوں کا داغ کسی طرح نہیں دھل سکتا، اے خلیفہ۔

— تم جو یہ ساری باتیں کہہ رہے ہو، یہ بھی تمھارے غرور کی علامت ہیں۔ پشیمانی

تمھارے گناہوں کو اور بھی بدتر بنادے گی۔

— لیکن اس چنگ ہی نے مجھے اس سے دُور رکھا۔

— اُسی نے تو یہ چنگ تمھارے ہاتھوں میں دیا تھا۔ ورنہ کیا تم اسے پاسکتے تھے؟ اس نے مجھے بھیجا تاکہ تم چنگ کے لیے نئے تار خرید سکو۔ اللہ تمھارے گلے سے گاتا ہے۔

خلیفہ سے دینار لے کر تسلیم نے انھیں سلام کیا۔ پھر وہ نیا چنگ خریدنے بازار چلا گیا۔ اس کے بعد کسی نے تسلیم کو نہیں دیکھا۔ نئے چنگ کو بجاتے ہوئے وہ اُس سکوت کی جانب بڑھ گیا جسے کوئی قصّہ کبھی نہیں چھوسکتا۔

۳۶

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا

میں تو ایک افسانہ نگار تھا، مرزا صاحب، لیکن دنیا کی عدالت نے بار بار مجھے فحش نگاری کا مجرم قرار دیا۔ حکومتِ پاکستان نے کبھی کہا کہ میں کمیونسٹ ہوں اور مشکوک کردار کا حامل ہوں، تو کبھی مجھے عظیم ادیب ہونے کا اعزاز بخشا۔ کبھی مجھ سے زندہ رہنے کا ذرا سا حق بھی چھین لیا گیا تو کبھی رحم کھا کر کچھ خیرات میں دے دیا گیا۔ کبھی انھوں نے کہا کہ میں کوئی نہیں ہوں، باہر کا آدمی ہوں، اور جب کبھی انھیں ٹھیک لگا؛ مجھے اپنا لیا۔ لیکن مجھ پر یہ ظاہر ہو چکا تھا، مرزا صاحب، کہ میں ان کی نظروں میں ایک بن بلائے مہمان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صرف پاکستانی حکومت کے لیے ہی نہیں بلکہ کسی بھی حکومت، کسی بھی طاقت کے لیے میں محض ایک باہر کا آدمی تھا، ایک مہاجر۔ میری زندگی اسی حالت میں گزری۔ میں نے خود سے بار بار سوال کیا، تو پھر کون ہوں میں؟ کہاں کا ہوں میں؟ پاکستان میں مجھے کبھی اپنی جگہ نہ مل سکی، مرزا صاحب، اگرچہ میں دیوانہ وار اُسے ڈھونڈتا رہا؛ اسی وجہ سے میرا زیادہ تر وقت کبھی ہسپتال تو کبھی پاگل خانے میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ سب نے مجھ پر تھوکا۔ منٹو! وہ فحش نگار۔ وہ غلاظت کے بارے میں لکھنے والا۔ دن بھر شراب پیتا رہتا ہے؛ شراب پینے کے لیے کبھی بھیک مانگتا ہے تو کبھی قرض لیتا ہے۔ اور پھر اپنے جہنم میں گھس کر گندی گندی کہانیاں لکھتا ہے۔

یہ سب بہت پہلے شروع ہو چکا تھا، میرے بھائیو۔ ابھی ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہُوا

تھا۔ میرے افسانے 'کالی شلوار' کے چھپتے ہی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس موقع پر لاہور سیشن کورٹ نے مجھے بری کر دیا۔ 'پھر 'دھواں' کے خلاف مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا۔ یہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ لاہور سے خفیہ پولیس کے ایک افسر نے آ کر مجھے گوزگاؤں پولیس اسٹیشن میں حاضر ہونے کو کہا۔ تھانے پہنچتے ہی مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ جب میں نے گرفتاری کے وارنٹ دیکھنا چاہے تو ایک افسر نے کہا: 'وہ ہم آپ کو نہیں دکھا سکتے۔'

— کیوں نہیں؟

— حکم نہیں ہے۔

— آپ مجھے وارنٹ دکھائے بنا گرفتار نہیں کر سکتے۔

— آپ کی کسی بات کا میں جواب نہیں دے سکتا، مسٹر منٹو۔ آپ کو یہاں سے سیدھے لاہور کورٹ پہنچانے کا حکم ہے۔

میں نے تھانے سے وکیل ہیرالال کو فون کیا۔ جب انھوں نے افسر سے بات کی تو مجھے رہا کر دیا گیا۔ ۸ جنوری کی رات مجھے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، اس بار گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ضمانت پر چھوڑ تو دیا لیکن یہ بتا دیا گیا کہ مجھے لاہور کے اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔

عصمت کو بھی اس کے افسانے 'لحاف' کے لیے انھی دنوں گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے بھی اسی دن اور اسی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ میں یہ سن کر کافی مسرور ہوا، مرزا صاحب۔ کم سے کم لاہور جا کر ہم دونوں کچھ ہلا گلا ہی کر لیں گے۔ میں صفیہ کو لے کر عصمت کے گھر جا پہنچا۔

— 'تم دونوں نے جو شروع کیا ہے نا۔' شاہد نے میری پیٹھ پر دھول جماتے ہوئے کہا: 'چلو اسے سیلبریٹ کرتے ہیں۔ عصمت تو بہت پریشان ہے۔'

— لیکن کیوں؟

— یہی تو میں نے کہا۔ اب اسے لگتا ہے کہ 'لحاف' لکھ کر اس نے بہت بڑی غلطی کر دی۔

— میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔ عصمت غرائی۔

— تو پھر؟

— محض ایک کہانی لکھنے پر اتنی پریشانی جھیلنا بُرا لگ رہا ہے۔

— میں نے بھی منٹو صاحب سے یہی کہا تھا۔ صفیہ نے کہا: 'اگر ایک کہانی لکھنے کی وجہ سے جیل جانا پڑے تو بہتر ہے کہ ایسی کہانیاں ہی نہ لکھی جائیں۔'

— سنو، عصمت بہن، زندگی میں ایسی چیزیں کبھی کبھار ہی واقع ہوتی ہیں۔

— کیا مطلب ہے آپ کا؟ یوں لگتا ہے جیسے آپ نے وکٹوریہ کراس جیت لیا ہے۔

— بے شک۔ ملکہ نے کہانیاں لکھنے پر، تمھیں اور مجھے کورٹ میں حاضر ہونے کا فرمان بھیجا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اعزاز ہو سکتا ہے؟

— اس اعزاز کو دھو کر آپ پانی پی لیجیے، منٹو بھائی۔ آپ خود کو دوسروں سے ہر طرح مختلف تصور کرنا پسند کرتے ہیں۔

— جھگڑا مت کرو، عصمت۔ شاہد آئس کریم منگواؤ۔ تم نے پتا ہے کیا کہانی لکھی ہے، عصمت؟ تم اس پر ہزار مرتبہ اپنی پیٹھ تھپتھپا سکتی ہو۔ لاہور کا دورہ پُرلطف رہے گا۔ شاہد تم بھی ہمارے ساتھ ضرور چلو۔

— یہ جا کر کیا کریں گے؟ عصمت نے ڈپٹ کر کہا۔

— خدا کو مانو، تمھیں اندازہ ہی نہیں کہ سردیوں میں لاہور کس قدر خوبصورت ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا، 'جنھے لاہور نہیں ویکھیا او جمیا ای نئیں'۔ تلی ہوئی مچھلی اور وسکی — ارے وہ جنت ہے، شاہد — ریڈ وائن ایسی گرم جیسے معشوق کا بوسہ، سوچ سکتے ہو؟

— آپ ذرا چپ رہیں گے، منٹو صاحب؟

— کیوں صفیہ؟ میں کیوں چپ رہوں؟ کیا میں کوئی چور ہوں یا فراڈ؟ دراصل ملکہ چاہتی ہے کہ ہم انصاف کے بہانے لاہور گھوم آئیں۔

ہمارے لاہور جانے اور عدالت میں پہنچنے کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ ہیرالال جی ہم دونوں کا کیس لڑنے والے تھے۔

آہ، لاہور! پورا شہر جیسے شیش محل ہو، مرزا صاحب۔ نہیں، بلکہ لاہور تو ایسی دوشیزہ کی طرح تھا جس کی چمک دار آنکھوں سے قوسِ قزح منعکس ہو رہی ہو، جو اپنی قسمت کے ساتھ خود ہی کھیلتی ہو اور جو آپ کو اپنی چھاتیوں کی خوشبو میں کھینچ لینا چاہتی ہو۔ ہمارے لاہور پہنچتے ہی ہمیں ڈھیروں

دعوتیں موصول ہونا شروع ہو گئیں۔ میں وہاں سب کو جانتا تھا لیکن وہ سب عصمت سے ملنا چاہتے تھے۔ کون تھی یہ عجیب عورت جس نے ایک کہانی لکھ کر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا؟

ہمیں اسپیشل مجسٹریٹ رائے صاحب ست رام کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ ہم نے اپیل کی تھی کہ ہمیں بار بار حاضریوں سے استثنا دیا جائے کیونکہ بمبئی سے لاہور بہت دور ہے۔ ہماری عرضی کو قابلِ غور بھی نہیں سمجھا گیا، اس لیے ہم نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ اس کے بعد ہمیں جسٹس اچھو رام کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ وہاں جو پیش آیا اُس نے ہمیں حیران کر دیا۔ جج بہت دیر تک ہماری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا، 'میں نے آپ دونوں کی کہانیاں غور سے پڑھیں۔ مجھے تو وہ کافی اچھی لگیں۔' یہ ایک نعمتِ غیر متوقع تھی۔ اس کا مطلب ہے ہم اس بار بچ جائیں گے۔ لیکن اچھو رام نے مقدمہ دین محمد کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ 'آپ دونوں نے ادب کے نام پر گندگی پھیلائی ہے۔' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ہماری درخواست مسترد کر دی۔ میں ان دنوں سچ مچ کافی بیمار تھا، مرزا صاحب، اس لیے میں ڈاکٹر کا خط ساتھ لے کر گیا تھا۔ دین محمد صاحب کے پاس مجھے ذاتی طور پر حاضری سے استثنا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

میں نے رائے صاحب ست رام کی عدالت میں، فحاشی کے الزام کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے صاف لفظوں میں اپنا بیان پیش کیا۔ جناب عزت مآب، آپ کی اجازت سے میں دو چار باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ عورت اور مرد کے رشتے میں ایسا کچھ نہیں ہے جسے فحش کہا جائے۔ اس رشتے کے بارے میں کہی جانے والی کوئی بات بھی گندی نہیں ہے۔ ہاں جب دو افراد کے تعلق کو چوراسی جنسی آسنوں کے ذریعے دکھایا جائے، تب اور صرف تب ہی اسے فحش قرار دیا جا سکتا ہے۔ افسانے، ناول، شاعری اور مجسموں کو ان کی تخلیق کے پیچھے کارفرما محرک کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ اگر یہ محرک غیر اخلاقی ہے تو یقیناً ہم اسے فحش کہیں گے۔ جنسیت کا مطلب فحاشی نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر 'کونارک' اور 'کھجراہو' کے مندروں کو ڈھا دینا چاہیے۔ جنابِ اعلیٰ، کوئی بھی اپنے دل میں گندگی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا ہی پاکیزگی اور گندگی کے نام چسپاں کرتی ہے۔ اپنے افسانے 'دھواں' میں میں نے ایک مخصوص صورت حال کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی میں ماں اور باپ جس جنسی برانگیختگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، وہی

برانگیختگی ان کا بیٹا مسعود بھی محسوس کرنے لگتا ہے جو غیر متوقع طور پر یہ ماجرا دیکھ لیتا ہے۔ پتا نہیں اس کہانی کو فحش کیوں کہا گیا۔ کوئی بیمار ذہن ہی اس کہانی میں فحاشی ڈھونڈ سکتا ہے۔ لیکن میں نے یہ افسانہ صحت مند ذہنوں کے لیے لکھا ہے۔ جنابِ اعلیٰ، میں ایک معمولی افسانہ نگار ہوں، مجھے فحش نگار نہ بنائیے۔

رائے صاحب ست رام نے شاید ایک لفظ بھی نہ سنا، یا شاید سنا بھی تو وہ اپنا فیصلہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ مجھ پر دو سو روپے کا جرمانہ کر دیا گیا۔ میں نے جیب سے فوراً رقم نکالی اور پیش کر دی۔ ست رام جی نے دبی دبی مسکراہٹ سے کہا، 'تو گویا آپ پہلے ہی تیاری کر کے آئے تھے؟'

—اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟

لیکن بعد میں اپیل کرنے پر جرمانہ خارج کر دیا گیا۔

چلیے، برادران، کچھ دیر کے لیے یہ عدالتوں، جرمانوں اور اہانت کی باتیں موقوف کرتے ہیں۔ میں کبھی لاہور کے اُن شان و شوکت والے دنوں کو نہیں بھول سکتا۔ صرف اس وقت کو چھوڑ کر جب ہمیں عدالت میں پیش ہونا ہوتا تھا؛ عصمت، شاہد اور میں سارا وقت تانگے میں سوار گھومتے اور خریداری کرتے رہتے۔ عصمت نے بے شمار کشمیری شالیں اور جوتیاں خریدیں۔ مجھے بھی جوتے خریدنے کا شوق تھا۔ جب بھی ہم کسی جوتوں کی دکان میں جاتے، عصمت میرے چھوٹے چھوٹے پاؤں دیکھ کر کہتی، 'آپ کے پاؤں دیکھ کر مجھے حسد ہوتا ہے، منٹو بھائی۔'

— بکومت۔ مجھے تو نفرت ہے اپنے پیروں سے۔

— کیوں؟

—بالکل لڑکیوں کے پیروں جیسے ہیں۔ بے تکی بات ہے۔ پتا نہیں تب خدا کیا کر رہا تھا! غلطی سے لڑکیوں کے پاؤں لگا دیے مجھے۔

—آپ عورتوں کے پیروں کو اتنا حقیر جانتے ہیں؟ ویسے تو عورتوں میں آپ کی دلچسپی کم نہیں دیکھی میں نے۔

—تم ہر بات کے غلط معانی نکالتی ہو، عصمت۔ میں عورتوں کے پیروں کو حقیر کیوں سمجھوں گا؟ مرد ہونے کے ناتے میں عورتوں کو پسند کرتا ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں

عورت ہونا چاہتا ہوں۔

— اچھا، بکیے مت۔

— پہلے خود بکتی ہو پھر کہتی ہو بکو مت۔ شاہد، تم اسے کیسے برداشت کر لیتے ہو؟

— شاہد نے ہنستے ہوئے کہا، 'اس کا سارا زہر تو تم پر نکل جاتا ہے، منٹو۔ جو میرے لیے بچتا ہے وہ تو آبِ حیات ہے۔

— عورت مرد کا قصہ چھوڑیں، منٹو بھائی، انسانوں کی بات کریں۔ عصمت نے متانت سے کہا۔

— انسان؟ وہ کیا ہوتا ہے؟

— کیا مطلب؟

— میں تو عورتوں اور مردوں کو ہی جانتا ہوں۔ میں کسی انسان کو نہیں جانتا۔

— آپ پھر بدمعاشی کرنے لگے۔ عصمت نے آنکھیں نکالیں۔

— میں بے جسمیت کو پسند نہیں کرتا عصمت۔

— کیا مطلب ہے آپ کا؟

— انسان کی اصطلاح میرے لیے غیر مجسم ہے۔ میرے لیے شاہد ہے، عصمت ہے، صفیہ ہے— ان میں کچھ عورتیں ہیں کچھ مرد۔ انسان کی اصطلاح میرے نزدیک فراڈ ہے۔

— ہر چیز آپ کے نزدیک فراڈ ہے نا؟ عصمت نے چیخ کر کہا۔

— تم فراڈ نہیں ہو، عصمت بہن۔

— پھر وہی؟

— کیا؟

— 'بہن' کہنا ضروری ہے؟

شاہد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا— 'عصمت، اسی زندگی میں منٹو کے کھیل کو مان جاؤ، ایسا نہ ہو اگلی زندگی میں اس کا انتظار کرنا پڑے۔'

میں نے مسکرائے بغیر کہا، 'شاہد، اتنی سنجیدہ عورت کو کہانیاں نہیں لکھنی چاہئیں۔'

عصمت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی دیر بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا— 'تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'

— اسے پھر سے غصہ مت دلاؤ، منٹو۔ شاہد نے بڑے پیار سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا— تمھارے جانے کے بعد یہ میرا قیمہ کر ڈالے گی۔

— وہ تم پاؤں کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں، عصمت؟

— کچھ نہیں۔

— اچھا یہ لو، بادام کھاؤ۔

بادام بھلا عصمت چھوڑ سکتی تھی؟ اس نے مٹھی بھر لی اور مزے سے چبانے لگی۔ یکا یک ہی وہ ایک دوسری عصمت بن گئی— آپ نے میری پوری بات تو سنی نہیں، جن کے پاؤں خوبصورت ہوتے ہیں وہ لوگ بہت ذہین اور حساس ہوتے ہیں۔

— واقعی؟ تب تو میں ذہین بھی ہوا اور حساس بھی۔

— پتا نہیں۔ عصمت نے جھنجھلا کر کہا۔ میرے بھائی عظیم بیگ تو تھے۔ ان کے پاؤں بہت خوبصورت تھے۔ بالکل لڑکیوں کے سے۔ مرتے وقت ان کے پاؤں اتنے سوج گئے تھے کہ دیکھا نہیں جاتا تھا، منٹو بھائی۔

اس کے بعد عصمت کو مزید ستانا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے درمیان عظیم بیگ چغتائی جو آ گئے تھے، جب بھی یہ نام آتا تھا، عصمت پتھرا جایا کرتی تھی۔ کیسا بدذات آدمی تھا، اسے تج دے گیا۔ 'دوزخی' میں عظیم بیگ کے بارے میں اس کا سارا دکھ تحریر ہے۔

لاہور کے وہ دن بڑے پُرمسرت تھے، مرزا صاحب۔ تقریباً سارا ہی دن ہم لوگ سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ انارکلی بازار، شالیمار باغ، مقبرۂ نور جہاں، مشاعرے، گپ شپ، تلی ہوئی مچھلی، کباب، مرغ تکّے۔ سارے لاہور میں پرانے دنوں کی تصویریں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ میری ناتجربہ کار نوعمری کے دن تھے۔

میرے افسانے 'بُو' کے چھپتے ہی ایک مرتبہ پھر ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے زیادہ فحش کہانی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں، عیسائی مجھ پر بہت برہم ہو گئے تھے، اس افسانے کا کردار رندھیر

ایک گھاٹن لڑکی کے لیے ایک عیسائی لڑکی کو چھوڑ دیتا ہے اور گھاٹن لڑکی کے جسم کی بُو میں اسے زندگی کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ عصمت اور میں دوبارہ لاہور کی جانب عازمِ سفر تھے۔ شاہد اپنی فلم کی وجہ سے مصروف تھا، وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ 'بُو' کے سلسلے میں پہلی سنوائی ہوئی۔

—'یہ کہانی فحش ہے؟' میرے وکیل نے پوچھا۔

—'جی ہاں۔' سرکاری گواہ نے جواب دیا۔

—'کون سا لفظ فحش ہے؟'

—'چھاتی۔'

—'کیا لفظ 'چھاتی' فحش ہے، مائی لارڈ؟ مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہے؟'

—'نہیں۔ مگر یہاں مصنف نے عورت کے سینے کو چھاتی کہا ہے۔'

میں مزید ضبط نہ کر پایا، مرزا صاحب۔ کیا عدالتوں کے وکیل، کلرک اور سرکاری ملازم بتائیں گے کہ کس لفظ کا کیا مطلب ہے؟ اور اس آدمی کو کچھ کہنے کی اجازت نہیں جو سوتے جاگتے میں اور اپنے ڈراؤنے خوابوں میں لفظوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے؟ میں اُچھل کر کھڑا ہوگیا، 'مائی لارڈ، میری کہانی میں چھاتی لفظ عورت کے پستانوں کے لیے ہی استعمال کیا گیا ہے۔ عورت کے سینے کو کوئی مونگ پھلی تو کہتا نہیں۔'

عدالت میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ میں بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا، مرزا صاحب۔ جو لوگ وہاں میرا فیصلہ کرنے بیٹھے تھے، کیا انھوں نے کبھی پستان دیکھے نہیں تھے، انھیں چھوا نہیں تھا، دبایا نہیں تھا یا چوسا نہیں تھا؟ تو پھر اس لفظ پر اُنھیں کیا اعتراض تھا؟ مجھے پستان اچھے لگتے ہیں مرزا صاحب۔ کیسی خوبصورت شکل ہوتی ہے ان کی۔ جیسے سمندر کی تہہ سے ابھری ہوئی سیپوں کی جوڑی ہو؛ کتنی ہی اَن جان اور بے نام مخلوقات کی خواہشات کی مہک ان میں اکٹھی ہوتی ہے۔ میں ان کی گرماہٹ کو سہلاتا ہوں، ان کے حسن کو ملاحظہ کرتا ہوں۔ جیسے وہ کسی مندر کے دو آراستہ گنبد ہوں۔ کبھی وہ دو پرندے بن جاتے ہیں اور میں ان کے پروں میں ایک لاڈ بھرا لمس محسوس کرتا ہوں۔ مجھے عورت کی گردن پسند ہے، اس کے بازو، اس کی ناف کا پھول، اس کے سُرین اور اُس کی رانیں۔ خدا نے جسے اتنا حسن عطا کیا ہو آپ کی مجال کیسے ہوئی اُسے فحش کہنے کی؟

جج حضرات عموماً چڑچڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اعلان کیا گیا: 'اگر ملزم نے پھر اس طرح کا چھچھورا مذاق کیا تو اسے توہینِ عدالت کے جرم میں نکال دیا جائے گا۔'

میں بیٹھ گیا۔ اپنے ہونٹوں کو میرے کان کے قریب لاتے ہوئے عصمت نے کہا: 'اگر چھاتی فحش ہے تو گھٹنا یا کہنی کیوں فحش نہیں ہے؟'

—اس بکواس پر توجہ مت دو۔

—کیا آپ کچھ نہیں کہیں گے؟

—میں اور کیا کہوں؟

—یہ لوگ آپ کے بخیے اُدھیڑتے رہیں گے اور آپ چپ بیٹھے سنتے رہیں گے؟

—یہی ادیب کا مقدر ہے، عصمت۔ کوئی بھی چاقو سے تمھارے ٹکڑے کاٹ سکتا ہے۔ تمھیں سب سنتے رہنا ہوگا۔ دنیا میں سچ کبھی اپنی آواز بلند نہیں کر پایا۔

—میں بولوں گی۔

—تم کیا بولوگی؟

—'لحاف' کے حق میں۔ میں نے کوئی خطا نہیں کی۔

—تمھیں بولنا چاہیے۔ تمھارے الفاظ عدالت میں گونجیں گے۔ معذرت مت کرنا، عصمت۔

—مجھے سمجھتے کیا ہیں، منٹو بھائی؟

—مار کھاتے کھاتے کبھی ہماری ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی ہوجاتی ہے، عصمت۔ ہم بے بس ہوجاتے ہیں۔ میں نے طے کیا ہے کہ اب میں چپ رہوں گا۔ میرے پاس خاموشی کے سوا کوئی دوسرا ہتھیار نہیں۔

اس رات اچانک عصمت نے مجھ سے پوچھا، 'اب آپ میں وہ پہلے جیسا جوش کیوں نہیں رہا، منٹو بھائی؟'

میں عصمت کو کیا بتاتا؟ کیا اسے معلوم تھا کہ میں ایک کمزور اور ناتواں آدمی ہوں؟ صرف زندہ رہنے کے لیے میں اپنے آپ کو سب کے سامنے یوں پیش کرتا تھا جیسے میں کوئی مشتعل بیل ہوں۔

—مجھے جیل جانے سے بہت ڈر لگتا ہے، عصمت۔

—آپ کو جیل سے ڈر لگتا ہے؟

—میں نے اپنے اس خوف کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا، عصمت۔ بتا تا بھی کس کو؟ صفیہ کو کہہ نہیں سکتا۔ اتنی اچھی اور خاموش طبع لڑکی ہے۔ میری وجہ سے ویسے ہی وہ ایک ہراساں زندگی جی رہی ہے۔ میری روزمرہ زندگی پہلے ہی کسی قیدی جیسی ہے، عصمت۔ اس پر اگر مجھے ایک اور قید میں ڈال دیا گیا تو میں ایک منٹ بھی جی نہیں سکوں گا۔

—آپ کو ہوا کیا ہے، منٹو بھائی؟

—میں بہت خوف زدہ ہوں، عصمت۔ میں اس زندگی کا ایک ایک لقمہ چکھنا چاہتا ہوں۔ سوچو، میں سڑک پر چلا جا رہا ہوں اور کوئی اچانک مجھے گولی مار دے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا، لیکن میں جیل خانے میں کسی کیڑے کی طرح نہیں مرنا چاہتا۔

—آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟

—میرا وقت اب ختم ہونے کو آیا ہے، عصمت۔

—منٹو بھائی! عصمت چلائی۔ آپ خود کو کیا سمجھتے ہیں؟ آپ کو ہمدردی چاہیے نا؟

—گاڑی کے ساتھ جو ایک فاضل پہیہ لگا ہوتا ہے، وہ دیکھا ہے نا، عصمت؟ میں وہی فاضل پہیہ ہوں۔

—ہماری گفتگو ہندی فلموں کے مکالمے جیسی ہوتی جا رہی ہے، منٹو بھائی۔

میں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ بحث کرنے کا دل نہیں تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خود سے کہا، کوئی نہ کوئی تو ہماری فلم بنا ہی رہا ہے، عصمت۔ شاید وہ اسے روزِ حشر ہمیں دکھائے گا۔

۳۷

جیسا کہ آپ جانتے ہیں منٹو بھائی، جس وقت میں ناٹک کے مچان پر چڑھا، کھیل کا آخری منظر دکھایا جا رہا تھا۔ ہم محض اس بات کے منتظر تھے کہ خدا کب پردہ گراتا ہے۔ شہنشاہ شاہجہان نے قلعہ معلیٰ کے دیوان خاص کی دیواروں پر امیر خسرو کے دو مصرعے کندہ کروائے تھے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اگر دنیا میں کہیں جنت ہے تو یہیں ہے، یہیں ہے، یہیں ہے

جس وقت میں بہادر شاہ کے دربار میں پہنچا تب تک وہ جنت جہنم میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ نے ۱۸۳۷ء میں باسٹھ برس کی عمر میں تخت سنبھالا۔ سلطنت کے نام پر کچھ نہیں بچا تھا۔ انگریز سب کچھ اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی نمائش بس قلعے اور چند ایک دوسرے مقامات تک محدود تھی۔ آمدنی کے نام پر انگریزوں کی جانب سے ملنے والا معاوضہ اور جمنا کنارے کے مٹھی بھر علاقوں سے موصول ہونے والا لگان تھا۔ اور معلوم ہے قلعے میں کتنے لوگ رہائش پذیر تھے؟ دو ہزار سے بھی زیادہ۔ ان میں اکثریت ناجائز اولادوں کی تھی۔ آپ تصور نہیں کر سکتے، منٹو بھائی، یہ سب حرام زادے وہاں کیڑوں کی طرح رہ رہے تھے۔ بہادر شاہ درحقیقت کیڑے مکوڑوں پر حکومت کرتے تھے۔

بادشاہ بننے پر انھوں نے ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ مجھے ہنسی آتی تھی۔ غازی؟ غازی کا مطلب معلوم ہے نا؟ مقدس جنگجو۔ انھوں نے کس جنگ میں حصہ لیا

تھا؟ ان میں تو جنگ لڑنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ جنگ لڑنے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے وہ شہنشاہ میں نہیں تھی۔ فوجی بغاوت کے دوران انھیں کٹھ پتلی کی طرح نچایا گیا۔ وہ بیگم زینت محل اور خواجہ سرا محبوب علی خاں کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی تھے۔ شہنشاہ وہی کرتے تھے جو محبوب علی خاں کہتے تھے۔ اور محبوب علی خاں کی ڈوریاں بیگم زینت محل کے ہاتھ میں تھیں۔ حیران نہ ہوں، برادران۔ مغل شہنشاہوں کے حرم کی نگرانی خواجہ سرا کیا کرتے تھے۔ جب سلطنت روبہ زوال تھی، حرم کے خواجہ سرا اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ بادشاہ بھی خواجہ سرا محبوب علی خاں کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ ذرا سوچیے، منٹو بھائی، جب خواجہ سرا اتنے اثر ورسوخ کے حامل ہو جائیں تو سلطنت کا خاتمہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اور ہمارا شہنشاہ؟ وہ بھی ایک خواجہ سرا ہی تھا۔ جی ہاں، منٹو بھائی، ایک ذہنی خواجہ سرا۔ انھیں کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑی۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کی دولت پر عیش کیے، شاہی تام جھام کی نمائش کی اور بیکار شاعری کی۔ ان کی چار شرعی بیویاں تھیں: بیگم اشرف محل، بیگم اختر محل، بیگم زینت محل اور بیگم تاج محل۔ اس کے علاوہ لاتعداد لونڈیاں اور داشتائیں۔ ان کی ستاون اولادیں تھیں— کیا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ بچیس بیٹے اور بتیس بیٹیاں۔ تو شہنشاہ اس طرح رہا کرتے تھے، منٹو بھائی۔

شہنشاہ بخوبی جانتے تھے کہ سلطنتِ تیموریہ کا سورج غروب ہونے کو ہے۔ اس لیے وہ اس بات کا تعین نہیں کر پا رہے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ روز دربار سجاتے تھے۔ آخر کیوں؟ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ آخر اس کی ضرورت کیا تھی؟ کچھ بھی تو ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی ہر روز حاضر ہونا ہوتا تھا۔ میرے ذمے یہ کام تھا کہ جب شہنشاہ شعر کہیں تو میں ان کی اصلاح کروں۔ دربار میں لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتے۔ ایسے میں بادشاہ اگر اچانک کوئی شعر پڑھ دیتے تو 'سبحان اللہ، سبحان اللہ' کا غلغلہ بلند ہوتا اور سب یک زبان ہو کر 'مرحبا، مرحبا' کہنے لگتے۔ کبھی بادشاہ بیٹھے بیٹھے سو جاتے اور ہم سب منتظر رہتے کہ کب حضور کی آنکھ کھلے اور ہمیں جانے کی اجازت ملے۔

ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا، 'استاد، کل سلیم گڑھ تشریف لائیے۔'

—بہت بہتر، حضور۔ لیکن کس لیے؟

—پتنگ بازی کے لیے۔ جمنا کے کنارے پتنگ بازی کا اپنا ہی لطف ہے۔

—آپ پتنگ اُڑائیے گا؟

—بہت عرصہ ہوا پتنگ اُڑائے ہوئے۔ اچانک جی چاہ رہا ہے۔

اگلی صبح سلیم گڑھ پہنچ کر چہرہ دکھانا پڑا۔ شہنشاہ کی پتنگ بازی ملاحظہ کر کے، دوپہر کے کھانے کے وقت میں کھانا کھانے کے لیے گھر چلا گیا، لیکن اس کے بعد مجھے دوبارہ جانا پڑا۔ مجھے شام تک ان کی پتنگ بازی ملاحظہ کرنی تھی۔ پتنگ اُڑاتے ہوئے انھوں نے ایک نئی فرمائش کر دی۔ مجھے ان کے لیے پتنگ بازی سے متعلق کوئی شعر کہنا تھا۔ میں نے فی البدیہہ ایک شعر پڑھ دیا۔ شہنشاہ خوشی سے سرشار ہو گئے، اور میں تھکن سے چور اپنے خزیر خانے میں لوٹ آیا۔ ہر روز مجھے یہ احساس دلایا جاتا تھا کہ شاعر کی زندگی کچھ نہیں ہوتی، منٹو بھائی— ہم سب ملازموں ہی کی طرح رہتے ہیں۔ شاعر اپنا کرتا پاجامہ زیب تن کرتا ہے، بالوں میں صفائی سے کنگھی کرتا ہے، داڑھی کو مہندی سے رنگتا ہے اور بدن پر عطریات چھڑکتا ہے— لیکن اس کے باوجود غلاموں والی بدبودار سانسیں اور پسینے کی عفونت ان سب چیزوں پر غالب آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے، یہ بات ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کبھی کبھار طاقت کے ساتھ کاندھا مس کر لینے سے وہ خود کو بھی طاقتور سمجھنے لگتے ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں، اے میرے پیارے شاعرو، اقتدار کی اس شطرنج میں تم محض ایک مہرے ہو۔ اس لیے اس کے صرف مزے لو۔ ہاں، منٹو بھائی، اقتدار کے ساتھ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو محض اتنا کہ اس کا تمسخر اُڑائیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اقتدار کے کسی ایک مرکز سے انحراف کر کے کسی دوسرے کو اختیار کر لینے سے آپ کی عزت میں اضافہ ہو جائے گا تو یہ محض آپ کی نظر کا دھوکا ہے۔ اقتدار صرف آپ کو استعمال کرے گا اور جب آپ فائدہ بخش نہیں رہیں گے، آپ کو لات رسید کر کے گندی نالی میں پھینک دے گا۔ اس لیے شاعر کو ہمیشہ اپنے فن کے ساتھ مخلص رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کسی دن دنیا میں مخلوق کے دلوں کو کسی ایسے کھیت میں بونے کے لیے، جس میں جاوداں زرّیں فصلیں پیدا ہوتی ہیں، دنیا کی اعلیٰ شاعری کے ساتھ ساتھ، اُس کے اس عطیۂ شعرگوئی کی بھی ضرورت پڑ جائے۔ تب وہ فطرت کی شفقت بھری آغوش کی گہرائیوں

میں چلا جائے گا۔ شہروں اور بندرگاہوں میں گھومے گا۔ ہجوم میں گھل مل جائے گا۔ کچھ نیا تخلیق کرنے کے لیے، جہاں کہیں بھی ضروری ہوا وہ مایوس کن نامطابقت پر اپنے ذہین تخیل کی مدد سے چڑھائی کردے گا۔ ہوسکتا ہے وہ ان مشتاق معذوروں کے ہمراہ دوبارہ فطرت کی شفقت بھری آغوش میں چلا جائے، مادرِ آدم کے پاس، سنسان دھوپ میں، گہری نیلاہٹوں کے درمیان، کسی خاموش اور بے سدھ مادرِ فطرت کے پاس۔

جب کسی بادشاہ میں حکمرانی کرنے کی طاقت نہیں رہتی یا جب وہ معذور ہوجاتا ہے تو معلوم ہے وہ کیا کرتا ہے؟ وہ فضول شاعری کرتا ہے، مشاعرے منعقد کرتا ہے، پتنگ بازی کرتا ہے اور ہاتھی پر بیٹھ کر جلوس نکالتا ہے۔ ہمارے بادشاہ کے پاس بھی اس کے سوا کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ خوشامدیوں کا ہجوم انھیں گھیرے رہتا تھا۔ وہ بادشاہ کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہتے۔ میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہتا کہ کس طرح تاریخ کی اس کتاب کو دیمک کھائے چلی جارہی ہے۔ جو کچھ بچ رہے گا کیا اسے واقعی تاریخ کہا جاسکے گا؟ صرف راہ کی دھول میں پڑی کچھ کہانیاں رہ جائیں گی۔

ایک روز کلّو ایک داستان گو کو لے آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا، 'آؤ، میرے ساتھ دربار میں چلو، میاں۔'

— دربار؟ کیسا دربار؟

— بادشاہ کا دربار۔

— معاف کیجیے، حضور۔ میں شاہی دربار میں جانے کے لائق نہیں ہوں۔

— فکر مت کرو۔ میں تمھیں لے جاؤں گا۔

— وہاں میرا کیا کام ہے، حضور؟

— تم جہاں پناہ کو داستان سنانا۔

— کیا جہاں پناہ داستانیں سنتے ہیں؟

— کیوں نہ سنتے ہوں گے۔ خود ان کی اپنی زندگی بھی تو ایک غیر معمولی داستان ہے۔

'استاد، یہ آپ کس کو لے کر آئے ہیں؟' شہنشاہ نے مجھ سے پوچھا۔

— حضور کو داستانیں سننا پسند ہے نا؟

— بے شک۔ کس کی کہی ہوئی داستان ہے جو تم سنانے والے ہو؟

— مولانا روم کی، حضور۔

— بہت خوب۔

بادشاہ اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگے۔

— حضور، یہ ایک چوہے اور اونٹ کا قصہ ہے۔

— اس میں کوئی انسان نہیں ہے؟

— جی نہیں۔ لیکن چوہا اور اونٹ بھی تو انسان ہی ہیں، حضور؟

— کیا مطلب؟

— کسی انسان کے اندر چوہا چھپا ہوتا ہے، حضور، تو کسی میں اونٹ۔

— بہت خوب۔ تم قصہ شروع کرو۔

— وہ ایک بہت نایاب قسم کا چوہا تھا، حضور۔ وہ خود کو شہنشاہوں کا شہنشاہ سمجھتا تھا۔

— شہنشاہوں کا شہنشاہ؟ بادشاہ کو ہنسی آگئی۔— چوہا بھی خود کو شہنشاہ سمجھ سکتا ہے؟

— کیوں نہیں، حضور، یہ چوہا وہ کام بھی فخریہ انجام دے سکتا تھا جس کے بارے میں دوسرے چوہے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

شہنشاہ زور زور سے ہنسنے لگے۔— کہیں چوہے بھی فخر کیا کرتے ہیں، میاں؟

— اگر آپ ہمیں آسمان کی بلندی سے دیکھیں، حضور، تو ہم سب بھی چوہے دکھائی دیں گے۔ کیا ہم فخر نہیں کرتے ہیں؟

— اچھا یہ واہی تباہی باتیں چھوڑو اور قصہ سناؤ۔

— حضور، تھا تو وہ چھوٹا سا چوہا لیکن وہ خود کو شیر سمجھتا تھا۔ وہ اکثر بڑی دلیری کے ساتھ مشکلات میں کود پڑتا تھا، اور پھر اپنی عقل کے زور پر بڑی صفائی سے باہر نکل آتا۔ دوسرے چوہے اسے بڑی حیرت سے دیکھتے تھے۔ ایک رات وہ چوہا ریگستان کے راستے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ ایک اونٹ وہاں ریگستان میں سویا ہوا تھا، حضور، چوہا اونٹ کے گلے میں بندھی رسّی سے الجھ گیا۔ لیکن وہ بہت ہوشیار تھا۔ اس نے خود کو رسّی کے پھندے میں پھنسنے سے بچالیا۔

—پھر؟

—ضرورت سے زیادہ ہوشیار لوگوں کے دماغ میں شیطانی خیالات ہوتے ہیں، حضور۔
چوہے نے رسّی کا سرا پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ اونٹ اُٹھ بیٹھا، اور چوہے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔
چوہے نے خود سے کہا، 'ایک اونٹ میرے پیچھے چل رہا ہے۔ جب لوگ یہ دیکھیں گے تو حیرت
میں پڑ جائیں گے۔' چلتے چلتے راستے میں ایک دریا آ گیا۔ دریا میں اونچی اونچی لہریں اُٹھ رہی
تھیں۔ چوہا کنارے پر رُک کر سوچنے لگا کہ پانی کے اِس عمیق حصے کو کس طرح پار کرے۔

—تو اس نے کیا کیا؟ شہنشاہ نے پوچھا۔

—ایک وقت ایسا آتا ہے جب ساری ذہانت دھری کی دھری رہ جاتی ہے، حضور۔ چوہا
سوچ رہا تھا۔ پھر اونٹ نے کہا، 'تم سے بڑھ کر عقل مند چوہا کوئی اور نہیں ہے۔ تم ٹھہر کیوں
گئے، جناب؟ مجھے دریا پار لے چلو۔' چوہا بولا، 'فضول باتیں مت کرو۔ یہ دریا بہت خطرناک ہے۔
پانی میں اُترتے ہی ہم ڈوب جائیں گے۔' اُونٹ پانی میں اُتر گیا۔ اُس نے چوہے کو بلاتے
ہوئے کہا، 'یہ اتنا گہرا نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ دیکھو، پانی صرف میرے گھٹنوں تک ہے۔ تم
کیوں خوف زدہ ہو؟'

—ٹھیک کہا۔ شہنشاہ نے حقے کی نے کو کھینچا۔

—چوہا بولا، 'تم احمق ہو۔ پانی ضرور تمھارے گھٹنوں تک ہے، لیکن میں تو اس میں ڈوب
جاؤں گا۔'

—تم کیوں ڈوبو گے؟ کیا تم جیسا عقل مند کوئی اور ہے؟ تمھاری ذہانت اور بہادری
تمھیں بچا لے گی۔ چلو، اُترو پانی میں۔ میں تمھارے پیچھے چلوں گا۔

—پھر کیا ہوا؟

—چوہے نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بے وقوف اونٹ سے مزید بے عزتی نہیں کروائے گا۔
رسّی کو منھ میں دبا کر وہ پانی میں اُتر گیا۔ خوفناک لہروں کے تھپیڑے سہتا، وہ نیم جان حالت میں
دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا۔ وہ کراہتا ہوا، اونٹ کے پیروں کے پاس زمین پر ڈھے
گیا۔ اونٹ نے کہا، 'چوہے بھائی، خود کو شیر سمجھنا چھوڑ دو۔ جو تم سے زیادہ دور تک دیکھ سکتا ہو، اُس

پر بھروسا کیا کرو۔ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہوشیاری ایک دن تمھیں لے ڈوبے گی۔ لمبے فاصلے
طے کرنا میرے لیے آسان ہے۔ میرے کوہان پر چڑھ جاؤ، میں تمھیں گھر پہنچا دوں گا۔'

—پھر کیا ہوا؟

—مولانا رومی نے اس سے آگے کچھ نہیں بتایا۔

—اُستاد، اس قصے کا مطلب کیا ہوا؟ شہنشاہ نے میری جانب دیکھا۔
میں پہلے ہی دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ مولانا نے لوگوں کو یہ قصہ اس لیے سنایا تھا کہ وہ
اپنے مرشدوں پر یقین رکھیں، لیکن مجھے اس کا ایک اور مفہوم بھی سمجھ میں آیا۔ کبھی کبھار چوہے بھی
شہنشاہ بننا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، 'قصے تو ہم لطف حاصل کرنے کے لیے سنتے ہیں، جہاں
پناہ۔ کیا آپ کو لطف آیا؟'
کس طرح لطف حاصل کیا جائے اور کتنا حاصل کیا جائے، اس ضمن میں شہنشاہ کے
خیالات محدود تھے۔ وہ اکثر و بیشتر مہرولی والے ظفر محل میں جایا کرتے تھے۔ یہ محل ان کے والد
نے تعمیر کروایا تھا، اس کی تزئین و آرائش شہنشاہ نے اپنے ذوق کے مطابق کروائی تھی۔ شکار، عیش و
عشرت اور تفننِ طبع— ظفر محل انھی مقاصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ جبکہ انگریزوں نے ۱۸۵۴ء میں یہ
اعلان کر دیا تھا کہ بادشاہ کی وفات کے بعد کسی کو قلعے میں رہنے کی اجازت نہ ہوگی، سب کو قطب
مینار کے قریب واقع ایک دوسرے محل میں منتقل ہونا ہوگا۔ شہنشاہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھ پا رہے تھے
کہ کس طرح انگریز نسلِ تیمور کو مٹانے کے درپے تھے۔ قلعے میں شعری نشستیں اب بھی گاہے بہ
گاہے منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار میں بھی چلا جاتا اور ان بے روح مشاعروں میں شریک
ہو جاتا۔ مجھے احساس تھا کہ خدا اس سوانگ کو کسی بھی لمحے مٹا دے گا۔ مجھے میر صاحب کا ایک
شعر مسلسل یاد آتا۔

شہرِ دل ایک مدّت اُجڑا بسا غموں میں
آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا

میں کچھ دن تو آسودگی سے رہا، برادران، لیکن خدا نے ہمیشہ میرے حال پر رحم نہیں
کیا۔ ۱۸۵۶ء میں آسمان پر پھر سے گہرے سیاہ بادل چھا گئے۔ بادشاہ کے جانشین اور میرے

شاگرد فخر الدین کی وفات ہوگئی۔ اور انگریزوں نے اعلان کر دیا کہ بادشاہ کے بعد جو جانشین بھی تخت نشین ہوگا وہ بادشاہ نہیں کہلائے گا۔ وہ محض شہزادہ ہی رہے گا۔ یہ واضح تھا کہ صرف نسلِ تیموری کے نہیں بلکہ مجھ ایسے درباری شاعروں کے دن بھی گنے جاچکے ہیں۔ اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ اسی سال لکھنؤ میں نواب کی عملداری کا خاتمہ ہوگیا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، منو بھائی، نواب واجد علی شاہ کے ہاں سے مجھے پانچ سو روپے سالانہ وظیفہ ملا کرتا تھا۔ نواب کو لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ جانا پڑا۔ اگر کوئی شخص صحیح معنوں میں نواب کہلانے کا حقدار تھا تو وہ واجد علی شاہ تھے، منو بھائی۔ ان کا تخلّص قیصرؔ تھا۔ انھوں نے صرف غزلیں ہی نہیں کہیں بلکہ لاتعداد ٹھمریاں بھی لکھیں۔ وہ خود بھی بہت عمدہ گاتے تھے۔ ان کا ایک اور پیارا سا تخلّص — اختر پیا — تھا۔ انھوں نے اس قلمی نام سے بھی بہت سے غزلیں اور ٹھمریاں لکھیں۔ یہ ممکن نہیں کہ راگ بھیروی میں وضع کردہ ان کی ٹھمری 'بابل مورا نیہر چھوٹو جائے' سن کر آنکھیں نہ بھر آئیں۔ اس ٹھمری کا ہر بول جلا وطنی کی اذیّت سے بھرا ہوا ہے۔ لکھنؤ چھوڑتے وقت انھوں نے کہا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لیکن میں تو سگِ آوارہ تھا۔ عہدِ مغلیہ کے خاتمے پر غمگین ہونے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے رقم کی ضرورت تھی؛ ورنہ جیتا کیونکر؟ میں نے رامپور کے نواب یوسف علی کو خط لکھا۔ ایک زمانے میں انھوں نے مجھ سے کچھ فارسی پڑھی تھی؛ وہ شعر کہتے تھے اور میری غزلوں کے مدّاح تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ وہ مجھے اپنا استاد مقرر کرنا چاہیں گے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ نواب رام پور کے استاد کے عہدے کا مطلب تھا آمدن۔ مجھے گزر اوقات کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، منو بھائی۔ میں نے اب شاعری کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دن، مدت ہوئی گزر چکے تھے۔

میں نے محض مالی اعانت کے لیے فارسی میں ملکہ وکٹوریا کا ایک قصیدہ لکھا اور لندن بھجوانے کے لیے اسے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو بھیج دیا۔ ساتھ ہی ایک خط بھی منسلک کیا جس میں ملکہ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ اس شاعر پر کچھ نظرِ کرم فرمائیں۔ اس کا جواب غدر والے برس کے

آغاز میں آیا۔ یہ اطلاع دی گئی تھی کہ مناسب تحقیق کے بعد ہی خطاب اور وظیفے کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن پھر کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر میری حیثیت ہی کیا تھی؟ ملکہ کے لیے اکٹھا ہونے والے ہجوم میں محض ایک چہرہ۔

آج آپ سب کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی ندامت نہیں ہے، منو بھائی، کہ میں واقعی ایک فاترالعقل تھا۔ میری زندگی میں سے ہر چیز مٹ چکی تھی، لیکن اس کے باوجود میں سوچتا تھا کہ وقت پلٹ آئے گا — کیا خدا دنیا میں مجھے اسی لیے لایا ہے کہ میں ہر قدم پر ہزیمت اٹھاتا چلا جاؤں؟ ساری عمر دامِ امید ہی میں پھنسا رہا ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

باوجود اس تمام صورتِ حال کے، کچھ دنوں کے لیے ہوائے بہار کا جھونکا دوبارہ آیا، منو بھائی۔ یوں میں نے اسے دیکھا نہیں تھا، منو بھائی۔ لیکن وہ میری شاگرد تھی۔ اس کے شعر سن کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں نے اس کے لیے 'تُرک' تخلّص منتخب کیا۔ وہ شاہجہان آباد کے ایک باوقار گھرانے کی خاتون تھی، ترکی النسل، اس کے آباؤاجداد بخارا سے یہاں آئے تھے۔ ترک نے کم عمری میں اپنے شوہر کو کھو دیا تھا۔ پھر اس نے شاعری میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اس کی والدہ کے بھائی اُس کے اشعار میرے پاس لایا کرتے تھے۔ میں ان حرفوں پر اپنی انگلیاں پھراتا اور اس طرح سے اُسے چھو کر دیکھتا۔ کبھی کبھار ان کی حویلی پر بھی جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ پردے کی اوٹ میں رہتی۔ شرفاء کی عورتیں مردوں کے سامنے نہیں آتی تھیں۔ سچ کہوں تو، منو بھائی، میں محض تُرک کی آواز سننے جایا کرتا تھا۔ جیسے سرو کے درختوں سے ہوا کا نرم نرم جھونکا آرہا ہو۔ کیسا صاف تلفظ تھا اس کا۔ اس کی غزلوں میں تخیل کی ایک غیر معمولی چمک تھی۔ آپ اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تخیل کی دنیا میں عورتیں مردوں سے بہت مختلف ہیں۔ ترک مجھے خوشبو کی طرح متوجہ کرتی

تھی، جسے سونگھا تو جا سکتا ہے، دیکھا نہیں جا سکتا۔

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا
پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا

وہ خوشبو کب معدوم ہوگئی، کچھ پتا ہی نہ چلا۔ ایک دن اس کے گھر سے معلوم ہوا کہ ترک اب مزید نہ مل سکے گی۔ 'کیا بات ہوگئی، میاں صاحب؟' میں نے استفسار کیا۔ 'وہ ٹھیک تو ہیں؟'

—نہیں مرزا صاحب۔ وہ اب مزید غزلیں نہ لکھے گی۔

—لیکن کیوں؟

—وہ سارا دن قرآن کی تلاوت کرتی رہتی ہے۔ اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں آتی۔

—یا اللہ! ایسی صلاحیتوں کی حامل شاعرہ نے شاعری ترک کردی! وہ ایک عظیم شاعرہ بن سکتی تھی۔

—ہمارا معاشرہ عورت کو اہمیت ہی کتنی دیتا ہے، مرزا صاحب۔ اس پر اگر وہ شاعرہ بھی ہو تو لوگ اُسے پاگل سمجھیں گے۔

—کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟

—جی نہیں۔ لیکن ہم لوگ تو سمجھ ہی نہیں پائے کہ اس نے کس طرح یہ فیصلہ کرلیا۔

—کیا میں ان سے مل نہیں سکتا؟

—نہیں مرزا صاحب۔ اس نے مجھ سے کہلوایا ہے کہ اب آپ یہاں تشریف نہ لایا کیجیے۔ سب سے بڑھ کر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنی تمام غزلیں اپنے ہاتھوں سے پھاڑ ڈالی ہیں۔

اُس دن میرا گھر لوٹنے کو جی نہ چاہا۔ میں جمنا کے کنارے جا کر بیٹھ گیا۔ کب شام ہوگئی، مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ تاریکی میں جمنا کا تیز بہاؤ خود اپنے آپ سے محوِ کلام تھا۔ اسی وقت میں نے اسے دیکھا۔ اُس بے تاب دوشیزہ کو جو پھولوں کے کنج میں پتوں کے بستر پر اپنے محبوب کے

ل یہ غزل بہادر شاہ ظفر کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ غزل ان کی نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے کسی دیوان میں موجود ہے۔ یہ غزل مضطر خیرآبادی کی ہے، جن کا دیوان چند برس قبل شائع ہوا ہے (مترجم)

انتظار میں بیٹھی تھی۔ پھولوں سے لدے ہوئے درخت اسے گھیرے کھڑے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں، ترزدمت کرو رادھیکا، وہ آئے گا، تمھارا شیام ضرور آئے گا۔ دوشیزہ کے آگے ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ وہ بھی یہی کہتا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ بس اک ذرا انتظار، دیکھو اس کی بانسری کی آواز آرہی ہے۔ ایک رم خوردہ مادہ آہو چشمے سے پانی پی رہی تھی اور ایک درخت کے پیچھے سے ہرن وجد آفریں آنکھوں سے اس دوشیزہ کو تاک رہا تھا۔ میں جان گیا کہ ترک نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ وہ لفظوں کا بوجھ مزید برداشت نہ کر پائی تھی۔ پردے کو ہٹا کر اپنا ہاتھ کسی ساتھی کی طرف بڑھانے کے قابل وہ کبھی نہ ہو سکتی تھی۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

۳۸

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

جانتے ہیں مرزا صاحب، مجھے فحش نگار ثابت کرنے کے لیے میرے آس پاس کے تمام دیانت داروں نے کیا کہا؟ ان کا بس ایک ہی سوال تھا—تیرے افسانوں میں بار بار ویشیاؤں اور چکلوں کا ذکر ہی کیوں ہوتا ہے؟ ایک ویشیا آخر کیسے کسی افسانے کا مرکزی کردار ہو سکتی ہے؟ یہ سوال کن لوگوں نے اٹھایا تھا؟ یہ سوال ان لوگوں نے اٹھایا تھا جو خود کو ترقی پسند کہہ کر غرور سے سینہ پھلاتے تھے اور سماج کے نچلے طبقے کی زندگیوں کی سرگزشت کہتے تھے۔ جی ہاں، مرزا صاحب، ان لوگوں کے لیے بھی ویشیائیں گندی نالی کے کیڑوں سے بدتر تھیں جبکہ ان میں سے کتنے ہی چھپ چھپا کر اُس بازار میں جایا کرتے تھے۔ میں نے اس بات کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ میں وہاں جاتا ہوں۔ میرے اردگرد کے ان بے رنگ لوگوں کے مقابلے میں وہ دھتکاری ہوئی، غازے کے رنگوں سے سجی ہوئی لڑکیاں، ان کے دلال، اُن علاقوں کے پھول بیچنے والے مجھے کہیں زیادہ جیتے جاگتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ لڑکیاں اگر کسی کو چاہنے لگتیں تو اسے پانے کے لیے خون تک کر سکتی تھیں۔ ہماری دنیا سے باہر، وہ اس بازار کی دنیا، کسی رزمیے کی طرح تھی۔ شکندھی، سلطانہ، نجی، بسم اللہ، محمودہ، زینت: ان سب کی کہانیاں میں نے بنائی نہیں تھیں، یہ سب کبھی دلی، لاہور اور بمبئی کے چکلوں میں رہا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ راجہ صاحب محمود آباد کے ساتھ میری تلخ کلامی ہوئی۔ ان کا بھی موقف وہی

تھا۔ 'ان گندی عورتوں میں تمھیں کیا دکھائی دیتا ہے، منٹو؟ تم عیاشی کرنے وہاں جاتے ہو اور پھر ان کے بارے میں فلسفیانہ افسانے لکھتے ہو۔'

— کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ میں نے ان عورتوں کے متعلق لکھ کر کون سا جرم کیا ہے؟

— ادب غیر اخلاقی باتوں کو بیان کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔

— تو پھر ادب کس لیے ہوتا ہے، راجہ صاحب؟

— ہمارے خوابوں کو بیان کرنے کے لیے۔

مجھے ہنسی آ گئی۔— یہ جس 'ہم' کا آپ ذکر کر رہے ہیں، کیا اس میں 'وہ' شامل نہیں ہیں؟ کیا انھیں خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا 'ان' کے خوابوں کے بارے میں کوئی نہیں لکھے گا؟ یہ 'ہمارا' اور 'ان کا' کھیل بہت دلچسپ ہے، راجہ صاحب۔ کیمونسٹ اس کھیل میں ماہر ہیں۔

— کیا تم کیمونزم سے نفرت کرتے ہو؟

— پتا نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میرے کیمونسٹ دوستوں ہی نے سب سے پہلے مجھے فحش نگار قرار دیا تھا۔

— تم مسلسل ویشیاؤں کے بارے میں لکھتے رہو اور یہ توقع کرتے ہو کہ تمھارے افسانوں کو فحش نگاری بھی نہ کہا جائے؟

— اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اس فاشی کو قائم رکھنے کی اجازت کیوں ہے؟ اگر ویشیاؤں کے بارے میں لکھنا ممنوع ہے تو یہ پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے، راجہ صاحب۔ ویشیا کے پیشے کو مٹائیے، پھر کوئی منٹو ویشیاؤں کے بارے میں لکھنے کے لیے پیدا نہیں ہوگا۔ ہم کسانوں، مزدوروں، حجاموں، دھوبیوں، چوروں اور ڈاکوؤں کے بارے میں لکھ سکتے ہیں۔ ہمیں جنوں اور پریوں کی کہانیاں گھڑنے کی اجازت ہے تو ہم ویشیاؤں کے بارے میں کیوں نہیں لکھ سکتے؟

— ٹھیک ہے، لکھو۔ جتنا چاہو لکھو لیکن تمھارے افسانے ردّی سے زیادہ کچھ نہیں ہوں گے۔

— یہی تو میں چاہتا ہوں، راجہ صاحب۔

— کیا مطلب؟

—یہی کہ ہمارے معاشرے کی ساری غلاظت سمٹ کر میرے افسانوں میں آ جائے۔اور آپ سب دیکھ سکیں کہ پاکیزگی کے پیچھے درحقیقت کیا ہوتا ہے؟

—کیا تم خود کو کوئی پیغمبر سمجھتے ہو؟

—نہیں۔شاعر اور ادیب دنیا کی سب سے کمزور مخلوق ہوتے ہیں۔کوئی بھی انھیں لات رسید کر سکتا ہے، رابعہ صاحب۔ ان کے پاس کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ وہ جو دیکھتے ہیں، جو محسوس کرتے ہیں، صرف اس کے بارے میں دیانت داری کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔نہیں، میں یہ سب باتیں آپ سے کہنے کی کوشش نہیں کر رہا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ نہیں سمجھ سکیں گے۔

—تو پھر وہ بات کہو جو میں سمجھ سکوں۔

—آپ جانتے ہیں ویشیاؤں کا محلّہ دراصل ہوتا کیا ہے؟

—کیا ہوتا ہے؟ ویشیاؤں کا محلّہ ہوتا ہے اور کیا؟ چلو منٹو کی نئی توجیح سنتے ہیں۔

—ایک گلی سڑی لاش۔ ہمارا سماج اس لاش کو کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہے۔ جب تک اس مردے کو دفنایا نہیں جائے گا، رابعہ صاحب، لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے رہیں گے۔ لیکن جانتے ہیں لاش کتنی ہی گلی سڑی کیوں نہ ہو، کتنی ہی لرزہ خیز کیوں نہ دکھائی دیتی ہو، کہیں کوئی ایسا ہوگا جو اس کے چہرے کو دیکھنا چاہے گا۔ اور اس میں بُرا کیا ہے؟ کیا ہمارا مردے کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں؟ اس بارے میں سوچیے، رابعہ صاحب، کیا ہم نے ہی اُسے قتل نہیں کیا؟ پھر اس کے چہرے کو دیکھنا کیوں جرم ہے، کیا منٹو کو اس لیے فحش کہا جائے گا کہ اس نے اُس چہرے کی طرف دیکھا۔

—میں مانتا ہوں، منٹو، کہ تم بہترین افسانہ نگار ہو۔ لیکن کیا تم اس دنیا کو اپنی کہانیوں سے باہر نہیں چھوڑ سکتے؟

—جی نہیں رابعہ صاحب۔ تو چلیے میں آج آپ کو نجمی کی کہانی سناتا ہوں۔

—نجمی کون؟

—ایک ویشیا۔ سنیے کہ وہ کس طرح ویشیا بنی۔

—تو پھر سناؤ۔ رابعہ صاحب مسکرائے— کہانیوں کا سُوت کاتنے میں تو تمھارا ثانی کوئی نہیں ہے۔

—اس کہانی کی شروعات میں نجمی کہیں نہیں تھی، رابعہ صاحب۔ یہ کہانی کوچوان ابو سے شروع ہوتی ہے۔ابو بہت اچھا انسان تھا، رابعہ صاحب۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ 'اچھا' میں باچھوں کی مہک ہوتی ہے۔ وہ بہت عمدہ ذوق کا مالک تھا اور اس کا تانگہ گھوڑا بھی شہر میں سب سے شاندار تھا۔ اپنے تانگے کو اس نے بڑے دل سے سجایا تھا۔ وہ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا؛ اس کے لگے بندھے گاہک تھے۔ دوسرے کوچوان کی طرح ابو کو نشہ پانی کرنے کی عادت نہیں تھی، لیکن اچھے کپڑے پہننے کا اسے شوق تھا۔ جب ابو کا تانگہ کسی سڑک سے گزرتا تو لوگ آواز کستے، 'وہ دیکھو، بانکے کا تانگہ جا رہا ہے۔' یہ سن کر صرف ابو کا سینہ ہی فخر سے نہیں پھول جاتا بلکہ اس کے گھوڑے چنی کی رفتار بھی بڑھ جاتی۔ چنی کی باگیں ضرور ابو کے ہاتھ ہوتی تھیں لیکن وہ ابو کے دماغ کو اتنی اچھی طرح پڑھ لیتا تھا کہ کبھی چابک چلانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابو اور اس کا گھوڑا دو الگ الگ وجود نہیں، رابعہ صاحب۔ کچھ دوسرے کوچوانوں نے بھی ابو کی نقالی کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی بھی ابو کی سی شان پیدا نہ کر سکا۔

ایک دوپہر ابو درخت کی چھاؤں میں اپنے تانگے میں لیٹا اونگھ رہا تھا کہ کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت اس کے تانگے کے پاس کھڑی ہے۔ ابو اُچھل پڑا۔ اس کی خوبصورتی کسی تیر کی طرح اس کے دل میں کھب گئی تھی۔ وہ سولہ سترہ برس کی سانولی سی لڑکی تھی جو جوانی سے دمک رہی تھی۔

— کیا چاہیے؟ ابو نے دھیرے سے کہا۔ یہ ایک خواب کی طرح تھا، رابعہ صاحب۔ جیسے جنت سے کوئی پری اُتر کر اس کے سامنے آ گئی ہو۔

—ٹیشن کا کیا لوگے؟

—کچھ نہیں۔ ابو مسکرایا۔

—کیا لوگے ٹیشن کا۔ بتاؤ نا؟ اس نے دہرایا۔

—تو سمجھتی ہے میں تجھ سے پیسے لوں گا؟ چل آ بیٹھ۔

—اس کا کیا مطلب ہے؟ لڑکی اکڑ گئی۔

—چل آ، اب بیٹھ بھی جا۔ جو دینا چاہے دے دینا۔

لڑکی ابو کے تانگے میں بیٹھ گئی — جلدی لے چل۔

— بڑی جلدی ہے تجھے؟

— ہائے...... تُو تو...... وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

ابو کا تانگہ چل پڑا۔ جنی کے سموں نے آج انوکھی تال پکڑلی تھی۔ لڑکی ابو کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ابو نے کتنی ہی بار خود کو پیچھے مڑکر دیکھنے سے باز رکھا۔ آخر لڑکی نے پوچھا: 'ٹیشن نہیں آیا ابھی تک؟'

— جلدی آجائے گا۔ ابو مسکرایا۔ تیرا میرا ایک ہی ٹیشن ہے۔

— کیا مطلب؟

— الہڑ ے۔ کیا اتنا بھی نہیں سمجھتی؟ تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔ اس وقت ایک ہوگیا تھا جب میں نے تجھے دیکھا تھا۔ تیری جان کی قسم میں تیرا غلام ہوگیا ہوں۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا، بس اپنی چادر اپنے گرد اچھی طرح کس لی۔

ابو نے پوچھا: 'کیا سوچ رہی ہے، بھاگ بھریے؟'

وہ پھر چپ رہی۔ اچانک ابو نے اپنا تانگہ روک دیا۔ کود کر نیچے اترا اور لپک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور بولا: 'دے دے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں۔'

— بہت ہوگیا۔ لڑکی نے سر جھکالیا۔

ابو نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے پہلے تو اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن پھر پُرسکون ہوگئی۔ ابو بولا: 'یہ تانگہ گھوڑا مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ لیکن اوپر والے کی قسم یہ بھی بیچ دوں گا اور تیرے لیے سونے کے کڑے بنواؤں گا، میری جان۔ کہہ دے کہ تُو میرے ساتھ رہے گی ورنہ میں ابھی تیری آنکھوں کے سامنے اپنا گلا گھونٹ لوں گا۔'

لڑکی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ابو منہ ہی منہ میں بڑبڑایا: 'جانے آج مجھے کیا ہوگیا ہے۔ چل میں تجھے ٹیشن چھوڑ آؤں۔'

— نہیں، اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو۔

— مجھے معاف کردو، مجھ سے غلطی ہوگئی۔

— کیا غلطی کی کوئی قیمت نہیں چکانا ہوتی؟ لڑکی بھڑک اٹھی۔

ابو نے اس کی جانب دیکھا، پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا: 'میں تیرے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں۔'

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھادیا اور بولی: 'یہ لے میرا ہاتھ۔'

اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ابو بولا: 'آج سے میں تیرا غلام ہوں۔ یہ نجی تھی، راجہ صاحب۔ گجرات کی رہنے والی؛ اس کا باپ موچی تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کر نجی ابو کے ساتھ چلی آئی۔ اگلے دن ان کی شادی ہوگئی۔ نہیں، ابو کو اس کے لیے تانگہ گھوڑا نہیں بیچنا پڑا۔ اس نے اپنی جمع پونجی سے نجی کے لیے ریشمی کپڑے اور سونے کی بالیاں بنوادیں۔ اُسے اپنے بازوؤں میں بھر کر وہ اکثر کہا کرتا: 'تو میرے دل کی رانی ہے۔'

مہینے بھر کے بعد ایک دن اچانک پولیس نے ابو کو اغوا کے جرم میں گرفتار کرلیا۔ نجی اس کے ساتھ ثابت قدم رہی پھر بھی عدالت نے اُسے دو برس قید کی سزا سنادی۔ نجی ابو کے ساتھ لپٹ گئی اور اس سے کہا: 'میں اپنے ماں باپ کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں تیرے لوٹنے کا انتظار کروں گی۔'

— اپنا خیال رکھنا۔ میں نے تانگہ چلانے کے لیے دینو سے کہہ دیا ہے۔ وہ تجھے روز کے روز حساب دے جایا کرے گا۔

ماں باپ کے بہت زور دینے کے باوجود نجی واپس نہ گئی، راجہ صاحب۔ وہ انجانے شہر میں اکیلی رہنے لگی اور ابو کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ دینو روز شام کو اسے پانچ روپے دے جاتا تھا جس سے اس کا گزر بسر آرام سے ہوجاتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار اسے ابو سے جیل میں ملنے کی اجازت تھی۔ وہ اس کے لیے خاص طور پر کھانا پکاتی اور پھل وغیرہ بھی لے کر جاتی۔

ایک دن ابو نے دیکھا کہ نجی کے کانوں میں بالیاں نہیں ہیں۔ — تیری بالیاں کہاں گئیں؟ نجی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اپنے کانوں کو چھو کر دیکھا۔ 'ہائے ربا مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ پتا نہیں کہاں گر گئیں؟'

—تو میرے لیے کھانا نہ لایا کر۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔

نتی دیکھ رہی تھی، ابو کی صحت دن بہ دن گرتی جارہی تھی۔ پچھلی بار جب وہ جیل گئی تو اُس نے دیکھا گرانڈیل ابو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ نتی کو لگا کہ شاید اس کی دوری ابو کو مارے ڈال رہی ہے۔ دراصل، راجہ صاحب، ابو دق کا مریض تھا۔ ابو کا باپ اور بھائی بھی اسی مرض کا شکار ہوکر مرے تھے۔

جیل کے ہسپتال میں لیٹے ہوئے ابو نے نتی سے کہا:'اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو میں کبھی تجھ سے شادی نہ کرتا۔ مجھے معاف کردے۔ تانگے اور گھوڑے کا خیال رکھنا۔ وہ تیرا خیال رکھیں گے۔ چنی سے کہنا میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔'

نتی کو اکیلا اور بے سہارا چھوڑکر ابو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لیکن نتی غیر معمولی صلاحیتوں والی لڑکی تھی، راجہ صاحب۔ اتنا بڑا دکھ سہہ کر بھی وہ مضبوطی سے کھڑی رہی۔ وہ ابو کو یاد کرتے ہوئے گھر میں سارا دن گزار دیتی۔ روز شام کو دینو آ کر روپے دے جاتا تھا۔ ایک دن دینو نے اس سے کہا:'کچھ فکر نہ کرو بھابھی۔ ابو میرے بھائی کی طرح تھا۔ میں تمھارے لیے جو بھی کرسکا وہ کروں گا۔'

—جو خدا کی مرضی......

—خدا تو بندوں ہی کو وسیلہ بناتا ہے، بھابھی۔ تم اس طرح اداس نہ رہا کرو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

—تو پھر میں کیا کروں، دینو بھائی؟

—دوسری شادی کرلو۔ کیا تم ساری زندگی ابو کے غم میں گزارنے کا سوچ رہی ہو؟

—شادی؟

—تم جب کہو میں تیار ہوں۔

—دینو بھائی!

—کیا ہوا؟

نتی کا دل چاہا دینو کو دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دے۔ ظاہر ہے وہ ایسا تو نہ

کرسکی۔ اس نے بس اتنا کہا:'میں دوبارہ شادی نہیں کروں گی، دینو بھائی۔'

اس دن کے بعد سے دینو کے رویے میں فرق آگیا۔ اب وہ اسے پانچ روپے کے بجائے روز کے چار روپے دینے لگا اور کبھی تین۔ جب نتی نے اس کی وجہ پوچھی تو بولا کہ کام آج کل بہت مندا چل رہا ہے۔ زیادہ سواریاں ہی نہیں ملتیں۔ پھر وہ نتی کو دو دو تین تین دن کے وقفے سے پیسے دینے لگا۔ آخرکار نتی کو مجبوراً اس سے کہنا پڑا:'اب تم تانگہ چلانے کی تکلیف نہ کرو، بھائی دینو، میں کام خود سنبھال لوں گی۔'

نتی نے یہ ذمّے داری دینو کے ایک دوست کو دے دی۔ کچھ دنوں میں اس نے بھی نتی سے شادی درخواست کردی۔ نتی نے اس کو بھی انکار کردیا۔ اب اس نے تانگہ ایک اجنبی کوچوان کے حوالے کردیا۔ ایک رات وہ آدمی نشے میں دھت ہوکر آیا، راجہ صاحب، اور اس نے نتی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔

سات آٹھ روز تانگہ گھوڑا بیکار کھڑا رہا۔ نتی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اپنا روزمرہ کا خرچ، گھوڑے کا گھاس اور دانا اور طویلے کا کرایہ کہاں سے پورا کرے؟ سارے اس سے شادی کی درخواست کرتے تھے۔ نتی خوب جانتی تھی کہ وہ صرف اس کی عزت سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ جب باہر نکلتی تو لوگ اسے بُری نگاہوں سے گھورتے تھے۔ ایک رات اس کا ایک ہمسایہ اس کا دروازہ پیٹنے لگا:'کتنے پیسے لے گی تو، کتیا، بول دروازہ کھولنے کے کتنے پیسے لے گی؟'

ایک دن اچانک نتی کو خیال آیا کہ تانگہ وہ خود بھی چلاسکتی ہے۔ جب ابو سیر کے لیے اسے باہر لے جایا کرتا تھا تو کبھی کبھی وہ تانگہ چلایا کرتی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی وہ واقف تھی۔ تو پھر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اگر ایک عورت کھیت میں مزدوری کرسکتی، مٹی ڈھوسکتی ہے تو تانگہ کیوں نہیں چلاسکتی؟ کچھ دن سوچ بچار کے بعد آخر نتی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ تانگہ خود ہی چلائے گی۔

نتی کو اپنا تانگہ خود چلاتے دیکھ کر دوسرے کوچوان ہکا بکا رہ گئے۔ بہت سے اس کا مذاق اڑانے لگے اور ہنسنے لگے۔ جو بزرگ تھے انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تانگہ گھوڑا چلانا عورت کا کام نہیں ہے۔ اس نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے چنی کو پیار کیا اور ابو سے دل

ہی دل میں پیار کی باتیں کرتی نکل کھڑی ہوئی۔

شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ایک خوبصورت عورت تانگہ چلا رہی تھی۔ لوگ اس کے تانگے کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ شروع شروع میں وہ مرد سواریوں کو اپنے تانگے میں نہیں بٹھاتی تھی لیکن بعد میں اس کی یہ جھجک بھی دور ہوگئی۔ نیتی کی خوب آمدنی ہونے لگی۔ اس کے تانگے کو کبھی سواریوں کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا، راجہ صاحب۔ مرد لوگ اس کے تانگے میں سوار ہونے کے لیے ہمیشہ کھڑے رہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی عورت کے کاندھے، کمر، بازو، چھاتیاں اور کولھوں کو دیکھنے کی مردانہ ہوس سے آپ انکار نہیں کریں گے۔ ہے نا راجہ صاحب؟ نیتی بھی اس بات کو بخوبی سمجھتی تھی۔ لیکن وہ کیا کرتی؟ آخر اسے عزت سے گزر بسر تو کرنی ہی تھی۔ اس نے اپنے کام کے اوقات کار مقرر کر لیے — صبح سات بجے سے دوپہر تک، اور پھر دو بجے سے شام چھ بجے تک۔ نیتی نے اس حساب سے اپنے جینے کا طریقہ ڈھونڈ لیا، راجہ صاحب۔

ایک دن اسے میونسپل کمیٹی کی طرف سے سمن موصول ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اس کے تانگے کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ عورت تانگہ نہیں چلا سکتی۔ 'مجھے معلوم ہے تانگہ کیسے چلایا جاتا ہے، جناب،' نیتی نے کہا۔ 'مسئلہ کیا ہے؟'

— تم اب تانگہ نہیں چلا سکتیں۔

— لیکن کیوں، حضور؟ اگر عورت دوسرے سارے کام کر سکتی ہے تو تانگہ کیوں نہیں چلا سکتی؟ یہ تانگہ گھوڑا میرے شوہر کا ہے۔ اسے میں کیوں نہیں چلا سکتی؟ اگر آپ مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے تو میں اپنا گزارہ کس طرح کروں گی، حضور؟

معلوم ہے میونسپل کمیٹی کے افسر نے کیا کہا؟ — جاؤ، بازار میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ وہاں زیادہ کما لوگی۔

نیتی جیسی عورت اس کے جواب میں کیا کہتی؟ وہ تانگہ اور گھوڑا بیچنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ میں قسم کھا سکتا ہوں، راجہ صاحب اس کی آنکھوں میں آنسو بالکل نہیں تھے — اس کی آنکھیں کسی صحرا کی طرح خشک تھیں۔ اس نے اپنی پیشانی لوحِ قبر پر رکھ دی اور بولی، 'یہ لوگ مجھے جینے دینا نہیں چاہتے۔ مجھے معاف کر دینا۔'

اگلے دن نیتی نے جسم فروشی کی منڈی میں عرضی دے دی۔ ہاں، اب سے وہ ہر رات اپنا جسم بیچا کرے گی۔ کیا ہمیں نیتی کی یہ کہانی تاریخ سے مٹا دینی چاہیے، راجہ صاحب؟ کیا اس طرح ہر چیز خود بخود پاک ہو جائے گی؟

جی نہیں، مرزا صاحب، راجہ صاحب نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آخر وہ کہہ ہی کیا سکتے تھے؟ کیا انھوں نے کبھی سلطانہ جیسی کوئی عورت دیکھی ہوگی؟ میں نے سلطانہ کے بارے میں اپنے افسانے 'کالی شلوار' میں لکھا تھا، برادران۔ ایک ویشیا کو محرم کے لیے ایک کالی شلوار چاہیے۔ اس معمولی سے خواہش میں فحاشی کہاں ہے؟ لیکن وہ — وہ جو سماج کے ٹھیکے دار ہیں۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ نکال ہی لیتے ہیں۔ وہ کسی فرد کو مجموعی حیثیت میں نہیں دیکھ پاتے۔ وہ صرف کچھ لمحوں اور کچھ لفظوں ہی کی چیر پھاڑ کر سکتے ہیں۔ جانتے ہیں وہ کون لوگ ہیں؟ وہ جو مسودوں، تبصروں، حاشیوں اور قلم دوات کے سنگھاسنوں پر چڑھ کر بیٹھے رہتے ہیں — شاعر نہیں ہیں وہ — ہاں لفظوں کے پروفیسر ہیں۔ پوپلے منہ والے۔ جن کی آنکھوں میں نامردی کی بلغم بھری رہتی ہے، اور تنخواہیں ان کی، ہزار روپے ماہانہ، اور ہزار ڈیڑھ ہزار مزید کما لیتے ہیں کسی بھی مردہ شاعر کے جسم کو نوچ کر۔

وہ سلطانہ کو کیا سمجھ سکیں گے؟ شام ہونے پر وہ اس خستہ حال عمارت کی بالکنی میں آ جاتی تھی جو کسبیوں کے لیے وقف ایک علاقے میں واقع تھی۔ سلطانہ کی بالکنی سے سامنے ریلوے یارڈ نظر آتا تھا۔ وہ ریل کی پٹریوں کو دیکھتی رہتی، پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگتی۔ اس کے ہاتھوں پر پھولی ہوئی نیلی نسیں بالکل ریل کی پٹریوں کی طرح لگتی تھیں۔ ریلوے یارڈ میں انجن اور ریل کے ڈبے مسلسل حرکت کرتے رہتے اور دھواں اُگل اُگل کر سلطانہ کی آنکھوں کے سامنے پھیلے آسمان کو گدلا کرتے رہتے۔ کبھی کبھار کسی ڈبے کو کسی دوسری پٹری پر ڈال دیا جاتا اور دھکا دے کر چلا دیا جاتا۔ سلطانہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے اسے بھی کسی نے پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ چلی جا رہی ہے۔ اس سفر پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کچھ دوسرے لوگ بٹن دباتے ہیں اور رُکنے یا چلتے رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی منزل کو کبھی نہ جان سکے گی۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کسی انجان جگہ پر رُک جائے گی۔

سلطانہ کی ملاقات ایک عجیب آدمی سے ہوئی تھی۔ اس کا نام شنکر تھا۔ وہ اکثر سڑک کے پار کھڑا، سلطانہ کے گھر کی طرف تاکتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا دھندا تو ویسے ہی نہیں چل رہا تھا، اور وہ دن بھر اکیلی بیٹھی رہتی تھی۔ ایک دن اُس نے اشارے سے شنکر کو بلالیا۔ وہ چلا آیا اور اس انداز سے آ کر بیٹھ گیا جیسے وہ نہیں بلکہ سلطانہ اس کی گاہک ہو۔ سلطانہ پریشان سی ہوگئی۔ 'فرمایئے — کیا کرسکتی ہوں میں آپ کے لیے؟' اس نے پوچھا۔

— میرے لیے؟ یہ پوچھو کہ میں تمھارے لیے کیا کرسکتا ہوں، بلایا تم نے ہے مجھے۔

سلطانہ چکرا گئی۔

شنکر بولا: 'میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، وہ غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو یہاں آتے ہیں اور کچھ دے کر جاتے ہیں۔ میری بھی فیس ہے۔ جب تم ڈاکٹر کو گھر بلاتی ہو تو کیا اُسے فیس نہیں دیتیں؟ میرا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔'

شنکر کی بات سن کر حیران ہونے کے بجائے سلطانہ مسکرادی۔ 'آپ کام کیا کرتے ہیں؟'

— یہی، جو تم لوگ کرتے ہو۔

— کیا؟

— تم کیا کرتی ہو؟

— میں ...... میں ...... کچھ بھی نہیں کرتی۔

— میں بھی کچھ نہیں کرتا۔

— یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔

— تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔

— پتا نہیں، بس جھک مارتی ہوں۔

— میں بھی جھک مارتا ہوں۔

شنکر اکثر اس کے پاس آنے جانے لگا۔ ایک دن سلطانہ نے اس سے کہا: 'کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟'

— شادی؟ پاگل تو نہیں ہوگئی؟ ہمارے تمھارے جیسے لوگ شادیاں نہیں کرتے۔ یہ سب

رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں ہیں۔ ایسی بیہودہ بات پھر مت کرنا۔ تم عورت ہو۔ ذرا دیر کے لیے میرا دل بہلانے والی باتیں کرو۔ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری تو نہیں ہے۔

— صاف کہو مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

— وہی جو دوسرے چاہتے ہیں؟ شنکر نے غیر جذباتی انداز میں جواب دیا۔

— پھر تم میں اور دوسروں میں فرق ہی کیا رہا؟

— دیکھو، سلطانہ، تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اُن میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جی ہاں، مرزا صاحب، میں دل ہی دل میں جانتا تھا، یہاں تک کہ میں نے بلند آواز سے کہا، کہ میں اپنے اردگرد سب لوگوں سے مختلف ہوں لیکن میں سلطانہ اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھا۔ میں خود کو دنیا کے اس بازار میں کسی نہ کسی طور بیچنے کے لیے آیا تھا۔ جن لوگوں نے مجھے فحش نگاری کا مرتکب ٹھہرایا انھوں نے بھی خود کو بیچا ہی تھا، لیکن انھوں نے اپنی عصمت فروشی کو چھپا کر اپنی عظمت کے غبارے پھلائے۔ میں سرتاپا ایک ویشیا تھا اور دنیا کے سارے رنڈی خانے میرا گھر۔

۳۹

آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں میرؔ شب کو
واں جا کے صبح دیکھا، مشتِ غبار پایا

جب اودھ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے نواب واجد علی شاہ کو جلا وطن کر کے کلکتہ بھیجا،منو بھائی، میں غصّے اور نفرت سے دہک رہا تھا۔ اگرچہ میں اودھ کے لیے غیر تھا،لیکن پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ہی بے دخل کیا گیا ہو۔وہی انگریز جو کبھی نئی تہذیب کے نقیب معلوم ہوتے تھے، اودھ کی تباہی سے اب اپنے دانت اور پنجے ظاہر کر چکے تھے۔ یہ محض غصّہ اور نفرت ہی نہ تھی، ناامیدی نے بھی مجھے جکڑ لیا تھا۔ تو کیا انگریز اس طرح سے ایک ایک ریاست کو تباہ کر کے حکمرانوں کو جلا وطن کر کے یوں ہماری تہذیب کو دفنانے پر آمادہ ہیں؟ جن لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے وہ تباہی اور بربادی کے اس رجحان کو کبھی قبول نہیں کر سکتے،میرے بھائیو۔ میں نے نواب واجد علی شاہ کی جلا وطنی کو تسلیم نہیں کیا۔ مجھے یقین ہو گیا منو بھائی، کہ وہ جلد ہی ہمیں پوری طرح ہڑپ کر لیں گے۔ ہم سب ہندوستانیوں کو — ہندو ہوں یا مسلمان اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہمیں جلا وطن کر دیں گے اور ہمیں مہاجروں کی طرح بھٹکتے رہنا ہوگا۔

انھی دنوں ان واقعات کا ایک اور رُخ بھی دکھائی دیا۔ انگریز پہلے ہی صاف کر چکے تھے کہ خاندانِ شاہی کے افراد کو قلعے سے نکال کر قطب شاہی کے پاس کسی محل میں منتقل کر دیا جائے گا اور یہ کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد کسی کو بادشاہ کا خطاب استعمال کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ کیا انگریزوں کا ہر فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا؟ شاہجہاں آباد کے بہت سے باشندے اس بات پر یقین کرنے

لگے تھے کہ شہنشاہ ایران یا روس کا زار ضرور ان فرنگیوں کو بھگانے کے لیے آئے گا اور یوں سلطنتِ مغلیہ کی شان و شوکت پھر سے بحال ہو جائے گی۔ غدر سے کوئی دو مہینے پہلے، کچھ لوگوں نے جامع مسجد کی دیوار پر ایک اشتہار چسپاں کر دیا جس میں لکھا تھا: شاہ ایران اپنے بھائیوں کو مشکل سے نکالنے کے لیے جلد ہی آنے والے ہیں۔ حتیٰ کہ حسن عسکری نے، جو کہ قلعہ معلی کے پیر کے فرزند تھے،علم نجوم کا حساب لگا کر یہ پیشین گوئی کی کہ کچھ ایسا وقوع پذیر ہونے والا ہے جس کے سبب مغلیہ سلطنت کا وقار اور اس کا پرچم دوبارہ سے سربلند ہوگا۔ لیکن ہم یہ سمجھ نہ پائے کہ وہ واقعہ غدر تھا۔

بہت سی افواہیں گردش کر رہی تھیں، میرے بھائیو۔ انھیں سن کر لگتا تھا جیسے ہم لوگ پرستان میں رہ رہے ہوں۔ لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے۔ ایک روز چاندنی چوک میں غلام نبی کی پان کی دکان پر میری ملاقات پہاڑ گنج کے تھانے دار حسن خان سے ہوئی۔ 'یہ سب کیا سُن رہا ہوں،میاں؟' میں نے پوچھا۔

— اجی مرزا صاحب، میرا تو ان افواہوں سے دماغ گھومنے لگا ہے۔

— اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساری افواہیں درست ہیں؟

— میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ لیکن اندر ہی اندر کچھ چل ضرور رہا ہے،مرزا صاحب۔

— یہ چپاتیوں کا کیا قصّہ ہے؟

میں نے بھی یہ بات سنی ہے۔ پہلے تو مجھے اس پر یقین نہیں آیا۔ لیکن کل صبح اندر پور کے گاؤں کا چوکیدار آیا اور اس نے مجھے ایک چپاتی دکھائی۔ اُسے یہ چپاتی سرائے فاروق خاں کے چوکیدار نے دی تھی۔ اسے کہا گیا تھا ایسی مزید پانچ چپاتیاں تیار کر کے پانچ دوسرے دیہاتوں کے چوکیداروں کو دے اور ان میں سے ہر ایک کو کہے کہ وہ بھی پانچ مزید چپاتیاں تیار کر کے اگلے پانچ دیہاتوں میں بھیجیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا یہ کیا معاملہ ہے،مرزا صاحب۔

— کیا چپاتیوں کے اندر کوئی معلومات رکھ کر بھیج رہا ہے؟

— جی نہیں۔ چپاتیوں کے اندر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض جگہوں پر گوشت بھی بانٹا گیا ہے۔

— یہ تو کوئی جادوگری لگتی ہے،میاں۔

معاملات دن بہ دن پُر اسرار ہوتے چلے گئے، منٹو بھائی۔ سرگوشیاں بڑھ گئی تھیں۔ لوگوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی کو کسی پر اعتبار نہ رہا ہو۔ جگہ جگہ سے فوجی بغاوت کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ بادی النظر میں انگریز سپاہیوں کو متعدد سہولتیں دی جاتی تھیں، جبکہ ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ جنگ پلاسی کے سو برس پورے ہونے میں کچھ ہی مہینے باقی تھے۔ کسی نے بتایا وہابیوں نے اعلان کیا ہے کہ ۲۳ جون کو ہندوستان کو ایک بار پھر سے آزاد کرنا ہوگا۔ اگرچہ شاہجہاں آباد پُر سکون تھا، لیکن ہر طرف جنگی ماحول کی ہوا بہہ رہی تھی۔

گیارہ مئی کا دن گویا ہمارے ہی انتظار میں گھات لگائے بیٹھا تھا، میرے بھائیو۔ کسی چیتے کی طرح ہم پر جھپٹ پڑا۔ اُس دوپہر قلعے کے در و دیوار ایک دھماکے سے کانپنے لگے، دھماکے کی گونج شہر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ یہ کسی زلزلے سے بھی زیادہ زوردار تھی۔ میرٹھ سے باغی فوجیوں نے آ کر شاہجہاں آباد پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ لوگ دریا گنج کے قریب واقع راج گھاٹ کے دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں متعین محافظ اور سپاہی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ایک بھیانک قتلِ عام شروع ہو گیا۔ شاہجہاں آباد کا جانا پہچانا نقشہ خون میں تر ہو گیا۔ گوروں اور ہندوستانی نژاد انگریزوں کو دیکھتے ہی مار ڈالو، ان کے گھر لوٹ لو اور انھیں جلا ڈالو۔ لیکن، میرے بھائیو، کسی بھی قتلِ عام میں صرف دشمن ہی تو نہیں مرتا، بے قصور لوگ بھی تو فنا ہو جاتے ہیں۔ شاہجہاں آباد کے کتنے عام شہری مارے گئے، اس کا کوئی حساب نہیں۔

باغیوں کا سردار محمد بخت خاں بریلی میں متعین پیدل فوج کا صوبیدار تھا۔ اس کے ماتحت، شہنشاہ بہادر شاہ کو تقریباً قید کر لیا گیا تھا۔ باغی جو بھی کرنا چاہیں اس کی انھیں منظوری دینا ہوگی۔ بخت خاں بس ایک بات کہتا تھا، 'آپ ہی دوبارہ ہندوستان کے بادشاہ ہوں گے، جہاں پناہ۔ لیکن آپ کو وہی کرنا ہوگا جو ہم کہیں۔' اس سلسلے میں انھیں شہزادے مرزا مغل کی بھی حمایت حاصل تھی۔ بادشاہ کے پاس ان کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہو سکتا ہے ان کے دل میں بھی لالچ ہو کہ ممکن ہے اس افراتفری میں انھیں اپنا تخت دوبارہ مل جائے۔ خود تو وہ کچھ کرنے کے لائق نہیں تھے۔ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ اس وقت ان کی عمر بیاسی برس تھی، سارا دن نیند میں بیٹھے محض اُونگھ ہی سکتے تھے۔

بادشاہ کی آڑ میں، دراصل یہ ان کا بڑا بیٹا مرزا مغل تھا جو سارے معاملات کو چلا رہا تھا۔ شہزادہ جواں بخت وزیر بن گیا تھا۔ کوتوال کو اس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا تھا۔ اور معلوم ہے محمد بخت خاں کو کیا خطاب عطا ہوا تھا؟ صاحبِ عالم بہادر۔ مغلیہ دربار میں اس سے پہلے ایسا کوئی عہدہ نہیں تھا۔ بادشاہ جن پر سب سے زیادہ اعتبار کرتے تھے اُن حکیم احسن اللہ خاں کو گوروں کا جاسوس قرار دے دیا گیا۔ انھیں قتل کرنے کی نیت سے لوگ اُن کے گھر میں گھس گئے، لیکن وہ اس وقت بادشاہ کے ساتھ قلعے میں تھے۔ انھیں گھر میں نہ پا کر بپھرے ہوئے لوگوں کا ہجوم قلعے پہنچ گیا۔ بادشاہ نے خود کو احسن اللہ خاں سے لپٹا لیا اور یوں ان کی جان بچائی۔ لیکن حکیم صاحب کے گھر کو لوٹ لیا گیا— چینی مصوری جیسے ان کے نفیس اور دلکش گھر کو آگ لگا دی گئی۔

بادشاہ جتنے بھی ناکام رہے ہوں، وہ ایک تہذیب کے علم بردار تھے۔ وہ تہذیب جو شہنشاہ بابر سے شروع ہوئی اور اکبر کے عہد میں پوری طرح اپنی تکمیل کو پہنچی۔ اس تہذیب کی خوبصورتی کا اندازہ آپ محض ایک فتح پور سیکری سے لگا سکتے ہیں۔ میاں تان سین کی موسیقی اس تہذیب کا اَوج تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے تصویر خانے کی تصویریں اسی تہذیب کی نمائندگی کرتی تھیں۔ بہادر شاہ کے لیے ان غیر مہذب اور وحشی سپاہیوں کو قبول کرنا بظاہر ناممکن تھا۔ تلنگے ان لوگوں کے لیے گویا اصطبل تھا۔ 'تم ان لوگوں کی مدد سے سلطنت کو بچاؤ گے، مرزا؟' بادشاہ نے ایک دن مرزا مغل سے پوچھا۔ 'یہ اپنے گھوڑوں پر چڑھ کر کہیں بھی گھسے چلے آتے ہیں۔ انگریز افسر کبھی ایسا نہیں کرتے تھے؛ وہ دیوانِ عام میں داخل ہونے سے پہلے گھوڑوں سے اتر جاتے تھے اور پیدل اندر آیا کرتے تھے۔'

—سلطنت کی بقا کے لیے ہمیں ان کی ضرورت ہے۔

—ان بدتہذیب چھوکروں کی؟ تم کیا سمجھتے ہو مجھے کسی بات کی خبر نہیں ہے؟ یہ لوگ بازاروں کو لوٹ رہے ہیں۔ یہ لوگ شرفاء کے گھروں میں جاتے ہیں، یہ بہانہ بنا کر کہ انگریز یہاں چھپے ہوئے ہیں، اور پھر ان کے گھروں کو لوٹ لیتے ہیں۔

—اس سے آپ کا کیا واسطہ جہاں پناہ؟ کیا آپ اپنا تخت بچانا نہیں چاہتے؟ آخر انھی لوگوں نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے۔

—ہاں، اوچھے لوگوں کا بادشاہ۔

— لیکن بادشاہ تو ہیں۔

ہاں، منٹو بھائی، دراصل سب کچھ اُلٹ جانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ ہو کیا رہا ہے۔ وہ گہری تاریکی کا دور تھا، جب آپ کو کسی ایک جانب ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ یا تو آپ بادشاہ کی طرف ہو سکتے ہیں یا انگریزوں کی طرف۔ مجھ جیسا شخص اس بات کا فیصلہ اتنی آسانی سے کیسے کر سکتا تھا؟ میں جانتا تھا بطور شاعر میں دونوں کے لیے اہم ہوں، وہ محض ضرورت کے وقت ہی مجھے یاد کریں گے۔ میں اُس گھاس کی طرح تھا جو دو ہاتھیوں کی لڑائی کے درمیان کچلی جاتی ہے۔ مجھے ان دونوں میں توازن برقرار رکھنا تھا۔ نہ تو بادشاہ مجھ سے خفا ہوں اور نہ گورے ہی مجھ پر شک کریں۔

اس لیے منٹو بھائی، میں نے کمرے کا ایک کونا پکڑا اور لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ایسے وقت میں ایک شاعر اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ جب صدیوں پرانی سلطنت ایک گلی سڑی لاش بن جائے اور تہذیب کے نقیب بن کر آنے والوں کی آستینوں میں چھپے ہوئے خنجر نمایاں ہو جائیں تو اس لاش کو لفظوں کا خراج ادا کرنے کے سوا اور رہ بھی کیا جاتا ہے؟ میں نے 'دستنبو' لکھنا شروع کی۔ مجھے وہ سب لکھنا تھا جو میں دیکھ اور سن رہا تھا، وہ سب کچھ میرے اردگرد ہو رہا تھا۔ میں نثر فارسی میں لکھنے لگا۔ میں نے اس خونچکاں باب کا عنوان 'دستنبو' یعنی گلدستہ رکھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی یہ ضرور سمجھ لے گا کہ یہ گلدستہ خون آلود پھولوں کا ہے، لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی بھی اس رمز کو نہیں سمجھ سکا۔ اس پر میں نے اپنی پیٹھ تھپتھپائی۔ آخر میں نے رمز و کنایے میں بات کہنے کا ہنر سیکھ ہی لیا۔ یہ ہنر سیکھنا ضروری تھا، منٹو بھائی۔ ورنہ کوئی نہ کوئی گولی — چاہے وہ باغیوں کی طرف سے آتی یا انگریزوں کی طرف سے — ضرور میرے سینے میں پیوست ہو چکی ہوتی۔

مجھے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ ان کی غزلوں کی اصلاح کرنے کے علاوہ یہ ثابت کرنے کے لیے بھی کہ میں ان کی طرف ہوں۔ باغیوں کی مدد سے چار مہینوں کی اس بادشاہت کے دوران بادشاہ نے جو سکّہ جاری کیا وہ میرا ہی کہا ہوا تھا۔

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ

سکہ زد در جہاں بہادر شاہ[1]

جب باغیوں نے اعلان کیا کہ بہادر شاہ ہی بادشاہ ہیں تو میں نے ان کے حضور ایک قصیدہ بھی گزرانا۔

ایک روز انھوں نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا: 'کیا دکھائی دیتا ہے، استاد؟'

— شہنشاہ، آپ کا عروج پھر لوٹ آیا ہے۔

— نہیں۔ کیا آپ نے بجھتے ہوئے چراغ کی لو دیکھی ہے؟

— دیکھی ہے، جہاں پناہ۔

— وہ بجھتی ہوئی لو میں ہی ہوں۔

ان کے بتائے بغیر بھی میں یہ بات جانتا تھا۔ میں نے انھیں ایک شعر سنایا۔

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

— سبحان اللہ، کیا کہنے، استاد۔

اپنی وفاداری کے ثبوت کے لیے وقتاً فوقتاً دربار میں حاضری کے علاوہ میں کوٹھری میں بیٹھا 'دستنبو' تحریر کرتا رہتا۔ میری وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں، اس بات کا واضح طور پر اعلان کرنے کے بجائے، اس دفتر کو تحریر کرنا میرے خیال میں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ جہاں تک ممکن ہو سکے غیر جانبدار رہتے ہوئے اپنے مصائب کا روزنامچہ تحریر کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کسی بھی چیز میں غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ان واقعات کا احوال تحریر کر جاؤں۔

مجھے معلوم ہے آپ خفا ہوں گے، منٹو بھائی، لیکن میں اس نچلے درجے کے سپاہیوں کی بالادستی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میری تہذیب تو اور تھی۔ اگر میں بھوک سے مر بھی رہا ہوتا تب بھی میں کسی کے تصویرخانے کو جلانے کا نہ سوچتا۔ مصوری تو میری آنکھوں اور ذہن کی غذا تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ان سپاہیوں نے قلعے میں موجود ایک ایک خوبصورت

---

[1] غالب ساری زندگی اس شعر کا انکار کرتے رہے، لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے ایک خط کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ شعر غالب ہی کا ہے (مترجم)

چیز کو مٹا دیا۔ انھیں اپنی بغاوت جاری رکھنے کے لیے صرف روٹی اور پیسہ درکار تھا۔ انھوں نے کتنے ہی بیش قیمت نوادرات بیچ ڈالے۔ اگر انقلاب ایسی وحشت کا نام ہے تو میں اس کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اس لیے میں دل و جان سے چاہتا تھا کہ انگریز دوبارہ شاہجہاں آباد پر قبضہ کرلیں، کم از کم امن تو بحال ہوگا۔

ہاں، میرے دوست، میں جانتا ہوں کہ آپ اودھ کے الحاق کا مسئلہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ہیں نا منٹو بھائی؟ مجھے نفرت تھی اس سے، لیکن پھر بھی امید کی یہ رمق تو باقی تھی کہ انگریز کم از کم خوبصورت چیزوں کو تباہ نہیں کریں گے۔ ذرا تصور کیجیے، منٹو بھائی، سپاہی چھاؤنیوں میں رہتے ہیں — وہ قید خانوں کی طرح ہوتی ہیں — کھانے، سونے اور جنسی خواہشات کے علاوہ ان کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ جو تہذیب بھی وہ ان چھاؤنیوں میں ساتھ لے کر جاتے ہیں اسے وہ بے رحمی تباہ کر ڈالتی ہے جو فن حرب سیکھنے کے دوران انھیں ذہن نشین کرادی جاتی ہے۔ آخر میں یہ سپاہی صرف لڑ سکتے ہیں، شہروں کو تاراج کرسکتے ہیں، لیکن کبھی امان نہیں دے سکتے۔ آزادی تو صرف عام آدمی لاسکتا ہے، جس کے ہتھیار ہوتے ہیں پتھر، درختوں کی شاخیں اور وراثت میں ملنے والی، صدیوں سے چلی آرہی جنگ و جدل کی یادیں۔ اپنے گھر، اپنے دریا، اپنے جنگل کے تحفظ کی جنگ — آزادی محض انسانوں کے لیے نہیں ہے، منٹو بھائی، آبشاروں کے لیے بھی آزادی ہے، درختوں کی آزادی، پرندوں کی آزادی، مچھلیوں کی آزادی — کیا چھاؤنیوں میں رہنے والے سپاہی کبھی ایسی آزادی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ انھیں تو صرف جنگوں میں لڑنا سکھایا جاتا ہے، لیکن آزادی کے لیے جنگ، بندوقوں اور تیروں والی جنگ سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

میں آج تو یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن مجھے اس وقت اپنا منہ بند رکھنے کی ضرورت تھی اس لیے 'دستنبو' لکھتے رہنے کے علاوہ میرے پاس کرنے کو اور کچھ نہ تھا۔ اس دوران، باغیوں کے شہر پر قابض ہوتے ہی، انگریزی سرکار کی جانب سے مجھے ملنے والی پنشن بند ہوگئی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ گھر پر موجود اتنے لوگوں کی گزر بسر کیسے ہوگی۔ اس بارے میں سوچ سوچ کر ہنسی آنے لگتی ۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

میرے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ میں منتظر تھا کہ کب انگریز دوبارہ شاہجہاں آباد پر تسلط قائم کریں اور حالات معمول پر آئیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، منٹو بھائی، مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مئی کے مہینے میں، پیر کے دن باغیوں نے شاہجہاں آباد پر قبضہ کیا تھا، اور اسی سال ۱۴ستمبر کو، پیر ہی کے دن انگریزوں نے دوبارہ شہر کا قبضہ حاصل کرلیا۔ لڑائی بیس ستمبر تک چلتی رہی۔ انگریز اسی روز قلعے پر قابض ہوگئے۔ شہنشاہ نے بھاگ کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ لے لی۔ یہ غزل کے شعر کا مضمون لگتا تھا، منٹو بھائی، لب دم شہنشاہ قبر میں پناہ گزین ہوگیا۔ آخرکار انھوں نے کیپٹن ہڈسن کے آگے اس یقین دہانی پر ہتھیار ڈال دیے کہ انھیں آزاد کردیا جائے گا۔ ان کے دو بیٹوں مرزا مغل اور خضر سلطان کو کیپٹن ہڈسن نے خونی دروازے کے سامنے گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔ شہنشاہ ان پر ایک نظر بھی نہ ڈال سکے کہ وہ خود اپنے بچاؤ میں مصروف تھے۔ میں نے سنا کہ مرزا مغل نے قتل ہونے سے پہلے صاف کہا — 'یاد رکھنا میرے ہندو اور مسلمان دوستو۔ اگر تم متحد ہوجاؤ تو سب کچھ حاصل کرسکتے ہو۔' میں نے ان دنوں ایسے متعدد لرزہ خیز مناظر دیکھے، منٹو بھائی۔ گیارہ شہزادوں کو سفاکی کے ساتھ قتل کرکے چاندنی چوک پر ڈال دیا گیا۔ ان کے برہنہ جسموں پر صرف ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ کیا مغلیہ شاہی خاندان کی اولاد اسی سلوک کی مستحق تھی؟ شہنشاہ اور ان کی بیگم زینت محل کو قلعے کے ایک تنگ اور تاریک کمرے میں قید کردیا گیا۔ انگریز انھیں یوں دیکھنے آتے جیسے وہ چڑیا گھر کے جانور ہوں۔ وہ ایک عارضی بستر پر، گندے کپڑوں میں ملبوس پڑے دہرایا کرتے، 'میں بہت خوش ہوں، میں بہت خوش ہوں۔' میں نے کچھ لوگوں سے سنا تھا کہ وہ سارا دن اور ساری رات چھت کو دیکھتے رہتے تھے، کبھی نیند کے خمار سے باہر آکر اپنی غزلیں پڑھنے لگتے۔ پھر مقدمہ شروع ہوا اور اکیس دن جاری رہا۔ کہتے ہیں کہ سنوائی کے دوران بھی شہنشاہ اکثر سوئے رہتے۔ جس کمرے میں انھیں قید کردیا گیا تھا اس کی دیواروں پر انھوں نے اپنی زندگی کی آخری غزل لکھی ۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

کسی کام میں نہ جو آ سکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا وقت مجھ سے بچھڑ گیا، مرا رنگ روپ بگڑ گیا
جو خزاں سے باغ اُجڑ گیا، میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں[1]

انگریزوں کے شاہجہاں آباد پر قبضہ کر لینے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مرتے ہوئے جانور کی آخری چیخیں سُن رہا ہوں جس دن انگریزوں نے شہر پر قبضہ کیا اسی رات انگریزی فوج کے کمان دار جنرل ولسن نے قلعے دیوان خاص میں ضیافت کا اہتمام کیا۔ دیوان خاص کا وقار ایک ہی رات میں خاک میں مل گیا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے آج بھی میں غم و غصے سے کسی جال میں پھنسے ہوئے جانور کی طرح پھڑ کنے لگتا ہوں۔ میں سب بتاؤں گا، میرے بھائیو، سب—— کس طرح دلّی اُجڑی—— کس طرح دلّی میں بچ رہ جانے والے چند لوگوں نے جہنم کی آگ میں اپنے دن گزارے۔

یہی دن تھے جب مرزا یوسف ہمیں چھوڑ گیا، منٹو بھائی۔ میں اپنے اس بھائی کے متعلق پہلے ہی سب کچھ آپ کو بتلا چکا ہوں۔ یوسف نے تقریباً تیس برس کا عرصہ دیوانگی کی حالت میں گزارا۔ لیکن اس نے کبھی کسی کو پریشان نہیں کیا؛ وہ بس بیٹھا آپ ہی آپ بڑبڑایا کرتا، کبھی کئی کئی دنوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتا پھر خود ہی لوٹ آتا۔ انگریزوں کے دلّی پر قبضے کے بعد بہت سے لوگوں نے تشدد اور قتل کے خوف سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ یوسف کی بی بی اور بیٹیاں بھی اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔ 'دستنبو' میں یوسف میاں کی موت کا جو سبب میں نے لکھا تھا، منٹو بھائی، وہ غلط تھا۔ 'دستنبو' تو درحقیقت میں انگریزوں کو پیش کرنے کے لیے لکھ رہا تھا، تا کہ ان سے خطاب اور وظیفہ حاصل کر سکوں اور پنشن کا فیصلہ اپنے حق میں کروا سکوں، میں قصداً 'دستنبو' میں ایسی کوئی بات شامل نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے انگریز مجھے انقلابیوں کا حامی سمجھیں اور مجھ پر شک کریں۔ لیکن معلوم ہے نا ایک وقت ایسا آتا ہے جب آپ کی تخلیق آپ کے اختیار سے باہر ہو جاتی ہے، آپ جو بھی لکھتے ہیں، آپ کے عقائد کے مطابق اس تحریر میں سچائی کے اشارے پنہاں ہوتے

ہیں، اسی وجہ سے 'دستنبو' میں آپ اس جہنم کی تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں جس میں انگریزوں نے ہمیں دھکیل دیا تھا۔ سلطنتِ برطانیہ ہندوستان کے لیے فرشتۂ آزادی ہے، جی ہاں، یہ بات میں نے 'دستنبو' میں بار بار لکھی ہے۔ لیکن بغاوت شروع ہونے کے پندرہ مہینوں میں دلّی کی بربادی، اور کیڑے مکوڑوں کی سی وہ زندگی جو ہم سب نے گزاری، وہ بھی وہاں درج ہے۔

'دستنبو' میں میں نے لکھا تھا کہ پانچ روز تیز بخار میں رہنے کے بعد یوسف مرزا کی وفات ہوگئی۔ اس کے دربان نے آ کر ہمیں مطلع کیا لیکن یوسف درحقیقت انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ اس وقت ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ گولیوں کے شور سے وحشت زدہ ہو کر یوسف باہر سڑک پر نکل گیا اور آگ اگلتی گولیوں کی زد میں آ کر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے معلوم ہے، منٹو بھائی، اس جھوٹ پر خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں نے اپنی کتاب میں اپنی جان بچانے کی غرض سے، اپنے بھائی کی موت سے متعلق جھوٹ تحریر کیا۔ مجھے دوزخ سے کبھی نجات نہ ملے گی۔ اب اُس کی لاش کا کیا کرتا؟ شاہجہاں آباد کی صورت حال کے پیشِ نظر مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کی میت کے لیے کفن کہاں سے آئے گا۔ میت کو غسل کون دے گا، گورکن کہاں ملے گا، اینٹیں اور چونے کا پتھر کہاں سے آئے گا؟ میں اسے کس قبرستان میں دفن کروں گا؟ ہندو کم سے کم اپنے مردوں کو جمنا کے کنارے نذرِ آتش تو کر سکتے تھے، لیکن ہم مسلمان کیا کرتے؟ گلیوں میں مستقل گولیاں چل رہی تھیں—— میں یوسف کو قبرستان تک بھی کیسے لے جاؤں؟ کچھ پڑوسیوں نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کلّو اور ایک دوسرا ملازم بھی ساتھ تھے۔ ان لوگوں نے میت کو غسل دیا، اسے کفن پہنایا اور مسجد کے قریب ایک میدان میں قبر کھود کر یوسف کو دفنا دیا۔ یوں میرا آخری خونی رشتہ بھی ختم ہو گیا، منٹو بھائی۔

وہ خاتمے ہی کا وقت تھا۔ بہت سے فرار ہو گئے، بہت سے دوسروں کو شہر سے بے دخل کر دیا۔ ہم میں سے جو پیچھے رہ گئے وہ خوف اور امید کے قیدی بن کر رہ گئے۔ جو جا چکے تھے یا جو رہ گئے تھے ان کی روحوں کے سکون کے لیے کوئی مرہم نہیں تھا۔ لگتا تھا موت نے سب کے چہروں پر کوئی تاریک نقاب ڈال دیا ہے۔ چاندنی چوک گویا موت کی وادی بن گیا۔ انگریزوں کو جو بھی ملا اسے پکڑ کر پھانسی دینے کے لیے درختوں کی شاخوں پر ٹانگ دیا۔ ہر طرف جاسوس

گھوم رہے تھے۔ فرض کیجیے آپ کے اور میرے بیچ کوئی عداوت ہے، میں نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور انگریزوں سے شکایت کردی کہ آپ باغیوں کے ساتھی ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیا میں بھی غداری کا مرتکب نہیں ہوا۔ ہاں، میں نے بھی غداری کی میرے بھائیو، مجھے آج اس بات کا اعتراف کرنا ہی ہوگا۔ 'دستنبو' فارسی نثر کا کیسا ہی شاندار نمونہ کیوں نہ ہو، یہ غداری کا بھی نمونہ ہے۔ میں نے ایک ڈراونے خواب کی تصویر کشی کی، لیکن خود کو بچانے کے لیے میں نے غیرملکی سلطنت کو وہ تصویر بیچ بھی دی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۴۰

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

ایک قصہ سنیے، برادران۔ مہابھارت میں بھیشم نے یدھشٹر کو یہ روایت سنائی تھی۔ ایک جنگل میں کسی شکاری کا زہرآلود تیر اپنے ہدف سے چوک کر ایک بڑے سے قدیم درخت کو جا لگا۔ درخت میں فوراً ہی آگ بھڑک اٹھی۔ اس درخت کی شاخوں پر ہر طرح کے پرندوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ پرندوں نے جب دیکھا کہ درخت جل کر بھسم ہوجائے گا تو وہ اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ کر اُڑنے لگے۔ بس ایک تنہا طوطا وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں آگ کے شعلوں نے درخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اب وہ شعلے طوطے تک پہنچنے ہی والے تھے۔ لیکن اپنی یقینی موت کو سامنے پا کر بھی طوطا اپنے گھونسلے سے نہیں اُڑا۔ اوپر آسمان سے دیوراج اِندر اس واقعے کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ انھوں نے طوطے سے پوچھا،' باقی سب اڑ گئے ہیں، تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا تم آگ میں جل کر مرنا چاہتے ہو؟'

— بھگوان، میں اسی درخت پر پیدا ہوا تھا، اس کے پتوں اور شاخوں کے درمیان بڑا ہوا۔ اس قدیم درخت سے میں نے سیکھا کہ صبر و تحمل کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے اور جیا کیسے جاتا ہے۔ اس درخت نے ہمیں آندھی اور طوفان میں پناہ دی ہے۔

— لیکن اس درخت کے ساتھ ساتھ تم بھی جل کر مر جاؤ گے۔

— جل جانے دیجیے، بھگوان۔

— کیا تمھیں موت سے ڈر نہیں لگتا؟

— موت سے کس کو ڈر نہیں لگتا؟ طوطے نے نقاہت سے مسکراتے ہوئے کہا، 'لیکن بھگوان، کیا موت کے خوف سے کسی کو اپنا دھرم چھوڑ دینا چاہیے؟'

— تمھارا دھرم کیا ہے؟

— میں اگر آج زندہ ہوں تو صرف اس درخت کی وجہ سے۔ اب بُرے وقت میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

— قابلِ قدر جواب دیا تم نے۔ مجھے تم سے ایسے ہی دیانتدارانہ جواب کی توقع تھی۔ اے طوطوں میں سب سے اچھے طوطے! مانگو، کیا وردان (عطیہ) چاہیے تمھیں؟

— کیا آپ میری گزارش پوری کریں گے؟

— ضرور۔

— تو پھر اس قدیم درخت کو زندگی لوٹا دیجیے۔

اِندر کے وردان سے درخت کو پھر سے زندگی مل گئی۔ لیکن جس قدیم درخت پر میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا اُسے بچانے والا کوئی نہیں تھا، مرزا صاحب۔ تقسیم کے زہرآلود تیر نے اسے جلا کر بھسم کر دیا۔ ایک ملک ٹوٹا اور سارے ہندوستان میں جاری قتل و غارت کے بیچ وجود میں آئیں دو علیحدہ قومیتیں۔ کون صحیح تھا اور کون غلط، آج میں اس بات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا— اس کے لیے سیاسی رہنما اور تاریخ دان کافی ہیں— لیکن وہ ڈراؤنے خواب مجھے قبر میں بھی آتے ہیں۔ کوئی کہتا تھا: ایک لاکھ ہندو مارے گئے، کوئی کہتا تھا: ایک لاکھ مسلمان مارے گئے۔ میں انھیں کہتا تھا، یہ کہو دو لاکھ انسان مارے گئے۔ ہندوؤں کو مار کر مسلمانوں نے سوچا، ہندوتوا کا خاتمہ کر دیا، مسلمانوں کو مار کر ہندوؤں نے سوچا، اسلام کو دفنا دیا۔ کس کو سمجھائیں، مرزا صاحب، کہ مذہب اس طرح نہیں مرتا۔ مذہب ہمارے دل میں، ہمارے یقین میں ہوتا ہے۔ مذہب کے نام پر بھائی نے بھائی کا خون کیا، بھائیوں نے بہنوں کی آبروریزی کی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک مہاجروں کا سیلاب بہنے لگا۔ ہم سب نہرو، جناح اور پٹیل کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے۔ ہر جانب کیسی نفرت اور کیسی بداعتمادی تھی۔ یہ سارے سیاسی رہنما جونکیں تھے، میرے بھائیو، یہ اس بات کے مستحق تھے کہ کھولتا ہوا پانی ڈال کر انھیں ختم کر دیا جاتا۔ ہمارا خون چوسنے کے علاوہ ان کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ نہیں، مرزا صاحب، ان کے بارے میں بات کرنے کی میری کوئی خواہش نہیں ہے۔

دن گویا کسی آتش زدگی میں گزر رہے تھے، جہاں دوست دوست کا خون کرتے ہوئے نہیں جھجکتا تھا۔ ایسا ہی ایک دن تھا جب مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ قتل کرنے کی خواہش کیسا چہرہ اختیار کر سکتی ہے۔ ہزاروں ہندو اور مسلمان ہر روز مر رہے تھے۔ ایک دن شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگ کر آئے ہوئے ایک سکھ خاندان سے ملنے گئے۔ شیام بھی آخر راولپنڈی کا تھا۔ کس طرح اس خاندان کے افراد کو مار ڈالا گیا تھا، یہ سن کر میرا خون جم گیا۔ شیام مشتعل ہو اٹھا۔ اس کے دماغ میں جو ہلچل مچ رہی تھی میں اس کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ جب ہم باہر نکلے، میں نے دیکھا وہ ابھی تک کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ شیام نے اجنبی نظروں سے میری طرف دیکھا، جیسے وہ مجھے پہچانتا ہی نہ ہو۔

— شیام......

وہ چپ چاپ چلتا رہا۔

— کیا ہوا، شیام؟

'کچھ نہیں'، اس نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

— تمھیں تکلیف ہو رہی ہے۔ ہے نا؟

— نہیں۔

میں نے اس کے دانت کچکچانے کی آواز سنی— میں ایک مسلمان ہوں۔ مجھے سچ بتاؤ، کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو؟ میں نے اس کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

شیام نے مجھے سرد نگاہوں سے دیکھا۔

— مجھے سچ بتاؤ، شیام، تم مجھے قتل نہیں کرنا چاہتے؟

شیام سنجیدگی سے بولا، 'اس وقت نہیں'۔

— کیا مطلب؟

—اُس وقت جب میں ان کی پتا سن رہا تھا— کہ کیسے مسلمانوں نے ہمارے لوگوں کو مار ڈالا—ہاں، اُس وقت—اُس وقت میں تمھیں واقعی قتل کر سکتا تھا، منٹو۔

شیام نے میرا باز و تھام لیا اور رونے لگا۔'مجھے معاف کر دو، منٹو۔' یہ محض ہندوستان کی تقسیم نہیں تھی، یہ دوستی کی تقسیم بھی تھی۔ یہ ساری قتل و غارت—خون کے دریا میں بہتی ہوئی وہ سر بریدہ لاشیں—بچوں کے وہ مردہ جسم جنھیں ٹانگیں چیر کر سڑک پر پھینک دیا گیا تھا—بار بار آبرو ریزی کا شکار ہونے والی لڑکی کے منہ پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں—سڑک پر چلتے ہوئے میں سوچتا تھا، ہر طرف اتنا سارا ٹھنڈا گوشت؟ یا اللہ، کیا میں زندہ ہوں؟

ہاں، میں زندہ تھا، میں ویسے ہی زندہ تھا، جیسے ایشر سنگھ زندہ تھا۔ کائنات جل رہی تھی، میں جل رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتا ایشر سنگھ زندہ کیسے رہا، مرزا صاحب۔ میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے وعدہ کیا تھا میرے بھائیو، کہ 'ٹھنڈا گوشت' کی کہانی سناؤں گا۔

یہ سب کسی آدھی رات کو پیش آیا۔ ایشر سنگھ کی زندگی کی آدھی رات کو، اور ہماری زندگیوں کی بھی، ہم جو ہندوستان نام کے ایک ملک میں رہتے تھے، لیکن کسے معلوم تھا کہ ہمیں اپنے دل کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا ہوگا۔ اُس رات جونہی ایشر سنگھ کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور اپنے پلنگ پر سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی طرف تیز تیز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کلونت کور نے دروازہ بند کر لیا۔ دوبارہ پلنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا، ایشر سنگھ اسی جگہ جما کھڑا تھا، اُلجھا ہوا، جیسے کسی پریشانی کا شکار ہو، جس کا حل اسے نہ مل رہا ہو۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں، کرپان ہاتھ میں تھامے سر نیہوڑائے کھڑا فرش کو گھور رہا تھا۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ کلونت نے محسوس کیا کہ کرپان کو تھامے ہوئے اس کا ہاتھ تھوڑا تھوڑا لرزاں تھا۔

ایک لمبے سکوت کے بعد، جب اس سے یہ خاموشی اور برداشت نہ ہوئی، کلونت نے اسے پکارا، 'ایشر سیاں۔'

ایشر سنگھ نے ایک لمحے کے لیے اس کی جانب دیکھا پھر اپنی نظریں ہٹا لیں۔

— کہاں رہے تم اتنے دن؟ کیا کر رہے تھے؟ کلونت چلائی۔

— مجھے معلوم نہیں۔

— یہ بھی کوئی جواب ہے؟

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور بستر پر ڈھے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، 'جانی کیا ہوا ہے تمھیں؟'

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے کلونت کے چہرے کی طرف دیکھا اور کراہتے ہوئے بولا، 'کلونت۔'

— ہاں، جانی۔

ایشر سنگھ نے اپنی پگڑی اُتار دی اور دوبارہ کلونت کور کی طرف دیکھا۔ یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں سہارا مانگ رہی ہوں۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک کراہ نکل گئی۔ 'میں پاگل ہو جاؤں گا، کلونت۔' وہ بولا۔

اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کلونت نے کہا، 'بتاؤ مجھے، اتنے دن کہاں رہے تم؟'

ایشر سنگھ دانت پیستے ہوئے بولا، 'مادر چود، بُرے کی ماں کے گھر۔' اچانک اس نے کلونت کور کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور ہنستے ہوئے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا، 'قسم واہگورو کی، تیرے جیسی جاندار عورت نہیں دیکھی، کلونت۔'

کلونت کور نے اس کے ہاتھ اپنی چھاتیوں سے جھٹکے اور پوچھا، 'تمھیں میری قسم ہے، سچ بتاؤ، کہاں تھے تم؟ کیا تم شہر گئے ہوئے تھے؟

— نہیں۔

— میرا دل کہتا ہے تم شہر گئے تھے۔ تم نے بہت سارا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔ ہے نا؟

— میں اپنے باپ کا تخم نہیں جو اگر تجھ سے جھوٹ بولوں۔

کلونت کور تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر یکدم بھڑک اٹھی۔ 'لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمھیں کیا ہوا؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، تم نے مجھے وہ سارے گہنے پہنائے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری پپیاں لیتے ہوئے تم نے کتنی ساری باتیں کیں۔

پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ تم اٹھے اور ایک لفظ کہے بنا کپڑے پہن کر باہر نکل گئے، کیا تھا وہ؟

ایشر سنگھ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے سارے چہرے کا خون نچوڑ لیا ہو۔

—ایشر سیاں، کچھ تو دال میں کالا ہے۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔

—تیری جان کی قسم، کلونت، کچھ بھی نہیں۔

—تم وہ آدمی نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے۔ کیوں؟ کیا کیا ہے تم نے؟ بتاؤ مجھے۔

کوئی جواب دیے بغیر ایشر سنگھ نے کلونت کور کو اپنے بازوؤں میں لپٹا لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ 'میں وہی ایشر سیاں ہوں، جانی۔'

—مجھے سچ بتاؤ، تمھیں اس رات کیا ہو گیا تھا؟

—بُرے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا......

—بتاؤ گے نہیں۔

—کیا بتاؤں تجھے؟ بتا؟

—مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔

ایشر سنگھ نے اسے اور کس کر بھینچ لیا اور اپنے ہونٹ اس کی گردن میں گاڑ دیے۔ کلونت کو زور سے ہنسی آ گئی، ایشر بھی ہنس پڑا۔ اس نے اپنی صدری اتار دی اور بولا، 'آ جاؤ، ایک بازی تاش کی ہو جائے۔'

کلونت کور نے مصنوعی خفگی سے کہا، 'چل دفعان ہو۔'

ایشر سنگھ اس کے ہونٹ چومنے لگا۔ اس نے اور مزاحمت نہ کی۔ ایشر سنگھ جوش سے چلایا، 'لو پھر ہو جائے ترپ چال—' کلونت کے کپڑے اُتار کر اس نے اپنی زبان اس کے بدن پر پھیرنا شروع کر دی۔

'بالکل جانور ہو تم۔' کلونت کراہی۔

—ہاں، جانور ہی ہوں۔

اس نے کلونت کور کے ہونٹوں اور کانوں کی لووں کو دانتوں سے کچکچایا، ابھرے ہوئے سینے کو مسلا اور بھنبھوڑ ڈالا، اپنا منھ اس کے پیٹ پر رگڑ ڈالا۔ کلونت کور کا بدن تیز آنچ سے دہکنے

لگا۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت نہ پیدا کر سکا۔ آخر کلونت کور کراہتے ہوئے بولی، 'ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک۔'

نہیں، آج ترپ کا پتا اس کے ہاتھ میں نہیں رکھا۔ مایوس اور ہانپتا ہوا ایشر سنگھ بستر پر لیٹ گیا اور اس نے اپنا منھ چھپا لیا۔ کلونت کور اسے ہر طرح سے گرمانے کی کوشش کرنے لگی۔ آخر جھنجھلا کر چیخی، 'اتنے دن کس حرامزادی کے ساتھ سو کر آیا ہے؟ ایشر سیاں جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے۔'

ایشر سنگھ ہانپتا رہا۔ کلونت اور زور سے چلائی، 'بتا مجھے کوئی ڈائن ہے وہ — کیا نام ہے اس کا......'

— کوئی بھی نہیں، کلونت۔ میری زندگی میں اور کوئی بھی نہیں۔

—میں آج سچ جان کے رہوں گی— کھا واہگورو جی کی قسم اور بتا کون الفتی ہے وہ۔ قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔ اگر جھوٹ بولا تو تیری تکا بوٹی کر دوں گی۔ اب بتا مجھے کون چڑو ہے وہ؟

ایشر سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کلونت کور غصے میں بالکل دیوانی ہو گئی۔ اس نے لپک کر فرش پر پڑی ہوئی کرپان اٹھائی اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ وہ ایشر سنگھ کے کیس نوچتے ہوئے گندی گندی گالیاں دیتی رہی۔

'جانے دے، کلونت جانے دے۔' ایشور سنگھ نے ٹھنڈے لہجے میں اُسے کہا۔

—پہلے بتا کون ہے وہ کتیا؟

خون ایشر سنگھ کے چہرے سے بہتا ہوا اس کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ کسی نشئی کی طرح وہ بولا، 'کیا بتاؤں تجھے، کلونت؟ میں چھ آدمی کا قتل کر چکا ہوں اسی کرپان سے۔'

—میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟

—اس کو حرامزادی نہ بول۔ ایشر سنگھ نے بھاری آواز میں کہا۔

— کیا مطلب ہے تیرا؟ مجھے بتا کون ہے وہ؟

—بتاتا ہوں۔ چہرہ پونچھ کر اس نے خون سے سنے ہوئے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

پھر بڑبڑایا، ہم سب ماں بیوے — ہم سارے مادر چود ہیں۔

— تو مطلب کی بات کر ایشر سیاں۔ کلونت چلائی۔

— ٹھہر، سب بتاؤں گا تجھے۔ لیکن ذرا دھیرج رکھ کلونت۔ ہر بات اتنی آسانی سے نہیں بتائی جا سکتی۔ انسان کڑی بیوا بھی — کلونت میں نے کہا نا — انسان مادر چود بھی عجیب چیز ہے۔ شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ گہنے پاتے اور روپے پیسے جو ہاتھ لگے وہ میں نے تمھیں دے دیے۔ لیکن ایک بات ایسی تھی جو میں نے تمھیں نہیں بتائی کلونت، جو میں تمھیں بتا نہیں پایا۔

— کون سی بات؟

— ہم ایک گھر کا دروازہ توڑ کر اندر گھسے...... ہاں، سات...... سات لوگ تھے اس گھر میں...... چھ کو میں نے قتل کر ڈالا، اسی کرپان کے ساتھ...... چھوڑ...... چھوڑ اسے کلونت...... وہاں ایک لڑکی تھی...... بہت سُندر...... باقیوں کی طرح میں اس کے بھی ٹکڑے کر سکتا تھا...... لیکن میں نے سوچا...... ایشر سنگھ ہنس دیا۔ وہ بہت سندر تھی، جانی، میں تم سے کیا کہوں کتنی سندر تھی۔ میں نے سوچا میں کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہوں، آج ذرا یہ نیا میوہ بھی چکھ دیکھ لوں۔

— میں جانتی تھی۔ کلونت کی چھیدتی ہوئی نظروں میں نفرت اور حقارت ایک ساتھ اُبھر آئی۔

— میں نے اسے کاندھے پر ڈالا اور نکل آیا۔

— پھر؟

— راستے میں...... ایشر سنگھ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ کیا کہہ رہا تھا میں؟ میں نے اسے کندھے پر ڈال رکھا تھا...... سامنے ایک نہر تھی۔ اس کی پٹری کے پاس جھاڑیاں تھیں۔ میں نے جھاڑیوں تلے اس کو لٹا دیا۔ پہلے خیال آیا کچھ دیر تاش پھینٹوں۔ لیکن آس پاس کون چھپا بیٹھا ہو، معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سیدھے سیدھے پتا پھینک دیا......

— کہتے رہو...... کہتے رہو۔

— میں نے پتا پھینک دیا۔

— پھر......

کتنی ہی دیر ایشر سنگھ اپنا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کلونت کو ایسے دیکھا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو...... وہ مری ہوئی تھی...... پتا نہیں کب مر گئی تھی...... وہ لاش تھی...... ٹھنڈا گوشت۔ جانی...... مجھے اپنا ہاتھ دے...... جانی......

کلونت کور نے ایشر سنگھ کو چھو کر دیکھا، وہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

ہاں، مرزا صاحب، ہم سب گویا کسی برفانی عہد سے گزر رہے تھے۔ کتنے لوگ مارے گئے؟ کتنوں کی آبروریزی ہوئی؟ کتنے مہاجر بن گئے؟ میں ان کی تعداد نہیں جانتا، میرے بھائی۔ اور پھر ہم تعداد جان کر کریں گے بھی کیا؟ میں نے ایک بچے کو دیکھا جو بات کرنا بھول چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گھر کے ایک ایک فرد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور گولیوں سے بھون دیا گیا۔ جب لوگ تعداد کی بات کرتے تو مجھے اس بچے کا چہرہ یاد آ جاتا — خالی آنکھیں اور ساکت چہرہ۔ جیسے پونچھا مارنے والے کپڑے سے ایک ہی پونچھے میں اس کی ساری یادوں کو صاف کر ڈالا گیا ہو۔

یہ واضح تھا کہ اب مجھے بھی بمبئی کو اپنی یادوں سے صاف کر دینا ہوگا۔ صفیہ اور بچے بہت پہلے ہی لاہور جا چکے تھے۔ وہ مجھے مسلسل لکھ رہی تھی اور لاہور چلے آنے کا کہہ رہی تھی۔ بمبئی میری دوسری جائے پیدائش تھی، میں اس شہر کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ میں زمانے میں بمبے ٹاکیز میں کام کر رہا تھا۔ فلمی ہیرو اشوک کمار اور ساوک واچا اس کے مالکان تھے۔ مسلمان وہاں اہم عہدوں پر تھے، اس وجہ سے ہندوؤں میں دن بہ دن عداوت بڑھ رہی تھی۔ بمبے ٹاکیز کو کئی گمنام خطوط موصول ہوئے تھے جن میں دھمکی دی گئی تھی کہ واچا کو مار ڈالیں گے اور اسٹوڈیو کو آگ لگا دی جائے گی۔ میں نے اس تشکیک اور تشدد بھرے ماحول کی کچھ خاص پروا نہ کی۔ میں اور زیادہ پینے لگا۔ بہت سے ہندو ملازمین یہ سمجھنے لگے تھے کہ میری وجہ سے بمبے ٹاکیز پر مسلمانوں کی اجارہ داری ہے۔ شاہد، عصمت، کمال امروہوی، حسرت لکھنوی، نذیر اجمیری، غلام حیدر، میں — ہم سب بمبے ٹاکیز ہی میں تھے۔

ایک دن میں نے اشوک سے کہا، مجھے اب سبکدوش کر دو، دادا منی۔

— کیا مطلب؟

—میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے بمبے ٹاکیز تباہ ہو جائے۔

— کیا تم پاگل ہو گئے ہو، منٹو۔ دھیرج رکھو۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن یہ دیوانگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ ہر طرف آتش زدگی اور لوٹ مار، گلیوں میں خون خرابہ۔ ایک دن اشوک اور میں بمبے ٹاکیز سے اپنے گھر لوٹ رہے تھے، جب ہم اس کے گھر پہنچے تو مجھے خیال آیا کہ میں اپنے گھر کیسے پہنچوں گا۔

'چلو، میں تمھیں چھوڑ آؤں، منٹو،' اشوک نے کہا۔ 'جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'

شارٹ کٹ لینے کے لیے اشوک موٹر کو مسلمانوں کے محلے میں لے گیا۔ سامنے سے ایک بارات آ رہی تھی۔ 'دادامنی یہ تم کدھر آ نکلے؟' میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑا۔

—چپ رہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔

میں سچ مچ بہت گھبرا گیا۔ بھلا اشوک کو کون نہیں جانتا؟ اس جیسے مشہور ہندو کے قتل سے ان کے ہتھیار پاک ہو جاتے۔ جب موٹر بارات کے جلوس کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلّانا شروع کر دیا، 'اشوک کمار، اشوک کمار!' میرا خون جم گیا۔ لیکن اشوک بالکل خاموش تھا۔ میں موٹر کی کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال کر ہجوم سے یہ کہنے ہی والا تھا کہ، 'دیکھو میں ایک مسلمان ہوں اور اشوک مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، دو نوجوان موٹر کی کھڑکی کے پاس آئے اور بولے، 'ادھر راستہ بند ہے، اشوک بھائی، آپ باجو کی گلی سے نکل جایئے۔'

ہم اس راستے سے صحیح سلامت نکل آئے۔ 'تم خوانخواہ ڈر رہے تھے، منٹو۔' اشوک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'یہ لوگ بھی آرٹسٹوں سے پیار کرتے ہیں۔'

کیا واقعی؟ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ وہ جو دنگے کرتے ہیں اور گلیوں میں خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں، کیا ان کے لیے فن کی کوئی اہمیت ہوتی ہے؟ لاہور کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک دن کبیر نے ایک دکان دار کو دیکھا، جو بھگت سورداس کی کتاب سے ورق پھاڑ پھاڑ کر لفافے بنا رہا تھا۔ کبیرا اپنے آنسو نہ روک سکے۔ 'یہ تم نے کیا کیا؟' انھوں نے دکاندار سے پوچھا۔

— کیا تم دیکھ نہیں کہ ان کاغذوں پر بھگت سورداس کی کویتائیں لکھی ہیں؟ تم ان کے لفافے کیسے بنا سکتے ہو!

—سورداس؟ دکان دار ہنسا۔— جس کا نام سورداس ہو وہ کبھی بھگت نہیں ہو سکتا۔

— کیوں نہیں؟

—سور کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

—اس کا مطلب ہے ترنم۔ بھگوان کا نام بھی......

—جانتے نہیں سور کا مطلب سُور ہوتا ہے، یعنی خنزیر؟ دکان دار ہنسنے لگا۔

—تو تم اس کا یہ مطلب سمجھتے ہو؟

اور ایک دن کبیر نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیوی لکشمی کے بت کو بھوسے سے ڈھانپ رہے ہیں۔ انھوں نے بت کو صاف کرنا شروع کیا۔ کچھ لوگوں کا جتھا ان کے پاس آیا۔ 'یہ کیا کر رہے ہو تم؟'

— کیا مطلب؟

— کیا تم نہیں جانتے کہ بتوں کی پرستش ہمارے مذہب میں ممنوع ہے؟

—خوبصورتی کو داغدار کرنے کا مطالبہ تو کوئی مذہب نہیں کرتا؟ کبیر کی باتیں سن کر لوگ ہنسنے لگے۔ وہ لاہور میں گلیوں گلیوں گھومتے رہے اور روتے رہے۔ کیا آپ کو حیرت ہو رہی ہے، برادران! کہ کبیر کب لاہور گئے؟ میں نے ان کے بارے میں ایک کہانی لکھی تھی۔ 'دیکھ کبیرا رویا'۔— کبیر جہاں جی چاہے جا سکتے ہیں۔ اگر مرزا صاحب کی ان سے منیکر نکا گھاٹ پر ملاقات ہو سکتی ہے تو وہ لاہور کی گلیوں میں کیوں نہیں گھوم سکتے؟

یہ لاہور ہی تھا جہاں آخرکار مجھے واپس جانا تھا۔ جنوری انیس سو اڑتالیس میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر میں بمبئی سے کراچی جانے والے پانی کے جہاز میں جا بیٹھا۔ شاید میں خوفزدہ تھا۔ بزدل جو تھا۔ میں نے عصمت سے کہا، میرے ساتھ لاہور چلو، وہاں سے سارے ہندو ادھر ہندوستان آ رہے ہیں، تمھیں گھر مل جائے گا۔ چلو میرے ساتھ، عصمت، چلو لاہور میں سب نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔

عصمت راضی نہ ہوئی۔ اس نے صرف اتنا کہا، 'آپ محض اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں اس طرح چھوڑ کر چلے جائیں گے؟'

— میں اس ملک میں غیر ہوں، عصمت۔

— کس نے کہا آپ سے؟

— میں جانتا ہوں۔

— نہیں، آپ نہیں جانتے۔ آپ بزدل ہیں۔ اس لیے بھاگ رہے ہیں۔

میں اس کی آنکھیں دیکھ کر سمجھ گیا تھا، مرزا صاحب، کہ اس دن کے بعد سے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ مجھے ایک خط بھی نہ لکھے؟ یا میرے کسی خط کا جواب بھی نہ دے؟ کیا نفرت ساری یادوں کو مٹا دیتی ہے؟ شاید مٹا ہی دیتی ہے۔ ورنہ فسادات کے دوران نفرت صدیوں پرانی یادوں کو کیسے مٹا سکتی تھی؟

۴۱

وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے

ہاں، منٹو بھائی، اس کے بعد نسیان کی دھند میں جاگتے رہنے کا وقت آیا۔ دماغ اب کچھ نہیں سوچتا تھا، دل کے ساحلوں سے اب کوئی لہر آ کر نہیں ٹکراتی تھی۔ شاہجہاں آباد پر قابض ہو کر انگریزوں نے ایک مردہ شہر ہمیں تحفے میں دیا۔ جہاں ہر وقت ایک سرد آندھی چلتی رہتی تھی، جہاں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ سنی جا سکتی تھی، جہاں مردہ لوگوں کے منجمد خون سے گلیاں سیاہ ہو چکی تھیں۔ ہر دن نحوست زدہ تھا، میں جانتا تھا اب اس کی کوئی انتہا نہیں تھی، سب برباد ہو چکا تھا۔

محلّہ در محلّہ خالی ہو گیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا، جو جان بچا سکے وہ بھاگ گئے۔ ان کے گھروں میں رات کو روشنی نہیں کی جاتی تھی، نہ ہی دن میں ان کے ہاں چولہوں سے دھواں اٹھتا تھا۔ بات کرنے والا بھی کوئی نہیں بچا تھا۔ میں تو لوگوں سے بات کیے بغیر رہ نہیں پاتا تھا۔ اپنے دوستوں کے علاوہ پڑوسیوں کے ساتھ بھی میرے اچھے تعلقات تھے۔ مذاق اور لطیفے بازی کے بغیر مجھے گھٹن محسوس ہونے لگتی تھی۔ میں بھلا ایسی خاموشی کو کیسے برداشت کرتا؟ آخر میں نے اپنے قلم کے ساتھ ہی باتیں شروع کر دیں، اور میرا سایہ ہی میرا دوست بن گیا۔ میرے پاس دوستوں سے مکتوب نگاری کے ذرائع بھی نہ تھے۔ ڈاک کا نظام پوری طرح منہدم ہو چکا تھا۔ اخبار کی ترسیل بند تھی۔ فرانسیسی شراب بھی مہیا نہ تھی۔ میں ایک آدھ جام پیے بغیر سو نہیں پاتا تھا۔ ایک دوست کبھی کبھار رَم بھجوا دیا کرتا تھا، اسی سے گزارہ ہو رہا تھا۔

میری پنشن بند ہو چکی تھی، لیکن مجھے کتنے ہی لوگوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ امراؤ بیگم کے زیورات بکنا شروع ہو گئے۔ حتیٰ کہ بستر توشک اور کپڑے لتّے بھی بیچنا پڑ گئے۔ میں اپنے آپ سے ہنستے ہوئے کہتا، لوگ روٹی کھاتے ہیں، مرزا، اور تم کپڑے کھا رہے ہو۔ لیکن جب اپنے سارے کپڑے لتّے کھا چکو گے تو پھر کیا کرو گے؟ انگوٹھا چوسوں گا۔ اگر میری باقی ماندہ پنشن مل بھی جاتی تب بھی اس آئینے سے دھبّے دور نہ ہوتے۔ اور نہ ملنے پر اس آئینے کو چکنا چور ہونا ہی تھا۔ میں پہیلیاں نہیں بجھوا رہا، میرے بھائیو۔ یہ دل ایک آئینہ ہی تو ہے۔ میں ہر روز اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ دلّی چھوڑ کر جانے کا وقت آ گیا ہے، اور یہ کہ اب اور اس شہر میں گزر کرنا ممکن نہیں۔ پانی تک میسر نہیں تھا، ہمیں ناپ تول کر گھونٹ بھرنا پڑتے تھے۔ تصور کیجیے، منٹو بھائی، لگاتار دو دن ہمارے گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی۔

اس صورتِ حال میں بھی اگر ہم زندہ رہ سکے تو وہ تین چار لوگوں کی مدد کی بدولت۔ خدا نے مجھے ایک بیش قیمت سرمائے سے نواز رکھا تھا — یعنی انسانوں سے۔ کڑے وقت میں کوئی نہ کوئی ضرور میرے ساتھ آن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ہیرا سنگھ اور شو رام جی میرے بیٹوں جیسے شاگرد تھے — انھوں نے کئی طرح سے میری مدد کی۔ شو رام جی کے بیٹے بال مکند نے بھی میری مدد کی، اور ہرگوپال تفتہ، جب ممکن ہوا، حیدرآباد سے مجھے روپیہ بھیجتا رہا۔

جب ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میں چکرا کر رہ جاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں کسی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گیا ہوں، جس کی گلیوں میں خون جما ہوا ہے، کتنے ہی جانے پہچانے اور انجانے لوگوں کے بُریدہ سر میدان میں بکھرے ہوئے ہیں، وہ سب پلک جھپکائے بغیر میری جانب دیکھ رہے ہیں، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں، میں دیکھ سکتا ہوں کہ ان کے ہونٹ نفرت اور حقارت سے تھرتھرا رہے ہیں۔ بیشک وہ ایسی لاوارث لاشوں والی موت کے تو حق دار نہیں تھے، منٹو بھائی۔

جس کسی کا بھی بادشاہ سے تعلق تھا، وہ موت سے نہ بچ سکا۔ ان کے نزدیک سارے مسلمان غدار تھے۔ میں بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ ایک دن کرنل برن نے مجھے گرفتار کرنے کے لیے کچھ گورے سپاہی بھیجے۔ پٹیالہ کے مہاراجہ نریندر سنگھ شروع ہی سے

انگریزوں کے طرفدار تھے۔ محمود خان، مرتضیٰ خان اور غلام اللہ خان جیسے نامور لوگ بھی اسی محلے میں رہتے تھے جہاں میں رہتا تھا۔ ان سبھی کا تعلق پٹیالہ کے شاہی دربار سے تھا۔ انگریز کی رضامندی سے مہاراجہ نریندر سنگھ نے ہمارے محلے میں اپنے سپاہی تعینات کر دیے تھے، تا کہ ہم دانہ پانی کے حصول کے لیے قسمت آزمائی کر سکیں، لیکن ہمیں چاندنی چوک سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی، ورنہ جان کا خطرہ تھا۔ تو گورے سپاہی دیوار پھاند کر ہمارے محلے میں گھس آئے اور میرے گھر کو حصار میں لے لیا۔ میرے ساتھ ساتھ، باقر، حسین، کلّو اور دو ایک ہمسائیوں کو کرنل برن کے پاس لے جایا گیا۔ وہ چوک کے پاس قطب الدین کی حویلی میں تھا۔ یہ لوگ واقعی بڑے سادہ لوح تھے، گویا نوزائیدہ بچے ہوں۔ پہلا سوال جو ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا گیا، وہ تھا:

'کیا آپ مسلمان ہیں؟'

میں بھلا مذاق کا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتا؟ میں نے کہا، 'آدھا مسلمان ہوں، حضور۔'

— کیا مطلب؟

— شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔

کرنل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ — آپ کی حسِ مزاح خوب ہے۔

— ساٹھ برس کی ظرافت ہے، حضور۔ یہ کہتے ہوئے میں نے لندن سے آیا ہوا مکتوب ان کے جانب بڑھا دیا۔ یہ اس قصیدے کی رسید تھی جو میں نے برطانیہ کی ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں بھیجا تھا۔

— یہ کیا ہے؟

— ایک نظر دیکھ لیجیے، حضور۔

مکتوب پر ایک اُچٹتی سے نظر ڈال کر کرنل نے اسے میری جانب اچھال دیا۔ — ایسی فالتو چیزیں دیکھنے کی مجھے ضرورت نہیں۔

— جی، حضور۔

— دلّی میں امن قائم ہونے کے بعد آپ ہم سے آ کر ملے کیوں نہیں؟

— میں ملنا چاہتا تھا، حضور۔ لیکن میں اگر باہر نکلتا تو گولی مار دی جاتی۔

—غداروں کے ساتھ اور کیا سلوک کرنا چاہیے؟

—بجا فرماتے ہیں، حضور۔

—تو پھر آپ آئے کیوں نہیں؟

—حضور......

—میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیوں نہیں آئے؟

—میں ایک مرزا ہوں، جناب۔

—تو پھر؟

—پالکی کے بغیر میں کہیں نہیں جاتا۔ شہر میں کوئی پالکی نہیں ہے۔ میں کیسے آتا؟

—تو آپ لاٹ صاحب ہیں جو پالکی کے بغیر کہیں جا نہیں سکتے! کرنل برن چیخا۔ گیٹ آوٹ—میں آپ کو اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ قلعے کی دستاویزات میں آپ کا نام نہیں ہے— گیٹ آوٹ۔

تذلیل کرنے کا رجحان ان کے خون میں شامل تھا۔ وہ جتنا لوگوں کو ذلیل کرتے، اتنا ہی اپنی طاقت کے نشے میں چور ہوتے جاتے۔ کیا میں کرنل کے منھ پر پیشاب نہیں کر سکتا تھا؟ لیکن ہماری پیٹھ تو دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھی اور شاہجہاں آباد چھوڑ کر بھاگ جانے کے علاوہ ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اتنی تذلیل اور تشدد، حتیٰ کہ موت بھی، صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے؟ میں محض اس لیے مشتبہ تھا کیونکہ میں مسلمان تھا؟ جس علمِ سائنس کی وہ شیخی بگھارتے رہتے تھے وہ انھیں کس سے ملا تھا، منٹو بھائی؟ مسلمانوں ہی سے۔ کیا تاریخ کو یوں آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے؟ لیکن ہاں، مٹایا جا سکتا ہے، جیسا کہ میں نے خود دیکھا شاہجہاں آباد کو مٹا دیا گیا۔

معلوم ہے کسی کو مٹانے کے لیے سب سے پہلے کیا کرنا پڑتا ہے؟ اس پر مجرم کی چھاپ لگانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد کام آسان ہو جاتا ہے۔ ایک مصنوعی مقدمے کی سنوائی اور سزائے موت۔ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلا وطن کرنے سے پہلے انھوں نے اکیس دن مصنوعی سماعت کا ڈھونگ رچایا۔ اب سنیے کہ انھوں نے شہنشاہ کے اطاعت گزار جھجھر، بہادر گڑھ، ولبھ گڑھ، لوہارو، فرخ گڑھ، دجانہ اور پٹودی نوابین کے ساتھ کیا کیا۔ شاہجہاں آباد کے زوال کے چند دنوں کے اندر اندر دُجانہ اور پٹودی نوابین کے علاوہ، دوسرے تمام نوابین کو قلعے لا کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ جھجھر، ولبھ گڑھ، اور فرخ گڑھ کے نوابوں کو چاندنی چوک پر درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلح شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دلّی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

بیٹھے بیٹھے میں بس اتنا کر سکتا تھا کہ مرجانے والوں اور لاپتا ہو جانے والوں کی گنتی کرتا رہوں۔ ان میں کچھ میرے احباب اور رشتے دار تھے اور جنھیں میں جانتا تھا۔ میرے دوست فضلِ

حق کو عمر بھر کے لیے جلا وطن کر دیا گیا۔ شیفتہ سات برس تک قید میں رہے۔ دوسرے یا تو قتل کر دیے گئے یا فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف ان کے نام میری زندگی میں رہ گئے — مظفرالدولہ، امیر نصیرالدین، مرزا اسود بیگ، احمد مرزا، حکیم رضی الدین خاں، مصطفیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، حسین مرزا، میری مہدی، میر سرفراز حسین، میرن — اپنی شیطانی کوٹھری میں بیٹھا میں سیڑھیوں کو تکتا رہتا، وہ میر مہدی آ رہے ہیں، یہ یوسف مرزا ہی ہیں نا؟ لیجیے میرن بھی آ گئے۔ یوسف علی خاں بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ یا اللہ! کیا میں اتنے بہت سے دوستوں کی موت کا بوجھ برداشت کر پاؤں گا؟ میری موت پر تو ماتم کرنے والا بھی کوئی نہ بچا، منٹو بھائی۔

وہ جو ہر قدم پر قانون قانون پکارتے تھے، ان کا راج لاقانونیت میں بدل گیا۔ صرف، آپ کو — یعنی ہندوستان کے لوگوں کو — یہ کہنے کی اجازت نہیں تھی کہ گوروں نے قانون کو قبر میں دفن کر ڈالا ہے۔ وہ آپ کو وہ قانون بتائیں گے جس کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا اور وہ آپ کو ماننا پڑے گا۔ میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حافظ مموں ہمارے قریبی تعلق دار تھے۔ جب ان پر انگریزوں کے خلاف سازش کا الزام ثابت نہ ہو سکا تو ان کی ضبط شدہ جائیداد انھیں واپس لوٹائی جانی تھی۔ کمشنر نے مموں کو بلوا بھیجا۔

— حافظ محمد خاں کون ہے؟

— میں ہوں، حضور۔

— حافظ مموں کون ہے؟

— میں ہی ہوں، حضور۔

— کیا مطلب ہے تمھارا؟

— میرا نام حافظ محمد خاں ہے لیکن سب مجھے حافظ مموں کہہ کر بلاتے ہیں۔

— کیوں؟

— لوگوں کی مرضی، حضور۔

— میں کیسے مان لوں کہ یہ دونوں ایک ہی آدمی ہے؟

— حضور، میں کہہ تو رہا ہوں۔

— تو پھر میں کہہ رہا ہوں کہ تمھیں کچھ بھی واپس نہیں ملے گا۔

— لیکن کیوں، حضور؟

— تمھیں پہلے ثابت کرنا ہوگا کہ تم کون ہو۔

حافظ مموں کو خالی ہاتھ گھر لوٹنا پڑا۔ یہ تھی قانون کی حکمرانی۔

میں نے سنا کہ لاہور میں نقصان کا معاوضۂ تلافی دینے کے لیے ایک دفتر کھولا گیا ہے۔ باغی سپاہیوں نے جن کی جائیدادیں لوٹ لی تھیں وہ دس فی صد معاوضہ تلافی حاصل کر سکتے تھے۔ یعنی اگر آپ سے ایک ہزار روپے لوٹ لیے گئے ہیں تو آپ اس کے عوض سو روپے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن انگریز سپاہیوں نے جو کچھ لوٹا تھا اس کی کوئی تلافی نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کر آسانی کیا ہوتی؟ ہندوستان تو ان کے باپ کی جاگیر تھی — اسے لوٹنے پر وہ زرِ تلافی کیوں دیتے؟

میرا کسی کے ساتھ بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، منٹو بھائی۔ باقر اور حسین کبھی کبھی آ جاتے اور مجھ سے لپٹ جاتے۔ ہمیں یہ چاہیے، ہمیں وہ چاہیے۔ میرے پاس پیسے کہاں تھے۔ لیکن میں یہ بات انھیں نہ بتاتا۔ پریشان ہو کر ایک دن کلو کو محل سرا بھیجا۔ شاید امراؤ بیگم کے پاس فروخت کے لیے کوئی زیور موجود ہو۔

کلو تو نہیں لوٹا البتہ تھوڑی دیر بعد امراؤ میرے کمرے میں چلی آئیں اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔

— آپ کیوں آئی ہیں، بیگم؟

— میرے پاس بیچنے کے لیے اور کچھ نہیں۔

— یہ بات وہ سور کلو بھی آ کر بتا سکتا تھا۔ کہاں مر گیا وہ؟

— اس کا کوئی قصور نہیں، مرزا صاحب۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔

— بیٹھ جائیے۔ یوں کھڑے کھڑے کیا بات ہوگی۔

— معافی چاہتی ہوں، مرزا صاحب۔

— بات کیا ہے، بیگم۔

— میں بڑی کم عقل ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ......

—بات کیا ہے، بتایئے تو سہی۔ کیا کھانے کے لیے کچھ چُرا لیا ہے؟ میں ہنسا۔—ویسے ہمارے پاس آپ کے چُرانے کے لیے ہے بھی کیا؟ کچھ بھی نہیں سوائے تازہ ہوا کے۔

—مرزا صاحب......انھوں نے کچھ کہنے سے پہلے ہی رونا شروع کر دیا۔ یہ عورتیں اتنے سارے آنسو کہاں سے لاتی ہیں؟

—روؤ مت بیگم۔ فرنگیوں نے دیکھ لیا تو گولی مار دیں گے۔ وہ ہمارے ملک کو ریگستان بنا دینا چاہتے ہیں، اور تم آنکھوں میں اتنا پانی چھپائے بیٹھی ہو۔ اب بتاؤ، کیا بے وقوفی سرزد ہو گئی تم سے۔ تم مجھ سے بڑھ کر تو بے وقوف نہیں ہو سکتیں؟

—جب باغی آئے تو میں زیورات سے بھرا ہوا ایک صندوقچہ کالے صاحب کے ہاں رکھوا آئی تھی۔ وہ شہنشاہ کے استاد ہیں، میرا خیال تھا باغی ان کا گھر نہیں لوٹیں گے۔

—اچھا، تو گویا سب چلا گیا ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟

باغیوں نے تو کالے صاحب کا گھر نہیں لوٹا، منٹو بھائی، لیکن گورے سپاہی بادشاہ کے استاد کا گھر کہاں چھوڑنے والے تھے۔ امراؤ بیگم کی آخری پونجی بھی لٹ گئی۔ وہ روتے ہوئے بتاتی رہیں۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا: 'آپ ہمیشہ دین پر عمل کرتی رہی ہیں۔ کیا آپ اس عمل کی اہمیت کو نہیں سمجھتیں کہ خدا نے اب جا کر آپ کو فقیر کر دیا؟ اب ساری دنیا آپ کی ہے۔'

امراؤ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہیں۔

—خوشیاں منایئے، بیگم خوشیاں۔ زندگی سے آسائشیں جتنی کم ہوتی جاتی ہیں، آپ کے لیے خوشیوں کا دروازہ اتنا ہی کشادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

—ہم کھائیں گے کیا، مرزا صاحب؟

—غم۔ ہم غم کھا کر زندہ رہیں گے۔ یہ بدذات بس اسے ہی نہیں چھوئیں گے۔

—آپ کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مرزا صاحب۔

—میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، بیگم۔ یہ لوگ ہمیں دنیا سے مٹا دینے کے لیے ہندوستان آئے ہیں۔

میری بہت سی غزلیں قلعے میں اور لوہارو کے نواب ضیاء الدین خاں کے کتب خانے میں رکھی تھیں۔ میں جو بھی لکھتا تھا نواب ضیاء الدین اس کی نقل رکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس میری

تقریباً نو سو صفحات کی نثر اور دو ہزار سے زائد اشعار موجود تھے۔ وہ سب جلدیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مراکش کے چمڑے سے منڈھی ہوئیں، جن کی سطح پر سونے اور چاندی کے تاروں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے فرزند اور میرے شاگرد مرزا فخرالدین کے کتب خانے میں بھی میری غزلوں کا ایک نسخہ موجود تھا۔ میں اپنی چیزیں کبھی قاعدے قرینے سے نہیں رکھ پایا۔ اتنے برس روزی روٹی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے اور اس کے لیے ضروری چالیس چلتے گزر گئے۔ جب فرنگیوں نے ہمارے شہر کو لوٹنا شروع کیا تو انھوں نے کتب خانوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ متعدد نایاب کتابیں دنیا سے غائب ہو گئیں۔ ایک دن میں نے کسی بھکاری کو سڑک پر اپنی غزل گاتے سُنا؟ 'یہ غزل تمھیں کہاں سے ملی، میاں؟' میں نے اس سے پوچھا۔

—سڑک پر سے، حضور۔

—کیا تمھارے پاس وہ کاغذ ہے جس پر یہ تحریر تھی؟

اس نے اپنے چوغے کی جیب سے ایک کٹا پھٹا کاغذ نکال کر مجھے تھما دیا۔ ہاں، وہ میری ہی غزل تھی۔ قلعے میں موجود قلمی نسخے کا ایک ورق۔ میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، میرے بھائیو۔

—کیا ہوا، حضور؟

—کیا تم یہ کاغذ مجھے دے سکتے ہو؟

—ضرور۔ میں اس کا کیا کروں گا؟

—اب تم گاؤ گے کیسے؟

بھکاری مسکرا دیا۔ 'میں نے اسے دل کی کتاب میں نقل کر لیا ہے۔ حضور۔'

ہر گزرتے دن کے ساتھ میری کتابِ دل کے اوراق پُرزے پُرزے ہو کر ہوا میں اڑتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کے آگے میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتا۔ آپ بہت سے لوگوں کے ساتھ خوشگوار باتیں کر سکتے ہیں، ہنسی مذاق بھی کر سکتے ہیں، پھر بھی ہم کوئی ایسا شخص چاہتے ہیں جو ہمارا ہم ذوق اور ہم مزاج ہو۔ مجھے بھی دو ایک ایسے لوگوں کی طلب تھی جن کے ساتھ میں شاعری اور تخیلات کی بابت گفتگو کر سکوں۔ ایسے لوگوں کا ساتھ نہ ملے تو سرسبز باغ بھی مرجھا جایا کرتے ہیں۔ دلّی اب محض فوجیوں، انگریزوں اور پنجابیوں اور ہندوؤں کا شہر

تھا۔ کہاں چلے گئے وہ لوگ جو میری تہذیب کے نمائندے تھے۔ ذوق نہیں، مومن خاں نہیں، نظام الدین ممنون کہاں چلے گئے؟ شاعروں میں صرف میں اور آزردہ ہی حیات تھے۔ آزردہ بالکل چپ ہو چکے تھے اور میں تحیر میں تھا۔ اب کوئی غزلیں نہیں کہتا تھا اور نہ ہی شاعری کی بات کرتا تھا۔ دنیا میں کبھی کبھی ایسا بدنصیبی کا وقت بھی آتا ہے، منو بھائی، جب شاعری مرجاتی ہے۔ میں گویا بے خوابی کے عالم میں شاعری کی لحد پر بیٹھا گھڑیاں گن رہا تھا۔ کب موت آئے گی اور مجھے اس دنیادارانہ زندگی سے دور لے جائے گی، اس وقت کے انتظار کے سوا میں اور کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔

ساری راتیں جاگتے ہوئے کٹتی تھیں۔ ایک دن میں نے دیکھا ایک سایہ سا میری کوٹھری میں کھڑا ہے۔ کون تھا وہ؟ یہ میری کوٹھری میں کیسے چلا آیا؟ اس دراز قد آدمی کو دیکھ کر میرا حلق خشک ہو گیا۔ 'کون ہو تم؟' میں نے پوچھا۔ 'کہاں سے آئے ہو؟'

—میں جلال الدین رومی ہوں، حضور۔

—مولانا روم! میں ان کے قدموں میں گر پڑا۔—تو کیا یوم حشر آ پہنچا؟

—نہیں، حضور۔

—آپ مجھے حضور کیوں کہہ رہے ہیں؟ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں، مولانا۔

—ہم بھی حضور ہیں، مرزا۔ حضور نے فرمایا ہے بس گھاس بن کر رہنے میں ہی خوشی ہے۔ موسم آئیں گے اور جائیں گے، پتے جھڑیں گے اور پھر سے نکلیں گے، صرف گھاس ہی میدان پر بچ رہے گی۔ صرف گھاس ہی جانتی ہے کہ کس طرح مرکز سے اطراف کے جانب پھیلتا ہے۔

—میرے لیے کیا حکم ہے، مولانا، فرمایئے؟

مولانا میری جانب رُخ کر کے بیٹھ گئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

—میں تمھیں ایک قصہ سنانے آیا ہوں، مرزا۔

—میرا تو آج نیا جنم ہو گیا، مولانا۔ آپ کے منھ سے قصہ سننے کی سعادت کتنوں کو نصیب ہوئی ہوگی؟

—میرا بھی نیا جنم ہوا ہے، حضور۔ خدا نے مجھے یہ موقع عطا کیا کہ میں ہندوستان کے سب سے اعلیٰ شاعر کو قصہ سناؤں۔

—آپ کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے؟

—ہم سب آسمان میں بکھرے ہوئے ستارے ہیں۔ کون کتنی دور ہے، خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ کچھ مر چکے ہیں تو کچھ حیات ہیں۔ پھر بھی خدا کے فضل و کرم سے ہمارے مابین مکالمہ قائم ہے۔ ایک شام رسول اللہ کسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ ان کے صحابی اور آس پاس علاقوں کے کچھ لوگ انھیں گھیرے ہوئے تھے۔ غروب آفتاب کا وقت تھا اور آسمان پر گلابی اور نیلا رنگ آپس میں گھل مل رہے تھے۔ اچانک زُحل اٹھ کھڑا ہوا اور چلّا کر بولا، 'اے محمد، تمھارے جدِ امجد ہاشم جیسا بُرا اور خراب آدمی اور کوئی نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد نے بھی وحشت انگیز جانشین پیدا کیے۔'

حضور اکرمؐ کے سب سے قریبی رفیق حضرت علیؓ نے فوراً اپنی تلوار میان سے نکال لی۔ حضورؐ نے نہایت نرمی سے فرمایا، 'زُحل، تم ٹھیک کہتے ہو۔' علیؓ وہیں رُک گئے، وہ زُحل کا سر اُڑانے ہی والے تھے۔

کچھ دیر بعد حضرت ابوبکرؓ نے دوزانو ہو کر عرض کی، 'اے نبی، زُحل کو معاف فرما دیجیے۔ آپؐ کے جدِ امجد ہاشم جیسا جری اور خوب رو کوئی نہیں تھا۔ آپ بھی ایسے ہی ہیں۔'

حضورؐ نے مسکرا کر ابوبکرؓ کی جانب دیکھا، 'تم ٹھیک کہتے ہو، ابوبکر۔'

ایک لمبی خاموشی چھا گئی۔ یکا یک حضرت علیؓ نے احتجاجی لہجے میں کہنا شروع کیا، 'یارسول اللہ، یہ دو لوگ دو مختلف باتیں کہہ رہے ہیں، آپ فرماتے ہیں دونوں درست ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟'

حضورؐ حضرت علیؓ کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔—تم بھی درست ہو علیؓ۔

—میں بھی درست ہوں۔

—ہاں۔ میں تو ایک آئینہ ہوں، علی۔ اللہ کب سے مجھے اُجال رہا ہے۔ میرے آئینے میں سب اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ اگر تم دنیا کو نیلے شیشے سے دیکھو گے تو دنیا نیلی نظر آئے گی، اگر سرخ سے دیکھو گے تو سرخ۔ انسان جو بھی دیکھتا ہے وہ اس کا اپنا ہی عکس ہوتا ہے۔

—تو کیا دنیا میں سچائی نام کی کوئی شے نہیں؟

—تم سچ کو پانا چاہتے ہو؟

—جی ہاں۔

—تو پھر اپنے آپ کو ہر طرح کے جوش اور جذبات سے آزاد کر دو، علی۔ اپنے اندر کے آئینے کو اجالتے رہو، یہاں تک کہ سارے رنگ مٹ جائیں اور آئینہ شفاف ہو جائے۔ تبھی تم اسے دیکھ پاؤ گے، علی۔

— کس کو دیکھ پائیں گے، مولانا؟ میں جلال الدین رومؔی کے پیروں سے چمٹ گیا۔

—پاؤں چھوڑ دو، مرزا۔ تم بجھتے جا رہے ہو......تم تحقیق کی گہرائی میں ضم ہوتے جا رہے ہو—اس سے بڑی خوشی اور سچائی اور کوئی نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تم ایک بلّی کی طرح اس دنیا سے جاؤ۔

— کیوں؟

—بلّی اپنی موت کی ساعت کو محسوس کر لیتی ہے اور خود کو الگ تھلگ کر لیتی ہے۔ وہ کسی کو تنگ نہیں کرتی، کسی کی ہمدردی نہیں چاہتی۔ وہ اکیلے ہی موت کا سامنا کرتی ہے۔ تنہائی ہی سب بڑا سچ ہے، مرزا۔ تم افسردہ کیوں ہو؟ سیاہ روزن ایک دن ہر شے کو نگل لے گا۔ تم اس دنیا میں آئے ہو، تم اسے چھوڑ جاؤ گے......کتنا آسان سفر ہے، جیسے اُڑتا ہوا پَر......یہی خوشی تنہائیوں میں تمھاری ساتھی ہوگی۔

۴۲

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

برادران، میں کوئی مؤرخ نہیں، اس لیے نہیں بتا سکتا کہ تقسیم کی وجہ سے کتنے لاکھ افراد بے گھر ہوئے، کتنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاپتا ہوئے، کتنی عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی، 'ہر ہر مہادیو' یا 'اللہ اکبر' کی دھاڑوں کے ساتھ کتنے لوگ قتل کیے گئے۔ میرے پاس تو محض چند کہانیاں ہیں، میں آپ کو بس وہ کہانیاں ہی سنا سکتا ہوں۔ لیکن تاریخ محض اعداد و شمار کا مجموعہ نہیں ہوتی، لوگوں کی زبان پر چڑھی کہانیاں اور گیت بھی تاریخ کی ایک بڑی تصویر بناتے ہیں۔ مجھے دلّی کے ایک دوست نے بتایا کہ وہاں بیس ہزار مسلمانوں کا قتل کیا گیا، پرانی دلّی میں چالیس ہزار سے زائد مسلمانوں کے مکانات اور جائیدادوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ لیکن میں ان اعداد و شمار کا کیا کروں؟ جس طرح شریفن اور وملا جیسی نوعمر لڑکیوں کی زندگیاں فنا ہوئیں، کیا ان کا مداوا ممکن ہے؟ لیکن سہائے جیسے لوگوں کو ایسے ہی مرنا چاہیے تھا، جیسے کہ وہ مرے۔ کسی کتے کی طرح؟ اور میں اس بڑھیا کو کیسے بھول جاؤں جو اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو گئی اور سڑک پر ہی دم توڑ گئی۔ رام کھلاون جیسے بھلے آدمی نے کس حیوانیت کے جنون میں میرا خون کرنا چاہا تھا؟ ہم میں سے وہ لوگ جو فسادات کا شکار نہیں ہوئے، ایسی ہی تاریخ کو ڈھوئے پھر رہے ہیں، وہ تاریخ جو محفوظ کی گئی دستاویز میں نہیں بلکہ سڑکوں پر پائی جاتی ہے۔ اس تاریخ میں تو بہ ٹیک سنگھ ہندوستان اور

---

۱ مصنف نے یہ نام حیدر لکھا ہے (مترجم)

پاکستان کے بیچوں بیچ زمین کے ایک بے نام ٹکڑے پر پڑا ہے۔ یہ لوگ، مرزا صاحب، یہ لوگ ہی ہمارے جلاوطنی کے دنوں کی جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ شریفن کے بارے میں جاننے کے بعد کیا کوئی اسے بھول سکتا ہے؟ دلّی میں کتنے مسلمان قتل کیے گئے، الگ الگ مؤرخ اس کے الگ الگ اعداد و شمار بتائیں گے، وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جب سراج الدین اپنی بیٹی سکینہ کی لاش کو تھام کر چیخا تھا، 'میری بیٹی زندہ ہے، حضور میری بیٹی زندہ ہے،' اس گھڑی کو کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ جب تک یہ کائنات رہے گی، یہ زخم بھی رہے گا، جس طرح نازی کیمپ اور گلاگ کے بڑے قتلِ عام کو کبھی محو نہیں کیا جا سکتا۔

بٹوارہ ہماری زندگیوں میں قتل کا ایک ڈراؤنا جشن بن گیا، مرزا صاحب، انسان نے محض دوسرے انسان کا قتل نہیں کیا، اس نے باہمی اتحاد، محبت اور انحصار کے جذبے کا بھی قتل کر دیا۔ ایک خاندان فسادیوں سے کسی نہ کسی طرح بچ کر جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ دو بیٹیوں میں جو بڑی تھی وہ کہیں نہ ملی تھی۔ ماں نے چھوٹی بیٹی کو بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔ فسادی گھر سے ان کی بھینس کھول کر لے گئے تھے۔ ایک گائے پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس کا بچھڑا کھو چکا تھا۔ اس لیے وہ میاں بیوی رات کو گائے کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ چھوٹی لڑکی بار بار ڈر کر رونے لگتی۔ اس کی خوفزدہ ماں اپنا ہاتھ اس کے منھ پر رکھ دیتی۔ اچانک ذرا فاصلے سے کسی بچھڑے کی آواز سنائی دی۔ گائے فوراً مضطرب ہو کر ڈکرانے لگی، اس نے آواز کو پہچان لیا تھا، یہ اسی کا بچھڑا تھا۔ میاں بیوی کسی طرح گائے کو خاموش نہ کر پا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے دیکھا کہ مشعلوں کی ایک قطار بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ بیوی نے غصّے اور مایوسی کے ساتھ شوہر سے کہا، 'آخر جانور کو کیوں ساتھ لے آئے؟' فسادات کے شعلوں نے اسی طرح ہماری ساری حساسیت کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔

مرزا صاحب، مجھے بار بار یاد آتا ہے، کوئی کہیں کسی دیوانے کی مانند بڑبڑاتا ہوا چلا جا رہا ہے:

میں نے ایک آدمی کا قتل کیا ہے
اس کے خون سے بھر گیا ہے میرا بدن

دنیا کی راہ پر
اس مارے گئے بھائی کا بھائی ہوں میں
مجھے چھوٹا جان کر
اس نے اپنے دل کو سخت کر لیا اور وہ مارا گیا
میں نے خون کی ندی کی لہر سے ڈر کر
اپنے سراسیمہ بڑے بھائی کا قتل کر دیا
اور اب میں سوتا ہوں جب
اس کے غیر مادّی سینے پر چہرہ رکھ کر
یوں لگتا ہے کہ وہ جس نے ایک محبت بھرا عہد کیا تھا
سب کو روشنی بانٹنے کا
آگے بڑھ گیا لیکن
کہیں روشنی نہ پا کر — سویا ہوا ہے
سو رہا ہے
اگر میں اسے آواز دوں
وہ کسی لہر کی طرح خون کی ندی سے اٹھے گا
اور کہے گا، پاس آ کر
میں ہوں یاسین، حنیف، محمد، مقبول، عزیز......
اور تم؟
میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر
وہ آنکھیں اٹھائے گا
اپنے مردہ چہرے سے
خون کے جھاگ بھرے دریا سے وہ کہے گا
بھگن، ووپن، ششی......

پاتھر گھاٹا سے، شیام بازار، گلف اسٹریٹ

ہگلی......[1]

ہاں، کوئی نہیں ہے، کچھ نہیں ہے — سورج بجھ گیا ہے۔ یہ پھر کبھی روشن نہ ہوگا۔ ایسے ہی ایک دن قاسم لنگڑاتے ہوئے اپنے گھر پہنچا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں گولی لگی تھی، جو خون سے سَنی ہوئی تھی۔ جوں ہی اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، سیاہی مائل خون کا ایک پردہ سا اس کی آنکھوں کے آگے جھول گیا۔ جمے ہوئے خون کے تالاب میں اس کی بیوی کی لاش پڑی تھی۔ قاسم کچھ دیر تک ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہا، پھر اس نے لکڑیاں پھاڑنے والا گنڈاسا اُٹھالیا۔ اب خون کا بدلہ خون سے لینے کا وقت تھا۔ اب وہ بھی سڑکوں پر، بازاروں میں خون کی ندیاں بہائے گا۔ قریب تھا کہ وہ باہر نکل جائے دفعتاً اُسے شریفن کا خیال آیا — اس کی بیٹی شریفن کہاں تھی؟ 'شریفن! شریفن......' قاسم نے چیخ چیخ کر پکارا۔

کوئی جواب نہ آیا۔ ہوسکتا ہے وہ ڈر کر کہیں چھپ گئی ہو۔ دالان کے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر قاسم نے سرگوشی کی، 'شریفن...... بیٹی...... میں آگیا ہوں۔'

لیکن اندر کسی سنسان غار کی سی خاموشی تھی۔ قاسم نے جوں ہی دروازہ کھولا اور دالان میں قدم رکھا وہ سکتے میں آگیا۔ تھوڑے فاصلے پر شریفن مُردہ پڑی تھی، بالکل ننگی۔ جیسے کسی پھول کو نوچ کر پھینک دیا گیا ہو۔ قاسم پھٹ پڑنا چاہتا تھا، لیکن وہ محض ہونٹوں کو بھینچے وہاں کھڑا رہا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر وہ فریاد کر اٹھا، 'شریفن...... میری بیٹی......' اندھوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اس نے کچھ کپڑے ڈھونڈے اور اُسے ڈھک دیا۔ اس کے بعد اس نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اپنی بیوی کی لاش کے پاس بھی نہیں ٹھہرا۔ شاید اس کی آنکھوں میں صرف شریفن کی ننگی لاش تھی۔ قاسم گنڈاسا اٹھا کر گھر سے نکل پڑا۔

قاسم کسی آتش فشاں سے بہتے لاوے کی طرح دوڑتا جارہا تھا۔ چوک کے پاس اس کی مڈھ بھیڑ ایک سکھ کے ساتھ ہوئی، اور یکدم اس نے اپنا گنڈاسا چلادیا۔ وہ آدمی تیز طوفان میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آرہا۔ قاسم گنڈاسا لہراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ تین

[1] جیبانند داس کی بنگالی نظم ۴۷-۱۹۴۶ کا ایک ٹکڑا

اور لاشیں قاسم کے گنڈاسے نے زمین پر بچھا دیں۔ اُسے بس شریفن کا ننگا بدن دکھائی دے رہا تھا، اس کے اندر بارود کا ڈھیر تڑتڑاتا ہوا جل رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک خالی بازاروں کو طے کرتا ہوا وہ ایک گلی میں داخل ہوا۔ لیکن وہاں سب مسلمانوں کے گھر تھے۔ اس نے دوسرے راستے کا رُخ کیا۔ اس کے منہ سے ہندوؤں کے لیے گالیوں کی بوچھار ہورہی تھی اور خون سے سَنا ہوا گنڈاسا اس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔

قاسم نے ایک مکان کے دروازے پر ہندی میں کوئی نام لکھا دیکھا تو رُک گیا۔ اس نے دروازے پر اپنے گنڈاسے سے وار کرنا شروع کردیے۔ دروازہ ٹوٹ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی قاسم گالیاں بکنے لگا، 'باہر نکلو، حرام زادو، جہاں بھی چھپے ہو، نکلو۔'

جوں ہی اس نے دھکا دے کر دروازہ کھولا، اس کا سامنا ایک لڑکی سے ہوا، شریفن ہی کی ہم عمر، معصوم اور کمسن لڑکی۔ 'کون ہو تم؟' قاسم نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

— وملا۔ اس کی آواز کونپلوں کی طرح کانپ رہی تھی۔

— ہندو کتیا......

قاسم کچھ دیر کھڑا ساکت آنکھوں سے چودہ پندرہ سال کی اُس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ اپنا گنڈاسا نیچے رکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس لڑکی کو دبوچ لیا اور دھکیل کر اندر دالان میں لے گیا۔ پھر اس نے دیوانہ وار اس کے کپڑے نوچنے شروع کیے۔ وقت تھم چکا تھا، مرزا صاحب۔ لڑکی کو پوری طرح ننگا کرکے، قاسم نے اس کا گلا دبا کر اُسے مار ڈالا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ہو بہو شریفن — جیسے شریفن ہی وہاں پڑی ہوئی تھی۔ قاسم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اتنی دیر سے اس کے اندر آگ دہک رہی تھی — اب وہاں برف جم چکی تھی۔ آتش فشاں سے بہنے والا لاوا ٹھنڈی چٹان بن چکا تھا۔ قاسم میں ہلنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک شخص تلوار لہراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا ایک آدمی آنکھیں بند کیے لرزتے ہاتھوں سے فرش پر پڑی ہوئی چیز پر کمبل ڈال رہا ہے۔ 'کون ہو تم؟' اس نے گرج کر پوچھا۔ قاسم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

— قاسم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

قاسم نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے کمبل کی طرف اشارہ کیا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا، شریفن —'

قتل کرنے والوں میں سے کتنے لوگ اس طرح پاگل ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی قاتل نہیں تھا، مرزا صاحب۔ اس لیے وہ ایسے گناہ کو ساری زندگی یوں سفا کی کے ساتھ نہیں جھیل سکتے تھے۔ یہ ہنر تو بس سیاست دانوں کے لیے خاص ہے کہ جو اپنے اقتدار کے علاوہ کسی شے سے محبت نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے عزیزوں کا لہو بھی اپنے ہاتھوں سے دھو سکتے ہیں۔ لیکن قاسم جیسے لوگوں کے لیے شریفن اور وملا میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اور یہ صرف اپنے گھر یا ملک سے متعلق نہیں ہے، لوگ اس طرح اپنے رشتوں سے بھی بے دخل ہو جاتے ہیں، وہ خلا سے گرنے والے شہاب ثاقب کی طرح بن جاتے ہیں، جو اتنے بے خود ہو جاتے ہیں کہ خود کو بھی نہیں بچا سکتے۔ میں نے انسانوں کا خون کیا ہے — میرا بدن ان کے لہو میں تر بہ تر ہے۔ میں ایک قتل گاہ ہوں۔

میری یادوں کی قتل گاہ میں وہ ماں گھوم رہی ہے جو اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو چکی ہے، اور پھر ایک دن سڑک پر مر جاتی ہے۔ میں تب پاکستان میں تھا، مرزا صاحب۔ سرحد کے اُس پار سے مسلمان ابھی تک اس پار آ رہے تھے، ہندو پاکستان چھوڑ کر جا رہے تھے۔ مہاجرین کے کیمپ گویا بھیڑ بکریوں کے باڑے تھے۔ کھانا نہیں تھا، علاج کی سہولت نہیں تھی۔ لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے تھے۔ سرحد پار کرتے ہوئے جو عورتیں اور بچے فرار ہو گئے تھے — درحقیقت جنھیں اغوا کیا گیا تھا، ان کے بچاؤ کے لیے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ اس کام میں رضا کارانہ طور پر شریک ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں امید جاگ اٹھی تھی، شاید ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ یقیناً خدا انسانوں کو پوری طرح حیوان نہیں بننے دے گا۔ رضا کاروں کے پاس سنانے کو بہت سی کہانیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے بتایا سہارن پور کی دو لڑکیاں اپنے والدین کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی تھیں۔ واپس جاتے ہوئے کتنی ہی جوان عورتوں نے شرم اور اپنے آپ سے نفرت کے باعث خودکشی کر لی۔ بہت سی طویل مدت تک دی جانے والی اذیتوں کے باعث نشے کی عادی بن گئیں۔ پیاس لگتی تو وہ پانی کے بجائے شراب

مانگتیں، اور جب شراب نہ ملتی تو مغلظات بکنے لگتیں۔

میں جب ان اغوا کی گئی لڑکیوں کے بارے میں سوچتا، مرزا صاحب، تو مجھے صرف ان کے پھولے ہوئے پیٹ نظر آتے۔ جو ان کے پیٹ میں ہیں، اُن کا کیا ہوگا؟ انھیں کون قبول کرے گا — ہندوستان یا پاکستان؟ اور نو مہینے تک انھیں پیٹ میں پالنے کی قیمت کون سا ملک ادا کرے گا؟ یا اس کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے؟ کیا ہمیں یہ سب فطرت پر چھوڑ دینا چاہیے؟

گمشدہ مسلمان لڑکیاں سرحد کے اس پار سے اس پار آ رہی تھیں، لاپتا ہندو لڑکیاں اس طرف سے اُس طرف جا رہی تھیں۔ سرکاری طور پر انھیں 'مفرور' کہا گیا۔ لیکن درحقیقت مفرور کوئی بھی نہیں تھا۔ انھیں اغوا کیا گیا تھا اور پھر ان کی آبرو ریزی کی گئی تھی، کوئی سکتے میں تھی، کوئی پاگل ہو چکی تھی، اور کوئی اپنا سارا ماضی بھول چکی تھی۔

ایک رضا کار نے مجھے اُس ماں کی کہانی سنائی تھی۔

— ہمیں کئی بار سرحد پار جانا پڑتا تھا، منٹو صاحب۔ میں ہر بار ایک مسلمان بڑھیا کو دیکھتا۔ پہلی بار میں نے اسے جالندھر میں دیکھا۔ وہ ایک پھٹی پرانی ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کے بال دھول مٹی سے اَٹے ہوئے تھے۔ وہ مسلسل کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

— کس کو ڈھونڈ رہی تھی؟

— اپنی بیٹی کو۔ وہ پٹیالہ کی رہنے والی تھی۔ اس نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا، لیکن وہ کہیں نہ مل سکی۔ ہو سکتا ہے اسے قتل کر دیا گیا ہو۔ لیکن وہ بڑھیا اس امکان کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ دوسری مرتبہ میں نے اسے سہارن پور میں دیکھا۔ وہ اور بھی پژمردہ دکھائی دے رہی تھی، بال مزید اُلجھ چکے تھے، اب ان میں جٹائیں پڑ چکی تھیں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اُسے اپنی بیٹی کی تلاش چھوڑ دینی چاہیے، انھوں نے اسے مار ڈالا ہے۔ 'مار ڈالا ہے؟' بڑھیا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ 'کبھی نہیں، اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ میری بیٹی کو کوئی نہیں مار سکتا۔'

— پھر؟

— تیسری بار جب اُسے دیکھا تو وہ چیتھڑوں میں تھی، تقریباً برہنہ۔ میں نے اسے کپڑے خرید کر دینے چاہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا یقین

— قاسم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

قاسم نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے کمبل کی طرف اشارہ کیا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا: 'شریفن......'

قتل کرنے والوں میں سے کتنے لوگ اس طرح پاگل ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی قاتل نہیں تھا، مرزا صاحب۔ اس لیے وہ ایسے گناہ کو ساری زندگی یوں سفاکی کے ساتھ نہیں جھیل سکتے تھے۔ یہ ہنر تو بس سیاست دانوں کے لیے خاص ہے کہ جو اپنے اقتدار کے علاوہ کسی شے سے محبت نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے عزیزوں کا لہو بھی اپنے ہاتھوں سے دھو سکتے ہیں۔ لیکن قاسم جیسے لوگوں کے لیے شریفن اور وملا میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اور یہ صرف اپنے گھر یا ملک سے متعلق نہیں ہے، لوگ اس طرح اپنے رشتوں سے بھی بے دخل ہو جاتے ہیں، وہ خلا سے گرنے والے شہاب ثاقب کی طرح بن جاتے ہیں، جو اتنے بے خود ہو جاتے ہیں کہ خود کو بھی نہیں بچا سکتے۔ میں نے انسانوں کا خون کیا ہے — میرا بدن ان کے لہو میں تر بہ تر ہے۔ میں ایک قتل گاہ ہوں۔

میری یادوں کی قتل گاہ میں وہ ماں گھوم رہی ہے جو اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو چکی ہے، اور پھر ایک دن سڑک پر مر جاتی ہے۔ میں تب پاکستان میں تھا، مرزا صاحب۔ سرحد کے اُس پار سے مسلمان ابھی تک اِس پار آ رہے تھے، ہندو پاکستان چھوڑ کر جا رہے تھے۔ مہاجرین کے کیمپ گویا بھیڑ بکریوں کے باڑے تھے۔ کھانا نہیں تھا، علاج کی سہولت نہیں تھی۔ لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے تھے۔ سرحد پار کرتے ہوئے جو عورتیں اور بچے فرار ہو گئے تھے — در حقیقت جنھیں اغوا کیا گیا تھا، ان کے بچاؤ کے لیے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ اس کام میں رضا کارانہ طور پر شریک ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں امید جاگ اٹھی تھی، شاید ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ یقیناً خدا انسانوں کو پوری طرح حیوان نہیں بننے دے گا۔ رضا کاروں کے پاس سنانے کو بہت سی کہانیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے بتایا سہارن پور کی دو لڑکیاں اپنے والدین کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی تھیں۔ واپس جاتے ہوئے کتنی ہی جوان عورتوں نے شرم اور اپنے آپ سے نفرت کے باعث خودکشی کر لی۔ بہت سی طویل مدت تک دی جانے والی اذیتوں کے باعث نشے کی عادی بن گئیں۔ پیاس لگتی تو وہ پانی کے بجائے شراب

مانگتیں، اور جب شراب نہ ملتی تو مغلظات بکنے لگتیں۔

میں جب ان اغوا کی گئی لڑکیوں کے بارے میں سوچتا، مرزا صاحب، تو مجھے صرف ان کے پھولے ہوئے پیٹ نظر آتے۔ جو اِن کے پیٹ میں ہیں، اُن کا کیا ہوگا؟ انھیں کون قبول کرے گا — ہندوستان یا پاکستان؟ اور نو مہینے تک انھیں پیٹ میں پالنے کی قیمت کون سا ملک ادا کرے گا؟ یا اس کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے؟ کیا ہمیں یہ سب فطرت پر چھوڑ دینا چاہیے؟

گمشدہ مسلمان لڑکیاں سرحد کے اس پار سے اِس پار آ رہی تھیں، لاپتا ہندو لڑکیاں اس طرف سے اُس طرف جا رہی تھیں۔ سرکاری طور پر انھیں 'مفرور' کہا گیا۔ لیکن در حقیقت مفرور کوئی بھی نہیں تھا۔ انھیں اغوا کیا گیا تھا اور پھر ان کی آبرو ریزی کی گئی تھی، کوئی سکتے میں تھی، کوئی پاگل ہو چکی تھی، اور کوئی اپنا سارا ماضی بھول چکی تھی۔

ایک رضا کار نے مجھے اُس ماں کی کہانی سنائی تھی۔

— ہمیں کئی بار سرحد پار جانا پڑا تھا، منٹو صاحب۔ میں ہر بار ایک مسلمان بڑھیا کو دیکھتا۔ پہلی بار میں نے اسے جالندھر میں دیکھا۔ وہ ایک پھٹی پرانی ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کے بال دھول مٹی سے اَٹے ہوئے تھے۔ وہ مسلسل کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

— کس کو ڈھونڈ رہی تھی؟

— اپنی بیٹی کو۔ وہ پٹیالہ کی رہنے والی تھی۔ اس نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا، لیکن وہ کہیں نہ مل سکی۔ ہو سکتا ہے اسے قتل کر دیا گیا ہو۔ لیکن وہ بڑھیا اس امکان کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ دوسری مرتبہ میں نے اسے سہارن پور میں دیکھا۔ وہ اور بھی پژمردہ دکھائی دے رہی تھی، بال مزید اُلجھ چکے تھے، اب ان میں جوئیں پڑ چکی تھیں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اُسے اپنی بیٹی کی تلاش چھوڑ دینی چاہیے، انھوں نے اسے مار ڈالا ہے۔ 'مار ڈالا ہے؟' بڑھیا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا: 'کبھی نہیں، اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ میری بیٹی کو کوئی نہیں مار سکتا۔'

— پھر؟

— تیسری بار جب اُسے دیکھا تو وہ چیتھڑوں میں تھی، تقریباً برہنہ۔ میں نے اسے کپڑے خرید کر دینے چاہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا یقین

کرو۔ تمھاری بیٹی کو پٹیالہ میں قتل کر دیا گیا ہے۔' کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟' بڑھیا بڑبڑائی۔

—میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم نے اپنی بیٹی کے لیے بہت آنسو بہا لیے۔ چلو میں تمھیں پاکستان لے چلوں۔

— نہیں......نہیں......میری بیٹی کو کوئی نہیں مار سکتا۔

— کیوں؟

بڑھیا کی آواز شبنمی سی ہوگئی۔—جانتے نہیں وہ کتنی خوبصورت ہے! اتنی خوبصورت کہ اسے کوئی بھی نہیں مارے گا۔ اُسے تو وہ طمانچہ بھی نہ ماریں گے۔

— کتنی حیرت کی بات ہے۔

—میں بھی حیران رہ گیا، منٹو صاحب۔ زندگی میں اتنی چوٹیں کھایا ہوا انسان بھی یقین کرسکتا ہے کہ خوبصورتی کو کوئی قتل نہیں کرسکتا؟

—مار کھایا ہوا انسان ہی اس پر یقین کرسکتا ہے، بھائی۔ مار کھاتے کھاتے اس کا آخری سہارا ذرا سی خوبصورتی ہی تو رہ جاتی ہے۔ خیر، پھر کیا ہوا؟

جتنی بار بھی سرحد کے اُس پار گیا، میں نے اُس بڑھیا کو دیکھا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ بمشکل دیکھ پاتی تھی لیکن اس کی تلاش جاری تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا یہ یقین اور مستحکم ہوتا چلا گیا کہ اس کی بیٹی کو کوئی قتل نہیں کرسکتا۔ وہ اسے ایک دن ضرور ڈھونڈ لے گی۔

—اسی لیے امید کو بھی حلال گوشت کی طرح ذبح کر دینا چاہیے۔ میں نے ہنس کر کہا۔

—ایک خاتون رضا کار نے مجھ سے کہا کہ اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بالکل پاگل ہو چکی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اسے پاکستان لے جاؤ اور کسی پاگل خانے میں داخل کرادو۔ پر میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا، منٹو صاحب۔

— کیوں؟

—وہ اسی آس پر تو زندہ تھی کہ ایک دن اس کی بیٹی واپس آجائے گی۔ دنیا کے اس لمبے چوڑے پاگل خانے میں کم سے کم وہ اپنی مرضی سے چلتے پھرتے اپنی بیٹی کو ڈھونڈ تو رہی تھی۔ لیکن

اگر اسے پاگل خانے کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا تو وہ زندہ ہی نہ بچے گی۔ آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا تو میں رو پڑا، منٹو صاحب۔ میں نے دراصل سوچ لیا تھا کہ اسے پاکستان لے جا کر کسی پاگل خانے میں داخل کرادوں گا۔

—شاید اس طرح تمھارا ضمیر تمھیں ملامت کرنا چھوڑ دیتا۔ ہے نا؟

—شاید؟

—پھر کیا ہوا؟

—وہ فرید چوک پر کھڑی تھی اور اپنی بے نور آنکھوں سے اردگرد دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں کسی کے ساتھ اغوا کی گئی کسی لڑکی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ وہ لڑکی کسی ہندو کے ساتھ تھی جو صابن کا بیوپاری تھا۔ اتنے میں ایک جوان لڑکی دوپٹے سے چہرہ ڈھانپے ایک پنجابی نوجوان کا ہاتھ پکڑے وہاں آئی۔ جب وہ دونوں بڑھیا کے نزدیک پہنچے تو نوجوان ٹھٹک کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس نے لڑکی کا ہاتھ کھینچ لیا۔ لڑکی کے چہرے سے دوپٹے کا نقاب کھسک گیا اور اس کا گلابی چہرہ جھلک اٹھا۔ میں بتا نہیں سکتا، منٹو بھائی، کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔

—میں جانتا ہوں۔

— کیا مطلب؟

—ہم یہ زبان بھول چکے ہیں۔ آگے بولو۔

—میں نے واضح طور پر سنا، نوجوان لڑکی سے کہہ رہا تھا: 'یہ تمھاری ماں ہے۔' لڑکی نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھا اور نوجوان سے کہا: 'چلو، جلدی چلو۔' بڑھیا چیخی: 'بھاگ بھری! بھاگ بھری!' میں نے جا کر اسے بازو سے تھام لیا اور پوچھا: 'کیا بات ہے؟'

—میں نے اسے دیکھا ہے، بیٹا۔

—کیسے؟

—بھاگ بھری کو۔ اپنی بیٹی کو۔ وہ اُس طرف گئی ہے۔

—بھاگ بھری کب کی مر چکی ہے، اماں۔ تمھاری بیٹی اب زندہ نہیں ہے۔ میرا یقین کرو۔ بڑھیا تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتی رہی اس کے بعد چوک پر ڈھیر ہوگئی۔ میں نے اس کی نبض

نٹولی، وہ مر چکی تھی۔

—ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کو مسکینوں پر رحم نہ آئے۔

—رحم؟ آپ اسے خدا کا رحم کہتے ہیں؟

—موت خدا کا بہترین تحفہ ہے، بھائی۔

لیکن فسادات میں جس موت کا سامنا ہم لوگوں نے کیا وہ خدا کا تحفہ نہیں تھی، برادران۔ ان کے جنازے نہیں اٹھے، ان کی بے چین روحوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ آپ اب بھی سُن سکتے ہیں—ان کے ہاتھوں اور پیروں میں بندھی زنجیروں کی جھنجھناہٹ سنی جا سکتی ہے—قاسم اب تک پرانی دلّی کی گلیوں میں 'شریفن......شریفن......' پکارتا پھر رہا ہے۔

میں جانتا ہوں بمبئی کے جے جے ہسپتال کے سامنے والے فٹ پاتھ کے نیچے مرتے ہوئے سہائے کی چیخ اب بھی دبی ہوئی ہے۔ شاید فرشتے سہائے جیسے انسانوں کے روپ میں ہی اس دنیا میں آتے ہیں۔ وہ ایک بھڑوا تھا—ہاں، طوائفوں کا دلّال۔ لیکن اس جیسا وفادار ہندو میں نے دوسرا نہیں دیکھا۔ سہائے بنارس کا رہنے والا تھا۔ ایسا سچا انسان کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنا دھندا چلاتا تھا، لیکن وہ جگہ ہمیشہ صاف ستھری ہوتی تھی۔ سہائے کی لڑکیوں کے پاس گاہکوں کے لیے چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے، لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے وہاں بچھے رہتے تھے۔ میں نے کسی چادر پر کبھی کوئی دھبّا نہیں دیکھا۔ اگرچہ سہائے کے پاس نوکر موجود تھا لیکن صفائی ستھرائی کا انتظام وہ بذاتِ خود دیکھتا تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا، مرزا صاحب، اس نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ 'میں نے تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما لیے ہیں، منٹو بھائی۔' اس نے مجھے بتایا۔

—وہ کیسے؟

—لڑکیاں ایک بار میں دس روپے کماتی ہیں۔ ڈھائی روپے میرا کمیشن ہوتا ہے۔

—پھر تو تم نے بہت روپیہ جمع کر لیا۔

—جیسے ہی دس ہزار اور جمع ہو جائیں گے، میں کاشی چلا جاؤں گا۔

—ارے، وہ کیوں؟

—میں بزازی کی دکان کھولوں گا۔ میں اس دھندے میں اور نہیں رہنا چاہتا۔

—بزازی کی دکان ہی کیوں؟ تم کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہو۔ سہائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لگتا تھا جیسے وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزومند کیوں ہے۔ کبھی کبھی اس کی باتیں سن کر لگتا وہ ایک دھوکے باز ہے، ایک فراڈ۔ بھلا اس بات پر کون یقین کرے گا کہ جن لڑکیوں سے وہ دھندا کرواتا تھا انھیں وہ اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا؟ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹ کھول رکھا تھا۔ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ وہ خود ادا کرتا تھا۔ میں ان سب باتوں کا اس کے دھندے کے ساتھ تعلق جوڑنے سے قاصر تھا۔ سہائے کے اس چھوٹے سے چکلے میں سب کو صرف دال سبزی کھانے کو ملتی تھی۔ اس لیے وہ ہر ہفتے انھیں ایک دن کی چھٹی دے دیا کرتا، تاکہ وہ اگر گوشت وغیرہ کھانا چاہیں تو باہر جا کر کھا لیں۔ ایک دن جب میں اس کے ہاں گیا تو وہ خوشی سے پھٹا پڑ رہا تھا: 'منٹو صاحب، داتا صاحب نے میری سُن لی۔'

— کیا مطلب؟

—عرفان اس کوٹھے پر آیا کرتا تھا، منٹو صاحب۔ اسے اور چندرا کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تو میں نے ان دونوں کی شادی کروا دی۔ چندرا اب لاہور میں رہتی ہے۔ مجھے آج اس کا خط ملا ہے، اس نے داتا صاحب کے مزار پر جا کر میرے لیے دعا کی تھی۔ لگتا ہے انھوں نے اس کی دعا سن لی۔ اب مجھے باقی کے دس ہزار روپوں کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد کافی عرصے تک میری سہائے سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ ادھر فسادات پھوٹ پڑے۔ شہر میں کرفیو لگ گیا، سڑکوں پر لوگ نہیں تھے، ٹرام بھی نہیں تھی۔ میں ایک صبح بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ جے جے ہسپتال کے پاس میں نے دیکھا کہ ایک آدمی فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اس کا سارا جسم خون میں لت پت تھا۔ فساد کا ایک اور شکار۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم حرکت کر رہا ہے۔ سڑک پر اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اس آدمی پر جھک گیا۔ اوہ خدایا! وہ تو سہائے تھا، خون کی بوندیں اس کے چہرے پر لرز رہی تھیں۔ میں نے اس کا نام لے کر اُسے پکارا۔ جب کافی دیر تک اس نے کوئی جواب نہ دیا، تو میں اٹھ کر جانے لگا۔ یکایک سہائے نے

آنکھیں کھول دیں...... منٹو بھائی......

میں اس سے بہت سے سوالات کرتا رہا۔ سہائے میں جواب دینے کی سکت نہ تھی۔ بمشکل اس نے اتنا ہی کہا: 'میں نہیں بچوں گا، منٹو صاحب۔'

عجیب صورتِ حال تھی، مرزا صاحب۔ سہائے ایک مسلمان محلّے میں خون میں لت پت پڑا تھا— ظاہر ہے کسی مسلمان نے ہی اسے مارا تھا، اور میں بھی تو مسلمان تھا جو اس مرتے ہوئے آدمی کے سامنے کھڑا تھا۔ اگر کوئی دیکھ لے تو مجھے ہی اس کا قاتل سمجھے گا۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اسے ہسپتال لے جاؤں، اگلے ہی لمحے میں نے سوچا اگر اس نے اپنا بدلہ لینے کے لیے مجھے ہی پھنسوا دیا تو؟ فسادات نے ہمارے یقین اور اعتماد کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ سچ کہوں تو میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ سہائے نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں ٹھہر گیا۔

سہائے اپنی قمیض کے اندر سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں بچی تھی۔ آخر اس نے مجھ سے کہا: 'اندر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ ہزار روپے ہیں...... یہ سلطانہ کا مال ہے...... آپ تو اسے جانتے ہیں نا؟...... میں یہ اُسے دینے کے لیے ہی نکلا تھا...... جس طرح کے حالات ہیں...... کسی کو نہیں پتا کل کیا ہو جائے گا...... سلطانہ کو دے دیجیے گا...... اسے کہیے گا یہ ملک چھوڑ کر چلی جائے...... آپ بھی کہیں چلے جائیے...... ورنہ آپ کا بچنا مشکل ہوگا......'

سہائے کے باقی الفاظ اس کے خون کے ساتھ ہی فٹ پاتھ پر جم گئے۔ اس کی طرح میرا بھی بمبئی کی سڑکوں پر خون ہو سکتا تھا۔ وہ ایسا وقت تھا، بھائیو، جب زندہ رہنے اور مرنے کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک روز منٹو کے دوستوں نے کراچی جانے والے پانی کے جہاز پر اس کی لاش کو الوداع کہا۔

۴۳

زیرِ فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

جب میں شہرِ خموشاں دِلّی کو دیکھتا تو کتنی ہی یادیں پلٹ آتیں، منٹو بھائی۔ وہ دن ہم نے خود نہیں دیکھے تھے، ہم نے ان کے بارے میں شرفائے دہلی سے نسل در نسل سنا تھا، جن تک وہ کہانیاں صدیاں پار کر کے پہنچی تھیں۔ ہر حقیقت ایک دن افسانہ بن جاتی ہے۔ وہ کہانیاں گویا شہنشاہ جہانگیر کے تصویر خانے کی تصویریں تھیں— کیا رنگ تھے، کیا چمک اور کیا نفاست۔ گویا پانی کی بوند میں کسی انوکھی دنیا کا عکس جھلک رہا ہو۔ مغلوں نے محض ایک سلطنت تخلیق نہیں کی تھی یا اس ملک کی دولت کو نہیں لوٹا تھا، انھوں نے ایک تہذیب کو جنم دیا تھا۔ یہی وہ تہذیب تھی جس نے ہمیں سکھایا کہ ادب و اخلاق کے بغیر کوئی عالی نسب نہیں ہو سکتا۔ صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ کہا کرتے تھے کہ ان کے والد ادب و اخلاق میں حرفِ آخر تھے۔ ان کے باطن کی خوبصورتی ان کے ظاہر میں بھی جھلکتی تھی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دِلّی کی سڑکوں پر نکلتے تو جان پہچان کے لوگ اور انجان بھی جھک کر ان کی قدم بوسی کرتے تھے۔ ہم جو یہ 'السلام علیکم' کہتے ہیں تو یہ محض ایک فقرہ نہیں ہے، یہ ایک دعا ہے کہ آپ پر سلامتی ہو۔ ذرا سوچیے، اس سلام میں کتنی صدیوں کا ادب شامل ہے۔ میرے لیے دِلّی کی موت ادب اور اخلاق کی موت تھی۔

بعض فرنگیوں نے تجویز کیا تھا کہ قلعے کو توپ سے اُڑا دیا جائے اور جامع مسجد کو ملیامیٹ

کردیا جائے۔ ان جگہوں پر ملکہ وکٹوریا کے نام سے ایک محل اور ایک گرجا گھر تعمیر کرنا چاہیے۔ اگرچہ وہ ایسا تو نہ کر سکے پھر بھی لاہوری دروازے اور دلّی دروازے کا نام بدل کر وکٹوریا گیٹ اور الیگزینڈر گیٹ رکھ دیا گیا۔ انھوں نے پورے قلعے کو ایک فوجی چھاونی میں بدل ڈالا۔ جامع مسجد اور غازی الدین مدرسے کا بھی یہی حال ہوا۔ فتح پوری مسجد ایک ہندو تاجر کو فروخت کردی گئی۔ زینت المساجد میں ولایتی روٹی بنانے کی بھٹیاں قائم کردی گئیں۔ معلوم ہے میں اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا کیا دیکھا کرتا تھا؟ وہ دیکھو، قلعہ مبارک تیار ہوگیا۔ سرکاری دستاویز میں اور لوگوں کی زبان میں قلعۂ معلّٰی کو قلعۂ مبارک کہا جاتا تھا۔ ۱۹ اپریل ۱۶۴۸ء کو شہنشاہ شاہ جہاں نے قدم رنجہ فرما کر دولت خانۂ خاص کا افتتاح کیا تھا۔ یہ تاریخ نجومیوں نے مقرر کی تھی۔ ہم اس جشن کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے، منٹو بھائی۔ ہندوستان، کشمیر اور ایران بھر سے بے شمار موسیقار اور مغنّی بلائے گئے تھے۔ وہ آرائشی سامان اور قالین جن سے پیشکار سعد اللہ خاں نے اس کمرے کو سجایا تھا واضح طور پر ساٹھ ہزار روپے کی مالیت کے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ انھوں نے خواب گاہ کی ایک دیوار پر اپنا کہا ہوا کلام بھی کندہ کروایا تھا۔ خواب گاہ کسے کہتے ہیں، معلوم ہے نا؟ وہ کمرا جہاں شہنشاہ سوتے تھے اور خواب دیکھتے تھے۔ سونے کے کمرے کا نام تھا خواب گاہ، اس نام کے ساتھ منسلک خیال کا ذرا تصوّر کیجیے، منٹو بھائی۔

پتھر کی ایک طویل فصیل شاہجہاں آباد کو گھیرے ہوئے تھی۔ آمد و رفت کے لیے سات کشادہ دروازے تعمیر کیے گئے تھے — کشمیری دروازہ، موری دروازہ، کابلی دروازہ، لاہوری دروازہ، اجمیری دروازہ، ترکمانی دروازہ اور اکبری دروازہ۔ لاہوری اور اکبرآبادی یہ دو صدر دروازے تھے۔ شہنشاہ شاہجہاں نے ان دروازوں کے باہر دو دو ہاتھیوں کے مجسمے ایستادہ کروائے تھے۔ شہنشاہ اورنگزیب نے ان مجسموں کو تڑوادیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، منٹو بھائی، اس کے بعد دلّی کو کتنے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نادر شاہ اور بعدازاں مرہٹوں کے حملے سے شہر تاراج ہوگیا۔ میر صاحب نے کہا تھا۔

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے برباد کردیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

فرنگی تو اور بھی سفاک تھے، میرے بھائیو۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں سرکار انگلشیہ نے اس ملک کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے لے لیا۔ کئی دنوں سے، غروبِ آفتاب کے وقت مغربی آسمان پر میں ایک دُم دار ستارہ دیکھ رہا تھا، منٹو بھائی۔ کسی بدشگونی کے پیش خیمے سے میرا دل لرز رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ ہمارا خاتمہ اب قریب ہے۔ ملکہ برطانیہ کی طرف سے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے انتظامات سنبھال لیے تھے۔ یا اللہ! میں جانتا تھا اب ان کا مقصد شاہجہاں آباد اور اس کی تہذیب کو مٹا دینا ہوگا۔ گورے لوگ اب اس شہر کو اپنی ضرورتوں کے مطابق نئے سرے سے تیار کریں گے، اور ہم خستہ حال لوگ، زخمی پرچھائیوں کی طرح پڑے رہیں گے۔

اُن دنوں محلّے کا ایک خارش زدہ کتا ہی میرا واحد دوست تھا۔ وہ فرار ہو جانے والے کسی خاندان کے گھر کا پہریدار رہا ہوگا۔ لاغر اور پسوؤں سے بھرا ہوا، اس کے جسم کا رواں جھڑ چکا تھا۔ ایک دن وہ میرے گھر کے دروازے پر لیٹا کوں کوں کر رہا تھا۔ جوں ہی میں سامنے آیا وہ بھونکنے لگا۔

'بھوں......بھوں......' میں نے بھی مزہ لیتے ہوئے آواز نکالی۔

—مرزا صاحب......

میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ کیا کتا بھی انسانوں کی طرح بول سکتا ہے؟ کون جانے، انگریزوں کے راج میں ہر چیز ممکن ہے۔

اس نے پھر پکارا، 'مرزا صاحب......'

—بدتمیز کتے!

—میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا، مرزا صاحب۔

'کلّو......کلّو، کہاں مرگیا سؤر!' میں چلّایا۔

کلّو دوڑتا ہوا آیا اور حیران و پریشان ہوکر میری جانب دیکھنے لگا۔ کلّو نے اب بات کرنی

تقریباً چھوڑ دی تھی۔ وہ قصّوں کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس دلّی میں، جو اب کربلا بن چکی تھی، اُسے قصّے کون سناتا؟

—اس کتے کو کچھ کھانے کو دو۔

— کھانا کہاں سے لاؤں، حضور؟

— کیوں؟ کیا ہمارے ہاں کھانا نہیں ہے، کلّو؟ اب تو ملک پر انگریز بہادر کا راج ہے—ان کے ملک میں تو بہت کھانا ہے، کئی طرح کی شرابیں ہیں — سرخ، نیلگوں، سفید—تو پھر ہمارے لیے کھانا کیوں نہیں؟ جاؤ، جاکر دیکھو اگر کچھ ہڈیاں ہی پڑی ہوں۔

— حضور......

— حضور کیا؟ کیا یہیں کھڑے رہو گے؟ کیا تم چاہتے ہو یہ کتا بھوک سے مرجائے؟

— آپ بھی تو بھوکے ہیں۔

—تو کیا ہوا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اگر کسی پکے مسلمان سے کوئی کچھ طلب کرے تو اُسے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا۔

— بھوں......بھوں......

— کیا ہو گیا میاں؟ ذرا توقف کرو۔ کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔

اپنی دُم کو ہلاتے ہوئے کتا بولا: 'چلیے ذرا چہل قدمی کرتے ہیں۔ راستے میں ضرور کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جائے گا، مرزا صاحب'۔

میں اس کی بات سُن کر ہنس دیا۔ کلّو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر میں نے کہا، 'دیکھو، دھرم راج یدھشٹر کیسے بذاتِ خود ہمارے گھر تشریف لے آئے ہیں۔ اب میں اجل کی جانب طویل چہل قدمی کے لیے جاؤں گا، کلّو،

اب تمھیں اور غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اجل کی سمت میرے سفر کے قصّے سُن سکو گے۔ جاؤ، میری چھڑی لے آؤ'۔

—آپ کہاں جا رہے ہیں، حضور؟

—ذرا شاہجہاں آباد کو گھوم پھر کر دیکھ لوں، اس سے پہلے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

مٹ جائے۔

وہ میرے سفرِ آخرت کا آغاز تھا، منٹو بھائی۔ دھرم راج نے میرے برآمدے میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اسے میاں کہہ کر بلاتا تھا۔ چلنا پھرنا میرے لیے مشکل ہو چکا تھا، پاؤں سوجے جارہے تھے، بینائی بھی کمزور ہو چکی تھی۔ میاں مجھے ادرگرد لیے پھرتا اور سب جگہیں دکھاتا۔ گلیوں کی گلیاں اور محلّوں کے محلّے صاف کرکے چٹیل میدان بنا دیے گئے تھے۔ انگریز سارے شہر کو نئے سرے سے تعمیر کر رہے تھے۔ اب وہاں پیچیدہ گلیوں اور گنجان محلّوں کی کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ پُرپیچ جگہوں کا مطلب تھا پوشیدہ خطرہ، باغی ہمیشہ ایسی جگہوں پر چھپے ہوتے تھے۔ اس لیے کشادہ اور چوڑی چوڑی سڑکیں بنانا تھیں، تاکہ انگریزوں کی نظر سے کچھ بھی اوجھل نہ رہے۔ قلعے کے دروازوں سے باہر پھیلے ہوئے مکانات کو دُور دُور تک منہدم کر دیا گیا۔ شہر کے بزرگوں کی درخواست پر کسی نہ کسی طرح دریا بازار کو بچا لیا گیا۔ کیا شاہجہاں آباد کا اس کے بازاروں کے بغیر تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے، منٹو بھائی؟ اردو بازار، خاص بازار، خرم کا بازار اور سب سے بڑھ کر چاندنی چوک۔ شاہجہاں آباد کی دھڑکن سننے کے لیے بس آپ کو اس کے بازاروں میں چلنے کی ضرورت تھی۔ یہ صرف خرید و فروخت کے مرکز نہیں تھے بلکہ یہاں ہر طرح کے رشتے قائم ہوا کرتے تھے۔ میں بہت بار ان بازاروں میں گھوم چکا تھا۔ جانتے ہیں کیوں؟ محض رنگوں کی بہار دیکھنے کے لیے اور وہ نئے چہرے بھی جو اچانک جھلک اٹھتے تھے—وہ چہرے جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوتے تھے۔ مجھے کتنے ہی اشعار، بازاروں میں یوں بے مقصد گھومتے ہوئے ملے تھے۔ ہجوم کے درمیان اکیلے چلنے کی شدید خواہش بازار ہی پوری کر سکتا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے سب اُجاڑ دیے—اردو بازار، خاص بازار، خرم کا بازار۔

— بھوں، بھوں......مرزا صاحب......

— کیسے، میاں؟ بھوں......بھوں......

—تو اس صورتِ حال میں ہم کہاں جائیں گے؟

—زیرِ زمین۔ جب میں پہلی بار شاہجہاں آباد آیا تو مجھ سے ہمکلام ہونے کو وہ زمین کی تہہ سے اٹھ آئے تھے۔ کون؟ جانتے ہو، میاں؟ وہ جنھیں شاہجہاں آباد کی تعمیر کے وقت دفنا دیا گیا

تھا۔ شاید شہروں کی تعمیر کا یہی دستور ہے۔ اب فرنگی ایک نیا شہر بنا رہے ہیں، اس لیے زیرِ زمین جانے کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ کچھ ایسا بُرا بھی نہیں، میاں، ہم ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے پڑے رہیں گے۔

انگریزوں کے اس نئے شہر میں مجھ ایسا آدمی کیا کرتا، منٹو بھائی؟ ہمارا شہر اور ان کا شہر تو بہت مختلف تھے۔ ہمارے ملک کے شہروں میں چوڑی اور کشادہ شاہراہیں آپ کو بہت کم دیکھنے کو ملیں گی۔ ہمارے ہاں گلیوں کی کثرت ہوتی ہے اور ان گلیوں کے گرد محلّوں کے جھنڈ ہوتے ہیں۔ اس انداز کی شہری منصوبہ بندی کے پیچھے ہماری طرزِ زندگی کا مختلف احساس کارفرما تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پاس رہتا ۔ بستے تھے، ہم ان گلیوں میں سکون سے چلتے، خوش مزاجی سے باتیں کرنے ٹھہر جاتے، کسی پڑوسی کے ہاں بیٹھ کر چلم پھونک لی، ترچھی نظر سے کسی چلمن کے پیچھے سے جھانکتی کسی حسینہ کی غیر متوقع جھلک دیکھ لی، پھل فروش، گل فروش اور قلفی فروش ہمارے ساتھ چلا کرتے۔ وہ راستے محض چلنے کے لیے نہ تھے، آپ انھیں ایک طرح کی اجتماع گاہ کہہ سکتے ہیں، جہاں پڑوسی اور اجنبی لوگ بھی ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ نیا شہر جو انگریز تعمیر کر رہے تھے وہ ہم لوگوں پر نظر رکھنے کے لیے تھا۔ جامع مسجد کے اردگرد پھیلے ہوئے تمام مکان اور دکانیں مسمار کر دی گئیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے قائم کردہ دارالبقا کو مٹا دیا گیا۔ یہاں ادب، طب اور مذہبی علوم کی مفت تدریس کی جاتی تھی۔ بھلا ہمارے ادب، طب اور مذہبی علوم کی انھیں کیا ضرورت تھی؟ خدا بڑا مہربان ہے، مجھے اونچا سنائی دینے لگا تھا۔ ورنہ میرا دماغ توڑ پھوڑ کے اُس شور سے بھر جاتا۔

تباہی کے اُس ڈھیر پر بیٹھے، میں شاعری کو مزید چھو بھی نہیں سکتا تھا، منٹو بھائی۔ میں، کیا وہ میں ہی تھا جو کبھی شعر کہا کرتا تھا؟ میں جب ان چیزوں کے بارے میں سوچتا تھا تو الجھن کا شکار ہو جاتا۔ کہیں سکون نہیں تھا، نہ ابنِ سینا کے فلسفے میں اور نہ ہی نظیریؔ کی شاعری میں، سب کچھ بے معنی تھا — ساری شاعری، سلطنتیں، فلسفے — کسی سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اک ذرا سی خوشی سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں۔ ہندوؤں کے ہاں اوتار ہوتے ہیں، مسلمانوں کے ہاں پیغمبر — لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ میں نے ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا، چاہے تم مشہور یا گمنام، سچ تو یہ ہے اس سے کچھ فرق

نہیں پڑتا۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا اوڑھنا اور زندہ رہنا اہم بات ہے۔ فن در حقیقت ایک قتل گاہ ہے، تفتہ، جہاں تم منصف بھی ہو اور جلاد بھی۔ میرے خدا، مجھے اس فریبِ نظر کے جال سے آزاد فرما۔ اتنے برسوں تک میں نے خود اپنا لہو بہایا ہے، اپنے پیاروں کا لہو بہایا ہے، اور اس لہو نے میرے فن کے باغیچے کو سرخ کر ڈالا ہے۔ میں آپ کی حمایت کرتا ہوں، جہاں پناہ اورنگ زیب۔ تباہ کر ڈالیے سب تصویروں اور مجسموں کو — سانس روک دیجیے میاں تان سین کی — میر تقی میر کا سر لے لیجیے — اس سارے فریبِ نظر کا کیا کریں گے ہم؟ اپنی تاریک کوٹھڑی میں، میں کچھ بھی نہیں پہچان پاتا تھا، منٹو بھائی۔ نہ اپنے اردگرد کی دنیا کو — نہ کسی کو۔ اگر کوئی میرا نام سعدیؔ یا حافظؔ کے ساتھ بھی لے تو کیا ہوگا؟ میں تو ایک ستائے ہوئے کتے کی طرح ہی جیا۔

مسلمان ان کے لیے آوارہ کتے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھے۔ دلّی پر قبضہ کرنے کے کچھ عرصے بعد ہندوؤں کو شہر لوٹنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن مسلمانوں کو نہیں۔ انھیں بہت بعد میں اجازت ملی۔ اعلیٰ خاندانوں کی بیگمات اور بچے ان دنوں سڑکوں پر بھیک مانگ رہے تھے، منٹو بھائی۔ قلعہ معلّیٰ کی بیگمات جن کے چہرے کبھی چاند کی طرح روشن تھے، اب چیتھڑے لگائے کبھی بڑبڑاتیں تو کبھی آپ ہی آپ ہنستی پھرتی تھیں۔ اپنی اجل کی راہ پر چلتے ہوئے میں نے ان تباہ حال لوگوں کو، ان زندہ لاشوں کو دیکھا، اور خدا سے دعا کی کہ اب مجھے میری گور میں لے جائے، اور میرے لیے ایک ٹکڑا کفن کا محفوظ رکھے۔

ایک دن میں چلتے چلتے جامع مسجد کے اگلے حصے کے سامنے میدان میں ڈھیر ہو گیا۔ میں سانس نہیں لے پا رہا تھا، مجھے لگا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ میں واضح طور پر سمجھ سکتا تھا، منٹو بھائی، کہ اس کی پرچھائیں دروازے پر پڑ چلی تھی۔ میں ہر روز آدھی رات کو بستر میں سیدھا اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ میری نیندوں میں صرف موت ہی موت تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں سے لٹکتی ہوئی لاشیں۔ میں ایسے درد کے احساس سے جاگ پڑتا جیسے میرے سینے کے بائیں جانب خنجر گھونپ دیا گیا ہو۔ میں خوفزدہ ہو جاتا، اگر اس لمحے میرے دل کی دھڑکن تھم گئی تو؟ مجھ پر رحم فرما، اے خدا، اب موت کو بھیج دے، میں دل ہی دل میں ہر وقت بس یہی دعا کرتا رہتا۔ لیکن پھر میں خوف سے جاگ کیوں پڑتا تھا، سینے کے بائیں حصے کو دبائے صبح ہونے کا انتظار کیوں کرتا تھا؟ میں جامع

مسجد کے چبوترے پر بیٹھا ہانپ رہا تھا کہ میاں بھونکنے لگا۔

—بھوں......بھوں......

—ذرا ستا لینے دو، میاں۔ بھوں......بھوں......

—ابھی سے ستانے لگے؟ ابھی تو بہت کچھ اور دیکھنا باقی ہے، مرزا صاحب۔

—بھوں......بھوں......تم جاؤ، میاں۔ میں اجل کی اس راہ پر اور نہیں چل سکتا۔

—چلیے، ٹھیک ہے۔ تو پھر کچھ شاعری سماعت کیجیے۔ بھوں......بھوں......

—لعنت ہو شاعری پر۔

—بھوں......بھوں۔ جس سے محبت ہو اس پر لعنت نہیں بھیجتے، مرزا صاحب۔ میں جانتا ہوں آپ نے شاعری کے علاوہ کبھی کسی کو، کسی بھی چیز کو نہیں چاہا۔

—میں نے کسی کو نہیں چاہا؟ کسی چیز کو بھی نہیں؟

—نہیں۔ کسی کو نہیں۔ آپ نے اس دنیا کا سارا حسن لفظوں ہی میں دیکھا، مرزا صاحب۔ لفظ ہی آپ کے لیے گوشت پوست تھے۔ میں آپ کی آخری نظم آپ کو سناتا ہوں، سنیے:

—میری آخری نظم؟

—بھوں— بھوں۔ جو ایک صدی بعد تحریر کی جائے گی۔

—تو پھر سناؤ، میاں۔

—بھوں......بھوں۔ شاعری کیسی عمدگی سے صدیوں کے ذریعے سفر کرتی ہے، ہے نا، مرزا صاحب؟

میرے دھرم راج میاں جم کر بیٹھ گئے اور انھوں نے جامع مسجد کے مینار کی طرف دیکھتے ہوئے سنانا شروع کیا:

لو میں گھٹنے موڑ کر بیٹھ چکا مغرب کے رُخ
بہار آج خالی ہاتھ آئی ہے
اگر چاہتے ہو تو تباہ کردو مجھے
بس سلامت رہے میری نسل کا خواب

کہاں معدوم ہوئی اس کی شفاف جوانی
کسے کھاتا ہے کرید کرید کر خفیہ زوال
میری آنکھ کے کونے پر یہ کم تر شکست
بھر رہی ہے زہر میری شریانوں میں،
پھیپھڑوں میں اور رگوں میں

بیدار کرنے شہر کی انتہا پسندی کو
ایک بے رنگ خلا سے آتی اذان
پتھر میں بدل دے مجھے، خاموش کردے، ساکت
بس سلامت رہے میری نسل کا خواب

یا پھر مستقبل کے لیے کوئی سکھ نہیں
گناہوں کے ان جراثیم میں جو لیے پھرتا ہے میرا جسم
اپنی وحشیانہ فتح کے جشن میں
بلا بھیجتا ہوں موت کو خود اپنے ہی گھر

یا اس محل کی چمکتی روشنیاں
جلا دیتی ہیں میری ہڈیاں، اور دل بھی
اور لاکھوں کیڑوں کو دے دیتی ہیں اجازت
بنالیں میرے پنجرے کی گہرائی میں کہیں گھر

تم نے مجھے بہت سی چیزوں سے نوازا
کہاں رکھو گے مجھے

جب میں ہو جاؤں گا مٹی کا ڈھیر

بہتر ہوگا کہ مجھے تباہ کر دو — اے خدا

بس سلامت رہے میری نسل کا خواب[1]

لیکن میرا کوئی خواب باقی نہیں تھا، منٹو بھائی۔ فرنگیوں نے میرے سارے خوابوں کا قیمہ کر کے اس کے کوفتے بنا ڈالے تھے۔ اس دن جب میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ میرے گھر کے باہر کافی لوگ جمع ہیں، اور امراؤ بیگم اندر برآمدے میں کھڑی ہیں۔ 'مرزا صاحب......' مجھے دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

— کیا ہوا، بیگم؟

— کلّو۔

— کیا کیا اُس سؤر کلّو نے؟

اتنے برسوں کے بعد آخر کلّو ہمیں چھوڑ گیا تھا، میرے بھائیو۔ وہ زندہ رہتا بھی کیسے؟ کون قصے سناتا اسے؟ اس لیے کلّو سو گیا۔ اس کے منھ کے کونے سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے اُسے آواز دی، 'کلّو...... میرے بیٹے......'

— حضور......

— مجھے حضور مت کہو، کلّو۔ تم میرے باپ ہو...... میرے بیٹے ہو...... کہاں درد اٹھا تھا، کلّو؟

— سارے داستان گو کہاں چلے گئے، حضور؟

— لیکن میں تو تمھیں بہت سی داستانیں سنایا کرتا تھا، کلّو۔

— معاف کیجیے گا حضور۔ آپ کی داستانیں بے رنگ تھیں۔

— رنگ دیکھنا چاہتے ہو؟ تو آؤ، میرا ہاتھ تھامو۔

— کہاں لے جایئے گا، حضور؟

— بادشاہ حضرت سلیمان کے دربار میں۔

— سبحان اللہ۔

---

[1] سنکھا گھوش کی بنگلہ نظم 'بابر کی دعا'

کیسی روشنی پھوٹ رہی ہے؟

— دیکھ رہے ہو ان تمام ہیرے موتی، یاقوت اور نیلم سے

— جی حضور۔ بہت روشنی ہے...... بہت روشنی...... میری نجات اسی روشنی میں ہے، حضور۔

ایسی روشنی تو بس داستانوں ہی میں دکھائی دیتی ہے، حضور۔

— وہ دیکھو، درباری شاعر شاہد شہنشاہ کے قدموں میں گر پڑا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا

کہے — اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔

حضرت سلیمان نے پوچھا: 'کیا بات ہے؟ تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'

خوف کے سبب شاہد کے ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ 'مجھے بچا لیجیے، شہنشاہ۔' اس نے کہا، اس کی

آواز لرز رہی ہے۔

— کیا ہوا؟ کون تمھاری جان لینا چاہتا ہے؟

— ہوا، جہاں پناہ ...... ہر سمت وہی ہوا ہے...... برقیلی...... کسی خنجر کی طرح میرے سینے، میرے شکم اور میری آنکھوں کو چیرتی چلی جا رہی ہے — وہ مجھے زندہ نہ رہنے دے گا۔

— کون؟

— اسرافیل، شہنشاہ۔ میں جب آپ کے دربار میں آ رہا تھا تو میں نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سیاہ پوش تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے کسی خنجر کی طرح چیر رہی تھیں۔ مجھے سور اسرافیل سے بچا لیجیے، جہاں پناہ۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔

— میں کیا کروں، بتاؤ۔

— ہوا تو آپ کی غلام ہے۔

— ہاں۔

— اسے حکم دیجیے کہ مجھے ہندوستان اڑا لے جائے۔ میں اسرافیل سے دور، سمندر کے اس طرف رہوں گا۔

— ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا۔

بادشاہ سلیمان نے ہوا کو بلا بھیجا۔ اور اسے حکم دیا کہ اس کے عزیز شاعر کو پہاڑوں اور سمندروں کے پار ہمالیہ کے دور افتادہ جنگلوں میں لے جائے۔

اگلے دن بادشاہ سلیمان کو درباریوں کے ہجوم میں اسرافیل دکھائی دیے۔ انھوں نے موت کے اس فرشتے کو طلب کیا اور پوچھا، 'کیا تم نے میرے عزیز شاعر کو کل ڈرایا تھا؟'

— نہیں، شہنشاہ۔ میں تو شاعر شاہد کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ خدا نے مجھے کل ہی ہندوستان پہنچ کر اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو میں نے سوچا، شاعر کے پَر ہی کیوں نہ لگ جائیں وہ ایک دن میں وہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لیے......

— حضور......کلّو نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

— کہو، کلّو۔

— یہ کون سا ملک ہے، حضور؟

— ہندوستان۔

— سلام علیکم، حضور۔ کلّو نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ کلّو کو لحد میں اُتار کر، میں اپنے چھوٹے سے حجرے میں پھر لوٹ آیا۔ یہاں بیٹھنا ایسا تھا جیسے ستاروں سے خالی آسمان کے نیچے بیٹھے ہوں۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کب بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ جب مجھے رونے کی آواز سنائی تو میں نے پوچھا، 'کون ہے؟'

— میں ہوں، مرزا صاحب۔

— اُمراؤ......کیا ہوا؟......تم سوئی نہیں اب تک؟

— آپ بھی تو نہیں سوئے۔

— کچھ کہنا چاہتی ہو؟

— چلیے، اس شہر کو چھوڑ کر چلتے ہیں۔

— اور جائیں گے کہاں؟

— آپ ہی فیصلہ کیجیے۔

— اب قبر کے علاوہ اور کہیں نہیں جا سکتے، بیگم۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کب کس کو پہلے بلائے گا۔ کچھ دنوں تک تمھیں بس یہ خواب دیکھنا ہوگا، بیگم کہ تم اب تک شاہجہاں آباد میں ہو۔ غور سے سنو......وہ دیکھو فتح پور سیکری سے میاں تان سین کا بلاوا چلا آتا ہے—

بارش ہو رہی ہے۔ میرے دھرم راج میاں بھیگ جانے کی وجہ سے کوں کوں کر رہے تھے۔

مجھ پر رحم کیجیے، منّو بھائی، اب مجھے آخری بار سو لینے دیجیے۔ اللہ نگہبان۔

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع

شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

۴۴

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

لاہور پہنچنے کے بعد تین مہینوں تک میرے دماغ میں آندھیاں سی چلتی رہیں، مرزا صاحب۔ کبھی کبھی لگتا میں ابھی تک بمبئی میں ہوں، اگرچہ میں کراچی میں اپنے دوست حسن عباس کے گھر میں تھا، اور کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں لاہور میں ہوں۔ ان دنوں قائدِ اعظم محمد علی جناح فنڈ کے لیے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے لاہور کے سبھی ہوٹلوں میں رقص و موسیقی کے مظاہرے منعقد کیے جا رہے تھے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دماغ کے صحرا میں ایک آندھی سی اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے سینما کے بڑے سے پردے پر آڑے ترچھے منظر چل رہے ہوں۔ ایک پل کو بمبئی کے بازار اور سڑکیں دکھائی دیتیں، جو کراچی کی تنگ سڑکوں پر چلتی ٹرام اور گدھا گاڑیوں میں مدغم ہو جاتیں، اگلے ہی پل لاہور کے کسی عیاشانہ شراب خانے کی تصویر اُبھر آتی۔ واقعتاً کہاں تھا میں؟ اپنی کرسی پر کسی مصری ممی کی طرح بیٹھا بس خیالات کی لہروں میں ڈوبتا ابھرتا رہتا تھا۔ 'اس طرح کتنے دن خود کو گھر میں بند کیے بیٹھے رہیں گے، منٹو صاحب؟'

—تو پھر میں کہاں جاؤں؟

—آپ کو نوکری حاصل کرنی چاہیے، ورنہ ہم گزارہ کیسے کریں گے؟

—مجھے کون نوکری دے گا، صفیہ؟

—اگر آپ انڈسٹری کے لوگوں کے ہاں آنا جانا شروع کریں......

'انڈسٹری' سے اس کی مراد لاہور فلم انڈسٹری تھی۔ صفیہ نہیں جانتی تھی کہ لاہور فلم انڈسٹری میں اب کچھ نہیں رہا تھا۔ کئی فلم کمپنیوں کا سنتے تو تھے، ان کے دفاتر وغیرہ بھی موجود تھے، لیکن ان کے پاس باہر رکھے سائن بورڈز کی نمائش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پروڈیوسرز لاکھوں روپے کی مالیت کی فلمیں بنانے کی ڈینگیں مارتے، دفتر قائم کرتے، اس کے لیے کرائے پر فرنیچر لے کر آتے، اور اس کے بعد قریب کے چھوٹے سے ہوٹل کا بل چکائے بنا وہاں سے چپت ہو جاتے۔ سارے کے سارے ٹھگ تھے۔ جو خود اُدھار کے پیسوں پر زندہ تھے، وہ بھلا مجھے نوکری کیا دیتے؟ لیکن سچ تو یہ تھا کہ مجھے ملازمت کی اشد ضرورت تھی۔ بمبئی سے میں جو روپیہ لے کر آیا تھا، وہ اب ختم ہونے کو تھا۔ صرف گھر کا خرچہ ہی نہیں تھا، مجھے کلفٹن بار میں اپنی شراب کا بل بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے یقین کر ہی لیا کہ میں اب لاہور میں ہوں، اور یہ کہ اب مجھے باقی کی زندگی اسی نامراد شہر میں گزارنی ہوگی۔ صرف مہاجر ہی نہیں، بلکہ وہ لوگ بھی جو ہندوستان سے ہجرت کر کے نہیں آئے تھے، جھوٹی کہانیاں گھڑ کے کوئی نہ کوئی دکان یا فیکٹری حاصل کرنے کے چکروں میں رہتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے مجھے صلاح دی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور اپنے لیے کچھ لے لوں۔ لیکن میں خود کو لٹیروں کی ٹولی میں شامل نہ کر پایا، مرزا صاحب۔ گمراہ کن سیاست کی وجہ سے ملک تقسیم ہو چکا تھا، اور یہاں مجھے کہا جا رہا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر راتوں رات امیر بن جاؤں؟ اتنا نیچے گرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایسی غیر یقینی کی صورتِ حال کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اگر ایک آدمی مسکرا رہا تھا تو دوسرا مایوسی میں ڈوبا آہیں بھر رہا تھا۔ کسی ایک کے جینے کی قیمت، کسی دوسرے کی موت تھی۔ سڑکوں پر ہمیں نعرے سنائی دیتے، پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد، اور میں ان نعروں میں چھپی ہوئی سسکیاں سنا کرتا۔ صرف لوگ ہی نہیں رو رہے تھے، پرندے اور درخت بھی گریہ کناں تھے۔ وہ مہاجر بھی جنھیں کوئی گھر نہ مل سکا اور سڑکوں کے کنارے پڑے تھے، وہ درختوں کی چھال اور خشک ٹہنیاں جمع کر کے سردیوں کی راتوں میں الاؤ روشن کر لیتے، ورنہ وہ زندہ کیسے رہتے، سینکڑوں درخت اور ان کی شاخیں چولہے جلانے کے لیے کاٹ ڈالی گئیں۔ لاہور کی سڑکوں پر صرف ٹنڈ منڈ درخت دکھائی دیتے۔ اگر کوئی ذرا سا غور کرتا تو ان درختوں کی چیخیں صاف سن سکتا تھا۔ سارے مکان غم کے اندھیرے میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگوں کے چہرے یوں نظر آتے تھے جیسے کسی نے ان کے بدن سے سارا لہو چوس لیا ہو——سب لوگ جیسے کاغذ کے بنے ہوئے تھے۔ میں یا تو سارا دن گھر میں کسی کٹھ پتلی کی طرح کرسی پر بیٹھا رہتا یا کسی آوارہ گرد کی طرح لاہور کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا۔ میں لوگوں کے چہروں کے تاثرات کا مشاہدہ کرتا اور ان کی باتیں سنتا۔ ہاں، میں بغور ان کی بات چیت سنتا، انھوں نے کیا کھو دیا اور انھیں کیا ملا، کس طرح ان کے خواب چکنا چور ہو گئے، حتیٰ کہ ان کی حماقتوں کی باتیں بھی جب میں باہر نکلتا اور لوگوں کی باتیں سنتا تو میرے ذہن پر جمی دھند چھٹنے لگتی۔ فضا میں تیرتے ان کے الفاظ اور جملے، ان کے جسموں سے چمٹی ہوئی حدت اور وہ سسکیاں جو سوکھ کر آہیں بن چکی تھیں، سب میرے اندر جذب ہوتی چلی جاتیں۔ گھر واپس لوٹ کر جب میں چپ چاپ بیٹھ جاتا تو وہ سارے الفاظ اور جملے میرے اندر سے نکلنے کو مچلنے لگتے۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرا پور پور پھٹ جائے گا——وہ سارے لفظ غصے، اذیت اور نفرت کے سبب زبردستی باہر نکل آنے کو ہوتے——وہ سارے لاپتا الفاظ، درحقیقت کسی تک پہنچنا چاہتے تھے، مرزا صاحب۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے ذریعے وہ اپنی ہجرت کی اس زندگی کو بسر کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے دھیرے دھیرے پھر سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ فلم انڈسٹری تھی نہیں کہ جس کے لیے کہانیاں لکھ کر کچھ کما لیتا۔ اس لیے سوچا کہ اخباروں اور رسالوں میں لکھ کر ہی شاید کچھ مل جائے۔ دن بھر کے لیے سالم تانگہ کرائے پر لے کر میں نکل پڑتا تھا۔ آپ مجھے افسانوں کا پھیری والا کہہ سکتے ہیں۔ اخبار کے دفتر کے باہر تانگے والے کو انتظار کرنے کا کہتا اور اندر جا کر افسانہ لکھنے لگتا۔ فوری نقدی دیجیے، گرما گرم افسانہ لیجیے۔ اس کے بعد دوسرے اخبار یا رسالے کے دفتر میں۔ انھیں طنز و مزاح کا مضمون چاہیے ہوتا، میں وہیں لکھنے بیٹھ جاتا۔ روپے جیب میں ڈالے اور پھر سے تانگے میں سوار۔ میں روپے کبھی نہیں گنتا تھا، یہ میری عادت ہی نہیں تھی۔ معقول رقم ہاتھ آتے ہی میری پہلی طلب شراب ہوتی، اس کے بعد باقی پیسے گھر کے اخراجات میں جاتے۔

لاہور آ کر میری شراب نوشی حد سے تجاوز کر گئی تھی، مرزا صاحب۔ کہیں کوئی دوست نہیں تھا۔ آنے والے دن بالکل تاریک دکھائی دیتے تھے۔ اگر میں مر گیا تو میرے بیوی بچے سڑک پر

آ جائیں گے۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد وہی وارفتگی کی کیفیت ہو جاتی، جس میں مجھے لگتا کہ میں ابھی تک بمبئی میں ہوں۔ میں نے توقع کی تھی کہ پاکستان میں مجھے افسانہ نگار کے طور پر عزت ملے گی، میں نے ہندوستان سے یہ سوچ کر ہجرت کی تھی کہ پاکستان میرا وطن ہے۔ لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ مجھے ایک آوارہ کتے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ جی چاہتا ہر وقت شراب کے خمار میں ہی رہوں، دھند سے گھرے ہوئے کسی پہاڑی ٹیلے پر اکیلا۔ ان گھنٹوں کے علاوہ کہ جب مجھے لکھنے کے لیے جاگنا پڑتا تھا، اور کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو نشے میں ڈوبے رہنے جیسا سکون دے سکتی۔ نشے کی اس حالت میں سینکڑوں لوگ ظاہر ہو جاتے——سب کے سب مبہم پرچھائیوں جیسے تھے——میں گویا کسی آسیب زدہ گھر کی طرح زندہ تھا۔ میں ان سائے نما لوگوں سے لگاتار باتیں کرتا۔ صفیہ جھنجھوڑ کر مجھے جگاتی اور میری محویت کو توڑ ڈالتی۔ نشہ اترتے ہی میرا جسم پھر سے شراب طلب کرنے لگتا۔ میرا پاگل پن اور بڑھ جاتا۔ صفیہ نے مجھے شراب کی اس لت سے نجات دلانے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ جتنی کوشش کرتی، میں اتنا ہی اپنی تخیلی دنیا میں لوٹ جانے کے لیے نئی چالیں ترتیب دینے لگتا۔ کچھ یار دوست بھی اکٹھے کر لیے تھے، میں جانتا تھا کہ انھیں افسانہ نگار منٹو کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ ہم بس پینے پلانے کے یار تھے۔ جب میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے تو وہی میری مدد کو آتے تھے، پھر بھلا میں انھیں کیسے چھوڑ دیتا؟ کثرتِ شراب نوشی نے میرے جسم اور دماغ دونوں کو کھوکھلا کر دیا تھا، اگر کوئی نیک مشورہ بھی دیتا تو میں طیش میں آ جاتا۔ احمد ندیم قاسمی نے کئی بار مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں شراب نوشی ترک کر دوں۔ کچھ دن تک تو میں چپ چاپ سنتا رہا پھر ایک دن مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے کہہ دیا، 'قاسمی، تم میرے دوست ہو، مسجد کے ملاّ نہیں ہو جو میرے اخلاقی کردار کی ذمے داری تم پر ہو۔' اس کے بعد قاسمی نے دوبارہ میری اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لاہور میں میرے کچھ پرانے دوست بھی تھے، لیکن وہ بھی مجھ سے دور رہنے لگے تھے۔ میرے خاندان والے مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے، مجھے دیکھتے ہی دور چلے جاتے۔ لاحول ولاقوۃ، منٹو بھی یہاں ہے...... چلو چلیں...... ذلیل کہیں کا پھر اُدھار مانگنے لگے گا۔ ہاں، میں اتنا ہی نیچے گر چکا تھا۔ میں اپنی تحریروں سے بھلا کتنا کما لیتا ہوں گا؟ ہر روز پینے کے لیے

بھی تو آخر پیسہ چاہیے۔ جو بھی ملتا میں اس سے ادھار مانگنے کی کوشش کرتا، کبھی جھوٹ بولتا کہ صفیہ بیمار ہے، کبھی کہتا کہ بیٹیاں بیمار ہیں۔ میں خوب جانتا تھا کہ یہ لت مجھے کسی گہری کھائی میں لیے جا رہی ہے، لیکن یہ اندھی محتاجی اب میرے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ جب تک شراب اندر نہ جاتی مجھے سکون نہیں ملتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے اور مزاج مزید چڑچڑا ہو جاتا۔

سب سے گھناؤنی حرکت میں نے تب کی جب میری بڑی بیٹی نگہت کو ٹائیفائیڈ ہوا۔ اس کی دوا کے لیے میں نے ایک رشتے دار سے پیسے ادھار لیے، لیکن میں اپنی بیٹی کی دوا کے بجائے وہسکی کی بوتل لیے گھر لوٹا۔ عموماً ایسے موقعوں پر صفیہ روتی اور چلاتی تھی، لیکن اس بار اُس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ دیر تک خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر پانی کا گلاس رکھ کر کمرے سے چلی گئی۔ دوسرے کمرے سے نگہت کے بخار میں کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے پانی ملائے بغیر جوں ہی وہسکی کا ایک گھونٹ بھرا، مجھے قے ہو گئی۔ دوسرے کمرے میں صفیہ نگہت کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ میں نے جا کر اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا، 'مجھے معاف کر دو۔'

—اسے بہت تیز بخار ہے آپ اپنے کمرے میں چلے جائیے، منٹو صاحب۔

—نہیں۔ پہلے تم مجھے معاف کر دو۔ میں نگہت کی قسم کر کہتا ہوں اب کبھی شراب نہیں پیوں گا۔

—اور کتنی قسمیں کھائیں گے، منٹو صاحب؟

—میرا یقین کرو...... اس بار، واقعی...... میں دوبارہ سے شروع کروں گا، صفیہ۔ صفیہ نے نرمی سے کہا، 'میری ہمت جواب دے چکی ہے، منٹو صاحب۔'

—آخری بار میرا یقین کر لو صفیہ۔ تم تو جانتی ہو میں کتنا ثابت قدم رہ سکتا ہوں۔ میں اگر ٹھان لوں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔

صفیہ مسکرا دی—ٹھیک ہے۔ اب آپ جا کر سو جائیے۔

میں نگہت کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ میں اسے گلے سے لگا لینا چاہتا تھا، چومنا چاہتا تھا۔ میں ندامت سے مرا جا رہا تھا، کیسا باپ تھا میں جو بیٹی کی دواؤں کے پیسوں سے شراب خرید لایا؟ مجھے معاف کر دینا، نگہت بیٹی۔ میں نے اسے گود میں بھر

لینا چاہا لیکن مجھ میں اس کی طاقت نہیں رہی تھی۔ دفعتاً صفیہ مجھے وہاں سے دھکیلتے ہوئے چلانے لگی، 'جو کچھ کیا وہ کافی نہیں تھا کیا؟ اب کم سے کم لڑکی کو تو چین سے رہنے دیں، منٹو صاحب۔'

—نہیں، میں آج رات یہیں اس کے پاس رہوں گا۔

—اگر آپ اسی طرح کریں گے تو نگہت کی طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔

—یہ میری بیٹی ہے...... میں اس کے پاس......

—رحم کیجیے، منٹو صاحب۔ ہم آپ کے کھیلنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ اس سے تو بہتر ہوگا کہ آپ ہم چاروں کو مار ڈالیں۔ تیز تیز بولنے کی آوازیں سن کر لوگ کمرے میں چلے آئے۔ حامد کی بیوی بگڑ کر بولی، 'بہت ہو گیا چاچا جی۔ یہ آپ کا شراب خانہ نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں چلے جائیے۔'

زندگی میں پہلی بار میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کسی نے مجھ سے اس طرح بات کرنے کی جرأت کی تھی، مرزا صاحب۔ میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔ کسی گھونگھے کی طرح اپنے خول میں سمٹ کر میں کمرے میں آ گیا۔ جواب دینے کی قوتِ ارادی مجھ میں بالکل نہیں تھی۔ نہ تذلیل کا احساس تھا اور نہ خود سے نفرت کا—یوں لگ رہا تھا گویا اب میرا کوئی سہارا نہیں۔ مجھے زخمی کرنے کے لیے یہ ہتھیار میں نے خود ہی ان کے ہاتھوں میں دیے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب واقعی شراب نہیں پیوں گا۔ مجھے لاہور میں نئے سرے سے زندگی شروع کرنا ہوگی، گھر بار ویسے ہی مؤثر طریقے سے چلاؤں گا جیسے بمبئی میں چلاتا تھا۔

اگلے دن میں صبح ہی سے گھر کے کاموں میں لگ گیا۔ اپنے ہاتھوں سے ہر کمرے کی جھاڑ پونچھ کی، دیواروں پر سے جالے صاف کیے۔ فرنیچر کو جھاڑا۔ ایک کرسی کا پایا ٹوٹ گیا تھا، بیٹھ کر اس کی مرمت کی۔ میں نے ساری ردی اور شراب کی بوتلیں جو جمع ہو گئی تھیں، بیچ ڈالیں۔ برآمدے میں بچوں کے لیے جھولا ڈال دیا۔ بازار سے رنگ برنگے پرندوں سے بھرا ہوا ایک پنجرہ خرید لایا۔ نزہت اور نصرت، دونوں چھوٹی بیٹیاں دوڑتی ہوئی آئیں اور آ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔ ان کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں رو پڑا، مرزا صاحب۔ یہ بچیاں اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے کیسے خوش ہو جاتی ہیں، لیکن میں اپنے نشے کی خماری کی وجہ سے آج تک یہ دیکھ

ہی نہیں پایا تھا۔

صفیہ بھی آ گئی اور اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا' یہ کیا نیا پاگل پن ہے، منٹو صاحب؟'

— پرندوں کے بغیر بھی کوئی گھر بنتا ہے، صفیہ؟

— کس کے گھر کی بات کر رہے ہیں، منٹو صاحب؟

— ہمارے گھر کی، اور کس کے گھر کی؟ میں کسی اور کا گھر بنانے کی بات کیوں کروں گا؟

— آپ گھر بنانا چاہتے ہیں تاکہ اسے پھر سے تباہ کر سکیں؟

میں نے صفیہ کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا' میرا بھروسا کرو، آخری بار صفیہ۔ اور میری مدد کرو۔ میں ایک بار پھر اپنے گھر کو بنا لوں گا۔'

— آپ پر بھروسا کر کے ہی تو میں اب تک زندہ ہوں، منٹو صاحب۔ ورنہ کب کی مر چکی ہوتی۔

— چھی چھی! صفیہ یہ بات مت بھولو کہ تمھاری تین تین بیٹیاں ہیں۔

— کیا وہ آپ کی بیٹیاں نہیں ہیں؟

— میرا اعتبار کرو، صفیہ۔ وہ ڈراؤنے خواب جیسے دن اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

کچھ دنوں تک میں نے بالکل مختلف زندگی گزاری۔ شراب نہ پینے کی وجہ سے مجھے بہت کمزوری ہو گئی تھی۔ میں کچھ وٹامن کی گولیاں اور ٹانک لے آیا۔ صرف میرے خاندان کے لوگ ہی نہیں بلکہ اردگرد کے سب لوگ بھی مل کر گویا جشن منانے لگے۔ منٹو نے شراب چھوڑ دی — ان سب کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ ویسے پوری طرح کسی کو بھی اب اس بات کا یقین نہیں تھا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ اور ہر بار کی طرح اس بار بھی منٹو نے سب کا بھروسا توڑ دیا۔ چند دنوں کے بعد ہی وہ اپنے شرابی دوستوں سے جا ملا۔ گھر میں پھر سے بوتل آ گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ شراب پر میرا انحصار اب انتہائی حد پر پہنچ چکا ہے۔ جس دن شراب نہ پیتا، میں ایک لفظ بھی نہ لکھ پاتا۔ اور اگر لکھ نہ پاتا تو کیسے گھر چلاتا؟ مروں یا بچوں...... اب شراب ہی میرا آخری سہارا تھی، مرزا صاحب۔

میں بہت امیدیں لے کر پاکستان آیا تھا۔ ان امیدوں کے ساتھ بہت سے سوال جڑے تھے۔ کیا نئی مملکت پاکستان کا اپنا مختلف ادب ہوگا؟ اگر ہوگا تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ غیر منقسم

ہندوستان میں لکھے جانے والے ادب کا، دونوں قوموں میں سے قانونی مالک کون ہوگا؟ کیا اس ادب کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا؟ کیا سرحد کے اس پار اردو کو بالکل ختم کر دیا جائے گا؟ اس کے لیے زبان پاکستان میں کیسے شکل اختیار کرے گی؟ کیا ہمارا ملک اسلامی مملکت ہوگا؟ مملکت سے وفادار رہتے ہوئے کیا ہم حکومت پر تنقید کر سکیں گے؟ کیا ہم انگریزوں کے راج سے بہتر زندگی گزار سکیں گے؟ مجھے ان سوالوں کا جواب نہ مل سکا، مرزا صاحب۔ جو شخص پھیری والے کی طرح کہانیاں بیچ کر اپنا گھر چلاتا ہو اس کے پاس ایسے بھاری بھرکم معاملات پر سوچنے کی فرصت کہاں۔ اوپر سے، پاکستانی حکومت ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ 'میرے افسانوں 'ٹھنڈا گوشت' اور 'اوپر نیچے اور درمیان' پر فحش نگاری کے مقدمے دائر کیے گئے تھے اور مجھے جرمانہ ہو چکا تھا۔ پاکستان کے کئی ادیب اور دانشور چاہتے تھے کہ مجھے جیل میں ڈال کر اچھی طرح سبق سکھایا جائے۔ عدالتوں میں لگاتار پیشی، مسلسل جرح — میں اتنا دماغی دباؤ اور نہیں سہہ سکتا تھا، مرزا صاحب۔ شراب پینے سے بھی تکلیف ہوتی تھی اور نہ پینے سے بھی۔ ڈاکٹر بتا چکا تھا کہ میرا جگر کام چھوڑنے والا ہے — میرا دماغ بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا تھا — میرے پاس سوائے خودکشی کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا:۔ پھر بھی میں نے کئی بار شراب ترک کی اور ہر بار پہلے سے زیادہ بیمار ہوا تھا۔ ایک مرتبہ صفیہ نے پوچھا' کیا آپ واقعی شراب چھوڑنا چاہتے ہیں، منٹو صاحب؟'

— زندگی میں اس سے بڑی اور کوئی نجات نہ ہوگی، صفیہ۔

— تو پھر سنیے جو میں کہتی ہوں۔

— کہو۔

— آپ کو کچھ عرصہ علاج کی ضرورت ہے۔

— کہاں؟

— آپ کو پنجاب مینٹل ہسپتال کے ایک الکوہلک وارڈ میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہ ضرور آپ کا علاج کر دیں گے۔ آپ کو دوبارہ شراب پینے کی طلب نہیں ہوگی۔

— تمھیں یقین ہے۔

—وہاں بہت سے لوگ ٹھیک ہوئے ہیں، منٹو صاحب۔

—ٹھیک ہے۔ میں وہاں داخل ہو جاتا ہوں۔ حامد کو بلاؤ۔

حامد آیا تو میں نے کہا، 'جتنی جلدی ہو سکے ہسپتال میں میرے داخلے کا انتظام کرو۔'

حامد نے اگلے ہی روز سارے انتظامات کر لیے۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھے ہسپتال لے کر جاتے مجھے بھاگنا پڑ گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کی فیس بتیس روپے ہے۔ پیسے تو اکٹھے کرنے ہی تھے۔ میں نے کچھ ادبی رسائل سے ایڈوانس پکڑا، اس شرط پر کہ ہسپتال سے واپس آ کر انھیں افسانے بھیج دوں گا۔ اور بھی دو ایک لوگوں سے کچھ پیسے ادھار لیے اور گھر واپس آ گیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ میں ہسپتال میں داخل ہونے کے خوف سے بھاگ گیا ہوں۔ لیکن میں سچ مچ ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ ابتدائی چند دن اذیت ناک تھے۔ جسم کے اندر کوئی عفریت ہلچل مچائے رکھتا اور اپنی غذا مانگتا رہتا تھا۔ لیکن چھ ہفتوں بعد، وہ کوئی اور ہی منٹو تھا جو ہسپتال سے نکل کر آیا۔ یہ سچ ہے کہ میرا جسم غارت ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی وہی پرانی والی چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ یقین کیجیے، برادران، اس کے بعد پورے آٹھ مہینے تک میں نے شراب نہیں پی۔ اور افسانوں کے ایک سلسلے کے علاوہ میں نے اور بھی کئی طرح کی چیزیں لکھیں۔

ایک دن میں نے صفیہ سے کہا، 'میں اب ٹھیک ہو چکا ہوں، چلو اب پاکستان سے چلتے ہیں۔'

—کہاں جائیں گے۔ منٹو صاحب؟

—بمبئی۔

—آپ بمبئی کو بھول نہیں سکتے۔ ہے نا؟

—بمبئی میری دوسری جائے پیدائش ہے، صفیہ۔

—بمبئی میں آپ کو کام کون دے گا؟

—میں عصمت کو خط لکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور بمبئی میں کچھ انتظام کر دے گی۔

—عصمت آپا نے تو پلٹ کر آپ کی خبر نہیں لی، منٹو صاحب۔

—وہ اپنی دھن میں رہتی ہے۔ میرے بمبئی آنے کا سن کر وہ ضرور رابطہ کرے گی۔ تم تو چلنے کو تیار ہو نا؟

—جہاں آپ جائیں گے، میں بھی چلوں گی۔

—میں نے فوراً عصمت کو خط لکھا— میں بمبئی لوٹنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے وہاں کچھ انتظام کرو، عصمت، تا کہ ہم سب واپس آ سکیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر تم میرے لیے کسی اسٹوڈیو میں کام تلاش کر دو تو ہم دوبارہ سے مل کر زندگی گزار سکتے ہیں، ہم سب۔

میں نے عصمت کو دوسری بار، پھر تیسری بار خط لکھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو کیا عصمت آخری وقت تک یہ سمجھتی رہی کہ میں ایک موقع پرست انسان تھا جو اپنے فائدے کے پیچھے پاکستان چلا گیا؟ یا وہ جان گئی تھی کہ شراب نے مجھے پوری طرح کھوکھلا کر دیا ہے اور یہ کہ میرے پاس اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ لیکن میں اس کے جوابی خط کا ہر روز انتظار کرتا رہا۔ میری شراب نوشی بھی اسی تناسب سے بڑھتی چلی گئی۔ نشے کی خماری میں میں اپنے افسانوں کے کرداروں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دن گزارا کرتا۔

ہاں، مرزا صاحب۔ میں مرتا جا رہا تھا۔ پورے ہوش و حواس میں تھوڑا تھوڑا روز مرتا جا رہا تھا۔ گلے میں رسّی ڈال کر یا زہر کھا کر یا پھر کلائی کی نسیں کاٹ کر جان دینے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ میں اپنے آپ سے، صفیہ سے اور اپنی تینوں بیٹیوں سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ اس لیے میں نے دھیرے دھیرے آنے والی موت کا انتخاب کر لیا۔ ایسے ملک میں رہنے کی میری کوئی خواہش نہیں تھی جس نے مجھے سوائے تہمتوں اور مذمتوں کے کچھ نہیں دیا تھا۔ اور میں جان چکا تھا کہ میں دن بہ دن اپنے خاندان کے لیے بوجھ بنتا جا رہا ہوں۔ اب نہ وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے اور نہ مجھ پر ترس کھاتے تھے— اب تو وہ مجھے شاید انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

ایک رات میں نے نیند کے عالم میں سنا کوئی مجھ سے سرگوشی میں کہہ رہا ہے، 'منٹو بھائی، منٹو بھائی—'

میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا عصمت میرے پاس بیٹھی برف کی قلفی دانتوں سے چبا رہی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

—عصمت بہن، تم کب آئیں؟

—مدّت ہوئی۔ کب سے آپ کو جگا رہی تھی۔

—شاہد کہاں ہے؟ وہ نہیں آیا؟

—آئے ہیں۔ جلدی سے تیار ہو جائیے۔

— کس لیے؟

—آپ بمبئی تشریف لے جا رہے ہیں۔

—بمبئی! میں بستر سے اچھل پڑا۔—میری نوکری کا بندوبست کر دیا نا؟

—بالکل۔

—صفیہ......صفیہ......میں چلّایا۔—جلدی آؤ، صفیہ۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ عصمت میرے خطوں کو نظر انداز نہیں کرے گی۔

صفیہ آئی اور آ کر اس نے مجھے لپٹا لیا— کیا ہوا، منٹو صاحب؟ کیا کوئی بُرا خواب دیکھ لیا؟

— عصمت کو کچھ ناشتا وغیرہ دو۔ شاہد کہاں ہے۔ بلاؤ اُسے۔

— کہاں ہیں عصمت آپا، منٹو صاحب؟

—وہ رہی......یہیں تو تھی......کہاں گئی وہ؟ ضرور تمھارے کمرے میں چھپ گئی ہوگی، صفیہ۔

صفیہ نے کسی بچے کی طرح مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے دوبارہ مجھے بستر پر لٹا دیا۔—سو جائیے، منٹو صاحب، سو جائیے۔ اس کی انگلیاں کسی پَر کی مانند مجھے چھوتی رہیں۔

اگلی صبح میں جلدی جاگ گیا۔ مدت پہلے سُنے ہوئے کسی پنجابی گیت کے بول کہیں سے تیرتے ہوئے آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا صفیہ میرے پیروں کے پاس سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ یوں دمک رہا تھا جیسے آج صبح ہی اس کا جنم ہوا ہو۔ تقسیم نے اس پر اپنا سایہ نہیں ڈالا تھا، اس پر فسادات کے خونی چھینٹے بھی نہیں پڑے تھے۔ وہ کسی پہاڑی پینٹنگ کی کوئی غنودہ دوشیزہ معلوم ہو رہی تھی جس کے اردگرد ایک نئی دنیا جنم لے رہی تھی۔ آسمان، پانی، ہوا، بادل، اڑتے ہوئے سارسوں کا جھنڈ، ہرن اور ہرنیاں—میرے کمرے میں گویا جشن بپا تھا۔

اچانک میرے پیٹ میں مروڑ اٹھا اور مجھے بڑی سی اُلٹی آ گئی۔ غسل خانے کے بیسن میں

نیلا اور زرد پانی پھیل گیا جس میں خون کی آمیزش تھی۔ اور اس کے بعد خون ہی خون آنے لگا۔ جب میں نے منھ دھو کر خود کو آئینے میں دیکھا تو میں چونک اٹھا مرزا صاحب۔ یہ کون تھا؟ کیا یہ سعادت حسن منٹو تھا یا خود موت کھڑی تھی؟ میں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ 'اس بار تم جیت گئے، منٹو۔ بس کچھ دن اور یونہی دانت بھینچے انتظار کرتے رہو۔'

۴۵

قارئین! منٹو کا قلم اب رُکتا ہے۔ مرزا صاحب گہری نیند میں جا چکے ہیں۔ ان کے پاس کہنے کو اب اور تھا بھی کیا؟ شاہجہاں آباد کی موت کے ساتھ جس تہذیب کی موت ہوئی تھی، اسی کے ساتھ مرزا غالب کی بھی موت ہوگئی۔ اس کے بعد بارہ سال تک ان کا جینا، جیتے رہ کر مرنے جیسا تھا۔ بیماریوں اور بڑھاپے سے پریشان، وہ نہ چل پاتے تھے، نہ سُن پاتے تھے، بینائی دھندلی ہو چکی تھی اور یادداشت ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ میں اس خرابے کے بارے میں اور نہیں لکھنا چاہتا۔ اب صرف اس دن کا انتظار باقی ہے جب میں 'خدا حافظ' کہہ کر آپ سے رخصت لوں گا۔

لیکن میں جانے سے پہلے آپ لوگوں کو اپنے کل رات کے خواب کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میں جامع مسجد کے باہر گھوم رہا تھا۔ اچانک کوئی آیا اور آ کر اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ دیکھا تو وہ کلّو تھا۔

— آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، منٹو بھائی؟

— کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟

— پہچانوں گا کیسے نہیں؟ کلّو مسکرایا۔ 'اپنی قبر میں لیٹا آپ سے اور مرزا صاحب سے اتنے قصے سُنتا رہا ہوں۔'

— قبر میں لیٹے؟

— آپ بھی تو اپنی قبر ہی میں تھے، منٹو بھائی۔ آپ کو یاد نہیں؟

— لیکن میں تو ابھی مرا نہیں ہوں، کلّو۔

— واقعی؟ کلّو اپنا سر کھجانے لگا۔ 'پھر ضرور میں نے خواب میں دیکھا ہوگا۔'

— خواب میں؟ لیکن تم تو مر چکے ہو، کلّو —

— تو کیا ہوا، منٹو بھائی؟

— کیا مُردے بھی خواب دیکھتے ہیں؟

— بے شک دیکھتے ہیں۔ معلوم ہے اس دنیا میں کتنے خواب تیرتے پھر رہے ہیں؟ دنیا میں جتنے لوگ ہیں، خواب اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ اس لیے وہ مُردوں پر بھی قابض ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ ایک قصہ سننا چاہیں گے، منٹو بھائی؟

— قصہ؟ یہاں قصہ سنانے والا کون ہے؟

— ارے میں روز یہاں آتا ہوں۔ اور مجھے کوئی نہ کوئی داستان گو ضرور مل جاتا ہے۔ وہ دیکھیے......

— کون؟

— وہ آدمی جو دُلائی اوڑھے بیٹھا ہے، وہ ایک گشت کرنے والا داستان گو ہے۔

— تمھیں کیسے معلوم، کلّو؟

— آپ خود دیکھ لیجیے۔ وہ آدمی آپ ہی آپ ہنستا چلا جا رہا ہے۔ جانتے ہیں کیوں؟ جو لوگ قصّوں سے چپٹے پڑ رہے ہوں، وہ اپنی ہنسی نہیں روک پاتے۔ آئیے۔ آئیے میرے ساتھ۔

اس آدمی کے پاس جا کر کلّو اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

— میاں —

— کون؟ آدمی نے کلّو کی طرف دیکھا پھر مسکرا دیا۔ 'ارے، کلّو میاں —

— تم مجھے جانتے ہو، میاں؟

— اس بھری دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو تمھیں نہ جانتا ہو؟ کلّو قصہ خور، کم بخت کہیں کا۔

کلّو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میرا بازو کھینچتے ہوئے بولا، 'بیٹھ جائیے، منٹو بھائی، یہاں بیٹھ جائیے۔

— تم تو بڑے مشہور ہو، کلّو۔ میں نے ہنس کر کہا۔

دُلائی اوڑھے بیٹھا آدمی میری جانب مڑا اور بولا، 'کتنے لوگ ہیں جنھیں واقعی قصہ سننے کا سلیقہ آتا ہے جناب؟ کوئی کان کھجا رہا ہوتا ہے تو کوئی چوتڑ۔ کوئی اِدھر اُدھر دیکھے جا رہا ہے۔ قصہ

سننے کی بھی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ جس طرح آپ خدا پر یقین کرتے ہیں، اسی طرح قصے پر بھی یقین کر کے اسے سنتے جایئے۔ میں سڑکوں پر گھوما کرتا ہوں، کسی سامع کو ڈھونڈ رہا ہوں، لیکن آج کل قصے سننے کا کسی کے پاس وقت نہیں۔ دنیا بڑی بے سکون ہوگئی ہے، جناب کوئی نہیں سمجھتا کہ قصہ سننے سے دل کا سکون لوٹ آتا ہے۔'

—تو پھر شروع کیجیے، میاں۔ کلو جوش کے ساتھ بولا۔

—عجلت مت کرو، کلو میاں۔ ذرا کتابِ دل کے اوراق الٹنے کا تو وقت دو۔ جو میری ہی تسکین نہ کرے، ایسا قصہ سنا کر بھلا مجھے کیا خوشی ہوگی؟

بڑی دیر تک وہ آدمی سر جھکائے بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا اور دھیرے دھیرے کچھ گنگناتا رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا، 'آج شیخ کا قصہ خوب رہے گا۔ یہ دلِ بینا کی تلاش کا قصہ ہے۔'

وہ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا پھر اس نے قصہ کہنا شروع کیا:

کسی شیخ کے دو بیٹے بیماری کے سبب فوت ہوگئے تھے۔ لیکن کسی نے اسے بچوں کے غم میں کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر روز معمول کے مطابق کام پر جاتا، حتیٰ کہ کام کرتے وقت گنگناتا بھی رہتا، گھر واپس آکر سب کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا اور قہقہے لگاتا۔ شیخ کی ماں اور اس کی بیوی اس کے اس رویے پر حیران تھیں۔ ایک صبح جب شیخ ناشتا کر رہا تھا، اس کی والدہ نے غل مچانا شروع کر دیا، 'دو بیٹوں کو کھونے کے بعد ہماری کیا حالت ہے، کیا تمھیں اس کا احساس ہے، میرے پسر؟ ہمارے دلوں سے مسلسل خون رس رہا ہے۔ اپنی بیوی کی طرف دیکھا ہے کبھی؟ دن بہ دن مرجھاتی جارہی ہے۔ تم ہر روز معمول کے مطابق کام پر چلے جاتے ہو، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو......' شیخ کی والدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کی بیوی بھی غصے سے پھٹ پڑی، 'تمھارے سینے میں دل ہے بھی یا نہیں؟ میں نے تمھیں ایک آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ اگر تمھیں بچوں سے پیار ہوتا تو تم ایسا کیسے کر سکتے تھے؟ جیسے کچھ بدلا ہی نہیں...... جیسے وہ زندہ ہوں ابھی......'

—در حقیقت کچھ بھی نہیں بدلا، بیگم۔ میرے بیٹے مجھ میں زندہ ہیں۔ میں انھیں ہر وقت

دیکھا کرتا ہوں۔

—اور میں انھیں ہر جانب ڈھونڈا کرتی ہوں۔ راتوں کو سو نہیں پاتی۔ وہ رو رو کر مجھ سے کہتے ہیں، 'ہمیں بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے والدہ، بہت بھوک لگی ہے۔ ہمیں اندر لے چلیے۔' وہ مجھے کیوں نہیں دکھائی دیتے؟

—انھیں دل کی آنکھ سے تلاش کرو، دکھائی دے جائیں گے۔

—تمھارے دل کی آنکھ تو اندھی ہے۔ تم تو اس سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

—نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے چیزوں کو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پاتے۔ ہم انھیں الگ انداز سے دیکھتے ہیں۔ میرے لیے سب ایک ہے۔ میں اپنے بچوں کو ہر وقت دیکھا کرتا ہوں۔ وہ یہیں میرے آس پاس کھیلتے رہتے ہیں۔

—کہاں؟ دکھاؤ مجھے۔ مجھے تو وہ نظر نہیں آتے۔

—وہ ہماری ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیں گے۔ تم نے کبھی پانی کے اوپر اُگے خودرَو پودوں کو دیکھا ہے؟ ہمارے احساسات بھی ان خودرَو پودوں کی طرح ہوتے ہیں۔ تم تبھی کچھ دیکھ پاؤ گی جب انھیں ایک طرف ہٹا دو گی۔ آنکھیں بند کر لو اور اس کا تصوّر کرو، جو دکھائی نہیں دیتا۔ تمھارے بیٹے تم سے آکر لپٹ جائیں گے، بیگم۔

—میرا سینہ خالی ہو چکا ہے، صاحب۔ تمھارے خوبصورت الفاظ اسے دوبارہ نہیں بھر سکتے۔ شیخ کی زوجہ رونے پیٹنے اور سینہ کوبی کرنے لگی۔

شیخ کی والدہ نے کہا، 'تم جس آنکھ کی بات کر رہے ہو، ہم وہ سمجھنے سے قاصر ہیں، پسر۔ ہمیں باتوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو۔'

شیخ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ماں اور بیوی کی باتوں کی جھنجلاہٹ نے اسے ناخوش کر دیا تھا۔ وہ ان کا غم دور کرنے سے قاصر تھا۔ وہ لوگ اس جدائی کو حقیقت تسلیم کر چکے تھے۔ شیخ نے انھیں ایک قصہ سنانا شروع کیا۔

—ایک عورت کا قصہ سنو، اس کے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہوتا، پیدائش کے چند ہی دنوں میں فوت ہو جاتا۔

—لیکن ہمارے بچے تو کئی سال زندہ رہے۔ اس کی ماں نے اسے ٹوک دیا۔

—اور وہ عورت؟ شیخ کی بیوی نے پوچھا۔—وہ تو ضرور غم سے مرگئی ہوگی۔ میں بھی مرجانا چاہتی ہوں، لیکن موت نہیں آتی۔

—عورت نے بیس بچے کھوئے۔ ایک دو نہیں، بیس۔ وہ گلیوں میں ماری ماری پھرتی اور خدا کو بُرا بھلا کہتی۔ پھر ایک رات ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

—وہ کیا؟

—عورت نے خواب میں دیکھا وہ ایک صحرا سے گزر رہی ہے۔ خون اس کے پیٹ سے رس کر ریت میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس پہنچی۔ اس میں داخل ہو کر وہ ایک تنگ سے راستے میں پہنچ گئی جو رحم سے مشابہ تھا، یہ راستہ اُسے ایک نئی اور حیرت انگیز دنیا میں لے گیا۔ اس نے دیکھا باغِ عدن میں نہر بہہ رہی ہے جس کے ساتھ چشمۂ آبِ حیات ہے۔ اس باغ کے نباتات کبھی نہیں مرتے۔ یہ باغ ہر ایک کو دکھائی نہیں دیتا۔ اسے وہی دیکھ سکتے ہیں جو اس کے ہونے کا یقین کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام جشنِ مسرت اسی باغ میں برپا ہوتے ہیں۔

'یہ سب تمھارا وہم ہے،' شیخ کی بیوی چلائی۔ 'ایسا کوئی باغ کہیں نہیں ہے۔'

—اس باغ کا کوئی نام نہیں، اس کا حسن بیان سے باہر ہے۔ پھر بھی یہ باغ اسی دنیا میں واقع ہے، بیگم۔

—بتاؤ، اس عورت کا کیا ہوا؟ اپنی ساری اولادیں کھونے کے بعد اس نے باغ میں کیا پایا؟

—وہ جنت کی اس نہر میں اُتر گئی۔ اس کے تمام غم اور وسوسے کسی میل کی طرح فوراً ہی دُھل گئے۔ نہر میں نہاتے ہوئے اس نے اپنے بچوں کی کلکاریاں سنیں۔ حقیقتاً، میرا یقین کرو، اس کے بچے ہنستے کھیلتے اس کے ساتھ تیر رہے تھے۔ عورت کے دل سے خوشی کا سیلاب بہہ نکلا۔

—تو پھر مجھے بھی اس جگہ لے چلو۔ بتاؤ، وہاں کیسے جایا جاسکتا ہے؟

—فقیروں کے بارے میں سوچو، بیگم۔ ان کی زندگی میں چاہے جو بھی ہو جائے، وہ کبھی شکوہ نہیں کرتے۔ اللہ نے جو ان سے لیا ہے، اس سے کہیں زیادہ انھیں دے گا۔ انھیں بس اس راہ پر چلنا ہوتا ہے جس پر انھیں چلنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

—ایسی مشکل راہ پر ہم کیسے چل سکتے ہیں؟

—یہ آسان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ لکیر و کو بھی واہموں نے گھیر لیا تھا۔

—لکیر و کون؟

—تو پھر ان مسافروں کے قصے سنو جو راہ میں پیش آنے والے ہر واقعے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

—سناؤ، بیٹے، تمھارے قصوں سے ہمارا دل ہلکا ہو رہا ہے۔ شیخ کی ماں روٹی تناول کرنے لگی۔

—لکیر و ایک زائر تھا۔ وہ ہمیشہ ایک مقام سے دوسرے پر سفر میں رہتا۔ وہ کہیں بھی یا کسی کے بھی ساتھ قیام نہیں کرتا تھا۔

—حیرت ہے! کیا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

—لیکن اس کی ایک کمزوری تھی۔

—اس کے بچے؟ شیخ کی بیوی نے پوچھا۔

—نہیں۔ فقراء۔ اس کا ان کی جانب بہت جھکاؤ تھا۔ ان کے ذریعے سے وہ ایک تنکے میں ساری کائنات دیکھ سکتا تھا۔ یہ فقیر ہی تھے جنھوں نے اسے یہ بات سمجھائی تھی کہ خدا بندوں ہی میں ہوتا ہے۔ ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں لکیر و فقیروں کی تلاش میں نہ گیا ہو۔ چلتے چلتے اس کے پیروں سے خون ٹپکنے لگتا۔ جب لوگ اُس سے پوچھتے، ان لہولہان پیروں کے ساتھ تم یہ صحرا کیسے پار کرو گے تو لکیر و مسکرا کر کہتا: 'یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'

—اور پھر؟

—ایک شام لکیر و ساحلِ سمندر پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ دور کہیں، کھجور کے درختوں سے بھی لمبی سات شمعیں روشن ہیں۔ ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ان شمعوں کی طرف چلتا ہوا لکیر و ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ گاؤں والے بنا تیل کے دیے ہاتھ میں لیے سڑکوں پر پھر رہے ہیں۔

—کیا معاملہ ہے؟ دکو کی نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

—دیکھ نہیں رہے؟ ہمارے چراغوں میں تیل نہیں ہے، بتی نہیں۔ پیٹ میں روٹی نہیں۔

—ذرا اپنے اردگرد تو دیکھو۔ آسمان روشنی سے بھرا ہوا ہے۔ کیا تمھیں وہ سات شمعیں دکھائی نہیں دیتیں؟ خدا نے خود ہی ہمیں اتنی روشنی دے رکھی ہے۔

— کیسی روشنی؟ آسمان تو بالکل تاریک ہے، تم نے روشنی کہاں دیکھ لی؟ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو؟

لکیرو نے اس آدمی کو غور سے دیکھا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن درحقیقت وہ سلی ہوئی تھیں۔ سب کی آنکھیں اسی طرح تھیں۔ کھلی ہوئی لیکن بند۔

جیسے ہی سورج طلوع ہوا، وہ ساتوں شمعیں سات درختوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جب صحرا تپنے لگا تو لکیرو ان درختوں کے سائے میں جا کر بیٹھ گیا اور کھانے کے لیے ان کا پھل توڑنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ گاؤں والوں نے دھوپ سے بچنے کے لیے پھٹے پرانے کپڑوں کے شامیانے تان رکھے ہیں۔ لکیرو نے انھیں پکارتے ہوئے کہا، 'تم لوگ یہاں درختوں کی چھاؤں میں آ کر کیوں نہیں بیٹھتے؟ کیا تمھیں یہ پھل دکھائی نہیں دیتے؟ ان سے تمھاری بھوک پیاس بھی مٹ جائے گی۔'

—ہمیں تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ کیسے درخت؟ یہاں تو ہر طرف ریگستان ہے۔ کیا تم ہم لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہو؟ ہم یہ گاؤں ہی چھوڑ جائیں گے۔

— کہاں جاؤ گے تم لوگ؟

—سمندر میں ایک جہاز لنگر انداز ہے، ہم لوگ اس پر سوار ہو کر جہاں جی چاہے گا چلے جائیں گے۔

—میری بات سنو، بھائیو۔ تم سب ایک دوسرے کو جھوٹ بول کر دھوکا دے رہے ہو۔

— بکواس بند کرو۔ اپنی فضول باتوں سے ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔ درخت تو ہم نے بھی دیکھے ہیں، لیکن وہ سب خواب ہے۔ ہمیں اس پر یقین نہیں۔ ہم حقیقت کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔

— حقیقت؟ کیا ہے حقیقت؟ بھوک اور پیاس اور جھلساتا ہوا سورج؟ درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ دیکھتے نہیں تم؟

— نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ سمندر کے اُس پار ہمیں ضرور کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔

لکیرو تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا اتنے سارے لوگ تو غلط نہیں ہو سکتے۔ تو کیا پھر میں ہی پاگل ہو گیا ہوں؟ وہ ایک درخت کے پاس گیا اور اپنے بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔ 'تم تو جانتے ہو گے میں ایک کند ذہن انسان ہوں،' اس نے سرگوشی کی۔ 'کیا تم میری روکھی ذہانت پر میری عُر دیوانگی کو ترجیح دو گے؟'

یکایک چھ درخت صف باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ساتواں امام کی طرح ان کی امامت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ ساتوں پیڑ سات انسانوں میں بدل گئے۔ 'لکیرو!' انھوں نے یک زبان ہو کر اسے مخاطب کیا۔

—آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟

—جو قلب اللہ کی تلاش میں ہو، اس قلب سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہتا، لکیرو۔ ہم یک قالب ہیں۔ قالب اللہ۔ قلب کو خود مت ڈھونڈو، لکیرو۔ اب آؤ، ہمیں نماز پڑھانے میں مدد کرو۔

—مجھے کچھ بھی نہیں آتا، حضور۔ میں تو گدھے سے بدتر ہوں۔

—تم جیسا متّقی گدھا تو سب سے بلند ہے۔

شیخ کی زوجہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ 'مجھے بتاؤ میں اپنے بیٹوں سے کہاں مل سکوں گی؟'

— کچھ دیر انتظار کرو، بیگم۔

—پسر، لکیرو کا کیا ہوا؟ شیخ کی والدہ نے اس سے پوچھا۔

—نماز پڑھتے ہوئے لکیرو کو بے شمار روتی چیختی پُر اندوہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سمندر چاندنی میں پُرشور ہو چکا تھا۔ جہاز کسی غرقابے کی مانند لہروں پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ سارا گاؤں جہاز پر تھا۔ وہ چیخ رہے تھے— ہمیں بچاؤ— ہم پر رحم کرو— اے خدا— ہمیں بچا لے— یکایک جہاز دو ٹکڑے ہو گیا۔

—تو کیا وہ سب مر گئے، پسر؟

— لکیرو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے دعا کی، انھیں بچا لے، اے خدا، انکی خطائیں معاف فرما دے، ان کی آنکھیں کھول دے اور انھیں صراطِ مستقیم پر لے چل۔

شیخ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اس کی والدہ نے پوچھا،'وہ لوگ بچ تو گئے نا، پسر؟'

—ہاں، سمندر پُرسکون ہوگیا تھا۔ وہ سب تیرتے ہوئے ساحل پر آ گئے۔

اتنے دنوں میں پہلی بار شیخ کی زوجہ نے روٹی کا ٹکڑا کھایا اور پانی کا گھونٹ بھرا۔

—پھر کیا ہوا؟ شیخ کی والدہ نے پوچھا۔

—سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے ان سات آدمیوں نے پوچھا،'اور کس نے خدا پر خدائی کی ہے؟' ظاہر ہے لکیرو کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ ہوا میں تحلیل ہوکر غائب ہوگئے۔ دکوکی نے دوبارہ گلی گلی پھرنا شروع کیا، اس بار وہ اپنے ساتوں ساتھیوں کی تلاش میں تھا۔

ایک رات اس نے سڑک کے کنارے ایک کنویں میں پورے چاند کا عکس دیکھا۔ خوشی سے بے قابو ہوکر وہ ناچنے اور گانے لگا۔ یکا یک ایک بادل نے آ کر چاند کو ڈھانپ لیا۔ کنویں میں عکس مٹ گیا۔ لکیرو کنویں کے پاس لیٹ گیا، دیر تک یونہی لیٹا رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔'احمق!'اس نے چلانا شروع کیا۔'میں بڑا احمق ہوں! مجھ سے اب بھی عکس کو دیکھ کر بھول ہوجاتی ہے۔ اللہ تو بغیر چراغ کے بھی روشنی بخش سکتا ہے۔ میں کیوں اب تک ان سات لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں؟ اور کتنی دیر یہ خارجی وجود میری توجہ بھٹکاتا رہے گا؟ اے خدا! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں صرف تیرے ہی بارے میں سوچ سکوں۔'

داستان گو خاموش ہوگیا تو کلّو نے اس کی خاموشی توڑتے ہوئے، جوش کے ساتھ پوچھا،'پھر؟'

—پھر کیا؟

—لکیرو کا کیا ہوا؟

—شیخ کے گھرانے میں سب لوگ اپنے کاموں میں لگ گئے۔ دکوکی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

—لکیرو اب کہاں جائے گا؟

—کہاں جائے گا؟ وہ تو میرے تھیلے میں تھا، اور تھیلے میں ہی واپس آ گیا۔ داستان گو نے اپنے کندھے سے لٹکتے ہوئے تھیلے میں سے لکڑی کا ایک پتلا برآمد کیا— دیکھو میاں، یہ ہے لکیرو۔

—تمھارے تھیلے میں اور کون کون ہے، میاں؟

—خود دیکھ لو، انھیں پہچانتے ہو، کون ہیں یہ؟

—مرزا صاحب، حضور۔

—اور یہ؟

—جہاں پناہ بہادر شاہ۔

—یہ؟

—کلّو اچھل پڑا۔'منٹو بھائی......آپ......آپ......آپ بھی پتلے بن گئے؟

داستان گو نے ایک کے بعد ایک لکڑی کے پتلے اپنے تھیلے سے نکال نکال کر مسجد کے چبوترے پر سجا دیے۔ میں نے حیران ہوکر دیکھا، وہ سب کے سب میرے ناول'دوزخ نامہ' کے کردار تھے۔ رنگوں سے پُتے ہوئے پتلے روشنی میں چمک رہے تھے۔ تاریخ کی گرد اور تمازت بھی انھیں میلا نہ کر سکی تھی۔

میرے قارئین، میرے ساتھیو! منٹو کو اب اجازت دیجیے کہ آپ کو الوداع کہہ سکے۔

خدا حافظ۔

جب سے ہم نے منٹو کا ناول ختم کیا ہے، تبسم، اسی وقت سے مجھے میاں تان سین کی زندگی کا ایک عجیب و غریب واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میاں تان سین راگ بھیرو کے ماہر تھے۔ اس راگ کا الاپ وہ صرف اس وقت کرتے تھے جب شہنشاہ اکبر کے بیدار ہونے کا وقت ہوتا۔ شہنشاہ کی نظروں میں تان سین کا مقام سب استادوں سے بلند تھا۔ اسی وجہ سے دوسرے استاد میاں تان سین سے حسد رکھنے لگے تھے۔ ایک بار انھوں نے مل کر تان سین کی جان لینے کا منصوبہ تیار کیا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا،'ہم نے کبھی راگ دیپک نہیں سنا، جہاں پناہ۔ ہم ایک بار اسے سننا چاہتے ہیں۔ میاں تان کے سوا یہ راگ کوئی نہیں جانتا۔' شہنشاہ کو استادوں کی اس ملی بھگت پر کوئی شبہ نہ

ہوا۔ انھوں نے تان سین سے کہا، 'میری راگ دیپک سننے کی خواہش ہے، میاں تان سین۔ کیا آپ میرے لیے یہ راگ گا سکیں گے؟' تان سین نے جواب دیا، 'یہ راگ گانے سے میری موت واقع ہوجائے گی، جہاں پناہ۔'

—وہ کیونکر؟

—میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔

—ایک راگ کے گانے سے کسی کی موت کیونکر واقع ہوسکتی ہے؟

—میں آپ سے حقیقت بیان کررہا ہوں، جہاں پناہ۔

—یہ ناممکن ہے، میاں۔ آپ کو دیپک راگ گانا ہی ہوگا۔

بہت سوچ بچار کے بعد تان سین نے پندرہ دن کی مہلت طلب کی۔ وہ جانتے تھے کہ دیپک راگ کی آنچ—اس کے سُروں کی آگ— گائیک کو جلا ڈالتی ہے۔ اس لیے کسی کو اس کا توڑ کرنے والے سروں کی ٹھنڈی پھوار سے اس آگ کو بجھانا پڑے گا۔ جب وہ دیپک راگ گا رہے ہوں، کوئی دوسرا گائیک اسی وقت راگ میگھ چھیڑے، صرف اسی صورت میں تان سین کی جان بچ سکتی ہے۔ تان سین نے ان پندرہ دنوں میں اپنی بیٹی سرسوتی اور سوامی ہری داس کی چیلی روپ وتی کو راگ میگھ گانے کی تربیت دی۔

طے شدہ دن کی صبح تان سین دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔ دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تان سین نے راگ دیپ گانے کی تیاری شروع کی۔ دوسری طرف سے سرسوتی اور روپ متی نے بھی اپنے گھر میں راگ میگھ شروع کیا۔ تان سین نے انھیں ہدایت کی تھی کہ جب وہ دعائیہ کلمات ادا کرکے راگ دیپک گانا شروع کردیں تو وہ دونوں راگ میگھ کا الاپ شروع کریں۔

جوں ہی دعائیہ رسمیں پوری ہوئیں، شہنشاہ جلال الدین اکبر رونق افروز ہوئے۔ ان سے اجازت طلب کرکے تان سین نے راگ دیپک شروع کیا۔ دربار میں ہر طرف دیپ رکھے ہوئے تھے۔ تان سین نے کہا جوں ہی دیپ جل اٹھیں گے وہ اپنا گانا بند کردیں گے۔ جیسے ہی انھوں نے الاپ شروع کیا، دربار میں موجود ہر شخص کو یوں لگا جیسے شدید لو چلنے لگی ہے۔ تان سین بھی پسینے میں شرابور ہوگئے۔ ان کی آنکھیں خون آلود ہوگئیں۔ پھر ان کا جسم جلنے لگا۔ دربار میں رکھے تمام دیپ

جلنے اٹھے— ہر طرف آگ پھیل گئی۔ لوگ جس طرف بھی ممکن ہوا بھاگ کھڑے ہوئے۔ نیم سوختہ تان سین بھی اپنے گھر کی سمت دوڑے۔

سرسوتی اور روپ وتی نے راگ میگھ میں اپنا الاپ شروع ہی کیا تھا۔ جوں جوں وہ گاتی چلی گئیں، دلّی کے آسمان پر گھٹا چھاتی چلی گئی۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں، اور پھر گھمسان کا مینہ برسنے لگا۔ تان سین کا جھلسا ہوا بدن ٹھنڈا ہوگیا۔

اس ناول میں منٹو گویا تان سین کا دیپک راگ ہیں مجسّم۔ ہم نے اس سفر میں کامیابی کے ساتھ آگ کے دائروں کو پار کیا ہے۔ لیکن کہاں ہیں آج سرسوتی اور روپ وتی، جو راگ میگھ گا کر مرزا اور منٹو کے جھلسے ہوئے جسموں کو بارش میں نہلا سکیں؟ ان کے لیے میری تلاش مجھے ایک نئے ناول کی جانب لے جارہی ہے۔ اس ناول کا نام ہوگا 'رادھا کا اسرار'۔

کچھ مصنف کے بارے میں:

کتاب کے مصنف رویشنکر بال بنگالی زبان کے نامور صحافی اور ادیب تھے۔ ۱۹۶۲ء میں پیدا ہونے والے اس نہایت عمدہ ادیب

کچھ مترجم کے بارے میں

کتاب کے مترجم انعام ندیم اردو کے شاعر اور ادیب ہیں اور وہ کراچی میں رہتے ہیں۔ انعام ندیم نے ۹۰ء کے ابتدائی عشرے میں شاعری کا آغاز کیا اور ۲۰۰۳ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ''درِ خواب'' کراچی سے شائع ہوا۔ اسی برس اس مجموعے کو 'عکس خوشبو ادبی ایوارڈ' دیا گیا۔ شاعری کے علاوہ انعام ندیم موسیقی کے بارے میں مضامین تحریر کرتے ہیں اور مختلف زبانوں سے شعروادب کے تراجم کرنے سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ''دوزخ نامہ'' ان کا پہلا ترجمہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے بھیشم ساہنی کی متعدد کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اس کے علاوہ گردیال سنگھ کے پنجابی ناول ''مڑھی دا دیوا'' کو بھی اردو میں ڈھالا ہے۔ یہ دونوں تراجم جلد شائع ہوں گے۔ آج کل وہ ''دوزخ نامہ'' کے مصنف روی شنکر بال کے ایک اور ناول A Mirrored Life کا اُردو میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ انعام ندیم حبیب یونی ورسٹی کراچی میں اُردو زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بیدل نے فردوس کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ وہ جگہ ہی کیا جہاں دل کسی درد سے نہ تڑپے۔ ریسنکر بال نے بجا طور پر غالب اور منٹو کا عالم عطف دوزخ کو قرار دیا ہے۔ دوزخ میں غالب اور منٹو ایک دوسرے کو اپنا اپنا افسانہ سنا رہے ہیں جو دل بے دماغ کی گفتگو سے بھی نازک تر ہے۔ غالب اور منٹو کی زندگیوں کے وہ بہت سارے کردار جن کی کچھ جھلکیاں کبھی ہمیں ان کی تحریروں میں نظر آئی تھیں، ریسنکر بال کے ناول میں ہم سے اور قریب آ گئے ہیں۔ یہاں غالب کی امراؤ بیگم بھی ہیں اور ان کے والد بھی، کلو داروغہ بھی ہے اور بہادر شاہ ظفر بھی، ولیم فریزر بھی ہے اور نواب شمس الدین بھی۔ غالب کی ڈومنی بھی ہے اور ایک محبوبہ شاعرہ المتخلص بہ 'ترک' بھی۔ منٹو کی طرف دیکھیے تو کون ہے جو نہیں ہے۔ لاہور اپنے کرشن چندر، بیدی، باری علیگ کے ساتھ، بمبے فلم انڈسری کا طلسمات، صفیہ اور اس کے ساتھ ساتھ عصمت جسے ریسنکر بال نے تقریباً منٹو کی محبوبہ ثابت کر دیا ہے۔ جہاں غالب نے اپنی زندگی کی تصویر کو صوفیانہ حکایات سے رنگین بنایا ہے، یہاں تک کہ رومی کا ان سے ملاقات کے لیے دوزخ میں آنا تک بیان کیا ہے، منٹو نے ان افراد کو اپنی یادداشت کا حصہ بنایا ہے، جنھوں نے اسے زندگی کے معانی سے آشنا کیا۔ ناول میں بنگالی مصنف نے غالب کے سفرِ کلکتہ کے بیان میں کمالِ فن سے ہمیں 'نازنیں بتانِ خود آرا' سے آگے دیکھنے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔

اپنی اپنی مشقِ فنا کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے غالب اور منٹو دونوں کی زندگیاں عبرت انگیز ہو گئی تھیں، مگر جانے دیجیے، غالب تو اس سے زیادہ کی توقع رکھتے تھے اور منٹو کی لاپروائی کے لیے تو غالب کا یہ آفاقی مصرعہ ہی بہت تھا:

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مصنف نے اس ناول کو منٹو کی تحریر کہا ہے جو کسی طرح اس کی دسترس میں آ گئی تھی۔ یہ ناول منٹو کو ہی لکھنا چاہیے تھا، شاید منٹو جیسا خود آگاہ غالب کو ہم سب سے زیادہ سمجھ سکتا تھا، مگر منٹو بت تراش نہیں تھا اور وہ اپنی بت شکنی کا تیشہ غالب اور اپنے آپ پر بھی برسانے سے نہ رکتا۔ دوزخ نامہ ان دو شخصیتوں کی زندگیوں کا مرقع ہے جو خود اپنے اپنے وقت میں 'ہندوستان' (برِصغیرِ پاک و ہند) قرار دیے جا سکتے ہیں۔ غالب اور منٹو اپنے اپنے عہد کی دانش کے عذاب سے باخبر تھے اور دونوں نے اسی لیے آشوبِ آگہی کے آگے خطِ ایاغ کھینچ لیا تھا۔

شاعر انعام ندیم نے دلسوزی سے دوزخ نامہ کو اردو میں منتقل کیا ہے اور ایسی خوش سلیقگی کے ساتھ کہ کہیں سے ترجمہ کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

افضال احمد سیّد

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road,Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

Scanned with CamScanner